

aanchalpk.com

ابتدائیہ

مغرب سے انتخاب

سلسلے وار ناول

ابن صفی

پبلشر مشتاق احمد قریشی پرنٹر جمیل حسن مطبوعہ ابن حسن پرنٹنگ پریس ہاکی اسٹیڈیم کراچی

دفتر کا پتا: 7 فرید چیمبرز عبداللہ ہارون روڈ صدر کراچی

متفرق کہانیاں

مستقل سلسلے

خط و کتابت کا پتہ: "آنچل" پوسٹ بکس نمبر 75 کراچی 74200 فون 021-35620771/2
فیکس 021-35620773 کے لیے ازمطبوعات نئے افق پبلی کیشنز۔ ای میل info@aanchal.com.pk

دستک

مشتاق احمد قریشی

میں ابن بطوطہ نہیں ہوں.....!

گذشتہ دنوں ہمارے کرم فرما جناب عبدالحمید صاحب جو خود بڑے اچھے شاعر اور ادیب ہیں۔ ملاقات کے لیے گھر تشریف لائے تو انہوں نے بڑی حیرانی کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا۔ قریشی صاحب آپ تو بڑے ہی چھپے رستم نکلے ہمیں یہ تو معلوم ہے کہ آپ شاعر بھی ہیں آپ کا ایک شعری مجموعہ بھی کوئی تیس برس پہلے شائع ہو چکا ہے جس پر ملک بھر کے تمام جید نقادوں شاعروں نے آپ کو بھرپور خراج تحسین پیش کیا تھا۔ اس کے بعد بھی آپ کی نثر کی کتابیں شائع ہو چکی ہیں لیکن کبھی آپ نے ذکر نہیں فرمایا کہ آپ ابن بطوطہ بھی تخلص کرتے ہیں۔ میں نے بڑی حیرانگی سے دریافت کیا حضرت یہ آپ کیا فرما رہے ہیں میں نے تو کبھی ابن بطوطہ کے نام کو بطور تخلص لکھا نہ استعمال کیا یہ خبر آپ کو کہاں سے ملی۔ میرے لیے تو یہ خبر ہے وہ بھی غیر معمولی۔ بولے حیرت ہے قریشی صاحب آپ کے گھر کے سامنے اتنا بڑا بورڈ ناظم صاحب نے لگوا رکھا ہے۔ جس میں جلی حروف میں اردو اور انگریزی میں لکھا ہوا" ابن بطوطہ اسٹریٹ" میں نے ہنستے ہوئے کہا۔ جناب اس سے میرا کیا تعلق کہنے لگے کیوں آپ کا کیوں تعلق نہیں آپ اسی اسٹریٹ میں رہتے ہیں۔ ارے جناب میں جب آپ کے گھر کی طرف آ رہا تھا تو بڑی سڑک پر داخل ہوتے ہی سب سے پہلے اسٹیٹ بینک کی عمارت ملی اس کے ساتھ والی گلی کے آغاز پر تاج الدین صدیقی کے نام کا تختہ لگا ہوا ہے اس کے بعد والی گلی حضرت میر تقی میر کے نام سے منسوب ہے پھر آپ والی گلی ہے جس کو ابن بطوطہ کے نام سے سجایا گیا ہے۔ میں غلط فہمی میں کئی گلیاں آگے نکل گیا آپ کے بعد یا آگے والی گلی کو ابھی کوئی نام نہیں دیا گیا۔ غالباً کوئی سیاسی مجبوری رہی ہوگی کیونکہ گلی کے نکڑ پر ہی ایک حکومتی سیاسی پارٹی کا غالباً دفتر بنا ہوا ہے مجھے ایسا ہی لگا۔ اس کے بعد والی گلی کے نکڑ پر حضرت راغب مراد آبادی قبلہ نام نامی لکھا ہوا ہے اس سے آگے جناب سحر انصاری شاید وہاں رہتے ہوں ان کا نام لکھا تھا اور پھر شاید چراغوں میں روشنی نہ رہی پھر معروف کرکٹرز کے نام پر تسلیم عارف جاوید میاں کے نام لکھے ہوئے ہیں میں لوٹ کر جب آپ کی گلی میں آیا تو میں یہی سمجھا کہ جس طرح میری تقی میر، راغب مراد آبادی، سحر انصاری کی ادبی خدمات کو خراج تحسین پیش کیا گیا ہے غالباً آپ کی پچاس سالہ ادبی خدمات کو مد نظر رکھتے ہوئے آپ کے نام کی تختی آپ کے گھر کے سامنے لگا کر آپ کو بھی خراج تحسین پیش کیا گیا ہوگا۔ لیکن شاید یہ وہ ابن بطوطہ ہوں گے جو مشہور تاریخ دان جغرافیہ دان عظیم مسلمان سیاح تھے۔ جس نے مراکش سے لے کر ہندوستان اور چین تک کا سفر کیا۔ اس سفر میں وہ جنوبی عرب، یمن، عدن، جنوبی افریقہ، مشرقی افریقہ، ممباسہ، عمان، مصر، شام، ایشیائے کوچک، ترکی اور بحری راستے ہندوستان کا سفر کیا۔

جس میں وہ لنکا' بنگال' کمبوڈیا' پیکنگ' کینٹن' سماٹرا' مالا بار' ظفار' پہنچا تھا یہ وہی معروف سیاح ہوگا جس کے نام سے آپ کی یہ گلی منسوب کی گئی ہے کیا وہ کہیں سے آپ کا کوئی نسبی رشتہ دار تو نہیں تھا کہ آپ کے حوالے سے آپ کے کسی جد امجد کے نام سے آپ کی یہ گلی منسوب کر دی گئی ہو۔ میں نے حمید صاحب کی بات پر ہنستے ہوئے کہا جناب آپ بھی تو کم تاریخ داں نہیں ہیں آپ نے تو ابن بطوطہ کی پوری تاریخ ہی بیان کر دی ہے۔ یہ تو علاقہ ناظم کا اختیار ہے کہ جسے چاہیں اسے نواز دیں میں کیا میری بساط کیا۔ کہنے لگے نہیں نہیں۔ یہ تو کہہ اوٹ پہاڑ والی بات ہوئی کہ سامنے کی چیز نظر نہ آئے اور دور کی سوجھے۔ ٹھیک ہے جب اردو ادب کے لوگوں کے نام لیے جا رہے ہوں تو ان کے درمیان ایک مسافر ایک سیاح کا نام کچھ مناسب نہیں تھا شاعروں کے ساتھ کسی شاعر کا ہی نام آنا چاہیے تھا یا تو ان کے آگے پیچھے بھی اور دیگر مسافروں سیاحوں کے نام آتے۔ میں نے کہا حضرت کوئی اور بات کیجیے۔ اللہ بڑا مسبب الاسباب ہے وہ ہر عمل سے پہلے اس کے اسباب پیدا کرتا ہے یقیناً اس میں بھی اللہ تعالیٰ کی کوئی نہ کوئی مصلحت ہوگی یہ تو آپ کی محبت ہے کہ آپ نے اس ناچیز کے بارے میں ایسا محسوس کیا مجھے تو میرے محلے والے اس حیثیت سے قطعی نہیں جانتے بس اتنا جانتے ہیں کہ ایک صاحب جو کسی اخبار سے متعلق ہیں اللہ اللہ خیر صلّا۔ نہ ہی میں نے کبھی کوشش کی نہ کسی کو تجسس ہوا پھر میں کیسے کسی سے کوئی شکوہ کر سکتا ہوں۔ آپ یہ بتائیں کہ موجودہ حالات میں پاکستان کہاں کھڑا ہے؟

ایک لمبی ٹھنڈی سانس لے کر گویا ہوئے پاکستان۔ یہ ہمارا وطن ہے اس کے لئے بڑی قربانیاں دی گئی ہیں اور عوام اب تک مسلسل قربانیاں ہی دے رہے ہیں اور شاید ایک عرصے تک مزید قربانیاں دیتے رہیں گے۔ مجھے یاد ہے کہ میرے بچپن میں گندم ایک روپے میں ایک من آیا کرتا تھی اس سے ہی اندازہ کر لیجیے کہ دیگر چیزوں کے کیا دام ہوں گے۔ ہاں اس وقت بڑے اچھے عہدیداروں کی تنخواہ سو ڈیڑھ سو روپے ہوا کرتی تھی اگر اس سے حساب کیا جائے تو آگے کی مہنگائی' مہنگائی نہیں لگے گی کیونکہ آج اچھے عہدیداروں کو لاکھوں میں تنخواہیں ملتی ہیں۔ اگر تناسب لگایا جائے تو تقریباً اتنا ہی بنے گا۔ ہاں تب میں اور اب میں یہ فرق آ گیا ہے کہ تب حکمران چور' ڈاکو لٹیرے نہیں ہوتے تھے خادم ہوتے تھے ملک و قوم کی خدمت کے جذبے لئے ہوتے تھے۔ اب تو خدمت خلق کے نام پر خود اپنی خدمت خلق کرنے والوں نے قبضہ کر رکھا ہے۔ اللہ ہماری اور ہمارے وطن عزیز کی حفاظت فرمائے۔ ہم نے ایک طویل زور دار آمین کہہ کر باتوں کا رخ موڑ دیا۔



گفتگو

عمران احمد

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: خبردار جس شخص نے ظلم کیا اس پر جس سے معاہدہ ہوچکا یا اس کے حق کو نقصان پہنچایا یا اس کو تکلیف دی اس کی طاقت سے زیادہ یا اس کی رضا مندی کے بغیر اس سے کوئی چیز لے لی تو میں اس سے قیامت کے دن جھگڑوں گا۔" (ابوداؤد)

عزیزان محترم ...... سلامت باشد

جس وقت آپ یہ سطور پڑھ رہے ہوں گے ماہ صیام کا ایک عشرہ جسے مغفرت کا عشرہ بھی کہتے ہیں گزر چکا ہوگا اور امت مسلمہ اللہ رب العزت کی رحمتوں کی بارش میں نہا رہی ہوگی کیونکہ یہ اس کا وعدہ ہے بے شک وہ اپنے وعدے میں سچا ہے ہماری بار بار کی نافرمانیوں، گستاخیوں، بغاوتوں کے باوجود وہ ہمیں نواز رہا ہے۔ ہر سال ہمیں رمضان المبارک دکھا نا نوازنا ہی تو ہے۔ اگر وہ ہماری غلطیوں سے صرف نظر نہ کرے تو ہم رمضان کا کوئی بھی عشرہ نہ دیکھ سکیں۔ اس کے باوجود ہم بحیثیت قوم اور امت ناشکرے ہیں۔ اگر ہم نے اس کی رحمتوں سے سبق سیکھا ہوتا اگر قرآن کی تعلیمات پر عمل پیرا ہوتے تو اس ماہ مقدس میں گراں فروشی اور ذخیرہ اندوزی نہ کرتے، مہنگا بیچنے والے دکاندار اور ریڑھی والے باہر سے نہیں آئے وہ بھی ہم سے ہیں اور وہی سب سے زیادہ لوٹ مار کررہے ہیں۔ ہم نے بھی قسم کھا کر دو دن قبل ایک خبر جو یقیناً آپ کی نظروں سے بھی گزری ہوگی ایک بار پھر آپ سے شیئر کرنے کو دل چاہتا ہے۔ ایک بھارتی صوبے کی خاتون وزیر اعلیٰ جو ہندو ہیں انہوں نے صوبے کی تمام مساجد میں افطار اور سحر کے لئے ہزاروں ٹن چاول تحفے میں بھجوانے کا اعلان کیا ہے تاکہ اس کی مسلمان رعایا کسی پریشانی کے بغیر اپنی عبادات کر سکے۔ ایک خبر یہ بھی سنئے کہ ملک بھر میں حکومتی دعوؤں کے باوجود ہر شے کی قیمت میں سو فیصد سے زائد کا اضافہ کردیا گیا ہے اور کئی شہروں میں سحری اور افطار کے دوران بجلی کی لوڈشیڈنگ کا سلسلہ بھی جاری ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اپنے حال پر رحم کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

نارتھ ناظم آباد کراچی سے شیخ محمد ابراهیم رقم طراز ہیں کسی بھی ڈائجسٹ کے لیے یہ میرا پہلا خط ہے آپ میرا شمار اپنے خاموش قارئین میں کرسکتے ہیں۔ ہاں اپنے بارے میں، میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ نئے افق تب سے میرے زیر مطالعہ ہے جب یہ ابن صفی میگزین تھا اور اس کی ادارت میرے عظیم پسندیدہ مصنف ابن صفی مرحوم اور اظہر کلیم مرحوم (اللہ تعالیٰ دونوں حضرات کو جنت الفردوس میں جگہ عنایت فرمائے) کیا کرتے تھے۔ کیا وقت تھا جب ہمیں کیسی کیسی شاہکار کہانیاں پڑھنے کو ملا کرتی تھیں۔ ایک سے بڑھ کر ایک انتخاب ہوتا تھا پھر ابن صفی میگزین نئے افق میں تبدیل ہوگیا تب بھی اس کے معیار میں کوئی کمی نہ آئی لیکن مشیت ایزدی نے ایک ایک کرکے کئی بڑے لکھنے والے ہم سے چھین لیے پہلے ابن صفی تھے پھر اظہر کلیم ہم سے جدا ہوئے اقبال کاظمی، ایس ایم الیاس، محمد ظفر اور کون کون سے تھے جو اپنی جگمگاہٹ سے قارئین کے اداس ذہنوں، لمحوں میں روشنی بکھیر دیا کرتے تھے۔ بہرحال محترم مشتاق احمد قریشی المعروف ڈاکٹر ایم اے قریشی نے بھی محترم ابن صفی صاحب کی شاگردی کا خوب حق ادا کیا۔ خود بھی خوب لکھا اور لکھنے والوں سے بھی کیا خوب

لکھوایا۔ اب تو انہوں نے بھی اپنی راہ تبدیل کرلی ہے۔ اب وہ فکشن کے بجائے اس راہ پر چل نکلے ہیں جس راہ پر چلنے کی ہر مومن تمنا کرتا ہے اللہ انہیں ان کے ارادوں میں استقامت بخشے، عمران میاں میرے اس ابتدائیہ کو پڑھ کر آپ کو اندازہ ہو گیا ہو گیا ہوگا کہ میں آپ کو برخوردار کہہ سکتا ہوں یعنی میں آپ کا اس وقت کا قاری ہوں جب آپ نے اس عالم فانی میں قدم بھی رنجہ نہیں فرمایا ہوگا۔ تو میاں میرا مقصد آپ کو بچہ جان کر تنقید کرنا نہیں ماشاء اللہ آپ اپنی ٹیم کے ہمراہ اچھی کوشش کر رہے ہیں لیکن وہ بات نہیں جو کبھی تھی۔ آپ پر بڑی ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ آپ اس چراغ کو جسے محترم ماہین صفی اور آپ کے والد مشتاق احمد قریشی نے روشن کیا جس لو کو مرحوم اظہر کلیم نے تیز کیا آپ بھی اس کی روشنی کو کم نہ ہونے دیں گو آپ اپنے وقت کے مطابق نئے لکھنے والوں کو ترجیح دے رہے ہیں ان کی خوب حوصلہ افزائی بھی کر رہے ہیں لیکن صاحبزادے وہ بات کہاں جو میں تھی ابھی کچھ پرانے لکھنے والے باقی ہیں جن کے نام نئے افق کی فہرست میں دیکھے برس گزر گئے کبھی کبھار ان سے بھی ملاقات کرادیا کریں گو آپ نئے دور کے ہیں ہوسکتا ہے آپ کا تعارف ان سے نہ ہو لیکن نئی نسل کو ان سے متعارف کرانے 'پرانی یادیں تازہ کرنے کے لیے ان سے رابطہ ضرور رکھیں یقین رکھیں آپ کو ان سے اب بھی سیکھنے کو بہت کچھ ملے گا سیکھنے سے مراد آپ پر تنقید نہیں انسان ماں کی گود سے لحد کی آغوش تک سیکھتا ہی رہتا ہے ویسے ایک بات پر تو آپ خراج تحسین کے مستحق ضرور ہیں کہ آپ حب الوطنی پر مبنی تحریروں کو زیادہ اہمیت دیتے ہیں آپ کی چاروں سلسلے وار کہانیاں، دیدبان، قلندر ذات، آتش زیر پا اور جگت سنگھ اس کی واضح مثال ہیں۔ دوسرے کہانیوں میں دلگرفتی یعنی تخش نگاری اور عامیانہ پن پر آپ کی گرفت سخت ہے، جس کی وجہ سے نئے افق ایک فیملی میگزین کہلاتا ہے۔ امید ہے آپ میری باتوں کو مائنڈ نہیں کریں گے اور اسے مثبت لیں گے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو آپ کی پوری ٹیم کو نیک ہدایت دے اور نئے افق کو ترقی دینے کی صلاحیتوں سے نوازے آمین۔ اللہ حافظ

ثنا سلوش ذشے کراچی سے فرماتی ہیں۔ محترم عمران بھیا! اسلام علیکم! امید واثق ہے کہ آپ کا اسٹاف، میرے قارئین اور نئے افق کے وہ تمام نئے ساتھی جو ابھی میرے نام سے واقف نہیں سب خیر خیریت سے ہوں گے۔ پہلے تو میں معذرت خواہ ہوں اپنی اتنی طویل غیر حاضری کے لیے، دیکھیے دیکھیے خفا مت ہوں قصور کچھ حد تک میرا بھی ہے مگر بہت حد تک حالات نے ایسا مصروف رکھا کہ ہر ماہ خط لکھ لینے کے باوجود میں اسے دفتر تک نہیں پہنچا سکی، وجہ دیگر آپ کو علم بھی ہوگا کہ میری شادی خانہ آبادی ہو چکی ہے اور اس خوب صورت حادثہ کو گیارہ ماہ گزر گئے بعد سرا 15 مئی کو اللہ تعالیٰ نے میری گود میں اپنی رحمت اتار دی اور مجھے ماں بننے کا اعزاز دیا۔ 15 مئی کو میری بیٹی پریشے خالد ناصر نے مجھے دنیا کی سب سے بڑی خوشی دی۔ میری سب قارئین سے التماس ہے کہ میری بیٹی کی صحت یابی کے لیے دعا کریں۔ پہلے میں سرحد پار (میرپور آزاد کشمیر) رہا کرتی تھی تو ہر ماہ تواتر سے شامل ہوا کرتی تھی مگر اب جب نئے افق کے شہر (کراچی) میں آ گئی ہوں تو طویل عرصے سے غیر حاضر ہوں۔ وجہ پوسٹ آفس سے دوری بھی ہے کچھ میں اپنے کام خود سے کرنے کی عادی ہوں اور کراچی جا کر پہلے سے قطعاً مختلف ماحول ملا ہے۔ مجھے راستوں کا علم نہیں حالات سب کے سامنے ہیں منٹوں میں کچھ سے کچھ ہو جاتا ہے پھر شادی کے بعد نئے گھر نئی زندگی اور نئے ماحول کو سمجھنے، اس میں ڈھلنے اور اپنے لیے وقت نکالنے میں بہت وقت لگتا ہے اس لیے میں امید کرتی ہوں کہ نا صرف ایڈیٹر صاحب بلکہ میرے سب قارئین میری مجبوری کو سمجھتے ہوئے مجھے معاف کر دیں گے۔ وعدہ نہیں کرتی پر ہر ماہ کوشش ضرور کروں گی کہ آپ تک کچھ نہ کچھ پہنچاتی رہا کروں۔ سال سے اوپر نئے افق سے غائب رہی ہوں تو اتنے عرصے میں نئے افق میں

بہت سی تبدیلیاں بھی دیکھنے کو ملیں بہت سے قارئین بچھڑ گئے بہت سے نئے لوگوں نے ساتھ دیا، کچھ قارئین کے عزیز حالات میں رہے تو بہت سے ساتھیوں کے عزیز و اقارب جہان فانی سے کوچ کر گئے۔ یہی دنیا ہے خود میری پیاری نانو 10 اپریل کو وفات پا گئیں ہمیں دعائیں دینے والے ہاتھ ہمارے لیے فکر مند رہنے والا ایک وجود، دعائیں دیتے والے لب، محبت سے دیکھنے والی آنکھیں...... سب مٹی میں جا سوئے۔ آج وہ تو کل ہماری باری ہے۔ نانو کے بغیر ان کا گھر ویرانہ تھا۔ میں خود کو بہلاتی رہتی گھر جانے والے واپس کب آتے ہیں۔ ان کے غم میں امی بھی بیمار رہیں قارئین سے التماس ہے کہ پلیز میری امی اور نانو کے لیے خاص طور پر دعا کریں کہ خدا امی کو صحت کاملہ اور نانو کو جنت الفردوس میں جگہ عطا فرمائے۔ اپنی باتیں بہت ہو گئیں اب رسالے کی طرف آتی ہوں گو کہ پچھلے تمام شمارے (تقریباً دو سال سے) میں مصروفیت کی وجہ سے مکمل پڑھ نہیں پائی پھر بھی ایک نظر دیکھے ضرور۔ کہانیوں کا انتخاب خوب رہا نیز سرورق بھی منفرد اور جاذب نظر تھے نئے لکھنے والوں کی تعداد میں بھی خاص طور پر اضافہ ہوا اور یہی نئے افق کی انفرادیت ہے کہ نئے آنے والوں کو مایوس نہیں کرتا میں خود بھی ہوں اگر آج سے سات سال قبل نئے افق میں میری پہلی کہانی شائع نہ ہوتی تو شاید آج میں رائٹر نہ ہوتی۔ جون کا شمارہ ابھی کی طرف الماری میں پڑا ہے سرورق پر بیٹھی جون کی تپش کا احساس نہیں تھا البتہ بردکت کے تھر پنا کو دیکھتی اکلوتی آنکھ میں الجھن کی ہلکی لکیروں پر خوب اتری ہوئی تھی۔ یعنی ہیروئن کے دل کے ویرانے کی طرح سرورق بھی ویران سا تھا۔ صفحات پلٹتے ہوئے نئے افق کی بہت سی ویب سائٹس کا بھی علم ہوا یہ اچھی بات ہے ساتھ ہی چونکا دینے والی بات نئے افق کی قیمت ہے۔ مارکیٹ میں رسالوں کی اکثریت 50، 60 یا 70 روپے سے بھی تجاوز کر چکی ہے جبکہ نئے افق اتنے برس گزر جانے کے بعد بھی فقط 40 روپے کا ہے جبکہ اس کا معیار صفحات اور تحاریر کا انتخاب بہت سے رسائل سے بڑھ کر ہے۔ سلام ہے عمران بھیا کو کہ جو آج بھی اتنا معیاری پرچہ ہمیں اتنے سستے میں فراہم کر رہے ہیں۔ حالانکہ مہنگائی کے بھوت نے سب کی جان لے رکھی ہے۔ فہرست میں کچھ پرانے ساتھی تھے اور کچھ نئے گو ابھی پریشانی کی وجہ سے کہانیاں نہیں پڑھ پائی۔ پھر بھی یقین سے کہتی ہوں کہ ایک سے بڑھ کر ایک ہوں گی۔ گفتگو کی طرف آتی ہوں خطوط کی تعداد نے بہت مایوس کیا کہاں تو چھ سات سال قبل یہ حال تھا کہ 20-25 خط شامل ہوا کرتے تھے خوب نوک جھونک اور پیار ملا کرتا تھا بزرگوں کی دعائیں ہمیں حوصلہ دیتی تھیں، صدارتی کرسی کی مبارک باد تو الگ ہی تھی اور ہم اکثر اسی چکر میں پرچہ ملنے کے اگلے دن ہی خط لکھنے بیٹھ جایا کرتے تھے اور کہاں آج 9 خط شامل ہیں جن میں سے 5 میرے پرانے ساتھی ہیں۔ طاہرہ جبیں تارا بہن کا صدارتی تبصرہ اچھا تھا انکل فقیر محمد بخش لنگاہ کی صحت کی خرابی کا پڑھ کر دکھ ہوا۔ ان کا تبصرہ بہت منفرد ہوا کرتا تھا۔ جس میں لفظ "کلیہ" مجھے بہت اچھا لگتا تھا۔ اللہ پاک انہیں جلد صحت یاب کرے آمین۔ ادیب سمیع چمن کی اس بات سے میں بھی اتفاق کرتی ہوں معیاری کہانیوں کے ساتھ بہت سی تحاریر میں کھل کر فحاشی لکھی جاتی ہے بعض کہانیوں پر جنسی ادب ہونے کا گمان ہوتا ہے اور یہ بات میں بہت دفعہ فون پر بھی ادارے کو بتا چکی ہوں پر آج کل کا ادیب نجانے کیوں اسی چیز کے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑ گیا ہے۔ ٹھیک ہے ہمارے معاشرے میں سبھی سب ہو رہا ہے پر معاشرتی اذیت سے بچنے کے لیے جو لوگ ادب کی طرف آتے ہیں وہ واقعی ذہنی مریض بن جاتے ہیں۔ اس چیز سے نئے اور پرانے سبھی لکھنے والوں کو اجتناب کرنا چاہیے اور ایسی تحاریر سامنے لانی چاہیے جو بالکل منفرد ہوں۔ ابن مقبول انکل، کشمیری بیٹی کا سلام قبول کریں، کبھی آپ نے مجھے کشمیری بیٹی کہا تھا آج بھی وہ محبت بھرا احساس باقی ہے پہلے تو میں اکیلی نازسلوش ژنے کی پری تھی اب ایک ننھی سی پری "پریشے خاشعہ ناصر" کی بھی

آمد ہو چکی ہے سو جو کبھی کبھار لکھنے کا موقع مل جاتا تھا اب وہ سب بھی گیا 24 گھنٹے سارے کے سارے اسی کے ساتھ گزر جاتے ہیں اف کتنا مشکل ہے ماں بننا.....اللہ پاک ریحانہ سعیدہ کے ماموں اور بشیر احمد بھٹی کے بیٹے کو جنت الفردوس میں جگہ عطا کرے اور ان کا اگلا جہاں آسان کرے آمین۔ عمر فاروق ارشد گفتگو کی جان لگتے ہیں انہوں نے ٹھیک کہا کہ قاری کو تبصرے کا پورا حق ہے پچھ سال قبل میں بھی ایسے ہی تبصرے کیا کرتی تھی لکھنے والا اپنے انداز سے لکھتا ہے اور پڑھنے والا اپنے انداز سے پڑھتا ہے ٹھیک ہے تنقید کرو مگر ایسی کہ لکھنے والے کا دل نہ ٹوٹے کیونکہ پڑھنے والا قاری تو ہو سکتا ہے مگر ہر بندہ لکھاری نہیں ہو سکتا۔ رائٹرز کے دل بہت حساس ہوتے ہیں جہاں کوئی چیز پسند نہ آئے اسے بہت محبت سے پوائنٹ آؤٹ کر دینا چاہیے تنقید برائے اصلاح کرو، نہ کہ تنقید برائے تنقید امید ہے سمجھ گئے ہوں گے۔ مارچ کی ایک کہانی شیطانی گروہ کے شیطانی عزائم کا پڑھ کر مجھے مارچ ہی میں کسی نیوز چینل پر نشر ہونے والی وہ خبر یاد آ گئی جس میں مزار قائد کے بارے میں دکھایا گیا تھا مزار قائد میں ہمارے محسن قائداعظم کی اصل قبر (جس کا رستہ اطراف نالے سے) کے پاس زنا اور بدکاری جیسا گھناؤنا کام برسوں سے جاری تھا وہاں موجود سیکیورٹی اور ان کا ہیڈ اس کام کے سرپرست تھے اور جب نیوز چینل والوں نے سارا بھانڈا پھوڑا تو ان کے پاس سوائے بغلیں جھانکنے کے اور کوئی کام نہیں تھا۔ میرا خیال ہے خط کو یہیں روک دینا چاہیے زندگی رہی اور فرصت نے ساتھ دیا تو جلد حاضر ہوں گی سب کے لیے دعا گو۔

(نازو شہر قائد میں آمد، شادی اور پھر ایک ننھی پری کی ماں بننے کی مبارک باد قبول کریں آپ اپنی رائے ای میل پر بھی دے سکتی ہیں اگر وقت ملے تو لیکن پہلے اپنے گھر اور بچی کو دیکھیں)

ابن مقبول جاوید احمد صدیقی..... راولپنڈی

انتہائی محترم عمران جی السلام علیکم! سادہ سا ہر فالی ٹائٹل، نیلگوں اور سفید رنگوں کا امتزاج بڑا اچھا لگا سادگی بھی اچھی چیز ہے۔ فہرست دیکھ کر تسلی ہوئی کہ نئے افق دن بدن بہترین معیار اختیار کرتا جا رہا ہے دستک میں مشتاق صاحب نے جس مسئلہ کو بیان کیا ہے اصل وجہ ہی یہ ہے ہم دوسروں پر انگلی اٹھانے کی بد عادت میں مبتلا ہیں اور یہ نہیں دیکھتے کہ تین انگلیاں تو ہماری اپنی طرف اشارہ کر رہی ہوتی ہیں اور یہ معاشرے میں ناسور اور کینسر کی حیثیت اختیار کر گیا ہے اس کی جڑ دولت کی بھوک، پیسے کا حصول، حقوق العباد کا فقدان اور بے حسی اور ہاتھا پائی اپنا ہر وقت کرتے رہنا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں ہر معاشرتی برائی سے بچائے اور ہدایت دے آمین۔ گفتگو میں عمران صاحب کے ایڈیٹوریل میں کہاوت نے تو آنکھیں ہی کھول دیں، ماشاءاللہ زبردست جناب۔ ستمبر کے پراسرار نمبر کا پڑھ کر بے حد خوشی ہوئی۔ گفتگو میں پہلے تو جناب محمد بخش صابر لنگاہ کے بیٹے کی شادی کی بے حد مبارک باد اور ان گنت نیک دعائیں۔ میری تمام قارئین اور نئے افق کی مجلس ادارت و کارکنان سے درخواست ہے کہ میرے بیٹے تیسرے اور آخری نمبر کی شادی خانہ آبادی اگست کی آخری تاریخوں میں ہے اس کے لیے خاص برکت اور خیریت کے لیے دعاؤں کی درخواست ہے۔ ریحانہ سعیدہ بیٹی کا تبصرہ بہت اچھا تھا، متوازن اور گہرائی لیے ہوئے۔ شجاع حسین جعفری بھئی ذرا تفصیل سے تبصرہ لکھا کریں پڑھ کر مزہ بھی آئے اور یہ محمد اسلم جاوید صاحب تو بے حد جلدی میں تھے کہ چاند پر جانے والا راکٹ چھوٹ جائے گا۔ منگلا والے ریاض حسین قمر بھی خوب آئے تبصرہ اور باتیں دل کو لگیں۔ عمر فاروق ارشد جی تبصرہ بے حد مختصر تھا مزہ نہیں آیا۔ ریاض بٹ جی اس دفعہ کیوں غیر حاضر ہو گئے اللہ آپ کو کمر کی تکلیف سے نجات عطا فرمائے۔ ادیب سمیع چمن جی اس خاموشی کو توڑنے والے عمران جی کے معاون بھٹی صاحب آ گئے ہوں گے عمران صاحب پرچہ میں کئی تبدیلیاں کر رہے ہیں اور پرچے کو بہترین معیاری پرچوں کے ساتھ لا کھڑا

کیا ہے۔ اول تو اتنے صفحات کے ساتھ اتنی کم قیمت یقیناً ان لوگوں کی بڑی ہمت ہے۔ بدیسی کہانیوں میں
دونوں ہی چونکا دینے والی تھیں۔ پراسرار ہاتھ اچھا رہا مگر ماورائی اور بے حد ہٹ کر کہانی تھی۔ رانگ نمبر معاشرتی
برائیوں میں سے ایک کے گرد گھومنے والی کہانی تھی۔ تین سوال خان صاحب کی نصیحت آموز رہی۔ انجانے فیصلے
بھی زرین قمر نے انجانے میں ہی لکھی ہے۔ واقعات کو لمبا کھینچ لیا گیا۔ آخری خواہش بے حد فکر انگیز کہانی ہے۔
موضوع عام سا مگر عبرتناک ہے۔ سید عبداللہ پھر غیر حاضر۔ آپ نے ادھورا ناول مکمل کیا یا نہیں کئی پرانے تبصرہ نگار
اور لکھاری چھوٹی چھوٹی باتوں پر ناراض ہو کر ہمیں چھوڑ چلے ہیں کیوں بھئی۔ خوشبوئے سخن میں ریحانہ سعید ٹاپ پر
تھیں۔ باقی غزلیں بھی اچھی تھیں انشاء اللہ آئندہ ماہ ملاقات ہوگی۔ والسلام

ساحل دعا بخاری... بصیر پور۔

محترم عمران احمد قریشی، السلام علیکم! آگ اگلتے سورج کے آگے سفید اور سرمئی بادل سایہ فگن تھے ہلکی ہوا سرمستی کی مانند سرسراتی تھی سامنے انار کے درختوں پر جھانکتے سرخی مائل سبز اناروں پر گلہریاں دانت بار بار گاڑتی تھیں۔ خاموش فضا میں گاہے بگاہے کوئل کی پیاری کوک دراڑیں ڈال جاتی تھیں ایسے میں سنے افق ملا تو ہم خود بھی جھوم اٹھے، سرورق ہمارے خوابوں کی عکاسی کر رہا تھا سحر انگیز..... دستک میں مشتاق انکل ہمارے اذہان پہ دستک دے رہے تھے مگر بہت کم جگہ اس دستک کو شرف باریابی نصیب ہوتی ہے پھر گفتگو میں جھانکا عمران بھائی نے بجا فرمایا کاش ہم کو بھی مخلص حکمران نصیب ہوں لیکن یہ نہ کبھی ہماری قسمت کرسی صدارت ریحانہ سسٹر کے حصے میں آئی اچھا لکھا آپ نے، عالیہ انعام الہٰی ویلکم بیک اب آتی رہیے گا ہماری ہم نام دعا مسلم غصے میں تھیں۔ شفیع صاحب اور ریاض حسین قمر یاد رکھنے کا شکریہ ہمارے فیورٹ عمر فاروق کا تبصرہ قدرے مختصر تھا رباب بٹ اور ادیب مسیح ناصر نے بھی اچھا لکھا۔ آتش زیر پا اصل راٹر کے ہاتھ سے نکل کر سنبھل نہیں پائی اور نتیجتاً اتنی جلدی دی اینڈ۔ حالانکہ کہانی ابھی مزید پھیلاؤ مانگتی تھی کئی ایک جھول بھی تھے مثلاً باوندوں پہ حملہ کرنے والے زوگا الف کو سرے سے نظر انداز کر دیا گیا زیشان اور پاکی مرشد کا دم سادھ لینا سمجھ میں نہیں آیا اتنی زبردست کہانی کا اینڈ نہایت عجلت میں کر دیا گیا کاش جعفری صاحب علیل نہ ہوتے تو ہم اتنی سحر انگیز تحریر سے محروم نہ ہوتے خیر دیدبان اچھا سلسلہ ہے۔ شافی کا کردار بہت اچھا ہے اسے روشن نواز کی بجائے عاصم نواز کی بات ماننی چاہیے اور ڈیوڈ کاش ہم اپنے ہاتھ سے اس کی گردن مروڑ سکیں جگت سنگھ نے سزا بھگت لی رہائی ہو گئی اور اب پھر ویوکے لیے برسرپیکار ہے۔ مختصر کہانی تین سوال بہترین رہی۔ اللہ بزرگ و برتر ہر کسی کی ہر جسمانی پریشانی دور فرمائے اور ہر جائز حاجت پوری کرے آخر میں سب کو سلام اور بہت ساری دعائیں اور عید مبارک۔

مبارک حسین چیچہ وطنی سے لکھتے ہیں۔

محترم عمران احمد قریشی! السلام علیکم! سب سے پہلے تو اتنا معیاری پرچہ نکالنے پر مبارکباد قبول کریں۔ جولائی کا شمارہ حسب معمول وقت مقررہ پر مل گیا تھا، سرورق ہمیشہ کی طرح دیدہ زیب اور منفرد تھا۔ سب سے پہلے مشتاق احمد قریشی صاحب کی دستک پڑھی انہوں نے بالکل بجا فرمایا کہ معاشرتی برائیوں میں ہر شخص مجرم ہوتا ہے۔ اگر ہر شخص خود اپنا احتساب کرے تو معاشرے سے تمام برائیوں کا خاتمہ ہو جائے آج ہر شخص اپنے گریبان میں جھانکنے کے بجائے دوسروں پر تنقید کرنے پر لگا ہوا ہے۔ گفتگو میں ریحانہ سعید کو صدارتی کرسی سنبھالنے پر مبارکباد۔ گفتگو کے تمام غیر حاضر ساتھی جلد از جلد حاضری لگوائیں۔ "اقرا" میں طاہر قریشی آداب معاہدہ کے حوالے خوب صورت بیان دیتے ملے۔ اب بات ہو جائے کہانیوں کی سب سے پہلے اپنا پسندیدہ ناول جگت سنگھ پڑھا جس کو شمیم نوید انتہائی اچھے طریقے

سے آگے لے جا رہے ہیں۔ ساس کے بعد "آتش زیر پا" کا انتہائی خوب صورت اختتام کرنے پر بدر سعید کو مبارک باد۔ "دیدبان" بھی انتہائی تیزی سے آگے بڑھ رہا ہے اب دیکھیں آگے کیا کیا راز فاش ہوتے ہیں۔ مغرب سے دونوں انتخاب اچھے تھے۔ جبکہ متفرق کہانیوں میں محمد اعظم خان کی آخری خواہش نمبر ون رہی۔ باقی بھی اچھی تھیں۔ خوش بو سخن اور ذوق آگہی میں تمام انتخاب لاجواب تھا کسی ایک کی تعریف کرنا دوسرے سے زیادتی ہوگی۔ آخر میں دعا ہے کہ اللہ نئے افق کو دن دگنی رات چوگنی ترقی عطا فرمائے آمین۔ والسلام

حسن اختر پریتم...... کراچی ۔ محترم و مکرم جناب عمران احمد صاحب سلام شوق امید ہے مزاج گرامی بخیر ہوں گے۔ امید واثق ہے آپ اور آپ کا ساتھی عملہ پوری لگن اور تندہی سے مصروف کار ہوں گے۔ اللہ رب العزت آپ سب کو اپنی حفظ و امان میں رکھے اور سب کو ڈھیروں خوشیاں عطا فرمائے۔ خوب صورت ٹائٹل والا جولائی کا شمارہ میرے سامنے ہے۔ بزرگوار جناب مشتاق احمد قریشی صاحب کی دستک ہمارے لیے چشم کشا ہے۔ گفتگو کے آغاز میں آپ نے جو احادیث ہم تک پہنچائی ہے ان سے ایمان کو بہت تازگی نصیب ہوتی ہے۔ آقا کریم کی زبان سے نکلا ایک ایک لفظ ہی ہمارے دلوں کا زنگ صاف کرنے کے لیے کافی ہے۔ اقرا میں جناب طاہر قریشی صاحب ہمیشہ ہی ہمارے لیے زندگی گزارنے کے سنہرے اصولوں سے متعلق احادیث سے ہماری رہنمائی فرماتے ہیں۔ قسط وار کہانیاں اپنی مثال آپ ہیں خاص کر امجد جاوید کی قلندر ذات ٹاپ پر جا رہی ہے۔ باقی بھی کہانیاں اور مغرب سے انتخاب اپنی اپنی جگہ پر خوب ہیں۔ تمام مصنفین لائق صد مبارک باد ہیں۔ روحانی مسائل کا حل دکھ درد کے ماروں کے لیے اچھا سلسلہ ہے۔ خوشبوئے سخن میں تمام غزلیں خوب تھیں۔ ذوق آگہی میں بھی تمام دوستوں کا انتخاب خوب تھا۔ نیک تمناؤں کے ساتھ اللہ حافظ۔

محمد شفا کورنگی، کراچی ۔ السلام علیکم! دعا ہے کہ اللہ پاک نئے افق کو دن دگنی رات چوگنی ترقی عطا فرمائے۔ جولائی کا سرورق انتہائی دلکش تھا۔ مصور کو ڈھیروں مبارک باد۔ مشتاق احمد قریشی صاحب کی دستک حسب سابق لاجواب ہے۔ گفتگو میں حدیث نے دل میں روشنی کی ایک لہر بھر دی۔ گفتگو میں صدارتی کرسی ریحانہ سعید نے حاصل کی مبارک باد۔ آپ کا تبصرہ دل سے پسند کیا گیا۔ بڑا بھرپور تبصرہ تھا۔ اقرا میں جناب طاہر احمد قریشی نے دینی سبق پیش کرتے دل کے سوتے جگا کر رکھ دیے۔ روحانی علاج دکھی بہن بھائیوں کی بھرپور خدمت ہے۔ خوشبوئے سخن عمران رضا صاحب نے بھرپور لگن سے سجائی۔ ذوق آگہی کا تمام انتخاب اچھا تھا۔ میری طرف سے عرفان احمد کو دعائیں اور مبارک باد کا پیغام پیش ہے۔ شمیم نوید کی "جگت سنگھ" اچھی جا رہی ہے۔ مگر کلچر اور ثقافت غیر مذہب کے بجائے اپنے مذہب اور علاقے سے بھی لی جا سکتی ہے جس سے کہانی کو چار چاند لگ جاتے۔ میری دعائیں آپ کے ساتھ ہیں۔ والسلام

زین الدین شانی...... ریلوے کالونی، کراچی ۔ السلام علیکم ورحمتہ اللہ وبرکاتہ۔ کیسے مزاج ہیں سب ساتھیوں کے امید ہے کہ بخیریت ہوں گے۔ جولائی کے شمارے کا ٹائٹل بھی حسب معمول اچھا تھا۔ خطوط کی محفل ہمیشہ کی طرح مہک رہی تھی۔ تبصرے ایک سے بڑھ کر ایک تھے۔ مختصر تحریریں بہترین تھیں۔ خصوصاً مغرب سے جو انتخاب ہوتا ہے وہ دل کو بھا جاتا ہے۔ اب رہ گئی میری فیورٹ کہانی "قلندر ذات" تو جناب ہمیشہ کی طرح اس بار بھی یہی ٹاپ پر تھی۔ لکھاری بہت بہترین انداز میں تصویر کے دونوں رخ ہمیں دکھاتے جا رہے ہیں۔ امید ہے کہ آنے والے دنوں میں مزید نکھر کر سامنے آئے گی۔ اب آتا ہوں غزلوں کی جانب۔ تمام ساتھیوں کا انتخاب خوب تھا۔ شمارے کو مجموعی طور پر اچھا

کہہ سکتے ہیں۔ اللہ سے دعا ہے کہ وہ نئے افق کو دن دگنی رات چوگنی ترقی عطا فرمائے اور ہم سب کو صراط مستقیم پر رکھتے ہوئے اپنے حفظ و امان میں رکھے۔ آمین

ثمینہ پیرزادہ خدا کی بستی حیدر آباد سے فرماتی ہیں۔ جولائی کا نئے افق ملا آپ نے گفتگو میں درست فرمایا کہ یہ چاہا تے سورج کی تپش کو کم کرنے کا سبب بنے گا واقعی حیدرآباد جہاں سورج سوا نیزے پہ آ جاتا ہے ہر طرف آگ برستی محسوس ہوتی ہے نئے افق نے مجھے تو ایک دن کے لیے موسم کے احساس سے چھٹکارا دلایا ویک دن اس لیے لکھا کہ میں پورا پرچا ایک ہی دن میں ایک ہی نشست میں پڑھ لیتی ہوں اپنے میاں کے گھر آنے سے پہلے پہلے، پھر پیرزادہ صاحب آتے ہی قبضہ کر لیتے ہیں ہاں بیا آپ حالات کا جو تجزیہ کرتے ہیں اس وقت آپ کے لہجے میں اتنی تلخی آتی کاٹ ہوتی ہے کہ بعض اوقات مجھے (دیگر قارئین کا نہیں کہہ سکتی) خود سے شرم اور خوف آنے لگتا ہے آپ کو پڑھ کر یوں لگتا ہے جیسے واقعی ہم کسی عذاب سے دوچار ہیں کسی کی بددعا کا شکار ہیں واقعی میں آج ہم اپنے پڑوسیوں سے وہ ہم سے خوف زدہ محسوس ہوتے ہیں سمجھ میں نہیں آتا ہم کس طرف جارہے ہیں کیا واقعی وہ وقت آ گیا ہے جس کا ہم سے وعدہ کیا گیا ہے کیا دنیا ختم ہونے کو ہے آپ درست کہتے ہیں اللہ ہم پر رحم کرے بلکہ ہمیں خود اپنے پر رحم کرنا چاہیے گفتگو میں عالیہ انعام لیلیٰ بہت عرصے میں ان کی آمد اچھی لگی ان کا انداز تحریر ان کی سلجھی ہوئی گفتگو مجھے بہت اچھی لگتی ہے عالیہ آپ ہر ماہ لکھتی رہا کریں دیکھیں آپ کو دیکھ کر مجھ جیسی خاموش پڑھنے والی کو بھی زبان مل گئی ہے آپ یقین کریں کسی بھی ڈائجسٹ میں میرا پہلا خط ہے بہرحال ایک غیر حاضری نہ کیا کریں۔ بہت عرصے تو آپ کی کوئی نظم بھی نہیں آئی لہٰذا آئندہ ماہ...... آپ بھی گئی نا۔ ریحانہ سعید دل ہو رکا خط بھی خوب صورت تھا اچھا لگا ریحانہ جی بہت دنوں سے کوئی کہانی نہیں آئی کیا بات ہے؟ اس ماہ کی کہانیوں میں بھیانک چہرہ اور پراسرار ہاتھ بالکل بچکانہ لگیں ایسی کہانیوں سے گریز کیا کریں۔ ہمارے حیدرآباد کے بھائی طفیل جبار بہت اچھے جارہے ہیں قسط وار ناول تمام کے تمام بہت ہی اچھے جارہے ہیں۔ اللہ زور قلم زیادہ کرے آمین



مصنفین سے گزارش

☆ مسودہ صاف اور خوشخط لکھیں۔
☆ صفحے کے دائیں جانب کم از کم ڈیڑھ انچ کا حاشیہ چھوڑ کر لکھیں۔
☆ صفحے کے ایک جانب لکھیں۔
☆ خوشبوئے سخن کے لیے جن اشعار کا انتخاب کریں شاعر کا نام ضرور تحریر کریں۔
☆ ذوق آگہی کے لیے بھیجے جانے والے انتخاب کے کتابی حوالے ضرور دیں
☆ فوٹو اسٹیٹ کہانی قابل قبول نہیں ہوگی۔ اصل مسودہ ارسال کریں اور فوٹو اسٹیٹ کروا کر اپنے پاس محفوظ رکھیں کیونکہ ادارے نے ناقابل اشاعت کہانیوں کی واپسی کا سلسلہ بند کر دیا ہے۔
☆ مسودے کے آخری صفحہ پر اردو میں اپنا مکمل نام پتا اور موبائل فون نمبر ضرور خوشخط تحریر کریں۔
☆ کہانیوں یا آپ کے تبصرے ہمیں ہر ماہ کی 2 تاریخ کو وصول ہو جانے چاہئیں۔

اقرأ

ترتیب: طاہر قریشی

گزشتہ سے پیوستہ

آداب معاملہ

اللہ تعالیٰ نے جس دین کامل کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ انسانوں تک پہنچایا ہے اس میں ایمان کے بعد جن باتوں پر بہت زیادہ تاکید بیان کی گئی ہے وہ اچھے اخلاق اختیار کرنا ہے اور برے اخلاق سے حفاظت کرنا ہے۔

انسان کی زندگی میں اخلاق کی بڑی اہمیت ہے اگر انسان کے اخلاق اچھے ہوں تو اس کی اپنی زندگی بھی قلبی سکون اور خوش گواری سے گزرے گی اور دوسروں کے لیے بھی اس کا وجود رحمت اور چین کا باعث ہوگا اور اگر انسان کے اخلاق برے ہوں تو وہ خود بھی زندگی کے لطف و مسرت سے محروم رہے گا اور جن لوگوں سے اس کا واسطہ اور تعلق ہوگا ان کی زندگیاں بھی بدمزہ اور تلخ ہوں گی۔ یہ تو خوش اخلاقی اور بداخلاقی کے دنیاوی زندگی میں ظاہر ہونے والے نتائج ہیں جن کا ہر انسان اپنی روز مرہ زندگی میں مشاہدہ کر رہا ہے لیکن مرنے کے بعد آنے والی ابدی زندگی میں اچھے اور برے اخلاق کے اس سے زیادہ اہم نتائج نکلنے والے ہیں۔ خوش اخلاقی کا نتیجہ ارحم الراحمین کی رضا اور جنت ہے اور بداخلاقی کا انجام خداوند قہار کا غضب اور جہنم کی آگ ہے۔

ان ہی اخلاقی خوبیوں میں سے ایک خوبی عہد کی پابندی ہے جس کے بارے میں سورۃ بنی اسرائیل کی آیت نمبر ۳۴ میں فرمایا۔

ترجمہ: "اور تم عہد کو پورا کیا کرو بے شک عہد کے بارے میں قیامت کے دن پوچھا جائے گا"

اس بارے میں تین الفاظ بولے جاتے ہیں، وعدہ، عہد اور معاہدہ۔

وعدہ اور عہد دونوں عربی زبان کے الفاظ ہیں دونوں کا معنی تقریباً ایک جیسا ہے یعنی قول و قرار کسی بات کو پختہ کر کے طے کر لینا لیکن اردو زبان میں ان دونوں لفظوں کے استعمال میں کچھ فرق بھی کر لیا جاتا ہے۔ اگر کسی بات کو عام انداز میں ذکر کر دیا جائے تو وعدہ کرنا کہتے ہیں اور بہت ہی پختہ کر دیا جائے تو عہد کہتے ہیں اور جب دو انسانوں یا دو قوموں کے درمیان کوئی بات طے ہو جائے تو اسے معاہدہ کہتے ہیں اور کبھی یہ فرق کیا جاتا ہے کہ اگر ایک شخص نے کوئی قول و قرار کیا ہو تو اسے وعدہ کہتے ہیں اور دو طرف سے قول و قرار ہو تو اسے عہد کہتے ہیں۔ عہد دو طرح کے ہیں ایک وہ عہد جو بندے اور اللہ کے درمیان ہو جیسے ازل میں بندہ کا یہ عہد کہ بے شک اللہ تعالیٰ ہمارا رب ہے اس عہد کا نتیجہ یہ ہے کہ انسان پر اللہ کی اطاعت لازم ہو جاتی ہے۔ یہ عہد تو اسلامی تعلیمات کے مطابق ہر انسان نے ازل میں کیا ہے اور پھر دنیا میں موجود میں آنے کے بعد مومن کا عہد جو اس نے کلمہ شہادت کے اقرار کے ذریعہ کیا ہے اس معاہدہ پر عمل کرنا بہر صورت واجب ہے۔

دوسری قسم عہد کی وہ ہے جو ایک انسان دوسرے انسان سے کرتا ہے اس میں تمام تجارتی معاہدات سیاسی اور دوسرے تمام معاہدوں کی صورتیں شامل ہیں۔ اس قسم کے تمام عہد اگر ان میں اسلامی تعلیمات یعنی احکام شریعہ کے خلاف کوئی بات نہ ہو تو ان کا پورا کرنا بھی واجب ہوتا ہے اور اگر اس عہد میں کوئی خلاف شرع بات ہو یا غیر شرعی کام کا عہد کیا ہو تو

دوسرے فریق کو اطلاع کرکے اس معاہدہ کو ختم کرنا واجب ہے۔ اگر کوئی سے دو فریق کسی کام کے کرنے یا نہ کرنے کا معاہدہ کرلیں پھر ایک فریق معاہدہ پر عمل نہ کرے تو عدالت میں دعویٰ دائر کرکے معاہدہ پر عمل کرایا جاسکتا ہے۔

اگر کوئی شخص کسی سے یکطرفہ وعدہ کرلیتا ہے کہ میں آپ کو فلاں چیز دوں گا یا فلاں وقت آپ سے ملوں گا یا آپ کا فلاں کام کردوں گا۔ اس کا پورا کرنا بھی انسان کے ذمہ واجب ہوتا ہے بسا اوقات وعدہ کو بھی عہد کے مفہوم میں داخل سمجھا جاتا ہے لیکن پھر بھی دو فرق موجود ہے کہ اگر یکطرفہ وعدہ یا عہد ہو تو اسے عدالت کے ذریعہ جبراً پورا نہیں کروایا جاسکتا جب کہ دوطرفہ معاہدہ میں عدالت سے رجوع کیا جاسکتا ہے۔

یکطرفہ عہد یا وعدہ کی پابندی بھی شرعاً لازمی ہے۔ اگر کوئی شخص بلا عذر شرعی عہد کی پابندی نہ کرے وہ شرعی طور پر گنہگار ہوگا۔ اللہ تعالیٰ کے ہاں جواب دہ ہوگا ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

ترجمہ: "اور تم عہد کو پورا کرو بے شک عہد کے بارے میں پوچھا جائے گا۔"

اور سورۃ المومن کے آغاز میں مومنین کی فلاح و کامیابی کے جو اصول بیان فرمائے ان میں ایک اصول آیت نمبر ۸ میں فرمایا۔

ترجمہ: "اور وہ لوگ جو اپنی امانتوں اور اپنے عہد کا خیال رکھتے ہیں۔"

طبرانی میں حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ العدۃ دین۔ "یعنی وعدہ بھی ایک طرح کا قرض بنتا ہے۔" لہٰذا اگر کسی کو کچھ دینے کا یا کسی کا کام کرنے کا عہد کیا جائے تو پھر اسے پورا کرنا اپنے اوپر قرض کی طرح سمجھنا چاہیے۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم خود اپنی زندگی میں عہد کی پابندی کس قدر فرماتے تھے اس کا اندازہ ابوداؤد کی اس روایت سے ہوتا ہے جس کے راوی عبداللہ بن ابی الحمساء ہیں کہتے ہیں کہ اس دور کی بات ہے جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نبوت کا اعلان نہیں فرمایا تھا میں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے خرید و فروخت کا ایک معاملہ کیا جو کچھ میں نے دینا تھا اس کا کچھ حصہ میں نے دے دیا اور کچھ ادا کرنا باقی رہ گیا تو میں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے وعدہ کیا کہ میں باقی حصہ ابھی اسی جگہ لے کر آتا ہوں۔ پھر میں بھول گیا اور تین دن بعد مجھے یاد آیا میں اسی وقت وہ لے کر وہاں پہنچا عبداللہ بن ابی الحمساء کہتے ہیں کہ میں نے دیکھا آپ صلی اللہ علیہ وسلم اسی جگہ موجود ہیں۔ آپ نے فرمایا۔

ترجمہ: "تم نے مجھے بڑی مشکل اور مشقت میں ڈالا میں تمہارے انتظار میں تین دن سے یہاں ہوں۔"

(جاری ہے)

بشکریہ: "درس حدیث" مولانا حافظ فضل الرحیم اشرفی

نائب مہتمم واستاد الحدیث جامعہ اشرفیہ لاہور



قسط نمبر 3

دیدبان

ارشد علی ارشد

صیہونی قوتیں صدیوں سے مسلم امہ کے خلاف ہر محاذ پر سرگرم ہیں۔ مسلمانوں میں جنم لینے والے فرقوں اور اختلافات کے پس پشت میں یہی قوتیں کارفرما ہیں۔ کبھی ان کی سازشیں حسن بن صباح کے روپ میں سامنے آتی ہیں تو کبھی غلام احمد قادیانی کی شکل میں خلافت ترکی کا خاتمہ کر کے انہوں نے پورے عالم کو مختلف ٹکڑوں میں تقسیم کیا اور اب ان کا نشانہ مسلم دنیا کی واحد ایٹمی طاقت پاکستان ہے' جو ہمہ وقت خطرے کی طرح نکیلیف پہنچا رہا ہے زیر نظر ناول انہی سازشوں کے پس منظر میں ہے۔ گو اس کے حالات و واقعات خیالی ہیں' اس کے کسی کردار و علاقہ کا تعلق حقیقت سے نہیں ہے لیکن اس کا تھیم اور خمیر اصل واقعات سے ہی اٹھایا گیا۔

جن پرستوں کے لیے بطور خاص دلوں کو جھنجوڑتا ہوا ایک دلچسپ ناول

سادے انسان میٹھا یا پھر نمکین پسند کرتے۔ زمینی کے وسیع چشموں کو چھیڑتے وقت اس نظام قدرت کو سامنے رکھا گیا تھا تا کہ بات بھی بن جائے اور حالات بھی حد سے زیادہ نہ بگڑے۔ گویا سانپ بھی مر جائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے۔ کامیاب تجربے کے بعد یہ بات واضح ہو گئی تھی پانی کا اثر کسی پر ستر فیصد ہوا تھا کسی پر بچاس اور کسی پر دس فیصد اپنا کرتب دکھایا تھا۔ کئی بندوں کو چھیڑا تک نہیں تھا۔ اس طرح ڈاکٹرز کے پاس مختلف اوقات میں مختلف مریض آتے تھے جن کی کوئی مدت بھی معین نہیں تھی۔ کبھی کوئی ایک مریض مہینے بھر میں آ جاتا تھا اور کبھی اس سے بھی زیادہ عرصہ بیت جاتا تھا۔ اسپتال کی لیبارٹری ٹیسٹ نے بہرحال لوگوں کے دل و دماغ میں یہ بات بٹھا دی تھی کہ چشموں کا پانی اب سو فیصد صاف و شفاف نہیں رہا۔ دیہات میں مختلف باتیں گردش کر رہی تھیں۔ جن لوگوں کا جنوں پریوں پر عقیدہ پہلے سے پختہ تھا وہ ہر جگہ کہتے تھے۔

پہاڑوں سے نکلتے وقت کسی ناراض جن نے پانی کو آلودہ کر دیا ہے۔ اب یہ پانی پہلے جیسا صاف نہیں ہو سکتا۔

جوزف ینڈ کمپنی سیکڑوں دیہات میں عمدگی سے منرل واٹر پہنچا چکی تھی۔ ڈاکٹرز اور این جی اوز کی مرتب رپورٹ نے بھی ان کا پورا ساتھ دیا تھا۔ اعلیٰ سوسائٹی کے لوگوں نے باقاعدہ گھروں میں دودھ کی طرح پانی کی بڑی بوتلیں منگوالی تھیں اور آتے جاتے سفر میں منرل واٹر کی بوتل ہمراہ رکھنا ضروری سمجھتے تھے۔ منرل واٹر کا استعمال بڑھ رہا تھا۔ ہر چھوٹی بڑی دکان پر منرل واٹر کے بیسوں کارٹن پڑے نظر آتے تھے۔ شہروں میں پہلے سے منرل واٹر بکثرت استعمال ہو رہا تھا۔ بلکہ لوگ منرل واٹر کی بوتل ہاتھ میں رکھنا فیشن سمجھتے تھے۔

پلان کے مطابق جب تمام دیہات، قصبوں اور دور دراز علاقوں میں بھی منرل واٹر کا رواج عام ہو جائے گا تب اس پلان کا اگلا قدم اٹھایا جائے گا۔

پاکستان میں سالانہ شرح اضافہ آبادی 1.8 فی صد ہے۔ مرد و عورت میں نسبت 108 اور 100 ہے یعنی انسان کو تولیدی نو دو قسم کے جراثیم X کروموسومز اور Y کروموسومز کے ساتھ کام کرتا ہے۔ مرد کے اندر ایکس اور وائی دونوں کروموسومز ہوتے ہیں۔ عورت میں ایک ہوتا ہے۔ اگر مرد کا ایکس عورت کے کروموسومز سے

ٹکرائے تو اللہ کے حکم سے نر مولود مذکر پیدا ہوتا ہے اور وائی ٹکرائے تو مونث۔ منرل واٹر میں ایسے قطرے ملائے جائیں گے جو وائی کروموسوم کو زیادہ اور ایکس کو کم کر دیتا کہ پاکستان میں مردوں کے مقابلے میں عورتوں کی تعداد بڑھائی جائے۔ انہی سیاق و سباق کے ساتھ یہ منصوبہ پورے سسٹم ملک میں جاری و ساری تھا۔ ورلڈ بینک اور اقوام متحدہ کی نظر خاص سے چند بڑی کمپنیوں کو اشیائے صرف کے ٹھیکے دیئے گئے تھے۔ ان کمپنیوں نے ہالینڈ کے دارالحکومت ہیگ میں منعقدہ ورلڈ واٹر فورم کو اسپانسر کیا تھا۔ اس میں تھار پور جیسے علاقوں میں موجود صاف و شفاف پانی کے قدرتی ذخائر سے مختلف بیماریاں پھیلنے کا منفی پروپیگنڈہ کیا گیا تھا۔ مصنوعی پانی کی اہمیت اور اس کے استعمال کو وقت کی اہم ضرورت قرار دیا گیا تھا۔ مصنوعی پانی کی خرید و فروخت کے لیے اربوں ڈالرز مالیت کے نئے منصوبے اور طریقے منظور کیے گئے تھے۔



شانی دوستوں کے ہمراہ کوئٹہ شہر میں ہوا تشتی ہو چکا رہا تھا۔ ان پر الزام تھا کہ انہوں نے ایک معزز خاتون شہری کے گھر میں گھس کر توڑ پھوڑ کی ہے اور اسے ہراساں کیا ہے۔ معزز خاتون ذکیہ بائی نے ذاتی ٹیم بھیج کر تھانے میں بھرا کر کے ذرا دو روپے بھیجے تھے اور وہاں سے لوٹتے ہی ساجد کو بلا لیا تھا۔

"ساجد بابو! تمہارے لیے خوشخبری ہے۔"

"تمہاری سب سے اچھی خوبی یہ ہے ذکیہ بائی کہ تم ہمیشہ اچھی خبر سناتی ہو۔ بولو۔"

"مجھے اس کتے کا سراغ مل گیا ہے جس نے تم پر ہاتھ اٹھانے کی گستاخی کی۔" ذکیہ بائی نے لہجے میں نفرت کا بھرپور تاثر دینے کی کوشش کی تھی۔

"یہ بہت بڑی خوشخبری ہے۔ ذکیہ بائی جلدی بولو۔ مجھے میرا انتقام کہیں چین سے بیٹھنے نہیں دیتا۔"

"اب تمہیں چین مل جائے گا ساجد بابو! مگر......"

"مگر کیا ذکیہ بائی؟ جو چاہیے بولو۔"

"اس کے لیے خرچہ کرنا پڑے گا۔ مجھے یہ پتہ ہے وہ کس کے ساتھ رہتا ہے۔ مگر میں یہ جان نہیں پائی وہ کہاں رہتا ہے۔"

"پیسوں کی فکر مت کرو مجھے ہر صورت میں اس کمینے تک پہنچنا ہے۔"

"شانی کا دوست شہزاد کوئٹہ میں ہی رہتا ہے۔ انتہائی عیاش لڑکا ہے۔ مجھے یقین ہے پیسوں کے عوض میں شانی تک پہنچا دے گا۔"

"جتنا پیسا مانگتا ہے دو دریغ مت کرو۔ مجھے ایک بار شانی تک پہنچا دو۔ پھر دیکھو میں کیسے اپنا انتقام لیتا ہوں۔"

"ٹھیک ہے ساجد بابو ایک دو روز میں شانی تمہارے قدموں میں ہوگا۔"

شہزاد نے اپنی خدمات کے پچاس ہزار روپے لیے تھے۔ ذکیہ بائی نے ساجد سے ایک لاکھ روپے اینٹھے تھے۔ شہزاد نے اپنا نام خفیہ رکھنے اور ولید کو بچانے کی شرط بھی رکھی تھی۔ شہزاد نے ولید کو بروقت اطلاع دے کر حالات سے آگاہ کر دیا تھا۔ تین دن بعد پولیس کارروائی میں ولید کے سوا سب دوست تھار پور میں موجود تھے۔ انہیں تھار پور کی مقامی پولیس نے گرفتار کر کے کوئٹہ پولیس کے حوالے کیا تھا۔

شانی، ظہیر، امجد اور فراز بے حد پریشان تھے۔ اچانک آنے والی افتاد سے وہ مکمل طور پر بے خبر تھے۔ تھانے میں شانی کے دوستوں کو سلاخوں کے پیچھے دھکیل دیا گیا تھا۔ جبکہ شانی کو ٹارچ سیل میں رکھا گیا تھا۔ حوالدار خالد بلوچ، کانسٹیبل اللہ یار اور کانسٹیبل کریم اس کے میزبان تھے۔ شانی کے ہاتھ پشت پر باندھ کر قمیض اتاری گئی تو اس کی مضبوط باڈی دیکھ کر لحظہ بھر پولیس والے ٹھٹک گئے تھے۔ بھاری توند والے اللہ یار نے دبلے پتلے حوالدار خالد بلوچ کی طرف دیکھا تھا۔ 6 فٹ ایک انچ قد، مضبوط کسرتی جسم اور پھڑکتی ہوئی بازوؤں کی مچھلیاں دیکھ کر انہیں شانی

کے غیر معمولی ہونے کا احساس ہو چکا تھا۔

ساجد حوالات کے ٹارچر سیل میں داخل ہوا۔ اس کا پہلا تاثر بھی پولیس جیسا تھا۔ تاہم اس کے لیے اطمینان بخش بات شانی کی بے بسی تھی۔ مگر پھر بھی ساجد نے ہاتھوں کے ساتھ پاؤں بھی بند کھلوا دیے تھے۔ ساجد کے تیور انتہائی خطرناک لگ رہے تھے۔ ساجد کو دیکھ کر پولیس والوں نے بھی شانی کی طرف تیوریاں چڑھا لی تھیں۔

عاصم نواز نے حالات کا جائزہ لیا اور شانی کو متنبہ کیا۔

"شانی خود پہ کنٹرول رکھنا تمہاری کوئی الٹی سیدھی حرکت تمہارے خلاف کیس کو مضبوط کر دے گی۔ میں دیکھ کے آیا ہوں تمہاری ممی نے اذان اور کامران کو اطلاع دے دی ہے یقیناً وہ لوگ ضمانت کا جلد بندوبست کرلیں گے۔"

"میرے کہنے پر رک جاتے تو نوبت یہاں تک نہ پہنچتی۔ اب گھر والوں کو اصل ماجرہ پتہ چلے گا تو کیا سوچیں گے اتنی کا نیک زادہ بیٹا کوٹھوں میں جا کر مجرا دیکھتا ہے بلکہ ناچا کرتا ہے۔" عاصم نواز کی بات انتہائی کڑوی تھی مگر سچ تھی۔

اس نے ایک اور کوشش کی تھی کیونکہ شانی کو غلط کاموں سے روکنا عاصم نواز کی اولین ترجیح تھی۔ روشن نواز خاموش تھا کیونکہ شانی جو کچھ کرتا تھا اس میں روشن نواز کی خواہشیں پوشیدہ ہوتی تھیں۔

"ساجد میاں! ہم چلتے ہیں ہوئے چیخے اب یہ تمہارا کیس ہے کیسے نمٹاتے ہو تمہاری مرضی پر منحصر ہے۔" حوالدار خالد فاروقی نے قانون کی ڈور بائیں سائڈ ساجد کے ہاتھ تھما کر ایم این اے فاروق بلوچ کے ساتھ وفاداری کا پورا پورا ثبوت دیا تھا۔

ساجد کے ہاتھ میں ہنٹر تھا۔ ٹارچر سیل میں ماحول حبس زدہ ہو گیا تھا۔

"تم کیا سمجھتے ہو مجھ پر ہاتھ اٹھا کر سکون سے رہ پاؤ گے؟ میں نے آج تک کسی سے شکست نہیں کھائی ہے۔"

"بہتر ہے لہجے میں بات کرنا شانی۔" عاصم نواز نے ایک بار پھر شانی کو پرسکون رہنے کی ہدایت کی۔

"اب بولتے کیوں نہیں ہو۔ اس دن تو بہت اچھل کود کر رہے تھے۔" ساجد نے نفرت آمیز لہجے میں پوچھا۔

"دیکھو ساجد ہماری کوئی دشمنی نہیں ہے اور بہتر بھی یہی کہ ہم کوئی دشمنی نہ پالیں ہمیں....." شانی کی بات ادھوری رہ گئی تھی۔ ہنٹر کی تیز ضرب نے اسے سسکنے پر مجبور کر دیا تھا۔

"میں تم جیسے کمینے شخص سے دوستی کروں گا۔ ذلیل انسان۔" ساجد نے غصے میں کہتے ہوئے ہنٹر ایک بار پھر لہرایا اس بار شانی کے سینے پر دو سرخ نشان واضح نظر آنے لگے تھے۔

"ساجد! ایک بار پہلے اس غلطی کا مزہ تم چکھ چکے ہو دوبارہ وہ غلطی نہ دہراؤ تو اچھا رہے گا۔"

"کیا کر لو گے تم میرا؟ بولو... تم میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔" ساجد کا غصہ عروج پر تھا۔ اس نے لگاتار ہنٹر برسانا شروع کر دیا تھا۔ ہنٹر کی تیز ضربیں شانی کے صبر کو للکار رہی تھیں۔ عاصم نواز اور عاصم نواز اس کی ہمت باندھ رہے تھے۔ شانی نے ہاتھوں کو تیز حرکت دینا شروع کر دی تھی۔ ادھر ساجد غصے میں پاگل ہو رہا تھا۔ اسے اس بات کی کوئی فکر نہیں تھی کہ مسلسل برسنے والے ہنٹر کی ضربیں شانی کے جسم پر کہاں کہاں برس رہی ہیں۔

ساجد پر ایک جنون طاری تھا۔ وہ تابڑ توڑ حملے کر رہا تھا۔ مگر یہ حملے زیادہ دیر جاری نہ رہ سکے۔ درد سے تڑپتے لوٹ پوٹ ہوتے اور ہاتھوں کو مسلسل حرکت دینے سے شانی کے ہاتھ کھل گئے تھے۔ ساجد کو ہوش اس وقت آیا جب ہنٹر کو شانی کے ہاتھوں نے پکڑ لیا۔ ساجد کے چہرے پر حیرت اور خوف منجمد ہو کر رہ گیا۔ شانی پاؤں کھول کر کھڑا ہو چکا تھا۔ کمرے کا دروازہ اندر سے لاک تھا۔

شانی نے زور کا جھٹکا دیا۔ خوف سے کانپتے ہاتھ ہنٹر کو سنبھال نہیں پائے ساجد لڑکھڑا کر فرش پر گر چکا تھا۔

"میں نے کہا تھا نہ یہ غلطی پھر سے مت دہراؤ۔"

شانی کا خونخوار لہجہ ساجد کے بدن میں خوف کی

سنسناہٹ دوڑا رہا تھا۔

"شانی اسے چھوڑ دو۔ کچھ مت کہنا۔ یہ تمہارے حق میں بہت اچھا ہوگا۔" ہم نواز نے شانی کو نئی راہ دکھائی تھی۔

"ساجد سے دوستی کر کے معاملہ یہیں رفع دفع کرلو۔"

"میں بزدل نہیں ہوں ہم نواز۔"

"شانی! گندگی میں جتنا ہاتھ مارو اس میں بدبو اتنی تیزی سے پھیلے گی۔"

"ہم نواز ٹھیک کہتا ہے۔ اس گندگی سے دور رہو۔" عاصم نواز اور ہم نواز دونوں نے اس کی کوشش کی مگر ناکام رہے۔ شانی صبر کا دامن چھوڑ چکا تھا۔ کمرہ ساجد کی چیخوں سے گونج رہا تھا۔ ایسے ہی ہنٹر ساجد کے جسم پر بھی پڑے تھے مگر تب چیخیں نہیں صرف سسکیاں تھیں۔ مگر اب بھیانک چیخوں سے کمرہ لرز رہا تھا۔ ساجد کے منہ سے ایسی کربناک چیخیں نکل رہی تھیں کہ ان کا پہچان لینا مشکل تھا۔ باہر والے اندر والوں کی حالت سے بے خبر تھے وہ سمجھ رہے تھے کھیل اب شروع ہوا ہے۔ پانچ منٹ بعد ساجد کی قوت برداشت جواب دے گئی۔ شانی نے غصے سے ہنٹر دیوار پر دے مارا۔ اس کی سانس پھول گئی تھی۔

دروازے پر دستک ہوئی اور حوالدار کی آواز سنائی دی۔

"ساجد میاں! دروازہ کھولو باقی حساب کتاب ہم کر لیں گے۔" قدموں کی چاپ سے شانی نے اندازہ لگایا آنے والے دو یا دو سے زیادہ تھے۔ اس نے ہم نواز کی طرف سوالیہ طلب نگاہ سے دیکھا۔

"دروازہ کھولنا پڑے گا۔ جو کچھ تم کر بیٹھے ہو اس کی سزا اب بھگتنا پڑے گی۔"

"اب اس سے آگے مزید کوئی غلطی مت کرنا۔" عاصم نواز نے شانی کو یاد دلایا کہ وہ غلطی پہ غلطی کر رہا ہے۔

شانی نے دروازہ کھول دیا اندر داخل ہونے والا پہلا شخص حوالدار خلد بلوچ تھا۔ اندر کا منظر دیکھ کر وہ انتہائی حیرت سے صرف "اوئے" کہہ پایا اس کے پیچھے آنے والے دونوں کانسٹیبل بھی کبھی شانی کو دیکھتے اور کبھی بے ہوش پڑے ہوئے ساجد کو۔ حیرت کے شدید ترین جھٹکے نے ان کی سوچوں اور حرکات پر روک لگا دی تھی۔

"کھڑے کیوں ہو۔ پکڑو اس حرامزادے کو۔" حوالدار کی چیختی ہوئی آواز نے انہیں چونکا دیا۔ حوالدار نے شانی کی طرف جھپٹتے ہوئے گالی دی۔

"تیری ماں کی......" گالی کے الفاظ ابھی پوری طرح لبوں سے باہر نہیں نکلے تھے کہ شانی نے غصے میں اسے گریبان سے پکڑ کر ہوا میں معلق کر دیا۔ حوالدار کے منہ سے گھٹی گھٹی آواز نکل رہی تھیں۔ ہوا میں اس کی دونوں ٹانگیں ماہی بے آب کی طرح حرکت کر رہی تھیں۔

"شانی کیا کر رہے ہو؟ پاگل مت ہو چھوڑ دو اسے۔" عاصم نواز نے اسے سختی سے روکنا چاہا مگر گالی کے الفاظ شانی کے اندر جیسے ہتھوڑے برسا رہے تھے۔ شانی نے عاصم نواز پر انتہائی غصے میں چھوڑ دیا۔ ہم نواز اور روشن نواز بے بسی سے عاصم نواز کا تڑپنا دیکھ رہے تھے۔ شانی نے عاصم نواز کو پکڑا ہوا تھا اب وہ کسی بھی قسم کی روک ٹوک سے آزاد تھا۔ دروازہ بند کر کے تینوں اہلکاروں کی اس نے خوب درگت بنائی تھی۔ حوالات کی چابیاں لے کر شانی اپنے دوستوں کے پاس پہنچا اور تیز لہجے میں بولا۔

"چلو جلدی کرو۔ ہمیں تھانے سے بھاگنا ہے۔"

دوستوں نے اس کے ساتھ جانے سے انکار کر دیا تھا۔

"اگر ہم تمہارے ساتھ فرار ہو گئے تو اس جرم میں برابر کے شریک ہو جائیں گے جو ہم نے نہیں کیا۔"

شانی اکیلا ہی تھانے سے بھاگ آیا تھا۔ اس ساری کارروائی میں دس سے پندرہ منٹ لگے تھے۔ باہر آتے ہی شانی کو ڈکیے بالی کا خیال آیا اسے سبق سکھانا ضروری تھا۔ ساجد نے ہم نواز کو دیکھا وہ بہت اچھا ہوا تھا۔ روشن نواز کی اداسی بھی دو چند تھی۔ جو کچھ ہوا تھا یقیناً ان کی مرضی کے خلاف ہوا تھا مگر شانی اس کی توفی کیسے برداشت کر سکتا تھا۔ اس نے ہم نواز سے ڈکیے بالی کا پتہ لگانے کے لیے اس کے کوٹھے پر جانے کا حکم دیا۔ ہم نواز نے آ کر جو کچھ

اسے بتایا اس سے گرم مزاج شانی مزید آگ بگولہ ہو گیا۔ وہ اب تک یہی سوچ رہا تھا کہ پولیس ان تک کیسے پہنچی ذکیہ بائی کے کوٹھے پر ولید اور شہزاد مدہوش کی اداؤں سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ اس بات سے شانی کے سامنے حقیقت کھل چکی تھی۔

جس وقت شانی ذکیہ بائی کے کوٹھے کی طرف اڑا جا رہا تھا اس وقت ٹارچر سیل روم میں سیلیا عاصم نواز کی لاش پر کھڑا قہقہے لگا رہا تھا۔

"میں نے کہا تھا نا آنے والا ہر دن شانی کے لیے تباہی لائے گا۔ اب دیکھو لو میں اسے ایک منٹ بھی چین سے بیٹھنے نہیں دوں گا۔" سیلیا خوشی سے چلاتے ہوئے بلند قہقہے لگا رہا تھا۔



اللہ تعالیٰ نے زمین و آسمان بنا کئی نمونے اپنی قدرت سے تخلیق کیے۔ اس کے بعد مختلف مخلوقات کو پیدا فرمایا اور ان کے رزق کا انتظام کیا۔ پتھر میں موجود کیڑے کو بھی رزق اللہ تعالیٰ کے حکم سے پہنچ رہا ہے۔ پھر ایک جیتا جاگتا انسان جسے خود اللہ تعالیٰ نے اشرف المخلوقات کا لقب عطا کیا ہے وہ کیسے راتوں کو بھوکا سوئے۔ یا قحط زدہ حالت میں مر جائے۔ یہ انسانوں کا پیدا کردہ نظام زندگی ہے۔ مغرب نے کرہ ارض کے تمام وسائل اپنی مٹھی میں جکڑ لیے ہیں اور دھیرے دھیرے ان پر کلی طور سے قابض ہوتا جا رہا ہے۔ قدرتی وسائل پر مغرب ایک سانپ بن کر بیٹھا ہوا ہے اور یہ ایسا زہریلا سانپ ہے جس کا ڈسا پانی بھی نہیں مانگتا۔ آج بھی زمین کے خزانے اور وسائل انسانی آبادی، 6,525,170,264 سے کئی گنا زیادہ ہے۔ زمین کے کل رقبہ 510.072 ملین مربع کلو میٹر میں موجودہ خزانے اتنے وسیع ہیں کہ انسانی آبادی کو چار سے ضرب دی جائے تب بھی ان کی کمی واقع نہیں ہوگی۔ مغرب جب بھی وسائل کی کمی کا ڈھنڈورا پیٹتا ہے تو اس میں اس کا اپنا مفاد پنہاں ہوتا ہے۔ وہ ایسے حالات پیدا کر رہے ہیں کہ سب کچھ ہوتے ہوئے بھی دنیا کو کچھ دکھائی نہیں دیتا۔ جنہیں دکھائی دیتا ہے وہ کچھ کر نہیں سکتے۔ جیسے پاکستان کو ہی لے لیجیے! بلوچستان اور سندھ کے معدنی ذخائر پنجاب کی زرخیز ترین زمین اور مثالی نہری نظام پورے پاکستان کے لیے بہت زیادہ ہے اس کے باوجود پاکستان گندم تک درآمد کر رہا ہے۔ یہ حالات کی ستم ظریفی اور ہمارے امریکہ جیسے باصلاحیت دوست کا کمال ہے۔ پاکستان اور سعودی عرب کے وسائل یکجا کیے جائیں تو یہ پورے ممالک عالم اسلام کی کفالت کر سکتے ہیں۔ مگر حالات یہ ہیں کہ سعودی عرب مسلسل خسارے میں جا رہا ہے اور اگر سعودی عرب کے فرمانروا شاہ فیصل جیسے رہنما مسلمانوں کے لیے کچھ کرنے کا فریضہ سر انجام دیتے ہیں تو انہیں اس غلطی کی پاداش میں قتل کر دیا جاتا ہے۔ ذوالفقار علی بھٹو اپنے ملک کے لیے ایٹمی پروگرام کا آغاز کرتا ہے تو اسے تختہ دار پر لٹکا دیا جاتا ہے لیکن مغرب کے ہاتھ خون آلود ہونے کے باوجود چہرہ سفید ہے۔ وہ آزاد ہیں، جنگل میں خونخوار شیر کی طرح جہاں چاہے دہاڑتا پھرے جو مرضی آئے کرے اس پر کوئی روک ٹوک نہیں ہے۔

نیو ورلڈ آرڈر نے جس کے کرتا دھرتا مغرب کے باسی ہیں انسانی زندگی کو کس طرح متاثر کیا ہے یہ سادہ لوح لوگ کبھی جان نہیں پائیں گے۔ ہر سال کرہ ارض کے موسم میں بڑی واضح تبدیلیاں رونما ہو رہی ہیں۔ یہ تبدیلیاں ہر شخص محسوس کر سکتا ہے۔ تاہم ان کا سبب ہر کوئی نہیں جان پاتا اگرچہ مغربی میڈیا اسے قدرتی عمل قرار دیتا ہے۔ مگر حقیقت اس کے برعکس ہے اصل میں انہیں اپنے شیطانی منصوبوں پر پردہ پوشی مقصود ہے۔

قدرت انسانیت پر انتہائی مہربان ہے اللہ تعالیٰ نے کرہ ارض کے لیے ایک مضبوط دفاعی نظام قائم کر رکھا ہے۔ سورج کی مہلک شعاعیں مختلف ستاروں اور سیاروں سے آنے والی تابکاری لہریں، الٹرا وائلیٹ ریز جیسی خطرناک شعاعوں سے اگر انسانیت محفوظ ہے تو یہ قدرت

کے قائم کردہ دفاعی نظام کی مرہون منت ہے۔
1886-66ء میں امریکی یہودی سائنسدان نکولا ٹیلا نے اے سی پاور ALTERNATIVE CURRENT بجلی اور اس کی ترسیل کا نظام ایجاد کیا۔ فی سیکنڈ 60 ارتعاشات ہرٹز کی اے سی بجلی کے پاور گرڈز زمین پر پھیل جائیں تو کرۂ ارض معمول کی فریکوئنسی 7.8 ہرٹز کی بجائے الگ رفتار سے اچھلنے لگے گا۔ جب یہ 7.8 ہرٹز پر مختلف رفتار سے اچھلے گا تو اس سے ریڈیائی لہریں آیونی زمین کی فضا اور موسم میں تبدیلی لائے گی۔ ہارپ میں قطب شمالی کے پاس مزید تجربات جاری ہیں۔ اگر کامیاب ہوئے تو موسم میں حسب منشا تبدیلی لانا ممکن ہو جائے گا۔

راکٹوں، سیاروں کے ذریعے بادلوں پر پوٹیشیم پاؤڈر وغیرہ کیمیائی مادہ چھڑک کر دنیا مصنوعی بارش کا نظارہ کر چکی ہے۔ جب کہ بارش کو روکنے کا عمل بھی جاری ہے۔ یوں موسم، پانی، خوراک، دوا اور علاج عنقریب مکمل طور پر قبضے میں کرنے کے لیے آئے روز نئے منصوبے بنایا جاتا ہے۔ دوا میں عملاً طور پر یہ ملٹی نیشنل کمپنیوں کے قبضے میں جا چکی ہیں۔ یہ تمام ملٹی نیشنل کمپنیاں یہودیوں کی ملکیت ہیں۔ اب وہ دن دور نہیں جب ڈاکٹر جان کولمین کی بات عملی شکل میں نظر آ جائے گی۔

تمام مغربی اور غیر مغربی روایات، تعلقات، ذائقے، رویے، سب تیزی سے ختم ہو رہے ہیں۔ نیا جنگل میں بدلا جا رہا ہے۔ کوئی بھی علاقہ اس وقت تک ترقی نہیں کر سکتا جب تک متعلقہ شہر، قصبے یا گاؤں کے ذمہ دار جنگل کے افسران کی تحریری اجازت نہیں دیتے۔

"ہم اندھیرے میں بھٹک رہے ہیں۔ ہمیں دانستہ مسائل میں الجھایا جا رہا ہے۔ بھائی بھائی کا دشمن بنا ہے۔ ایک مسلمان دوسرے مسلمان کے خون کا پیاسا ہے۔ کیوں؟ میں پوچھتا ہوں آخر کیوں؟"

سابقہ ڈی ایس پی امجد بخاری کہتے کہتے آخری بات پر آبدیدہ ہو گیا تھا۔ ان کے سامنے بیٹھے ہوئے تین نوجوانوں کے چہروں پر گہری سنجیدگی در آئی تھی۔

یہ ایک لائبریری نما کمرہ تھا۔ گہری سنجیدگی کے سبب ماحول میں تلخی کی چادر تنی ہوئی تھی۔ رنجیدہ لہجے میں امجد بخاری محو گفتگو تھا۔

"خفیہ ہاتھ ایسی پلاننگ کرتے ہیں کہ میں خود تیرہ برس پولیس کے انتہائی اہم عہدے پر فائز رہنے کے باوجود کچھ نہ کر پایا تھا۔"

"سر آپ کون سی پوسٹ پر تھے؟"

"میں کوئٹہ میں ڈی ایس پی کے عہدے پر تعینات تھا۔ دوسرے پولیس آفیسرز کی طرح بندھے ٹکے انداز میں ڈیوٹی پوری کر رہا تھا۔ وقت کے کیلنڈر میں ہر روز کے دن بھرتے ہوئے ایک واقعے نے میری آنکھیں کھول دیں۔ کوئٹہ شہر سے 80 کلومیٹر دور شارپور میں میرا دوست جمال خان رہتا ہے۔ وہ میرے پاس اپنا مسئلہ لے کر آیا تھا۔ جب میں نے ان کی پریشانی کی وجہ جانی تو ٹھیک ٹھاک سٹپٹا کر رہ گیا۔" امجد بخاری نے لحظہ بھر رک کر سامنے بیٹھے ہوئے تین نوجوانوں کو دیکھا جن کی عمریں بائیس سے پچیس سال کے درمیان تھیں۔ وہ پوری توجہ سے ان کی باتیں سن رہے تھے۔ ان کے سامنے تپائی پر چائے کا تھرماس اور چار کپ پڑے ہوئے تھے۔ ایک بار وہ چائے پی چکے تھے۔

امجد بخاری نے انہیں شارپور کی پراسرار پہاڑیوں میں ہونے والی پراسرار اموات کا پورا قصہ سنایا تھا۔

"جب میرے منع کرنے کے باوجود تفتیشی ٹیم اپنی مرضی سے میرے ماتحت روانہ کی تھی میں کسی شک میں پڑ گیا تھا۔ پھر ٹیم نے جھوٹی رپورٹ بنا کر شارپور کے لوگوں کو جھوٹے دلاسے دیئے تب میرا ضمیر میرے سامنے کھڑا ہو گیا۔ میں ضمیر کی عدالت میں سرخرو نہ ہو پاتا اس لیے استعفیٰ دے کر خود سیدھا شارپور کی پہاڑیوں میں جا پہنچا۔"

"سر! کیا واقعی وہاں جن اور پریوں کے مسکن تھے؟" امجد بخاری کے سامنے کرسی پر بیٹھے ہوئے نوجوان نے پوچھا۔

"نہیں قاسم وہاں جن و بھوتوں کا نہیں بلکہ پاکستان دشمن عناصر کا ڈیرہ ہے۔" امجد بخاری کی بات سن کر تینوں نوجوانوں نے چونک کر انہیں دیکھا۔

"سر! کیا وہاں کسی خطرناک گروہ کا خفیہ ٹھکانہ ہے؟" قاسم کے ساتھ بیٹھے ہوئے نوجوان نے تجسس آمیز لہجے میں دریافت کیا۔ اس کے چہرے پر ہلکی داڑھی تھی۔ جسامت کے لحاظ سے وہ دوسروں سے کمزور تھا۔

حمزہ وہاں پاکستان کے دشمنوں کا ٹھکانہ ہے۔ غیر ملکی گروہ ہے جو اپنا کام کر رہا ہے۔

اوہ! تینوں بری طرح چونک پڑے۔ غیر ملکی گروہ۔ انہوں نے یک زبان دہرایا۔ امجد بخاری نے انتہائی گہری نظروں سے انہیں دیکھا۔ تینوں نوجوانوں کے چہروں پر دبا دبا جوش امڈ آیا تھا اور وہ لاشعوری طور پر اپنے اندر بے چینی محسوس کرنے لگے تھے۔ یہ بات امجد بخاری کے لیے اطمینان بخش تھی۔ اسے اپنے انتخاب پر خوشی ہو رہی تھی۔

"ہاں غیر ملکی گروہ جن کا مقصد پاکستان کو ٹکڑوں میں تبدیل کرنا ہے۔"

"ہم ایسے ہاتھ کاٹ دیں گے سر جو پاکستان کی طرف اٹھنے کی جرات کریں گے۔ وہ آنکھیں نکال دیں گے جو ہمارے پیارے پاکستان کو ناپاک نظروں سے دیکھتی ہیں۔" تیسرے نوجوان نے کہا۔

"مجھے تم تینوں نوجوانوں پر فخر ہے۔ مجھے اللہ تعالیٰ کی ذات پر کامل یقین ہے جب تک میرے ملک میں تم جیسے نوجوان موجود ہیں ان شاء اللہ ہمارے پاکستان کا کوئی کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔"

"ان شاء اللہ" حمزہ، قاسم اور طلحہ نے کورس میں پورے دلی جذبات کے ساتھ جواب دیا۔

"سر ہماری ٹریننگ جلد مکمل کروائیے ہم اس گروپ سے ٹکرانا چاہتے ہیں۔"

"ابھی نہیں۔ ابھی ہمارے پاس وہ وسائل نہیں ہیں کہ ہم موساد، بلیک واٹر اور را جیسے پاورفل جدید اسلحے سے لیس تنظیموں سے ٹکرا سکیں۔"

"تو کیا وہ گروپ..... انہی تین تنظیموں کا مشترکہ گروپ ہے۔" امجد بخاری نے حمزہ کی بات پوری کرتے ہوئے بتایا۔

"تم لوگ اپنی ٹریننگ دل جمعی سے مکمل کرو۔ ابھی مجھے بہت کچھ کرنا ہے جب وقت آئے گا ہم ان شاء اللہ ان سے ضرور ٹکر لیں گے اور ہم انہیں بتائیں گے کہ پاکستان میں منفی سرگرمیوں کا نتیجہ کیا ہوتا ہے۔"

"ہم اس وقت کا بے چینی سے انتظار کریں گے سر ہم ان کا ایسا حشر کریں گے کہ دوسری تنظیموں کے لیے نشان عبرت بن جائیں گے۔"

"شاباش میرے بچوں یہی جذبہ میرے حوصلے کو بے پناہ تقویت دیتا ہے۔ میں اعلیٰ حکام پر یقین نہیں کر سکتا۔ میں جانتا ہوں اس گروپ کی پشت پناہی پر ہمارے کئی اعلیٰ افسران موجود ہیں۔ مفاد پرست، ضمیر فروش اور ملک کا سودا کرنے والے لوگ ان کا ساتھ دے رہے ہیں۔ اس لیے میں نے محب وطن پاکستانیوں کا گروپ تشکیل دینے کا فیصلہ کیا تھا۔ ابھی ہم چھ ہیں چار ہم اور دو ہمارے انفارمر مگر مجھے بھروسہ ہے اللہ تعالیٰ کی ذات پر کل ہم دس ہوں گے پھر سو ہوں گے اور پھر بہت جلد ہم سیکڑوں ہزاروں میں چلے جائیں گے۔"

"سر! آپ فکر نہ کریں ہم ان شاء اللہ تعداد سے گھبرانے والے نہیں ہوں گے۔ ہم میں اتنی ہمت ہے کہ ہم دشمنان پاکستان کو صفحہ ہستی سے مٹا دیں۔ 1965 کی جنگ میں اسلحہ نہیں جذبہ لڑا تھا۔ ہمارے نوجوانوں نے توپوں کا جواب توپ سے نہیں دیا تھا جان کا نذرانہ پیش کیا تھا۔ آج بھی وہ جذبہ موجود ہے بس موقع ملنے کی بات ہے۔"

"مجھے فخر ہے تم پر میرے وطن کے جانباز نوجوانو! میں اس بات کا قائل ہوں جنگ میں اسلحہ نہیں جذبہ کام آتا ہے اور ایسا جذبہ نہ پاکستانی فوج میں ناپید ہے اور عوام میں اس کا فقدان ہے۔ مگر فی الحال قلیل تعداد سے میدان میں نہیں اترا جا سکتا ہمیں کچھ انتظار کرنا ہوگا۔"

"ٹھیک ہے سر! آپ ہم سے بہتر سمجھتے ہیں۔"

"آؤ میں کھانے کا کہہ کر آیا تھا یقیناً تیار ہو چکا ہوگا۔" امجد بخاری نے کرسی پیچھے دھکیلتے ہوئے کہا۔ اس کی تقلید میں حمزہ، قاسم اور طلحہ بھی کھڑے ہو چکے تھے۔

❁......❁ ❁

حالات و واقعات نے یک دم پلٹا کھایا تھا۔ شانی جذباتیت میں جو کچھ کر چکا تھا وہ اس کے لیے وبال جان بن رہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں پچھتاؤں کے سوا کچھ نہیں تھا۔ خاصم نواز اور ہم نواز دونوں نے اسے روکنا چاہا تھا لیکن جذبات میں وہ کسی کی نہ سن سکا اور سنتا بھی کیسے؟ حسینہ نے اپنا کمال فن دکھایا شانی پر کئی قسم کے الزامات عائد ہو چکے تھے۔ اس نے معزز خاتون شیری ذکیہ کے مکان میں گھس کر توڑ پھوڑ کی اور اسے ہراساں کیا تھا۔ حوالدار اور دو کانسٹیبل پر حملہ کیا تھا۔ پولیس تھانے میں قانون کی دھجیاں اڑا کر فرار ہوا تھا اور ایک بار پھر ذکیہ خاتون کے مکان میں جا کر اس کے مہمانوں ولید اور شہزاد کو مار مار کر اسپتال پہنچا دیا تھا۔ پولیس پوری تگ و دو کے ساتھ اس کی تلاش میں سرگرم تھی۔ شانی حوالات سے بھاگا ہوا مفرور ملزم تھا۔ ہم نواز نے گھر کے حالات کا جائزہ لے کر اسے بتا دیا تھا۔

بیگم کلثوم کو جیسے ہی خبر ملی تھی شانی کو دوستوں کے ساتھ ناکردہ جرم میں گرفتار کر لیا گیا ہے تو انہوں نے فوراً تھانے رابطہ کیا تھا مگر وہاں سے پتہ چلا ملزمان کو کوئٹہ منتقل کر دیا گیا ہے کیونکہ ان کے خلاف ایف آئی آر کوئٹہ تھانے میں درج کرائی گئی تھی۔ کوئٹہ میں اذان اور کامران سے رابطہ کرنے میں اس نے دیر نہیں کی تھی۔ دونوں نے یقین دلایا تھا۔ ممی آپ فکر نہ کریں ہم ابھی ضمانت کا بندوبست کرتے ہیں۔ گھر میں یکدم ہی پریشانی کود آئی تھی۔ کنزہ اور منزہ کے چہروں پر ہوائیاں اڑ گئی تھیں۔ جب تک ڈیڈی زندہ تھے وہ تمام فکر و اندیشوں سے دور تھیں۔ اب بات اور تھی بڑے بھائی اپنی دنیا میں مگن تھے۔ شانی ہی تھا جس کی ذات سے ان کی ساری اُمیدیں اور خوشیاں وابستہ تھیں۔

بیگم کلثوم بیٹوں کو فون کر کے چین سے نہیں بیٹھی تھیں وہ خود کوئٹہ پہنچ گئی تھیں۔ مگر کوئٹہ سے ملنے والی خبر پچھلی خبر سے زیادہ پریشان کن تھی۔ کامران نے انہیں بتایا شانی تھانے میں پولیس والوں کی درگت بنا کر فرار ہو چکا ہے۔ بیگم کلثوم کے لیے یہ بات ہضم کرنا بہت مشکل تھا وہ سکتے کی سی کیفیت میں یہ روداد سن رہی تھیں۔ معصوم شانی جس نے کبھی کسی سے لڑائی نہیں کی وہ اس قدر باغیانہ پن پہ کیسے اتر آیا ہے۔ پریشانیوں نے بیگم کلثوم کا در دیکھ لیا تھا۔ وہ شانی کے معاملے میں الجھی ہوئی تھیں کہ ایک اور اندوہناک خبر سننا پڑی۔ کنزہ صبح سے گھر واپس نہیں لوٹی تھی۔ شانی مرد تھا اچھے برے حالات سے نمٹ سکتا تھا مگر کنزہ ایک معصوم لڑکی تھی اس کا غائب ہو جانا سب سے بڑی پریشانی تھی۔ بیگم کلثوم سب کچھ چھوڑ کر کامران کے ساتھ ہنگامی طور پر پلٹ آئی تھیں۔

ہم نواز نے شانی کو گھر کے سارے حالات سے آگاہی دے دی تھی۔ گھر کے حالات سے آگاہی رہی تو بات ممی کے کوئٹہ جانے تک محدود تھی کنزہ کی گمشدگی کا شانی کو فی الحال پتہ نہیں تھا۔ وہ سیدھا گھر پہنچا گھر کی نگرانی کے بارے میں ہم نواز کو اس نے خاص ہدایات جاری کی تھیں۔ گھر میں منزہ شانی سے لپٹی ہچکیوں میں رونے جا رہی تھی۔

"شانی بھیا! یہ سب کیا ہو رہا ہے۔ پلیز شانی خود کو ان آفتوں سے دور رکھو ورنہ ہم جیتے جی مر جائیں گے۔"

"کچھ نہیں ہوگا پگلی! چھوٹا موٹا کیس ہے جلد نمٹ جائے گا ممی سے رابطہ کرو میں ان سے بات کرنا چاہتا ہوں۔ کنزہ کہاں ہے؟" شانی کے سوال پر منزہ لرز کر رہ گئی۔ شام ڈھلنے کو تھی صبح کو نکلی کنزہ تا حال گھر کو واپس نہیں لوٹی تھی۔ نمبر ڈائل کرتے ہوئے اس کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔ شانی نے منزہ کی حالت دیکھی تو اسے احساس جرم شدت سے ستانے لگا۔ اس حالت کا موجب وہی

تھا۔ عاصم نواز کی بات نہ مان کر اس نے بڑی غلطی کی تھی۔ مگر اب تیر کمان سے نکل چکا تھا۔ سانپ گزر جائے تو لکیر پیٹنے کا کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔ روشن نواز تب سے اب تک اداسیوں کی لپیٹ میں تھا۔ شانی نے اس معاملے میں مدد کرنے کے لیے ہم نواز سے التماس کی تھی۔

منزہ کے ہاتھوں میں اس قدر لرزش تھی کہ وہ نمبر ملا نہیں پا رہی تھی۔ شانی نے آگے بڑھ کر ریسیور لیتے ہوئے کہا۔

"تم بیٹھو منزہ اور ریلیکس ہو جاؤ۔ ان شاء اللہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔" کہتے ہوئے شانی نے نمبر ملایا۔

"ہیلو ممی! میں شانی بات کر رہا ہوں۔"

"ہاں شانی! تم گھر پر ہو بیٹا تم ٹھیک تو ہو نا؟"

"جی ممی! میں بالکل ٹھیک ہوں۔"

"بیٹا! کنزہ کہاں ہے۔ وہ گھر لوٹی؟" ریسیور میں ممی کی پریشان کن آواز سنائی دے رہی تھی۔

"کنزہ...... مجھے نہیں پتہ کہ کنزہ کہاں ہے؟" شانی کہتے ہوئے منزہ کو دیکھنے لگا۔ منزہ کا چہرہ دھواں دھواں ہو رہا تھا۔ اسے کسی بڑی گڑبڑ کا احساس ہونے لگا تھا۔

"ہیلو شانی! میں کامران بول رہا ہوں۔ ہم لوگ راستے میں ہیں اور آدھے گھنٹے میں گھر پہنچ جائیں گے ہمارے آنے تک تم گھر میں ہی رہنا۔"

"اوکے بھائی! مگر کنزہ....." شانی کی بات ادھوری رہ گئی تھی۔ ادھر کامران بول رہا تھا۔

"ہم وہاں آ کے ہی پھر بات ہو گی۔" کہتے ہوئے کامران نے رابطہ کاٹ دیا۔

"کنزہ! کہاں ہے منزہ؟"

"پتہ نہیں شانی! ہم سب تمہارے لیے بہت پریشان تھے۔ ممی کوئٹہ نکل گئی تھی اور ہم گھر میں آنسو بہا رہے تھے اچانک کنزہ کو ڈیڈی کے دوست ریٹائرڈ میجر شفقت خان کا خیال آیا میرے منع کرنے کے باوجود کہ ممی کو آنے دو پھر کوئی فیصلہ کریں گے وہ ان کے گھر کی طرف نکل گئی تھی۔ وہ انکل کو ساری صورت حال بتا کر ان سے مدد کی اپیل کرنا چاہتی تھی۔ دو گھنٹے گزر جانے کے بعد وہ گھر نہ لوٹی تو مجھے تشویش لاحق ہوئی۔ میں نے انکل شفقت کے گھر فون کر کے پوچھا وہاں سے پتہ چلا کہ کنزہ وہاں آئی ہی نہیں۔" منزہ آنکھوں میں آئے اشکوں کو کافی دیر سے روک رہی تھی۔ تفصیل بتاتے ہوئے ضبط نہ کر سکی اور پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی۔ شانی نے آگے بڑھ کر اسے سینے سے لگایا۔ یہ منظر دیکھ کر روشن نواز اور ہم نواز بھی رو پڑے تھے۔ روشن نواز اداسیوں کی اتھاہ گہرائیوں میں گرا ہوا تھا۔

شانی نے تسلی آمیز انداز میں منزہ کے شانے تھپتھپائے۔ مگر اسے خود پر کنٹرول رکھنا دشوار ہو رہا تھا۔ وہ دور خلاؤں میں کھویا ہوا تھا۔ سب ٹھیک کیسے ہوگا؟ کھوکھلے الفاظ ان کے دکھوں کا مداوا نہیں کر سکتے تھے۔

ہم نواز کوئی ترکیب کی راہ نکالنے میں مگن تھا۔ روشن نواز کے پاس اداسیوں کے سوا کچھ نہ تھا۔

شانی کو باہر کے حالات کا جائزہ لینے کا خیال آیا۔ اس نے ہم نواز کو باہر جا کر حالات سے آگاہی پانے کا حکم دیا۔ ہم نواز نے اسے آ کر بتایا پولیس کی نفری گھر کی طرف آ رہی ہے۔ یہ سن کر شانی بے حد پریشان ہو چکا تھا۔ نہ وہ منزہ کو گھر میں اکیلا چھوڑ سکتا تھا نہ خود گھر میں رہ سکتا تھا۔ وہ انتہائی مشکل صورت حال سے دوچار ہو چکا تھا۔

❁......❁......❁

وہ ان دیکھی منزل کی طرف گامزن تھا اور نہ ہی کوئی واضح لائحہ عمل تھا۔ بنا سوچے سمجھے چل رہا تھا۔ کانٹے دار جھاڑیوں نے اسے کئی خراشیں پہنچائی تھیں۔ جنگل میں لگڑ بھگڑ، گیدڑ، بھیڑیوں اور کئی قسم کے جانوروں کی آوازیں وقتاً فوقتاً کانوں میں گونج رہی تھی۔ جنگل میں جا بجا پانی کے چشمے تھے وہ چلتے چلتے کسی چشمے کے پاس رک کر پانی پیتا اور پھر چل پڑتا۔ نہ جانے کتنی دیر یونہی چلتا رہا بدن میں تھکاوٹ کا احساس شدت اختیار کر گیا تو وہ دور نظر آنے والے سلسلہ کوہ کی طرف ہو لیا۔ یہاں سے پانی کا بڑا چشمہ گزرتا تھا۔ یہ چشمہ آگے جا کر دریا میں جا ملتا

تھا۔ دریا پہاڑیوں کے گرد چکر کاٹ کر دوسری طرف نکلتا تھا۔ وہ پہاڑی کی جڑ میں بیٹھ گیا۔ پہاڑی میں ایک بڑا شگاف تھا جس کے ارد گرد جھاڑیاں تھیں۔ سوچوں کا انبار تھا جو اس کے گرد لپٹ گیا تھا۔ وہ دور بھاگنا چاہتا تھا جو وہ کہیں جا چھپنا چاہتا تھا اور جو وہ چاہتا تھا وہ ہوتا دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

پولیس نے ان کے دروازے پر دستک دی تو اس کا بھاگنے کا قطعی ارادہ نہیں تھا۔ مگر حمزہ نے پولیس سے دروازے پر جا کر بات کی تو پتہ چلا ان کے پاس گھر کی تلاشی کے وارنٹ موجود ہیں۔ حمزہ نے بحث و مباحثے میں بہر حال آدھا گھنٹہ لے لیا اس دوران بیگم کلثوم کامران کے ساتھ پہنچ گئی تھیں۔ کامران پولیس والوں کے ساتھ بات کرنے لگا۔ بیگم کلثوم براہ راست اندر چلی گئی تھیں۔ شالی کو گلے سے لگا کر وہ کافی دیر روئی تھی۔ شالی اپنے کیے پر شرمندہ تھا۔ کسی سے معافی کا طلبگار تھا مگر بیگم کلثوم کو شالی سے زیادہ حمزہ کی فکر کھائے جا رہی تھی اور وہ کوئی بھی فیصلہ کرنے سے قاصر تھیں۔ شالی کو فی الحال پولیس کی کسٹڈی میں دینا خطرناک تھا یقیناً وہ اسے ٹارچر کرتے۔ شالی کا تب تک منظر سے غائب رہنا سود مند تھا جب تک کامران اور لا ان ضمانت کا مکمل بندوبست نہ کر لیتے۔

کامران جان گیا تھا پولیس کے ہاتھ کچھ نہیں لگا۔ وہ کسی بھی بہانے کو ٹالنے والے نہیں تھے۔ انہیں بہ صورت گھر کی تلاشی لینی تھی۔ شالی نے بھاگنے کا ہی فیصلہ کر لیا۔ گھنے جنگلات اس کے لیے محفوظ ترین ٹھکانہ تھے۔ حفظ ماتقدم کے طور پر اس نے ڈیڈی کا ریوالور ساتھ رکھنے کا فیصلہ کیا۔ وہ جانتا تھا ڈیڈی کے دو ریوالور ہیں ایک ریوالور بیڈ روم میں اور دوسرا اسٹڈی روم میں رکھتے تھے۔

شالی اسٹڈی روم میں ریوالور تلاش کر رہا تھا۔ دوران تلاش اس کے ہاتھ ڈیڈی کی ڈائری لگ گئی۔ اس نے ڈائری کو ویسے ہی سرسری سا الٹ پلٹ کر دیکھا مگر چند سطریں اس کی نظر سے گزریں وہ چند سطریں حیران کن تھیں۔ وقت نہیں تھا کہ وہ ڈائری پڑھتا اس لیے ریوالور اور ڈائری لے کر پچھلی دیوار پھلانگ کر باہر نکل آیا تھا۔ گھنے جنگلات میں اس کا ملنا محال تھا۔

پہاڑی کی جڑ میں بیٹھ کر اس نے طویل سانس خارج کی۔ چند منٹ اس نے آنکھیں بند رکھ کر خود کو ریلیکس کرنے کی ناکام کوشش کی۔ سامنے پہاڑی سے آبشار گر رہی تھی۔ عام حالات میں یہ ایک دلکش منظر تھا۔ مگر اس وقت شالی کافی الجھا ہوا تھا۔

حمزہ کہاں جا سکتی ہے؟ یہ سوال بار بار اسے ڈس رہا تھا۔ ہم آواز شالی کی رگ رگ میں تھی یا پاتال کی جگہ تک جا سکتا تھا از خود کسی کی جگہ جانا اس کے دائرہ اختیار میں نہیں تھا۔ وہ حمزہ کو ڈھونڈ نہیں سکتا تھا صرف شالی کی بھالی ہو گئی جا۔ پر جا کر جادو ٹونا ہی اسے لے سکتا تھا۔ شالی اسے ہر ممکنہ جگہ ڈھونڈ چکا تھا مگر حمزہ کا کہیں سراغ نہیں ملا۔ روشن ہونے والا سپیدہ نگل رہا ہوا بالکل خاموش تھا۔ شالی نے بہت سے تکنیکی پہلو سوچتا رہا اچانک اسے ڈائری کا خیال آیا اس نے چونک کر ڈائری کھولی اس کی نظریں تیزی سے تحریر پر دوڑنے لگیں۔

شالی کی تلاش میں میں نے پراسرار پہاڑیوں میں جانے کا فیصلہ کیا تو میرے ذہن میں تاثر یوں کے دوسرے عام لوگوں کی طرح نقش جنات دیریوں کا مسکن بنا ہوا تھا۔ مگر وہاں جا کر پتہ چلا اصل ماجرہ کچھ اور ہے۔

صداقت علی خان اور اس سے پہلے ہونے والی اموات میں کسی پراسرار مخلوق کا ہاتھ نہیں تھا بلکہ وہ انسانی بھیڑیوں کا شکار ہوئے تھے۔ میری کوشش تھی پہلی مڈبھیڑ میں کسی ایک پر قابو پا سکوں مگر میں اپنی کوشش میں کامیاب نہیں ہو سکا گھر پہنچ کر میں فیصلہ کرنے سے محروم رہا کہ اصل حالات کا پولیس یا پھر کسی جان پہچان کے اعلیٰ افسر کو بتا دوں میری چھٹی حس کہہ رہی ہے معاملہ انتہائی سنگین ہے۔ میں الجھ کر رہ گیا ہوں۔ یقین ممکن ہے حکام بالا سارے معاملے سے آگاہ ہوں اس صورت میں میری شنوائی نہیں ہوگی۔ مجھے خود ہی شالی کی تلاش میں ایک

بار مجھے پہاڑیوں کی طرف جانا ہوگا۔ ہو سکتا ہے دوسرے لوگوں کی طرح میں بھی پراسرار موت کے شکنجے کا شکار ہو جاؤں لیکن مجھے بہرحال جانا ہے۔ اپنے بیٹے کو تلاش کرنا ہے اللہ تعالیٰ میری مدد فرمائے۔

شانی کے جواں سال چہرے پر فکرمندی کے شدید ترین آثار نظر آ رہے تھے۔ اس نے ہم نواز کی طرف راہنمائی طلب نظروں سے دیکھا۔

"مجھے لگتا ہے ان پہاڑیوں سے منسوب جنات و پریوں کی ساری کہانیاں من گھڑت ہیں۔ یہاں کوئی گروپ غیر قانونی سرگرمیوں میں مصروف ہے یا پھر ان کے ٹھکانے ہیں۔" ہم نواز نے کہتے ہوئے یاد دلایا۔

"شانی! تم یاد کرو گھر آ کر تمہیں ڈیڈی کی موت کے بارے میں تفصیل بتائی گئی تھی۔ ڈیڈی کی موت انہی پراسرار پہاڑیوں میں واقع ہوئی تھی اور حسب سابق انہیں جن بھوتوں کی کارستانی قرار دے کر خاموشی اختیار کر لی گئی۔"

مجھے وہاں چلنا چاہیے۔ شانی نے خود کلامی کی۔ اس کے چہرے پر سوچ کی لہریں دوڑ رہی تھیں یہاں تک کہ ہم نواز سے کہا۔

"تم پراسرار پہاڑیوں پر جاؤ ہم نواز۔" کہتے ہوئے شانی کھڑکی سے کھڑا ہو چکا تھا۔ اس نے آٹھ دس میٹر پہاڑی سے دور ہٹ کر دوبارہ دیکھا۔ وہ پوزیشن کا تعین کرنا چاہتا تھا۔ جہاں وہ کھڑا تھا اس سے متصل تین پہاڑیاں پراسرار کہی جاتی تھیں۔ اس نے ہم نواز کو تینوں پہاڑیوں کا بتایا۔

"جا کر اچھی طرح چیک کرو ڈیڈی کو وہاں کیا نظر آیا تھا۔"

چند لمحوں بعد ہم نواز نے آ کر اسے تفصیل بتائی جسے سن کر شانی محاورتاً نہیں حقیقتاً اچھل پڑا۔ ہم نواز کہہ رہا تھا۔

"شانی تمہارے ڈیڈی کا شک صد فیصد درست تھا۔ جہاں ہم موجود ہیں اس سے تیسری پہاڑی پر آٹھ افراد کا گروپ موجود ہے۔ چھ مرد اور دو لڑکیاں یہ آٹھوں افراد غیر ملکی ہیں۔"

"غیر ملکی؟"

"ہاں شانی! اور دوسری اہم بات کنزہ اسی گروپ کے پاس موجود ہے۔"

"ک... کیا کہہ رہے ہو؟"

ہم نواز کنزہ یہاں پہاڑیوں میں وہ بھی غیر ملکی گروہ کے قبضے میں۔ شانی کو پاؤں تلے زمین سرکتی محسوس ہوئی۔ لمحہ بھر اس کی سوچیں ماؤف ہو گئی تھیں۔

"ہاں میں دیکھ چکا ہوں۔ ہمیں جلد کچھ کرنا ہوگا۔ مجھے کنزہ کی عزت......"

"بس کرو۔" شانی جلدی سے بولا۔

"چلو۔" اس نے انتہائی تلخی سے ہم نواز کی بات کاٹ دی۔ شانی نے ریوالور نکال کر گولیاں چیک کیں اور تقریباً دوڑتا ہوا آخری چٹان کے راستے پر چڑھنے لگا۔



شانی راستوں پر چڑھتے ہوئے جوش و جذبے میں شاید کیسے دو ہزار فٹ بلندی پر پہنچا اسے کچھ خبر نہیں تھی۔ ہوش تب آیا جب وہ مطلوبہ جگہ پہنچ چکا تھا۔ ہم نواز کی نشاندہی پر وہ عین صحیح جگہ تک پہنچا تھا۔ یہاں جوزف اور جوتھم، ہانس تھامس کے روانہ کیے گئے چھ ایجنٹوں کے ہمراہ قیام پذیر تھے۔ ان چھ افراد میں دو وسار کے، تین ہانس تھامس کے گروپ یعنی بلیک واٹر کے اور ایک انڈین را کا ایجنٹ تھا۔

کنزہ کو جوزف نے بہت پہلے دیکھا تھا۔ مشرقی حسن کی تصویر کنزہ اس کے دل میں بیٹھ گئی تھی تاہم زریا کے اعتراض پر وہ خاموش ہو گیا تھا۔ مگر اس کے واپس پلٹتے ہی جوزف کنزہ کو اٹھوا لایا تھا۔ کنزہ کو پہاڑوں تک لانے میں ان کے مقامی ساتھیوں نے مدد کی تھی۔ ان کا یہاں ایک مضبوط نیٹ ورک تھا۔

شانی ایک بڑے پتھر کی اوٹ میں کھڑا ماحول کا جائزہ لے رہا تھا۔ جہاں چھوٹے سے میدان کی شکل میں پہاڑ کی زمین چپٹی تھی میدان میں کئی چھوٹے بڑے پتھر

پڑے تھے۔ چھوٹے موٹے درخت، پودے گھاس پھوس اور جھاڑیاں بھی موجود تھی۔ چند بڑے شگاف نظر آرہے تھے اور کچھ غار نظروں سے اوجھل تھے۔ کچھ شانی دیکھ سکتا تھا شانی کے اشارے پر ہم نواز یک بار پھر جائزہ لینے جا چکا تھا۔ اس نے آکر بتایا۔

"یہاں بہت سے غار ہیں جو ان لوگوں کے زیر استعمال ہیں۔ مصنوعی بجلی کا بندوبست ہے ضروریات زندگی کی تمام مراعات میسر ہیں۔ یہ لوگ یہاں شہریوں جیسی زندگی گزار رہے ہیں۔ کنزہ سامنے نظر آنے والے غار میں قید ہے اس وقت اس کے پاس ایک لڑکی اور لڑکا موجود ہیں۔ باقی افراد دوسرے غاروں میں ہیں۔ ہم بالا ہی بالا سامنے والے غار میں پہنچ سکتے ہیں۔" ہم نواز کے کہنے پر شانی بالکل پتھروں کی آڑ سے نکل کر سامنے والے غار کی طرف بڑھا۔ اندر روشنی کے آثار تھے۔ چند لمحے شانی نے اندر کی سن گن لی۔ نسوانی قہقہے اور مرد کے چند انگلش میں ادا کیے گئے فقرے اس کے کانوں میں ٹکرائے اس نے دائیں بائیں دیکھا وہ اکیلا کھڑا تھا۔ ریوالور پر گرفت مضبوط کرتے ہوئے وہ اندر داخل ہو گیا تھا۔

"ہینڈز اپ۔" اس نے داخل ہوتے ہوئے غرا کر کہا۔ چند لمحوں میں وہ تیز نظروں سے اندر کا جائزہ لے چکا تھا۔ کنزہ زمین پر پتھر کے ساتھ ٹیک لگائے بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کے ہاتھ پشت پر بندھے تھے۔ وہ محویت سے شانی کو دیکھ رہی تھی۔ حیرت نے شدید ترین جھٹکے نے اس کے لب سی دیئے تھے۔

جوزف کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ یہاں تک کوئی غیر متعلق شخص پہنچ سکتا ہے وہ بھی ایسے کہ انہیں خبر تک نہ ہوئی۔ وہ سکتے کی سی کیفیت میں دیدے پھاڑے شانی کو دیکھ رہا تھا۔ جس کی متقابل نظریں اسی پر جمی ہوئی تھیں۔ نیم برہنہ لڑکی جو اس کے پہلو میں بیٹھی ہوئی تھی اس کی حالت بھی جوزف جیسی تھی۔

"تت..... تم یہاں کیسے پہنچے؟" حیرت سے جوزف کو کچھ سمجھ نہیں آرہی تھی کہ کیا بولے اور کیا کہے۔ وہ سلو موشن میں اٹھ کر کھڑا ہو چکا تھا۔

"اپنے چہرے دوسری طرف کر لو۔ ہری اپ۔ کوئی غلط حرکت مت کرنا ورنہ میں گولی چلانے سے باز نہیں آؤں گا۔" شانی کے لہجے میں پختگی اور اعتماد تھا۔ بلیک واٹر کا جوزف جیسا کائیاں ایجنٹ سمجھ چکا تھا شانی اپنے کہے پر عمل کر گزرے گا۔ ہاتھ اٹھا کر جوزف نے چہرہ پھیر لیا تھا لڑکی نے اس کی پیروی کی۔

"شانی..... تم..... بھائی....." کنزہ فرط جذبات میں کچھ بھی کہہ نہیں پا رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ آنسوؤں میں شانی کا دھندلا چہرہ کنزہ کو نئے حوصلے بخش رہا تھا۔ شانی نے جوزف اور لڑکی پر نظریں رکھتے ہوئے آگے بڑھ کر کنزہ کے ہاتھ کھول دیئے۔ کنزہ جذبات میں آکر اس سے لپٹنا چاہ رہی تھی مگر شانی نے اسے اشارے سے روک دیا۔ شانی کی نظریں متواتر جوزف اور لڑکی پر جمی ہوئی تھیں۔ مگر بیچ میں کہیں نظر چوک گئی تھی جوزف نے اس پر چھلانگ لگا دی کنزہ کے منہ سے چیخ نکلی اور وہ دو قدم پیچھے ہٹ گئی۔ جوزف شانی سے ٹکرایا اور شانی پچھلی دیوار سے۔

شانی دانستہ گولی چلانے میں سے گریز کر رہا تھا۔ ریوالور پر سائلنسر نہیں تھا۔ گولی کی آواز دوسرے لوگوں کو متوجہ کرنے کا موجب بن سکتی تھی۔ جوزف کے ٹکرانے سے ریوالور اس کے ہاتھ سے نکل چکا تھا۔ جوزف نے اس کے چہرے پر مکہ مارنا چاہا مگر شانی کے بروقت چہرہ ہٹانے سے اس کا مکہ دیوار سے جا ٹکرایا۔ شانی نے چہرہ ایک لمحہ کے لیے ہٹایا تھا دوسرے لمحے اس نے سر کی ٹکر جوزف کی لمبی ناک پر ماری جوزف بے اختیار دو قدم پیچھے ہٹ گیا۔ شانی نے اس موقع سے فائدہ اٹھا کر اس کے سینے پر کک جڑ دی۔ جوزف لڑکھڑاتا ہوا پیچھے جا گرا۔

"شانی....." کنزہ کی چیختی ہوئی آواز پر شانی نے چونک کر وہاں دیکھا۔ جوزف کی ساتھی لڑکی اس کا گرا ہوا ریوالور اٹھا رہی تھی۔ وہ شانی سے صرف ایک میٹر کے

فاصلے پر تھی۔ شانی نے ہوا میں اچھل کر لڑکی کو بوٹ کی ضرب رسید کی جو شاید اس کی کنپٹی پر لگی تھی۔ لڑکی لہرا کر زمین پر گر گئی۔

جوزف غصے میں گالیاں دیتا ہوا شانی کی طرف لپکا، شانی نے پھرتی سے قریب پڑا ہوا نوکیلا پتھر ہاتھ میں لے لیا اور جیسے ہی جوزف اس پر حملہ آور ہوا نوکیلا پتھر اس کے سر کی گہرائی میں اترتا چلا گیا۔ جوزف کے سر سے خون کا فوارہ ابل پڑا تھا۔ اس کے حلق سے تیز غراہٹ کی آواز نکلی۔ وہ کٹے ہوئے شہتیر کی طرح زمین پر گر چکا تھا۔ کنزہ کے لیے یہ منظر دیکھنا دشوار تھا۔ چند منٹوں نے شانی نے میدان مار لیا تھا۔ اب اس کی باہیں کھل چکی تھیں۔ وہ کنزہ کو بلا رہا تھا۔

"شانی!" کنزہ بھاگ کر بھائی کی محفوظ باہوں میں سما گئی۔

"شانی! جلدی نکلو۔ باقی لوگوں کو شک ہو گیا ہے وہ باہر نکل رہے ہیں۔" ہم نواز نے شانی کو خبر دی شانی نے فوراً کنزہ کا ہاتھ پکڑا اپنا ریوالور اٹھایا اور غار سے باہر نکل گیا۔ مگر باہر اسے رک جانا پڑا۔ میدان میں بوتھم اپنے تین ساتھیوں کے ساتھ موجود تھا۔ انہوں نے حیرت سے ایک دوسرے کو دیکھا ان کی حالت بھی جوزف جیسی تھی۔ وہ ناقابل یقین نظروں سے شانی اور کنزہ کو دیکھ رہے تھے۔ کنزہ کے چہرے پر خوف و ہراس امڈ آیا تھا۔ شانی نے اسے اپنے پیچھے کر لیا۔ اب وقت نہیں تھا احتیاط کا دامن چھوڑنا ناگزیر تھا۔ اس نے ریوالور سیدھا کرتے ہوئے ٹریگر دبا دیا ایک منٹ میں کئی گولیاں داغی تھیں لیکن صرف ایک بندہ ڈھیر ہوا تھا کیونکہ بوتھم کے ساتھ ایک اور آدمی نے دائیں بائیں چھلانگیں لگا دی تھیں۔

"کنزہ سامنے پتھر کی اوٹ میں چلی جاؤ جلدی۔" شانی نے چیختے ہوئے کنزہ کو پتھر کی طرف ہلکا سا دھکا دیا اور خود بھی بائیں جانب چھلانگ لگا دی۔ بوتھم کی طرف سے پھینکے گئے پتھر سے وہ بال بال بچا تھا۔ چونکہ بوتھم اور جوزف کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ یہاں تک بھی کوئی پہنچ سکتا ہے۔ وہ بھی ایسے کہ انہیں خبر تک نہ ہو اس لیے وہ خالی ہاتھ تھے۔

بوتھم پتھروں کی آڑ لیتا ہوا شانی کے عقب میں پہنچ چکا تھا۔ شانی نے آہٹ پا کر پیچھے دیکھا مگر تب تک دیر ہو چکی تھی بوتھم نے اسے دبوچ لیا۔ جھٹکا لگنے سے ریوالور ہاتھ سے نکل گیا تھا۔ بوتھم اور اس کے تمام ساتھی کڑیل جوان تھے مگر شانی بھی ان سے کم نہ تھا۔ شانی دیوانہ وار لڑ رہا تھا۔ وہ خم ٹھونک کر میدان میں اترا تھا۔ لڑتے ہوئے ڈیڈی کی شبیہ اس کی آنکھوں میں انگارے بھر رہی تھی۔

درس عبرت

"حق بات کہنے سے کبھی گریز نہ کرو خواہ تمہارے سر پر تلوار ہی کیوں نہ لٹک رہی ہو۔ کیا تم موت سے ڈرتے ہو۔ حالاں کہ رب کائنات نے موت کا ایک دن اور ایک وقت مقرر کر دیا ہے۔ پھر موت سے ڈر کر سچی بات کہنے میں ہچکچاہٹ اختیار کرنا انتہائی بزدلی اور ایمان کی کمزوری ہے۔ کمزور اور بزدل قوم کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ زمین کی پیٹھ کا بوجھ بن کر زندہ رہے۔ کمزور اور ضعیف ایمان ایسا گھن ہے جو اندر ہی اندر قوم کو کھا جاتا ہے۔ مشکلات کے راستے سے ڈر کر اللہ کے راستے سے فرار اختیار کرنا بغاوت ہے اور باغی کی سزا تم جانتے ہی ہو۔ کیا تم چاہتے ہو کہ تمہارا حشر بھی ویسا ہو جو تم سے پہلی قوموں کا ہوا ہے۔ کیا کھنڈروں میں ڈھلی ہوئی بستیاں جو قہر خداوندی کا نشانہ بنیں اور جو فرسودگی سے حرف غلط کی طرح مٹ گئیں، تمہاری عبرت کے لیے کم ہیں؟ جہاد ایمان کی روح ہے اور مجاہدین کا ستون، جہاد سے انکار کفر ہے اور کفر ظلمت قلب۔ دل سیاہ ہو تو انسان فحاشیت کے دائرے سے نکل جاتا ہے۔ دل کی بستی تاریک ہو تو انسان خدا کو بھول کر عیش و عشرت میں کھو جاتا ہے۔ دل اپنی ظلمت تمر ہو تو تیغ و سناں جو انسان کے زیور ہیں، ان کی جگہ طاؤس و رباب لے لیتے ہیں۔ جب قومیں طاؤس و رباب کی رسیا ہو جاتی ہیں تو مٹ جاتی ہیں اور ان کی تباہی دوسروں کے لیے عبرت کا درس بن جاتی ہے۔"

(امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری رحمتہ اللہ علیہ)

جن سے اس کا دل و دماغ دہک رہا تھا۔

بوتھم کے ہاتھ میں چاقو تھا۔ چاقو سے اس نے شانی کے سینے پر وار کیا۔ جسے آخری لمحہ میں شانی نے دیکھ لیا وہ خود کو بچانے کے لیے ایک طرف سرکنا چاہتا مگر چاقو کا پھل اس کے بازو میں پیوست ہو گیا تھا۔ درد کی تیز لہر شانی کے جسم میں سرایت کر گئی۔ اس کے منہ سے تیز سسکی نکلی۔ بوتھم نے چاقو کو نیچے کی طرف کھینچا تاکہ بازو میں چیرا لگا سکے۔ مگر شانی نے زخم کی پروا نہ کرتے ہوئے گھونسا بوتھم کی تھوڑی پر رسید کیا۔ بوتھم کے منہ سے کربناک چیخ بلند ہوئی۔ شاید اس کی زبان دانتوں تلے دب کر کٹ چکی تھی۔ بوتھم کی چیخ نے شانی کو انوکھی توانائی بخشی۔

ان لوگوں نے اس کے ڈیڈی کو مارا تھا۔ اسے تڑپا تڑپا کر موت کے حوالے کیا تھا۔ یہ ڈیڈی کے قاتل ہیں۔ انہوں نے کنزہ کو اغوا کیا ہے۔ خیالات کا سمندر اس کے اندر موجزن تھا۔ وہ جوش اور ولولے سے لڑنے لگا۔ اس نے بوتھم اور بوتھم کے ایک ساتھی کو ڈھیر کر دیا تھا۔ شانی کا چہرہ جذبات کی حدت سے تمتما رہا تھا۔ پتھریلی اور وحشت ناک خوف سے بھری کنزہ کانپتے وجود کے ساتھ بھائی کو لڑتا دیکھ رہی تھی۔ اسے جو کچھ یاد تھا وہ پڑھ کر پھونک چکی تھی۔ شانی اس کا بھائی اس کی خاطر موت کی وادی میں اتر کر موت سے پنجہ آزمائی کر رہا تھا۔ دعا کنزہ نے دیکھا بوتھم کا [illegible] جانے والا تیسرا ساتھی شانی کا نشانہ لے رہا ہے۔ کنزہ دو چند سیکنڈ میں فیصلے کی دہلیز پر پہنچ گئی۔ پستول شانی کی کھوپڑی سے دور تھا۔

ڈوش نے ریوالور اٹھا کے شانی پر فائر کر دیا تھا۔ مگر کنزہ فیصلے کی دہلیز پار کر چکی تھی۔ وہ شانی کے سامنے دیوار بن کر کھڑی ہو گئی۔ ڈوش کی چلائی گئی گولی کنزہ کے سینے میں اتر چکی تھی۔ وہ شانی کی بانہوں میں جھول رہی تھی۔

"کنزہ!" شانی چیخا۔ شانی کا سارا خون اس کے چہرے پر جم چکا تھا۔ ڈوش نے دوسرا فائر کرنا چاہا مگر کلک کی آواز نے اس کی حسرت پوری نہیں ہونے دی۔ ریوالور کا چیمبر خالی ہو چکا تھا۔ اس نے غصے میں شانی پر ریوالور کھینچ مارا۔ شانی نے کنزہ کو زمین پر لٹایا اور دھاڑتا ہوا ڈوش پر ٹوٹ پڑا۔

"یو باسٹرڈ۔" اس کے سر پر خون سوار ہو چکا تھا۔ ڈوش کی گردن اس کے آہنی ہاتھوں میں دبی ہوئی تھی۔ ڈوش مچھلی بے آب کی طرح تڑپ رہا تھا۔ اس کی آنکھیں باہر ابل پڑی تھیں۔ شانی پوری قوت سے اس کا گلا دبا رہا تھا۔ چند منٹوں میں ڈوش تڑپ تڑپ کر دم توڑ چکا تھا۔ شانی نے انتہائی نفرت سے دور پھینکا اور بھاگ کر کنزہ کے پاس پہنچا۔

کنزہ کا خون بے تحاشا بہہ چکا تھا۔ وہ آخری سانسیں لے رہی تھی۔ سانسوں کی ڈور ٹوٹنے کو بے تاب تھی۔ شانی نے بہن کا سر اپنی گود میں لے لیا۔

"کنزہ... کنزہ... آنکھیں کھولو پلیز کنزہ۔" وہ اس کے گال تھپتھپا رہا تھا اور دیوانہ وار انداز میں بول رہا تھا۔

"کنزہ [illegible] آنکھیں کھولو۔ تمہیں کچھ نہیں ہوگا۔ آنکھیں کھولو میری بہنا آنکھیں۔"

آنسوؤں کی جھڑی لگ چکی تھی۔ 2 ہزار فٹ بلند پہاڑیاں اس بات کی انتہائی [illegible] تھیں۔ کنزہ نے زندگی کی آخری [illegible] کو دیکھا [illegible] دھیرے سے آنکھیں کھولنے کی کوشش کرنے لگی۔

"کنزہ..." شانی کے آنسو ٹوٹ ٹوٹ کر گر رہے تھے۔ دل کی دھڑکن کی [illegible] رفتار سے جاری تھی۔

"یہ کیا [illegible] بھیا [illegible]"

"شانی! [illegible] بہنیں بھائی [illegible] پر قربان [illegible]"

[illegible] کپکپاتے لبوں سے نکلے ٹوٹے پھوٹے الفاظ کا خنجر شانی کے دل کو خنجر کی طرح چیر رہا تھا۔ کنزہ بمشکل کہہ رہی تھی سانس اکھڑ رہی تھی۔ شاید اس کا وقت ختم ہو چکا تھا۔

"شانی بہنیں بھائی پر قربان..." [illegible] لب چپ اور الفاظ ٹوٹ چکے تھے۔ بہن نے بھائی کے لیے جان قربان کر دی تھی۔

"کنزہ......!" شانی کی زوردار چیخ بے تحاشا گولیوں کی آواز میں دب گئی تھی۔ پیچھے سے اس پر فائر کیے گئے

تھے۔ خوش قسمتی سے گولیوں کا ہدف قریبی پتھر بنا تھا۔

"شالی! اٹھو۔ جلدی کرو ان لوگوں کے پاس جدید اسلحہ ہے۔" ہم نواز نے چیخ کر احساس دلایا۔

کنزو ہمیشہ کے لیے خاموش ہو چکی تھی۔ اس کے قاتلوں کو کیفر کردار تک پہنچانے کے لیے شالی کا زندہ رہنا ضروری تھا۔ شالی ایک طرف درختوں اور پتھروں کی اوٹ میں گھس چکا تھا۔ مگر آنے والوں نے اسے دیکھ لیا تھا۔ اب شالی کو بھاگنا پڑا۔ شالی جہاں بھاگ رہا تھا، تقریباً ڈیڑھ میٹر کا راستہ تھا۔ ڈیڑھ میٹر کے بعد گہری کھائی تھی۔ راستہ دس میٹر کے بعد پہاڑی کے ساتھ دوسری طرف گھوم رہا تھا۔ شالی پتھروں اور جھاڑیوں کو پھلانگتا ہوا موڑ کی طرف بھاگ رہا تھا تاکہ اس کی اوٹ میں پناہ لے سکے مگر وہ جیسے ہی موڑ مڑا پاؤں تلے سے زمین نکل گئی تھی۔ وہ ہاتھ پاؤں مارنے لگا۔ مگر کوئی سہارا ہاتھ نہیں آیا۔ یہ ڈیڑھ میٹر کا راستہ دراصل ایک چھجہ تھا جو باہر کو نکلا ہوا تھا۔ موڑ کے بعد گہری کھائی کا خلاء تھا۔ اس خلا میں شالی گرتا جا رہا تھا۔ دو ہزار فٹ کی بلندی سے وہ موت کے بھیانک منہ کی طرف بڑھ رہا تھا۔ تیز ہواؤں نے اس کا دماغ سلا دیا تھا۔ وہ بے ہوشی کے عالم میں گر رہا تھا۔

❁……❁……❁

بحرالکاہل میں فلپائن اور جاپان کے اکھ علاقے ایسے ہیں جنہیں شیطانی سمندر کہا جاتا ہے۔ اصل میں جہاں سمندر کو جاپان کے مقامی لوگ مانڈ اومی (MANDUMI) کہتے ہیں۔ جس کے معنی شیطان کا سمندر ہے۔ شیطانی سمندر کا علاقہ تکون کی شکل میں ہے۔ یہ جاپان اور فلپائن کے مشترکہ علاقوں پر مشتمل ہے۔ یہ تکون جاپان کے ساحلی شہر یوکوہاما سے فلپائن کے جزیرے گوام تک اور گوام سے واپس جاپان کے ماریانہ جزائر تک اور جاپان سے یوکوہاما تک بنتی ہے۔ ماریانہ جزائر پر دوسری جنگ عظیم میں امریکہ نے قبضہ کر لیا تھا۔ شیطانی سمندر کو ڈریگن تکون بھی کہا جاتا ہے۔ یہ شیطانی سمندر برمودا تکون کی طرح انتہائی پراسرار ہے۔ یہ اس قدر خطرناک ہے کہ جاپان کی حکومت نے باقاعدہ سرکاری اعلان کے ذریعے عوام کو اس علاقے سے ہمیشہ دور رہنے کا حکم جاری کر رکھا ہے۔ یہاں پر کئی آبدوزیں، طیارے، جہاز اور افراد غائب ہو چکے ہیں۔ ان میں ایسے جہاز اور آبدوزیں بھی شامل تھیں جن میں خطرناک ایٹمی مواد بھرا ہوا تھا اور دنیا کے ذہین ترین لوگ یہاں غائب ہوئے ہیں۔ 1952ء تا 1958 جاپان نے اپنے پانچ بڑے فوجی جہاز اس علاقے میں کھوئے ہیں لاپتہ افراد کی تعداد 700 سے اوپر ہے۔ یہ سب پراسرار واقعہ تھا کہ جاپانی حکومت نے سو سے زائد سائنسدان ایک جہاز پر روانہ کیے تاکہ اس پراسرار معمہ کا کھوج لگایا جا سکے۔ مگر بدقسمتی معمہ حل کرنے والے سائنسدان خود معمہ بن گئے۔ اس کے علاوہ فرانسیسی جہاز جیرانیم 24 نومبر 1974ء کو خوشگوار موسم ہونے کے باوجود عملے کے 29 افراد سمیت یہاں غائب ہو چکا ہے۔

لائبیریا کے مال بردار جہاز بانالونا اور ماکھور سار شیطانی سمندر کا شکار بن چکے ہیں۔ ان میں سے حیرت انگیز بات یہ تھی ماکھور سار جہاز کے چاروں طرف سمندر میں آگ لگ گئی تھی۔ پانی کی لہریں آگ کی لپٹیں پھینک رہی تھیں۔ مثلث کی شکل میں بڑھنے والی آگ نے جہاز کو گھیرا اور اسے چوبیس افراد کے ساتھ غائب کر دیا۔

یونانی جہاز اجیوسس جیور جیس 29 افراد کے عملے اور 16565 ٹن وزن کے ساتھ شیطانی سمندر کی بھینٹ چڑھ چکا ہے۔ شیطانی سمندر کے واقعات برمودا تکون سے زیادہ ہیں۔ مگر برمودا تکون کی طرح شیطانی سمندر میں رونما ہونے والے ان عجیب و غریب واقعات کی آج کی جدید ترین ٹیکنالوجی بھی کوئی سراغ نہیں لگا سکی ہے۔

یہ بات سوچتے ہوئے گرو کے چہرے پر طنزیہ مسکراہٹ دوڑ گئی۔ گرو نے ایک چکر شیطانی سمندر کے گرد کاٹا۔ گرو کی آنکھوں میں اطمینان کی دبیز تہہ چڑھ گئی تھی۔ شیطانی سمندر کے گوشے گوشے میں گرو کی سربلندی کے جھنڈے بلند تھے۔ جہاں کوئی نہیں جا پاتا

وہاں گرو کی حاکمیت قائم تھی۔ دنیا کی سالمیت امن و سکون، محبتیں، رشتے ناتے اور جینے کا مسلمہ قانون جو قدرت نے انسانوں کے لیے وضع کیا اسے ختم کرنے کے لیے شیطانی سمندر کی سطح، گہرائی اور فضاؤں میں بھرپور طریقے سے کام جاری تھا۔ دنیا کی تباہی و بربادی اور موجودہ سسٹم کو فنا کرکے پوری دنیا پر حسب منشا مملکت قائم کرنا گرو کا دیرینہ خواب تھا۔ گرو کی فتح و کامرانی میں غیر مسلم ممالک بھرپور کردار ادا کر رہے تھے۔ ایسے ممالک گرو کو بہت عزیز تھے اس لیے گرو چاہتا تھا آزادی کا مجرد تصور صرف اپنے ہمنوا ممالک کے لیے مختص کیا جائے اور جو گرو کے اخذ کردہ قانون کی پاسداری سے انکاری ہوں اس ملک کی گستاخی اور بے ادبی کا سر کچل کر اسے غلامی کی زنجیروں میں جکڑ لیا جائے۔ یہ غلامی خواہ عسکری ہو، نظریاتی، ظاہری یا باطنی جو بھی ہو بہر حال یہ ممالک گرو کے ہمیشہ مطیع رہیں۔ گرو ان کی بالادستی چاہتا تھا جو ان کے حکم کے تابع ہوں۔ جو گرو کے خلاف دفاعی ہتھیار استعمال کرتے ہیں انہیں ناکارہ بنا دیا جائے گا۔ ان کے خلاف ایسی پالیسیاں مرتب کی جا چکی تھیں کہ دو گرو اور اس کے حواریوں کے رحم و کرم پر چلے جا رہے تھے۔ گرو نے شیطانی سمندر اور برمودا تکون میں اپنے خفیہ ٹھکانے بنا رکھے تھے۔ گرو کے پاس ایسی طاقت موجود تھی کہ اپنی منشاء کے مطابق طیارے، جہاز اور انسانوں کو بھی با اسباب ان ٹھکانوں میں کھینچ لیتا تھا۔ کئی دانشور اور ذہین ترین دماغ، سائنسدان اور ماہرین گرو کے قبضے میں جا چکے تھے۔ گرو کی کارروائی میں ایسی مربوط پلاننگ ہوتی تھی کہ باہوش اور باخبر لوگ جو حالات و واقعات کا گہرا مشاہدہ کرتے ہیں وہ بھی ان واقعات میں فقط لکیر پیٹتے رہ جاتے ہیں۔ کوئی مثبت پہلو آج تک ان کے ہاتھ نہیں لگا تھا۔ ہاں البتہ اقوام عالم میں ایسے چند ممالک اور افراد ضرور شامل ہیں جنہیں گرو نے از خود ان خفیہ ٹھکانوں میں جانے کا شرف بخشا تھا۔ کیونکہ انہی ممالک میں میڈیا کی طاقت سے ان ٹھکانوں کو دیومالائی کہانیوں میں لپیٹ کر دنیا کی آنکھوں میں چڑھا دیا تھا۔ اب دنیا انہی کی عینک سے دیکھتی ہے جو عینک ان کی آنکھوں میں چڑھا دی گئی ہے۔ دنیا نہیں جانتی ہے گرو اپنے حواری ممالک کے ساتھ مل کر تمام مملکتوں کی جڑیں متواتر کھوکھلی کرنے میں مگن ہے۔ گرو اکثر اپنا تخت شیطانی سمندر کے سینے پر بچھاتا تھا۔ چیلے اس کے سامنے بیٹھ کر اپنی کارگزاری سناتے ہیں اور انعام و اکرام وصول کرتے ہیں۔ داد و تحسین سمیٹتے ہیں اور اپنے مشن کے لیے نئی ہدایات پاتے ہیں اور آئندہ کی پلاننگ ترتیب دیتے ہیں۔

سیلیا سے اس بار گرو بے انتہا خوش نظر آتا تھا۔ گرو نے اسے شاباش دیتے ہوئے کہا۔

"سیلیا! میں ہر چیلے کی ذہانت، فراست اور دانشوری کا قائل ہوں کہ وہ میرے چیلے ہیں اور میری منشاء کے مطابق چل کر کامیابی حاصل کرتے ہیں۔ ان کے اسرار و رموز میں میری ذہنی تعلیم کارفرما ہوتی ہے۔ جس کے سبب وہ ہمیشہ سرخرو رہتے ہیں۔ مگر سیلیا تم نے اپنے کمال فن میں بہتر مہارت دکھائی ہے۔ شالی مجھے بوڑھے جن کی سحر انگیز باتوں میں ڈوبا ہوا دکھائی دیتا تھا۔ اگر اسے اپنی پلاننگ کے حصار میں قید نہ کرتے تو وہ آج امن کا انسان ہوتا۔ اس کا اندر باہر روشن ہوتا اور وہ ہماری پہنچ سے کوسوں دور نکل جاتا۔ مگر اب کے وہ خواہشات کا اسیر ہے، ذلیل و خوار ہے اور ہمیشہ در در کی ٹھوکریں اس کا مقدر بن چکی ہیں۔"

گرو کی باتیں سن کر سیلیا کی گردن فخر کی بلند ترین سطح پر پہنچ رہی تھی۔

گرو کا بلند قہقہہ سمندر کی فضاؤں کو چیر رہا تھا۔

"ہاہاہاہاہا...... میں دنیا کے تمام نظام کو جلد کر دوں گا۔ اپنے حربوں سے ساری دنیا پر قابض ہو جاؤں گا اور مجھے روکنے ٹوکنے والا کوئی نہیں ہے۔"

گرو کی چالاک ہنسی میں چیلے ساتھ دے رہے تھے۔

گرو کہہ رہا تھا۔

"میرا ہر چیلا سیلیا کی طرح ذہین، چالاک اور غیر

معمولی عقل وفہم کا مالک ہے۔" گرو سیلیا کی تعریف کررہا تھا اور سیلیا خوشی سے پھولے نہیں سمارہا تھا۔ گرو دوں ارجوں چیلوں کے سامنے گرو اس کی عقل و دانش کو تسلیم کرتے ہوئے تعریفیں کررہا تھا۔ اس کا مان بڑھا رہا تھا۔ سیلیا نے محسوس کرلیا تھا آج گرو کا موڈ بہت اچھا ہے۔ سیلیا کو ایک بات کافی عرصے سے کھٹک رہی تھی مگر وہ اس کا جواب نہیں پاسکا تھا۔ ابتداء میں جب اسے شانی کا مشن سونپا گیا تھا تب پہلے دن کی صبح کے مناظر وہ تا حال نہیں بھولا تھا۔ گھنا جنگل میدان تمام درخت، پودے، جانور، پہاڑ زمین بوس کیسے ہوئے تھے۔ یہ سوال وہ پہلے بھی گرو سے پوچھ چکا تھا۔

گرو نے کہا تھا یہ تیرے لیے نہیں ہے جس کے لیے وہ دیکھنا نہیں چاہتے، جو دیکھتے ہیں وہ اوروں کو بتاتے نہیں۔

سیلیا کو وہ راز جاننے کی خواہش روز اول سے تھی۔ آج نادر موقع تھا جس سے فائدہ اٹھا کر اس نے گرو سے پوچھ لیا۔

گرو نے لمحہ بھر سوچا پھر اپنے چیلوں پر نظریں دوڑائیں سیلیا کا سوال ایسا تھا کہ تمام چیلے اس کا جواب سننے کے خواہش مند نظر آتے تھے۔ گرو نے سب کو مخاطب کرتے ہوئے کہنا شروع کیا۔

"مجھے کچھ قدرت کے اہم رازوں سے آشنائی ہے۔ کچھ راز زمین کے باسی بھی جان لیتے ہیں۔ زمین کے یہ باسی مسلمانوں کے طبقے سے ہیں۔ دیکھا جائے تو وہ لوگ اندر کے روشن انسان ہیں اور وہی ہمارے دشمنان خاص ہیں۔ وہ یہ راز جانتے ہیں کہ علی الصبح ہر چیز رب کائنات کے سامنے سجدہ ریز ہوتی ہے۔ سیلیا اس نے صبح تم نے بھی سجدے کے مناظر دیکھے تھے۔ بس فرق یہ ہے کہ یہ مناظر ہر انسان کو نظر نہیں آتے وہ جان سکتے ہیں پر دیکھ نہیں سکتے۔ اس لیے کوئی ان مناظر سے سبق نہیں سیکھ سکتا۔ لہٰذا صبح بھی غفلت کی نیند سوئے رہتے ہیں۔" گرو نے دیکھا سیلیا کچھ مزید پوچھنا چاہ رہا ہے۔

"مزید کچھ مت پوچھنا سیلیا فی الحال تمہارے لیے اتنا ہی کافی ہے ہاں وقت آیا تو میں خود تمہیں مزید بتاؤں گا۔"

"گرو! ہم لب کشائی کی بنا اجازت کے جرأت کیسے کرسکتے ہیں۔ آپ ہی حق اور سچ ہو جو بہتر سمجھتے ہو بتا دیتے ہو۔" سیلیا نے انتہائی مودبانہ لہجے میں کہا۔

"مجھے ابھی اسرائیل جانا ہے۔ تین منٹ بعد میری وہاں میٹنگ ہے تم سب اپنے اپنے کاموں پر لوٹ جاؤ۔" گرو نے میٹنگ برخاست کرنے کا اشارہ دیدیا تھا۔ چیلے حق گرو، سچ گرو کے نعرے لگاتے ہوئے روانہ ہونے لگے۔

❁ ❁ ❁

امجد بخاری نے گروپ کو بہت استحکام بخشا تھا۔ جو ایسے جاں نثار پاکستانی سپوت تیار کررہا تھا جو دشمنان اسلامی جمہوریہ پاکستان کا سر کچل سکیں۔ انہیں نیست و نابود کرسکیں اور ان کا ناپاک وجود پاک سرزمین سے ہمیشہ کے لیے مٹا سکیں۔ اس مقصد میں اسے خاطر خواہ کامیابی ملی تھی۔ طلحہ، حمزہ، قاسم، عبداللہ، شرجیل، شاہ میر اور اویس اور کئی دوسرے نوجوان اس کے ہاتھ پہ بیعت کرچکے تھے۔ ان نوجوانوں نے خون کے آخری قطرے تک پاکستان کی حفاظت کرنے کا عہد کیا تھا اور قسمیں اٹھائی تھیں۔ جب یہ نوجوان عملی طور پر میدان میں اترنے کے قابل ہوئے تو امجد بخاری نے حمزہ، طلحہ اور اویس کو پراسرار پہاڑیوں میں روانہ کیا۔ کیونکہ وہاں کوئی غیر ملکی گروہ متحرک ہے۔ بجز اس کے امجد بخاری کے پاس کوئی معلومات یا شواہد موجود نہیں تھے۔ قبل اس کے وہ اس قابل نہیں تھا کہ وہ عملی قدم اٹھا پاتا۔ کسی سرکاری آفیسر پر اعتماد کرنے کو دل آمادہ نہیں تھا۔ اسے معلوم تھا قانون کا وقار مجروح کرنے والے بہت ہیں۔ ہمارے بہت سے اعلیٰ حکام پر غیر ملکی اثر و نفوذ کارفرما رہتا ہے۔ لاقانونیت اور اختیارات کے غلط استعمال کے کئی کیس اس کی نظروں کے سامنے سے گزرے تھے۔ اس لیے امجد بخاری اپنے زور بازو پر یقین رکھتا تھا۔

حمزہ، طلحہ اور اویس کو روانہ کرتے ہوئے امجد بخاری

نے ان کے ساتھ طلبی تی میٹنگ کی تھی۔

"تم لوگ پہلی بار پاکستان کے دشمنوں سے ٹکرانے جا رہے ہو۔ نیک مشن میں روانگی سے پہلے دو رکعت نماز نفل ادا کر لیا کرو۔ جذبہ شہادت کو ہمیشہ ملحوظ رکھو اور ہر نئے مشن کو اپنا آخری مشن سمجھ کر نکلو۔"

"ہمیں اس دن فخر حاصل ہوگا سر! جس دن ہم پاکستان کے دفاع میں موت کو گلے لگائیں گے۔"

"حمزہ اس گروپ کو کمان کرے گا۔ اپنی پوری طاقت اور تمام تر صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے تکمیل مشن کی کوشش کرنی ہے۔ کیونکہ تم لوگوں کا مقابلہ انٹرنیشنل ایجنٹوں سے ہوگا۔ جو اپنے کام میں ماہر ترین لوگ سمجھے جاتے ہیں۔"

"آپ بے فکر رہیے سر! ہم ان شاء اللہ انہیں دوسروں کے لیے مقام عبرت بنادیں گے۔"

"یہ بین الاقوامی تنظیموں کے ایجنٹ ہیں ان کے پاس جدید ترین اسلحہ اور جدید آلات ہوں گے۔ جن کی بدولت وہ اکثر فتح حاصل کرتے ہیں اگر بات دوبدو لڑائی پر آجائے تو تب ان کی بہادری اور جراتمندی کا بخوبی پتہ لگ جاتا ہے۔ ان ظاہری شیروں میں بھیڑوں کی روح ہوتی ہے۔ یہ شیر کی کھال اوڑھ کر دندناتے ہیں مگر حقیقی شیر سے واسطہ پڑ جائے تو ان کی ساری اکڑ ناک کے راستے نکل آتی ہے۔"

"ایک بار انہیں ہمارے مدمقابل آنے دیں سر! وہ موت سے پناہ مانگیں گے اور زندگی کی بھیک کے لیے گڑ گڑائیں گے۔"

امجد بخاری نے انہیں تعریفی نظروں سے دیکھا یہ وہ سرمایہ تھا جن کے جذبات پاکستان کے حوالے سے گرانقدر تھے۔ ان کے بدن امجد بخاری نے ماہر انسٹرکٹر کی نگرانی میں کندن بنا دیے تھے۔ امجد بخاری نے انہیں سینے سے لگا کر رخصت کیا تھا۔

پانچ فٹ گیارہ انچ قد کا پچیس سالہ حمزہ کڑیل نوجوان تھا اس نے کمپیوٹر میں انجینئرنگ کیا ہوا تھا وہ غیر معمولی ذہانت کا مالک تھا۔ طلحہ اور اویس بھی کم وبیش انہی خصوصیات کے مالک تھے۔

امجد بخاری کے بتائے گئے نقشے کے مطابق وہ پراسرار پہاڑیوں میں پہنچ گئے تھے۔ حمزہ نے اویس اور طلحہ کو دائیں بائیں پھیلا کر ہدایات کی کہ کوئی غیر معمولی چیز تلاش کی جائے کیونکہ بقول امجد بخاری کے دو سو فٹ تک انہوں نے غیر ملکیوں کی نقل وحرکت دیکھی تھی۔ اس کے بعد وہ کہاں غائب ہوجاتے تھے یہ پتہ نہیں لگ سکا تھا۔

ان کی خوش بختی تھی کہ پہلے قدم پر انہیں کامیابی مل چکی تھی۔ اویس نے 25mm کا سلنگ دیکھ لیا تھا جو اوپر سے نیچے لٹک رہا تھا۔ لوہے کی باریک تاروں سے بنائے گئے سلنگ کی 13 ٹن وزن اٹھانے کی کپیسٹی تھی۔ جہاں یہ لٹک رہا تھا وہاں دو آمنے سامنے پہاڑیاں تھیں۔ دونوں کے درمیان خلا تھا۔ ایک پہاڑی جس پر وہ کھڑے ہوئے تھے تقریباً تین میٹر کی سل باہر کو نکل کر پیچھے جارہی تھی۔ سلنگ اسی سل کے ساتھ منسلک نیچے بالکل سیدھا لٹک رہا تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ مجوزہ سلنگ اوپر سامان اور بندوں کی ترسیل کے لیے استعمال ہوتا ہے مگر کیسے؟ اس سوال کا جواب ذہن تلاش کررہا تھا۔

"اویس! یہاں پہاڑی کی جڑ میں کوئی غیر معمولی چیز دیکھنے کی کوشش کرو۔" حمزہ نے ادھر ادھر نگاہیں دوڑاتے ہوئے کہا۔

"میں بھی تمہاری مدد کرتا ہوں۔ طلحہ تم کہیں اوٹ میں چھپ کر ہمیں کور کرو ایسا نہ ہو کہ ہم بے خبری میں مارے جائیں۔"

"حمزہ! آپ کے خیال میں یہاں کوئی الیکٹرک بٹن وغیرہ ہوسکتا ہے؟" اویس نے ہاتھ سے جھاڑیاں ہٹاتے ہوئے پوچھا۔

"الیکٹرک بٹن کا امکان بہت کم ہے پھر بھی ہمیں جدید آلات کو مدنظر رکھتے ہوئے کوئی نا کوئی چیز تلاش کرلینی ہے۔"

"حمزہ! خیال کرنا یہ دو تین میٹر کی سل ہے نیچے گہری کھائیاں ہیں تھوڑی سی چوک ہمیں موت کی نیند سلادے

گی۔" اویس نے حمزہ کو سل کے کنارے پر جاتے دیکھ کر تنبیہی لہجے میں کہا۔

"ہاں میں دیکھ رہا ہوں۔" حمزہ نے اسے تسلی دی۔ حمزہ نے سلنگ کو ہاتھ میں پکڑ کر ہلایا اس سلنگ سے بندے لٹک کر اوپر جانے سے رہے یقیناً اس سے منسلک کوئی لفٹ نما چیز ہوگی اور عین ممکن ہے وہ اس وقت اوپر ہو۔ حمزہ نے اوپر دیکھنے کی کوشش مگر ایک حد تک سلنگ نظر آ رہی تھی اس کے بعد وہ کچھ دیکھنے سے قاصر تھا۔

"میرا خیال بھی کچھ ایسا ہی ہے حمزہ ہمیں انتظار کرنا چاہیے۔ ہو سکتا ہے اوپر سے نیچے کوئی آئے۔ ہم اس پر نہ صرف قابو پا سکتے ہیں بلکہ اس کی سواری پر اوپر بھی جا سکتے ہیں۔"

"شاید ہمیں ایسا ہی کرنا ہوگا۔ گھنی جھاڑیوں میں کچھ ملنا ناممکن لگتا ہے۔"

"نہیں حمزہ جب اللہ تعالیٰ مدد فرمائے تو سب کچھ ممکن ہو جاتا ہے یہ دیکھو۔" اویس جو ایک چھوٹے سے غار میں جھانک رہا تھا سیدھا ہوتے ہوئے بولا۔ حمزہ نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ اویس کے ہاتھوں میں بچوں کے پلے اسٹیشن کی کی طرح کا ریموٹ پکڑا ہوا تھا۔

"واؤ!" حمزہ بچوں کی طرح خوشی سے اچھل پڑا اس نے ریموٹ لے کر اسے غور سے دیکھا۔ ریموٹ پر چار بٹن تھے اور ایک گول اسٹک لگی ہوئی تھی۔ تھوڑی دیر بغور جائزہ لینے کے بعد حمزہ نے بسم اللہ پڑھتے ہوئے ایک بٹن دبا دیا۔ بٹن دبتے ہی سلنگ میں ہلچل مچی دونوں نے چونک کر اسے دیکھا۔ حمزہ تیز لہجے میں بولا۔

"ہمیں ایک طرف چھپ جانا چاہیے تم دائیں طرف کے بڑے پتھر کے پیچھے چلے جاؤ میں یہاں جھاڑیوں میں بیٹھ جاتا ہوں۔" وہ دونوں بھی طلحہ کی طرح مورچہ بند ہو گئے۔ انہیں آدھا گھنٹہ انتظار کرنا پڑا تھا۔ اوپر سے ایک لفٹ نما جالی دار بکس سلنگ کے ساتھ آہستہ آہستہ رینگتا ہوا نیچے آیا۔ بکس سلنگ کے آخری سرے سے چار میٹر پہلے رک گیا تھا۔ جہاں بکس رکا تھا اس کے سامنے وہاں دو بڑے بڑے پتھر پڑے ہوئے تھے جن پر چڑھ کر بکس کے اندر با آسانی پہنچا جا سکتا تھا۔ حمزہ نے دس منٹ مزید انتظار کیا مگر بکس میں کوئی نقل و حرکت نظر نہ آئی تو وہ باہر نکل آیا۔ اس نے اویس اور طلحہ کو اشارے سے باہر بلایا۔

"طلحہ! تمہیں یہیں رکنا ہے میں اور اویس اوپر جا رہے ہیں زیادہ دیر ہو جائے تو تم اپنی مرضی سے کوئی بھی قدم اٹھا سکتے ہو۔"

"ٹھیک ہے حمزہ اس ریموٹ کا کیا کروں؟"

"اویس اسے اپنی جگہ سابقہ زاویے پر رکھ دو یقیناً ایک ریموٹ اوپر بھی ہوگا۔"



حمزہ اور اویس آخری سومنٹ میں اوپر پہنچے تھے۔ انہوں نے شانی کو حمزہ کے پاس بیٹھ کر روتے دیکھا تھا۔ ابھی وہ حالات کا جائزہ لے رہے تھے کہ شانی پر فائر ہوئے اور وہ ایک طرف بھاگ پڑا تھا۔

"یہ کیا ہو رہا ہے؟" حمزہ اویس نے سرگوشی کی مگر حمزہ نے اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ دونوں نے ریوالور اپنے ہاتھوں میں لے لیے تھے۔

شانی اس سل پر بھاگا تھا جس نے دو تین میٹر باہر نکل کر چھجہ بنا رکھا تھا اور جس کے ایک کونے میں سلنگ لٹک رہا تھا۔ شانی سلنگ کی مخالف سمت بھاگا تھا اس کے پیچھے دو غیر ملکی بھاگ رہے تھے ان میں ایک لڑکا اور ایک لڑکی تھی دونوں کے ہاتھوں میں اسٹین گنیں تھیں۔

حمزہ اور اویس تیز نگاہوں سے ماحول کا جائزہ لے رہے تھے۔ کافی دیر گزر جانے کے باوجود بھاگنے والے لوگ واپس نہیں پلٹے۔ نہ ہی مزید کوئی ہلچل کے آثار نظر آئے۔ اویس کے انداز میں اضطراب تھا۔ فطرتاً وہ جذباتی لڑکا تھا وہ میدان میں کودنے کو بے چین ہو رہا تھا۔ وہ سرک کر حمزہ کے قریب ہوا اور بولا۔

"ہمیں باہر نکل کر دیکھنا چاہیے وہ لوگ کہاں گئے ہیں؟"

"ہاں چلو۔" حمزہ نے اس بار اس کی تائید کی تھی۔ وہ لوگ بکس کے پاس پہنچے تھے تو بکس کو غائب پایا۔
"یقیناً ان میں سے کوئی نیچے گیا ہے۔" اویس نے بکس ناپ کر خیال ظاہر کیا۔
"ہوں.... "حمزہ نے پر سوچ ہنکارا بھرا۔ سب سے پہلے بھاگنے والا لڑکا اس کی مخالف سمت بھاگا تھا۔ حمزہ نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔
"پھر وہ کہاں گیا؟ تم یہیں رکو میں دیکھ کے آتا ہوں۔"
وہ احتیاط سے آگے بڑھنے لگا مگر راستے کے کنارے پہنچ کر اس کے رونگٹے کھڑے ہو گئے آگے گہری کھائی تھی۔ اس کی ریڑھ کی ہڈی میں سنسناہٹ دوڑ گئی۔ وہ معاملے کی تہہ تک پہنچ گیا تھا۔ پاکستانی لڑکا یہاں سے بھاگتا ہوا نیچے کھائی میں گر چکا تھا۔ اسے دیکھنے کے لیے یقیناً غیر ملکی بکس میں بیٹھ کر نیچے جا چکے ہیں۔ حمزہ واپس پلٹ آیا اس نے اویس کو وہیں ایک طرف رکنے کو کہا اور خود جائزہ لینے کے لیے اس طرف بڑھا جس طرف سے وہ لوگ بھاگ کر آئے تھے۔
حمزہ جیسے جیسے وہاں گھوم رہا تھا اس کی حیرانگی میں اضافہ ہو رہا تھا۔ وہاں جدید ترین اسلحہ اور آلات موجود تھے۔ لیبارٹری کے آثار بھی دکھائی دیے۔ مصنوعی بجلی جگمگ کر رہی تھی۔ جدید ترین جنریٹر موجود تھے۔ وہ حیران و پریشانی سے سوچ رہا تھا اتنا بھاری اور وافر مقدار میں سامان یہاں کتنے عرصے میں پہنچایا گیا اور اسے یہاں لایا ہوگا۔ وہاں چھ لاشیں بھی پڑی ہوئی تھیں پانچ غیر ملکی مردوں کی اور ایک مقامی لڑکی کی۔ ایک لڑکی غار میں بے ہوش پڑی ہوئی تھی۔ مکمل جائزہ لینے کے بعد وہ شش و پنج میں پڑ گیا تھا۔ اس موقع پر اسے کون سا فیصلہ لینا چاہیے۔ حمزہ کے جوان شاداب چہرے پر فکر و غم کے گہرے بادل چھا گئے تھے۔

❀......❀......❀

جیسے گھپ اندھیرے میں روشنی کی کرن پھوٹ کر اندھیرے کے سحر کو توڑ دیتی ہے ایسے ہی شانی کو سوئے ہوئے دماغ میں بیداری کی کرن پیدا ہوئی۔ وہ کئی منٹ تک خالی الذہن لیٹا رہا۔ آنکھیں کھلی ہوئی تھیں مگر ان میں اشیاء کی شناسائی کے آثار نہیں تھے۔ سن ہوتے ہوئے بدن میں درد دھیرے دھیرے چیونٹیوں کی طرح رینگنے لگا تھا۔ دماغ میں ٹیسوں نے دستک دینا شروع کر دی تھی۔ اسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے دماغ میں بہت کی نامعلوم آوازوں کا شور برپا ہے۔ یہ شور بہت سے جانوروں کے مل کر چلانے کے مشابہ تھا۔
وہ کچی مٹی کی اینٹوں سے بنے ہوئے کمرے میں لیٹا ہوا تھا۔ کمرے کی دیواریں 18 انچ سے بھی زیادہ موٹی تھیں۔ جن پر مٹی کا لیپ دیا گیا تھا۔ دیوار میں چھوٹا سا خانہ تھا خانے میں دیا ٹمٹما رہا تھا۔ چھت کے ساتھ موٹے چمڑے کا خود ساختہ پنکھا دو چھوٹی زنجیروں سے بندھا ہوا لٹک رہا تھا۔ رسی کھینچنے سے آگے پیچھے پینگ لینے کی وجہ سے یہ ہوا پیدا کرتا تھا۔ بانس کی کرسی، مٹی کے چند برتن، دو چار پائیاں یہ کمرے کا کل اثاثہ تھے۔ دروازے کی جگہ بانس کی چک لٹک رہی تھی۔ شانی کے ذہن میں آہستہ آہستہ گزرے واقعات تازہ ہونے لگے۔ ذکیہ بالی کے کوٹھے سے شروع ہونے والی مہم پراسرار پہاڑوں تک پہنچا تو کنزہ کے خیال نے اسے اٹھنے پر مجبور کر دیا تھا لیکن درد کی تیز لہر نے اس کی کوشش ناکام بنا دی۔ اس کے منہ سے بے اختیار کراہ نکل گئی۔ شانی کے بالائی جسم پر جابجا پٹیاں بندھی ہوئی تھیں۔ پٹیوں کا محرک اس کا دو ہزار فٹ گہری کھائی میں گرنا تھا۔ پہاڑوں کی اس قدر گہری کھائی میں گرنے والے کے جسم کے چیتھڑے ملنا بھی ناممکن ہوتا ہے مگر شانی کی خوش قسمتی تھی جس سل کے نیچے سے وہ گرا تھا اس کے عین نیچے دریا ختم کیا کر گزرتا تھا۔ سل اور دریا کے درمیان کوئی روک نہیں تھی۔ شانی سیدھا دریا میں گرا تھا۔ جسم پر لگنے والی چوٹوں کا اصل سبب پہاڑ پر ہونے والی لڑائی تھی۔ زخموں میں بازو کا زخم سب سے گہرا تھا۔ جس میں چاقو کا پورا پھل اترا تھا۔ کنزہ کی موت کا خیال شانی کے دماغ میں ہتھوڑے جیسی ضربیں لگا رہا تھا۔ اس کا دماغ پھوڑے

کی طرح دکھ رہا تھا۔ روشن نواز ساکت و جامد تھا یوں جیسے زندگی جن طنابوں سے بندھی تھی وہ ٹوٹ کر تار تار ہو چکی ہیں۔ ہم نواز اور روشن نواز شانی کے ہمراہ غم کے گہرے سمندر میں ڈوبے ہوئے تھے۔ کنزہ کی ناگہانی موت کا اثر انہیں ہرا اور دکھوں کے بنڈل سونپ گیا تھا۔

"ہم نواز... !" شانی کی غم میں ڈوبی مدھم آواز ہم نواز کی سماعت تک رسائی حاصل نہ کر سکی۔

"روشن!" ہم نواز کی طرف سے جواب نہ پا کر شانی نے روشن نواز کو پکارا روشن نواز سسکیوں میں مصروف تھا۔

"شانی! یہ کیا ہو گیا؟ کنزہ ہم سے بچھڑ گئی۔ ہمیشہ کے لیے۔" روشن نواز کی ہچکیاں تھمنے کا نام نہیں لے رہی تھیں۔ ہم نواز کی آہیں بھی بلند ہونے لگی تھیں۔

شانی دوران دیکھے خلاؤں میں کھویا ہوا تھا۔ آنکھوں سے آب غم رواں تھا۔ دردکی یہ چٹان جو کنزہ کی موت ان کے سامنے کھڑی کر گئی تھی اسے وہ اور اس کے گھر والے کیسے پاٹ سکیں گے۔

شانی نے ایک بار پھر اٹھنے کی کوشش کی اپنے اندر کی ساری قوت جمع کر کے وہ بیٹھنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ مگر اسے اتنے زور سے چکر آیا کہ وہ بے اختیار سر پکڑ کر رہ گیا۔ اسے لگا کمرہ پھرکی کی طرح گھوم رہا ہے۔ وہ پھر سے لیٹ گیا۔

"ہم نواز پلیز جاؤ دیکھو میری بہن..." لفظ اتنے بھاری بھرکم ہو گئے تھے کہ لب ان کا بوجھ اٹھانے سے انکاری تھے۔ لب تھرتھرا رہے تھے مگر الفاظ کے معنی سمجھ سے بالاتر تھے۔ وہ پھر سے ہمت کر کے بولا۔

"ہم نواز پہاڑوں میں جاؤ دیکھو کنزہ کی لاش کہاں ہے؟" روشن نواز شانی کی ابتر ہوتی ہوئی حالت دیکھ کر ہم نواز سے بولا۔

"ہم نواز ہمیں جلد حالات سے آگاہ کرو۔"

سوچوں کے انبار تھے جو ہم نواز پر اترے ہوئے تھے تاہم وہ جا چکا تھا۔ روشن نواز غمزدہ نظروں سے شانی کے سوچتے ہوئے چہرے کو دیکھ رہا تھا۔

آہٹ پا کر شانی نے گردن موڑ کر دیکھا۔ بوسیدہ کپڑوں میں ملبوس پچاس پچپن سالہ شخص اندر داخل ہو رہا تھا۔ اس کی ظاہری حالت خستہ حالی کی غماض تھی۔ وہ سیدھا شانی کے پاس آیا۔ شانی کی کھلی ہوئی آنکھیں دیکھ کر خوشی سے بولا۔

"تمہیں ہوش آ گیا بیٹا اللہ کا شکر ہے اللہ نے تمہیں بھی بچا لیا اور میری بیٹی کو بھی۔" وہ ایک ہی سانس میں بولنے لگا۔ مسلسل بولنا اس کی عادت تھی چونکہ وہ رکا نہیں بلکہ کہہ رہا تھا۔

"اب کیسا محسوس کر رہے ہو؟" اس نے شفقت سے شانی کے ماتھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ پھر جواب سنے بغیر ہی بولا۔

"میں نے حکیم نصیر بلوچ سے دوا دارو کروا دیا تھا۔ ان کی مرہم پٹی میں جادو ہے۔ دیکھنا ایک دو دن میں تم بالکل ٹھیک ہو جاؤ گے۔"

شانی اس کی مزید کوئی بات سننے کے لیے خاموشی سے لیٹا ہوا تھا۔ توقع کے عین مطابق وہ پھر بولا۔

"رمضان مچھیرا میرا جگری دوست ہے مچھلیاں کیسے پکڑی جاتی ہیں یہ دیکھنا بیٹی بروج کا شوق تھا۔ میں نے رمضان سے کہا تو وہ بولا۔"

"یار فردوس' یہ کون سی انوکھی بات ہے کل ہی چلو میرے ساتھ دکھا دیتے ہیں۔ ہم باپ بیٹی رمضان کے ساتھ دریا پر چلے گئے۔ وہاں بیٹی بروج کو اتنی خوشی تھی کہ وہ دریا کے اندر دور تک چلی گئی۔ بالی عمر ہے بیٹا کچھ نہ پائی۔ دریا کی منہ زور لہریں اسے اپنے ساتھ بہا لے گئی تھیں۔" کہتے ہوئے اس کا لہجہ بے حد اداس ہو گیا تھا۔ مگر وہ رکا نہیں۔

"بیٹی بروج ڈوب گئی اور ہمارے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے بس پھر کیا تھا۔ رمضان اور اس کے ساتھی مچھیرے دریا میں کود پڑے بیٹی بروج سے پہلے تم ہاتھ لگ گئے اس کے بعد میری بیٹی بھی مل گئی اللہ نے دونوں کو بچا لیا۔ بیٹا اس ڈش (خوبصورت) رب کے وشی کام۔"

کہتے ہوئے فردوس کو خیال آیا کہ پچھلے کئی منٹ سے وہی بولے جا رہا ہے۔ اس نے شانی کے ماتھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

"تم بولتے نہیں بیٹا؟"

"میں کہاں ہوں؟"

شانی بمشکل کہہ پایا۔ وہ ہنوز خود کو مکمل طور سے سنبھال نہیں پا رہا تھا۔

"بیٹا! تم میرے گھر میں ہو۔" شانی کو اس قدر سادہ جواب کی توقع نہیں تھی۔ چند لمحے خاموش رہنے کے بعد وہ بولا۔

"آپ کا گھر کہاں ہے؟" شانی کو خدشہ تھا موصوف پھر سے اسٹارٹ ہو جائے گا۔

"تمہیں نہیں پتہ میرا گھر کہاں ہے؟" حیرانی میں ڈوبی آواز سن کر شانی کو لگا کہ وہ احمقوں کی دنیا میں پھنس گیا ہے لیکن فردوس نے کمال ذہانت کا ثبوت دیتے ہوئے کہا۔

"بیٹا! ہمارا گھر گورے بستی میں ہے۔ بستی میں زیادہ مچھیرے رہتے ہیں مگر میں مچھیرا نہیں۔ مچھلیاں نہیں پکڑتا اپنے برتن بناتا ہوں مٹی اور......"

"آپ کو پتہ ہے نثار پور کہاں ہے؟" شانی نے اسے مزید بولنے سے روک دیا۔

"نثار پور؟ جن و پریوں کی پہاڑیوں والا نثار پور؟"

"جی وہی نثار پور۔"

"وہ کسے نہیں پتہ بیٹا! پر وہ بہت دور ہے پورے چار گھنٹے لگتے ہیں۔ بیٹا تم نثار پور کے رہنے والے ہو؟" فردوس جب بولنے پر آتا تھا تو بلا تکان نان اسٹاپ بولتا تھا۔

"ہاں میں نثار پور کا رہنے والا ہوں مجھے واپس جانا ہے آج ہی بلکہ ابھی۔"

"ٹھیک ہے بیٹا! میں تمہیں رحیم بیٹا کے ساتھ گدھا گاڑی میں بٹھا دیتا جب وہ برتن لے کر جاتا۔ مگر بیٹا حکیم صاحب نے تمہارے لیے آرام کرنے کا حکم دیا ہے اور ہم حکیم نصیر کا حکم ٹال نہیں سکتے۔ تم فکر مت کرو تمہیں یہاں کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔"

شانی نے خاموشی سے آنکھیں موند لی تھیں۔ فی الحال کچھ کہنا فضول تھا۔ وہ خود کچھ حرکت کرنے سے قاصر تھا۔ جبکہ فردوس حکیم نصیر کی حکم عدولی کرنے پر آمادہ نظر نہیں آتا تھا۔

ہم نواز پلٹ آیا تھا۔

"شانی۔" ہم نواز بولا تو اس کی آواز میں سوز و الم کی عجب کہانی غم کا انوکھا تاثر تھا۔

"بولو ہم نواز مقدر نے کون سا اندوہناک کھیل کھیلا ہے میرے ساتھ۔"

"شانی! میں نثار پور پہنچا تو کنزہ کی تدفین ہو رہی تھی۔ جنازے میں لوگوں کا ٹھاٹھیں مارتا سمندر تھا۔ تمہارے گھر میں تل دھرنے کی جگہ نہیں تھی اس لیے کہ کنزہ کی لاش پراسرار پہاڑیوں کی جڑ میں ملی تھی۔ لوگوں کی پرانی تباہ کاریاں لوٹ آئی تھیں۔ تمہاری ماں پر کئی بار غشی کے دورے پڑ چکے ہیں۔ وہ دہرے غم میں تڑپ رہی ہے۔ بیٹی کا دائمی ہجر اور شانی کا پولیس سے فرار۔ کامران ملازان کے ساتھ سارے خاندان نے شرکت کی تھی اور میں تمہیں بتاؤں شانی جنازے میں بہت سے پولیس اہلکار سادہ لباس میں شریک تھے۔ ان کا خیال تھا تم بہن کے جنازے کو کندھا دینے ضرور آؤ گے۔ کیونکہ شانی تو مفرور قاتل ہے۔ جس حوالدار کو تم نے تھانے میں چھپا تھا وہ اسپتال میں زخموں کی تاب نہ لاتے ہوئے فوت ہو چکا ہے۔" ہم نواز تفصیل بتائے جا رہا تھا۔ مگر شانی کنزہ کی تدفین سے آگے کچھ نہ سن سکا تھا۔

❀......❀......❀

مکمل صحت یابی میں بروج کو ایک اور شانی کو تین دن لگے تھے۔ بروج کو کوئی جسمانی چوٹ نہیں لگی تھی۔ دریا میں بہنے سے اس کے دل میں خوف بیٹھ گیا تھا ورنہ وہ صحیح سلامت تھی۔ شانی کے زخموں کا درد بے تحاشہ تھا۔ اس لیے اسے چلنے پھرنے میں تین دن لگے تھے۔ دو دن بروج اس کے آس پاس رہی تھی۔ کئی بار شانی کو پانی اور کھانا بھی اس نے دیا تھا۔ جب اس کی ماں شانی

کے پاس کمرے میں آتی ساتھ بروج کا ہونا لازمی تھا۔ بروج سحر انگیز حسن کی مالکہ تھی۔ لوگوں نے ننار پود کی پہاڑیوں میں پریوں کے قصے کہانیاں گھڑ رکھی تھیں مگر کسی نے پری دیکھی نہیں تھی۔ شانی کی نگاہیں بروج کی صورت میں پری دیکھ چکی تھی۔ انتہائی مخدوش اور نامناسب حالات میں بھی وہ نظروں پر پہرے بٹھانے سے قاصر تھا۔ روشن نواز نے شانے سے دو ہاتھ آگے پھرتی دکھائی تھی۔ بروج کی پہلی جھلک میں ہی وہ زیر و زبر ہو چکا تھا اور بروج کی خوبصورت آنکھوں میں پکے ڈیرے جما کر بیٹھ گیا تھا۔ عام حالات میں بروج کے سنگ گزرنے والے لمحات نہایت فرحت آمیز اور خوش کن ثابت ہوتے لیکن شانی درد کی راہوں میں پاؤں دھرے چل رہا تھا۔ دو دن میں بروج نے شانی کی حد سے بڑھ کر خدمت کی تھی۔ بروج کی گفتگو گھنگرو کی طرح چھن چھن کرتی ہوئی کانوں میں موسیقی کی لے چھیڑ دیتی تھی۔ اس کے لہجے کی مٹھاس رس گھول دیتی تھی۔ ہم نواز کا خیال تھا شانی اور روشن نواز دونوں ہی بروج کے حسن پر فریفتہ ہو چکے ہیں مگر فی الحال اس بات کی پرکھ یا پہچان نہیں رکھتے تھے کیونکہ دونوں گنزہ کی موت اور شانی کے ساتھ پیش آنے والے حالات میں بری طرح الجھے ہوئے تھے۔

بروج جب بھی کوئی چیز دینے کمرے میں آتی اداؤں میں منفرد شرمیلا پن لے کر آتی۔ جسے دیکھ کر انوکھے لطف کا احساس جاگ اٹھتا تھا۔ بروج کی ماں اور بہنوں کا خیال تھا جب سے وہ دریا میں غوطہ لگا کر آئی ہے اس کے حسن میں مزید نکھار آ گیا ہے۔ محلے کی سہیلیاں تو باقاعدہ اسے چھیڑتی بھی تھیں۔

"دریا کی گہرائی میں کیسے دیکھ لیا تھا کہ تیرے حسن کو چار چاند لگ گئے۔"

خود بروج ہاتھ میں ٹوٹا شیشہ لے کر دیکھتی تو شرما کر خود میں سمٹ جاتی۔ اس کا حسن واقعی غیر معمولی حد تک بڑھ گیا تھا۔

شانی میں بروج کی دلچسپی شانی کا جھکاؤ اور روشن نواز کا رویہ ہم نواز کو سخت پریشان کر رہا تھا۔ کیونکہ وہ مستقبل کی کھڑکی سے جھانک کر حالات کی کڑیاں جوڑ رہا تھا۔ شانی پر قتل کا مقدمہ درج ہو چکا تھا۔ وہ تھانے کے لاک اپ سے بھاگا ہوا مجرم تھا اور اس کے مد مقابل ایم این اے کا بیٹا ساجد اور تھانے کا پورا عملہ تھا۔ شانی کو فی الحال حالات کو سدھارنا تھا اگر وہ یونہی ان دیکھی منزل کی طرف بھاگتا رہا تو اس دلدل کی گہری کھائی میں مزید دھنستا چلا جائے گا۔ ہم نواز نے شانی کو سمجھانے کی غرض سے کہا۔

"شانی! میں دیکھ رہا ہوں تمہارا جھکاؤ بروج کی طرف بڑھ رہا ہے اور بروج کی حرکات و سکنات میں بھی کونپلیں پھوٹ رہی ہیں، اگر ایسا ہے تو یہ ٹھیک نہیں ہے۔" شانی کے بولنے سے پیشتر روشن نواز بول اٹھا۔

"ہم نواز! پیار وہ جذبہ ہے جس پر کسی کو اختیار نہیں ہوتا۔ یہ بے اختیار ہے اور اسے جب ہونا ہوتا ہے ہو کر رہتا ہے۔ حالات و واقعات اس کی راہ میں رکاوٹ نہیں بنتے۔"

"روشن نواز! تم حالات کو سمجھو۔ شانی اس وقت انتہائی نازک دور سے گزر رہا ہے مخدوش حالات اسے چاروں طرف سے گھیر چکے ہیں۔ ابھی اسے بہت سی گتھیاں سلجھانی ہیں۔ گنزہ کی موت کے بعد گھر میں بھونچال آیا ہوا ہے۔ امی اور منزہ کو سہارا دینا شانی کی ذمہ داری ہے۔ کامران اور لقمان جس طرح اپنی اپنی فیملیوں میں ڈوبے ہوئے ہیں وہ اس ذمہ داری سے مبرا نظر آتے ہیں۔ مگر جب شانی خود کو تھانے میں پیش کرے گا۔ وہ چار و ناچار اس کا مقدمہ لڑیں گے۔ شانی نے جو کچھ تھانے میں کیا اپنے دفاع میں کیا۔ تھانے میں ساجد کی موجودگی اس کی پوزیشن مستحکم کرنے میں معاون ثابت ہوگی اور......"

"ہم نواز! میں تمہارے تجزیے سے متفق ہوں مگر پیار بھی نعمت سے کم نہیں اور یہ نعمت مقدر سے ملتی ہے۔ بروج حسن کی دیوی ہے اگر وہ شانی سے متاثر ہے اور شانی اس کے حسن میں ڈوبا چلا جا رہا ہے تو اس میں کیا

مقدر ہے۔"

"روشن نواز! تم اپنی فطرت کے مطابق جذباتی باتیں کرتے ہو۔ تم حالات کو الگ زاویے سے دیکھ رہے ہو اور میں الگ زاویے سے دیکھتا ہوں۔"

شانی دونوں کی گفتگو سن رہا تھا۔ ہم نواز کی بات پر وہ بولا۔

"ہم نواز! جو تم نے سوچا اور کہا وہ اٹل حقیقت ہے۔ بروج کے حسن میں مقناطیسی کشش ہے میں چاہنے کے باوجود خود کو روک نہیں پاتا اور گزرنے والے ہر لمحے میں میرا جھکاؤ اس کی طرف بڑھ رہا ہے۔ جبکہ مجھے ان حالات میں یہ زیب نہیں دیتا مگر میں بالکل بے بس ہو چکا ہوں۔ حالانکہ مجھے ابھی حالات کا مقابلہ کرنا ہے۔ اپنا گھر سنبھالنا ہے، کیس لڑنا ہے اور وہ غیر ملکی گروہ بھی میرے اعصاب پر سوار ہے۔ ان لوگوں کے مقاصد کیا ہیں۔ وہ پہاڑوں میں کیا کرتے پھر رہے ہیں۔ جدید ترین سامان سے لیس یہ گروپ اتنا منظم کیسے ہوا۔ یقیناً انہیں مقامی لوگوں کا تعاون حاصل رہا ہے۔ وہ سب میرے ڈیڈی اور بہن کے قاتل ہیں۔ میں انہیں کبھی بخش نہیں سکتا۔ میرا کیس حل ہوتے ہی میں اس گروپ کی تہہ تک پہنچ کر انہیں نیست و نابود کر دوں گا۔"

"شانی! فی الحال ہمیں جوش سے نہیں ہوش سے کام لینا۔" ہم نواز نے اسے باور کرایا کہ وہ ایک بار پھر ہوش کا دامن جھٹک رہا ہے۔ "ہمیں سر دست یہاں سے چلنا چاہیے کیونکہ میں محسوس کر رہا ہوں جتنی دیر یہاں ٹھہریں گے۔ یہاں اپنا بہت کچھ گنوا دیں گے۔ یہاں سے جلدی نکلنا ہی ہمارے حق میں بہتر ہے۔"

ہم نواز کی تجویز پر شانی نے عمل کیا تھا ویسے بھی وہ تندرست تھا اور وہاں رکنے کا کوئی جواز نہیں بنتا تھا۔ شانی نے اپنے محسن فردوس کا بہت شکریہ ادا کیا۔ فردوس بہت سادہ اور مخلص انسان تھا۔ زندگی کے اصل راز ایسے ہی سادہ لوگوں میں پوشیدہ ہوتے ہیں۔ یہی لوگ جو خلوص و محبت سے لبالب بھرے ہوتے ہیں۔

"ناکو (چچا) فردوس میں آپ کا بے حد مشکور ہوں آپ نے میرے لیے تکالیف اور پریشانیاں اٹھائی ہیں میں آپ کا احسان کبھی نہیں بھولوں گا۔ زندگی رہی تو اس کا ازالہ کرنے کی کوشش کروں گا۔"

"شانی بیٹا! میں نے جو کچھ کیا اپنے رب کی خوشنودی کے لیے کیا ہے۔ میں اجر کی توقع بھی اپنی ذات سے رکھتا ہوں۔ انسان کے ساتھ کی جانے والی نیکی کا بدلہ دنیا میں مل جائے تو آخرت میں نہ ملنے کا ڈر رہتا ہے۔ شانی کو گوریہ بستی کے سادہ اور حق شخص نے ششدر کر دیا تھا۔ وہ ان لوگوں سے خلوص کے ساتھ ملا۔ فردوس کی بیوی اور بیٹیاں اور بیمار جیم سب نے اسے عزیز ترین ہستی کی طرح الوداع کیا تھا۔ تاہم وقت رخصت بروج گھر پر نہیں تھی۔ ماں نے بتایا کسی سہیلی کے گھر نکل گئی ہے۔ روشن نواز بروج کا مشتاق تھا۔ شانی ترچھی نگاہوں سے صحن کا جائزہ لے رہا تھا مگر پانچ افراد کی موجودگی کے باوجود صحن بہت اداس اور سونا سونا لگ رہا تھا۔

بروج گھر نہیں لوٹی تھی اور شانی چلا آیا تھا۔ اس کے پاؤں انتہائی سست روی سے اٹھ رہے تھے۔ جاتے سمے نامعلوم اداسی اس کے وجود کو گھیر چکی تھی۔ گوریہ بستی کو اسے پیدل عبور کرنا تھا اس کے بعد کسی سواری کے ملنے کی اُمید تھی۔

شاید وہ گوریہ بستی کی آخری گلی تھی۔ قدم منوں بھاری محسوس ہو رہے تھے۔ روشن نواز اسے ٹوک رہا تھا۔

"چند لمحوں کے لیے کسی بہانے فردوس کے کچے مکان میں لوٹ جاؤ شاید بروج گھر واپس آ گئی ہو۔ شاید بے مثال حسن کا دیدار نصیب ہو جائے۔"

شانی روشن نواز کے سامنے ہتھیار ڈال کر کمزور نہیں ہونا چاہتا تھا۔ اس لیے چلتا رہا مگر آخری موڑ مڑتے ہی زمین نے اس کے قدم تھام لیے۔ سامنے بروج کھڑی تھی۔ شانی کی طرح روشن نواز بھی اسے دیکھ کر چونک اٹھا تھا۔ ان کے اندر روشنی کے نئے دیے جلنے لگے تھے۔ جبکہ ہم نواز سوچ کی اتھاہ گہرائیوں میں اتر چکا تھا۔

"آپ واپس جا رہے ہیں؟"

"یہ بستی تمہاری ہے بروج، میں تو مسافر تھا۔ چند دنوں کا مہمان واپس جانا میری مجبوری ہے۔"

"جانے والوں کو روکنا مشکل ہوتا ہے۔ مگر جانے والے لوٹ بھی آتے ہیں۔ کیا میں لوٹ آنے کی توقع رکھوں؟"

شانی کشمکش میں کھڑا ہوا تھا۔ بروج کبھی اسے دیکھتی اور کبھی دیکھ کر نگاہیں جھکا لیتی۔ شانی کے اندر الجھنوں کے جھکڑ چلنے لگے تھے۔

"ہر جانے والا لوٹ کر آیا نہیں کرتا بروج۔" شانی کے لہجے میں نہ چاہتے ہوئے بھی اداسی در آئی تھی۔ اس کی نگاہیں فضاؤں میں بھٹک رہی تھیں۔ بروج نے پلکوں کی چادر اٹھا کر اس کے خوبصورت اداس چہرے کو دیکھا۔ یہ کیسا اجنبی تھا جو بہت اپنا لگ رہا تھا۔ جس نے پچھلے دو دنوں سے اسے اضطراب کی نئی دنیا بخشی تھی۔ لذت بھری بے چینی اور خوشبوؤں بھری اداسی سونپی تھی۔

"جانے والا جب لوٹ آنے کا وعدہ کرتا ہے تو وعدے کی زنجیر اس کے پاؤں میں چھنکتی رہتی ہے اور وہ کبھی نہ کبھی اس چھنک کو محسوس کر کے واپس پلٹ آتا ہے۔"

"میں کوئی ایسا وعدہ نہیں کرتا بروج جو مجھ سے پورا نہ ہوسکے۔"

"وعدے اُمیدیں دلاتے ہیں شانی! اور اُمیدیں زندگی کو نئی حرارت بخشتی ہیں۔ آپ لوٹ کر آئیں نہ آئیں میرے ہاتھ میں وعدے کی ڈور تھما جائیں میں زندگی کی ٹوٹتی سانسوں کو اس سے حرارت دیتی رہوں گی۔"

وہ عجیب لمحات تھے جو جنہیں ایک دوسرے کو زندگی کی ڈور تھمانا چاہتے تھے مگر تھما نہیں پا رہے تھے۔ بروج نے کہتے ہوئے ہاتھ آگے بڑھا رکھا تھا۔ دونوں کا درمیانی فاصلہ تین میٹر کا تھا۔ بروج کا ہاتھ شانی کے سامنے ہوا میں معلق تھا۔

زندگی میں کوئی ایک لمحہ ایسا ضرور آتا ہے جب ہم فیصلے کی دہلیز پر رک جاتے ہیں جب فیصلہ کرتے ہیں تو بسا اوقات یہ فیصلہ ساری زندگی پر انتہائی گہرے اثرات مرتب کرتا ہے۔ وہ بھی لمحوں کی بات تھی شانی فیصلے کی دہلیز پہ جما کھڑا تھا۔ ہم نوا خاموش اور روشن نواز بے حد خوش تھا۔ چند لمحے خاموشی کی نذر ہوگئے۔ وقت ساکت تھا جیسے تھم گیا ہو۔ قریبی گھر سے کسی عورت کی ڈانٹ ڈپٹ جاری تھی۔ چند پرندے فضا میں پر مار رہے تھے۔ شانی کو کوئی ان دیکھی الجھن پیش قدمی سے روک رہی تھی۔ مگر وہ ہار گیا تھا۔ محبت جیت گئی تھی۔ اس نے خاموشی سے بروج کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا مگر کہا کچھ نہیں۔ شاید مزید کچھ کہنے کو تھا ہی نہیں۔ وہ بنا کچھ کہے راستے پر چل پڑا تھا۔ دو اداس آنکھیں اسے دیر تک پیچھے سے جاتا تکتی رہی تھیں۔

❁......❁......❁

ڈیوڈ اسی خیال میں اپنی مخصوص کرسی پر بیٹھا ہوا تھا۔ جس کرسی پر بیٹھ کر پہلی بار آٹھ ممالک کے نمائندوں کے سامنے نیو ورلڈ آرڈر کا منصوبہ پیش کیا تھا۔ ابتدائی چند میٹنگز میں کل ملا کر نو افراد شریک ہوئے تھے اور ہال میں دس کرسیاں رکھی گئی تھیں لیکن بعد میں دو کرسیوں کا اضافہ کر دیا تھا۔ کیونکہ ڈیوڈ نے انتہائی ہوشیاری سے اپنے خفیہ منصوبوں کی تکمیل کے لیے دو مسلم رہنماؤں کو ان میں شامل کر لیا تھا۔ مسلم رہنماؤں کے ساتھ ڈیوڈ نے اقتدار و اختیارات مختلف مراعات اور وسیع فوائد دینے کا وعدہ کیا تھا۔ نیو ورلڈ آرڈر میں شامل ہونے والے نام نہاد مسلم رہنما اپنی عاقبت نا اندیشی میں یہ جاننے سے قاصر تھے کہ ان کی حیثیت نیو ورلڈ آرڈر شامل حکومت میں فقط کٹھ پتلی کی ہوگی۔ ان رہنماؤں کے توسط سے اہم اسلامی ممالک میں مادہ پرست، ذاتی سہولیات زندگی، خوشحالی اور ذاتی مفادات کو ترجیح دینے والے اسلامی لیڈروں کو وہ مٹھی میں لے چکے تھے۔ ایسے لیڈر جوان کی تقلید کو باعث فخر سمجھتے تھے۔ وہ لیڈر فخر سے اپنے ممالک کو یورپ کے کسی ملک کے برابر کھڑا کر دینے کا دعویٰ کرتے تھے۔ ان کی ڈور نیو ورلڈ آرڈر کے آقاؤں کے ہاتھوں میں تھی۔ جنہوں نے

انہیں فکری ارتداد میں ڈبو دیا تھا۔ اب وہ اپنے اپنے ممالک میں بڑی جانفشانی سے فرقہ وارانہ فسادات، سماجی طبقات اور منفی انداز میں عوامی مسائل کو اجاگر کر رہے تھے۔ تمام اہم اسلامی ممالک میں اسلامی قانون کا تصور بالکل مٹا دیا گیا تھا اور وہ جمہوریت کو اعلیٰ وارفع نظام حکومت سمجھتے تھے اور عوام کے ذہنوں کو آئے روز پست کرنے میں سرگرم عمل تھے۔ وہ ہر سنجیدہ سوچ جو نیو ورلڈ آرڈر کے خلاف جاری تھی انہیں کچلنے کے لیے اپنا کردار احسن طریقے سے نبھا رہے تھے۔ لوگوں کی ذہنی قوتوں کو پراگندہ کیا جا رہا تھا اور بہت سے اسلامی ممالک کے مسائل فصاحت و بلاغت بیان بازی، اخباری کالموں اور ٹی وی ٹاک شو میں الجھ کر رہ گئے تھے۔ یہ مسائل ظاہری نمود و نمائش اور زبانی دعوؤں میں حل ہو رہے تھے۔ مگر حقیقت کا روپ دھارنے کا نام نہیں لیتے تھے۔

ڈیوڈ کے لیے سب سے بڑی کامیابی یہ تھی کہ یہ سب کچھ واحد اسلامی ایٹمی طاقت پاکستان میں بھی ہو رہا تھا۔

ڈیوڈ ہال میں بیٹھا ہوا اب تک کیے گئے اقدامات پر غور کر رہا تھا۔ جب اس نے ایک مثالی حکومت کا آئیڈیا پیش کیا تھا تب اس کے ہمنوا رفیقوں کی تعداد محدود تھی مگر بتدریج اس کے مطیع افراد کی لسٹ طویل تر ہوتی چلی گئی تھی۔ ڈیوڈ نے ان افراد سے مل کر ایسے پلان ترتیب دیے تھے کہ دنیا کی معیشت، وسائل ٹیکنالوجی اور توانائی کے تمام اہم ذرائع ان کی مٹھی میں چلے آئے تھے۔ ذہین ترین دماغ شب و روز جدید ترین آلات ایجاد کرنے میں مصروف تھے۔

وہ سپر مین، بے مثال آدمی، محیر العقول، مہارت کا ناقابل تسخیر آدمی بنانے میں کامیاب ہو چکے تھے۔ مگر اسے منظر عام پر لانے سے اجتناب کیا گیا تھا۔ فی الحال اس کا خفیہ رکھا جانا مقصود تھا۔ انہوں نے اپنی جدید لیبارٹریز میں ممتاز سائنسدان، ذہین انجینئر، ماہر معاشیات، بیرسٹر، کامیاب ترین سیاستدان اور اعلیٰ عسکری دماغ کو یکجا کیا ان کی یادداشتیں حاصل کی گئیں پھر انہیں کمپیوٹر میں ڈاؤن لوڈ کیا گیا اور پھر اسے ایک دماغ میں اپ لوڈ کر دیا گیا۔ اس طرح انہیں حسب منشا نتیجہ ملا تھا۔ وہ ایک مثالی آدمی بنانے میں کامیاب ہو چکے تھے۔ اس عمل میں نقصان دہ پہلو یہی تھا کہ جن افراد کی یادداشت لے کر کمپیوٹر میں ڈاؤن لوڈ کی گئی تھی وہ پہلے پاگل ہوئے اور بعد میں ابدی نیند سو گئے۔ اگر وہ از خود ابدی نیند نہیں سوئے تو انہیں زہر کا انجکشن لگا کر موت کے حوالے کر دیا گیا۔ چونکہ وہ اب نارمل انسان بن چکے تھے۔ اس طرح انہوں نے یکمشت کئی اہم ترین افراد کھو دیے تھے لیکن ڈیوڈ کے خیال میں اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا کیونکہ ان کی صلاحیتیں بہرحال محفوظ ہو چکی تھیں۔ اس اہم کامیابی کے ساتھ ساتھ وہ لوگ خلاؤں، سمندروں، چاند ستاروں اور تمام سیاروں میں اپنی طاقت کا سکہ جما چکے تھے۔ برموداٹرائی اینگل میں مقناطیسی لہروں پر بہت حد تک قابو پا چکے تھے۔ تاہم ڈیوڈ کو معلوم تھا کہ ان پر مزید عبور حاصل کرنا اب ضروری نہیں رہا اس لیے کہ ڈیوڈ بذات خود ان لہروں پر سو فیصد عبور رکھتا تھا۔ جس حد تک عبور دیا گیا تھا وہ نیو ورلڈ آرڈر کے ممالک کو خوش کرنے کے لیے حاصل کیا گیا تھا۔ ورنہ ڈیوڈ جانتا تھا وہ لہریں کیسی ہیں۔ ان میں غائب ہونے والے جہاز، طیارے اور انسان کہاں جاتے ہیں اور کیسے غائب ہوتے ہیں۔ سارن ششتریوں کا معاملہ بھی کچھ ایسا ہی تھا۔ مصنوعی بارش برسانا اور قدرتی بارش کو روکنا اب خوابوں اور خیالوں کی باتیں نہیں رہی تھیں۔

زمین کی نبض کو چھیڑنے کا پروگرام متواتر جاری تھا۔ زمین کا ٹمک مسلسل 7 سائیکل فی سیکنڈ سے بڑھ رہا تھا جس کا مطلب تھا کہ عنقریب وہ وقت کو تھام لینے میں کامیاب ہو جائیں گے۔

بین الاقوامی متحدہ ادارہ کا کمال فن مسلسل عروج پر تھا۔ یہ ادارے کی مسلسل کامیابی کی وجہ تھی کہ آج وہ اس پوزیشن میں آ کھڑے ہوئے تھے کہ جس ملک پر جب چاہیں حملہ آور ہو جائیں۔ کسی بھی معمولی جواز کے ساتھ وہ

اس ملک پر دھاوا بول کر قبضہ جما لیتے تھے۔ لاشوں کے ڈھیر لگا دینے کے باوجود حالات کو ایسا رخ دیا جاتا تھا کہ دنیا انہیں حق بجانب سمجھتی تھی۔ جن ممالک پر عسکری اثر و رسوخ نہیں چل سکتا تھا وہاں اقتصادی بحرانوں کے ذریعے ملکی نظام کو جامد کیا گیا تھا۔ معاشی بحران اور وسائل میں کمی لائی گئی تھی۔ ایسے ممالک کو قرضوں کے بوجھ تلے دبا کر غلام بنا لیا گیا ہے۔ جو ممالک قرضہ لینے یا ان کے رعب و دبدبہ میں آنے سے دور تھے وہاں اندرونی مداخلت کے ذریعے انتشار، بدنظمی پھیلا کر خانہ جنگی کی کیفیت پیدا کر دی گئی تھی۔ جس سے نیو ورلڈ آرڈر کو امید ہو چلی تھی کہ ایسے تمام ملک بھی بہت جلد سرنگوں ہو جائیں گے بہت جلد ان کے ہاتھوں میں کشکول ہوگا اور لبوں پہ فریاد ہوگی۔ وہ انہیں رو کر پکاریں گے قرضہ مانگیں گے اور ملک میں امن و امان بحال کرنے کے لیے ان کی خدمت حاصل کرنے کے لیے منتیں کریں گے۔

فرانس اور سوئٹزر لینڈ میں کائنات کی تخلیق کا راز جاننے کے لیے جو تجربہ شروع کیا گیا تھا وہ بھی تکمیل کے آخری مراحل میں تھا۔

ڈیوڈ نے ہال پر طائرانہ نظر ڈالی۔ گیارہ خالی کرسیاں پڑی ہوئی تھیں۔ دس کرسیاں میٹنگ میں بندوں سے پر ہو جاتی تھیں۔ مگر سامنے کی بڑی کرسی ہمیشہ خالی رہتی تھی۔ ڈیوڈ کو اس دن کا بے چینی سے انتظار تھا جس دن بڑی والی کرسی پر بیٹھا جانا تھا۔ ڈیوڈ کے نزدیک اب وہ دن دور نہیں تھا۔ کیونکہ جینان کے باغات ویران ہو رہے تھے۔ زغر کا چشمہ خشک ہو رہا تھا اور عرب لمبی لمبی بلند بلڈنگیں بنا رہے تھے۔ حالات کے پیش نظر ہی ڈیوڈ کچھ کر رہا تھا وہ سب کچھ آنے والے مسیحا، بے مثال، طاقتور اور دنیا پر حکومت کرنے والے ناقابل تسخیر لیڈر کی جھولی میں ڈال دینے کے لیے کر رہا تھا۔ آنے والا طاقتور لیڈر ڈیوڈ کا آخری ہتھیار تھا جو انہیں دنیا کا اصل حکمران بنائے گا۔ یہ دنیا ان کے تابع ہونا تھی۔ ڈیوڈ نے آنکھیں موند لیں اس کے دماغ میں مستقبل کی حکومت کا تصور چل رہا تھا۔ ایسی حکومت جسے کبھی زوال نہیں ہوگا۔ جس کو کوئی بڑی طاقت مات نہیں پائے گی۔ وہ سوچتا رہا اور نئے پلان ترتیب دیتا رہا۔



تھامس کا دماغ سائیں سائیں کر رہا تھا۔ وہ انتہائی بے چینی سے آفس میں ٹہل رہا تھا۔ اضطراری کیفیت میں بار بار ہونٹ کاٹ رہا تھا۔ کبھی ہتھیلی پر غصے سے مکا مار دیتا کبھی کرسی پر بیٹھ جاتا کبھی اٹھ کر پھر سے ٹہلنے لگتا تھا۔

پاکستان سے موصول شدہ رپورٹ نے اس کے دماغ کی چولیں ہلا دی تھیں۔ اس ناکامی کا اس نے کبھی تصور بھی نہیں کیا تھا۔ اسے فوراً جنرل میٹنگ میں طلب کر لیا گیا تھا اور اس واقعے کی باز پرس کی گئی تھی۔ کیونکہ اس مشن کی کمان براہ راست اس کے ہاتھ میں تھی۔ بات صرف بلیک واٹر کی نہیں تھی۔ بلکہ اس میں را اور موساد کے مشترکہ ایجنٹس بھی موجود تھے۔ آٹھ افراد میں سے گروپ کے پانچ افراد لقمہ اجل بن چکے تھے۔ ایک لڑکی غائب تھی۔ جمیم اور فوزی زندہ بچے تھے۔ تھامس کو اس ناکامی کے سبب میٹنگ میں اچھی خاصی سبکی کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ یہ معمولی واقعہ نہیں تھا۔ موساد، را اور بلیک واٹر کے مایہ ناز ایجنٹس جن کی ٹریننگ، تربیت اور تیاری میں لاکھوں کروڑوں ڈالرز خرچ ہوتے ہیں۔ جنہیں انتہائی مشکل ترین مراحل سے گزرنا پڑتا تھا اذیتیں، مصیبتیں اور کئی سنگلاخ راہوں سے گزر کر وہ عملی میدان میں قدم رکھتے ہیں۔ انہیں جان سے مار دینا کسی عام آدمی یا گروپ کا کام نہیں تھا۔

تھامس سے سخت الفاظ میں باز پرس کی گئی تھی۔ اس سارے معاملے میں کون سی ایسی کوتاہی سرزد ہوئی کہ انتہائی شاطر اور عیار ایجنٹس بے خبری میں مارے گئے تھے۔ جدید ترین اسلحہ ہونے کے باوجود انہیں استعمال کا موقع نہیں ملا تھا۔ تھامس نے اپنی شرمندگی کا ازالہ کرنے کے لیے ذہین و فہیم، چالاک عیار، سفاک اور ماہر ایجنٹ جان رائٹ کی پاکستان روانگی کی منظوری لے لی تھی۔ وہ جان کا بے چینی سے منتظر تھا۔ جان آدھے گھنٹے بعد آفس میں داخل ہوا۔

رسمی علیک سلیک کے بعد تھامس براہ راست موضوع پر آتے ہوئے بولا۔

"جان رائٹ! میں سخت ترین ذہنی انتشار کا شکار ہوں۔" تھامس نے کرسی کی طرف اشارہ کیا۔ جان رائٹ تھینک یو کہتا ہوا کرسی پر بیٹھ گیا۔

"میں نے آپ کو فائل بھجوائی تھی۔ تھامس کی پریشان نگاہیں جان پر مرکوز تھیں۔

"جی ہاں میں یہاں آنے سے پہلے فائل پڑھ چکا ہوں۔ رپورٹ انتہائی پریشان کن اور ناقابل یقین ہے۔"

"میرا دماغ سن ہو گیا ہے۔ جب مجھے اس واقعے کی مفصل رپورٹ ملی تھی۔" تھامس کے لہجے میں ہنوز پریشانی جھلک رہی تھی۔

"تھامس! ہمارے پانچ افراد موت کے منہ میں چلے گئے ہیں۔ لڑکی غائب ہے۔ اسلحہ اور کمپیوٹر فلاپی بھی موجود نہیں جبکہ اس کا محرک ایک بائیس تیئیس سالہ لڑکے شانی کو بتایا گیا ہے۔"

"ہاں...... رپورٹ ولیم نے تیار کی جو جوزف کے بعد اس مشن کا انچارج ہے۔ ولیم اور ڈوروتی چشم دید گواہ بھی ہیں کہ ان پر حملہ کرنے والا شانی اکیلا تھا۔"

"یہ بات حلق سے نہیں اتر رہی تھامس۔" جان رائٹ مطمئن ہوتا نظر نہیں آ رہا تھا۔ تھامس اس کے سخت گیر چہرے کو دیکھ رہا تھا۔ جوزف نے اپنی جسمانی تسکین کے لیے مقامی لڑکی نسرین کو اٹھایا۔ پیچھے سے اس کا بھائی شانی وہاں پہنچا اور تہلکہ مچا دیا ایسا تہلکہ جس میں بہترین ایجنٹس موت کے گھاٹ اتر گئے ہیں۔ تھامس! یہ سب کسی فلمی سٹوری کا کوئی سین لگتا ہے۔

"جان! یہ بات طے ہے کہ حملے کے وقت شانی تنہا تھا اور ہمارے آدمی بے خبری میں مارے گئے ہیں۔ کیونکہ جوزف اور بوتھم کئی عرصے سے کام کر رہے تھے دو ہزار فٹ بلندی پر ان کے علاوہ کسی بھی شخص کا پہنچنا ناممکن تھا۔"

پھر بھی شانی ان کے سر پر پہنچ گیا۔ جان رائٹ کے لہجے میں ہلکا سا طنز تھا۔

"وہ کیسے پہنچا اور اب کہاں ہے اس کا کھوج آپ کو لگانا ہے۔ تھامس اس کا طنز نظر انداز کر کے بولا۔ "شانی کے مرنے یا زندہ بچ جانے کی تصدیق نہیں ہوئی ہے۔"

"شانی گہری کھائی میں گر گیا تھا۔ ولیم اور ڈوروتی اس کے پیچھے گئے تھے۔ ان کی غیر موجودگی میں بے ہوش بیٹری جدید اسلحہ اور کمپیوٹر فلاپی غائب پائے گئے۔ اس کا صاف مطلب یہ ہوا کہ شانی کی نگرانی میں مزید بندے موجود تھے۔ جب میدان صاف ہوا تو وہ اپنا کام دکھا گئے۔"

"ہوں......" تھامس نے طویل ہنکارا بھرا۔ پریشانی میں وہ اب تک ان باتوں پر غور نہ کر سکا تھا۔ جان رائٹ نے اسے اب حالات کو نئے رخ سے دیکھنے پر مجبور کر دیا تھا۔

"شانی کے دوسرے ساتھیوں کی موجودگی صد فی صد ہو سکتی ہے جان۔ اس میں بس سوال یہی اٹھتا ہے کہ وہ شانی کی مدد کے لیے لڑائی میں شریک نہیں ہوئے۔ دوسری بات گنرہ کی موت پہاڑی کے اوپر دو ہزار فٹ بلندی پر واقع ہوئی تھی جبکہ اس کی لاش پہاڑی کی جڑ میں پائی گئی۔"

"تھامس ولیم اور ڈوروتی نے سنگین غلطی کی ہے۔ وہ دونوں اکٹھے شانی کے پیچھے چلے گئے حالانکہ شانی دو ہزار فٹ بلندی سے گرا تھا۔ یقیناً اس کی ہڈیاں سرمہ ہو گئی ہوں گی۔"

"جان یہ گتھی سلجھانے کے لیے آپ کو پاکستان جانا ہوگا۔"

"مجھے آرڈر مل چکے ہیں۔ تھامس اور میں بالکل تیار ہیں۔ کیا ویزے کے لیے مجھے پاسپورٹ بھجوانا ہوگا۔ پاکستان کے لیے ہمیں ویزے کی ضرورت نہیں جان۔ ہماری ایجنسی یہ کام کرے گی۔ آپ تیاری کریں اور شانی کو نظر انداز نہیں کرنا ہے۔ اس کی موت کی تصدیق ضروری ہے اور اگر خوش قسمتی سے زندہ بچ گیا ہے تو اس کا پکڑا جانا اس سے بھی ضروری ہے۔ اس کے توسط سے آپ بیٹری لوٹ کر لے جانے والے بندوں تک پہنچ سکتے ہیں۔"

"میں سمجھتا ہوں یہ میرا کام ہے۔ آپ بے فکر رہیے۔ مجھے وہ فائل چاہیے جس میں پاکستان کے مقامی

ٹرالیوں کی تفصیل موجود ہے۔ جو ہمارے لیے کام کر رہے ہیں۔"

"میں بھجوا دوں گا۔" تھامس نے بلا تامل کہا۔

"ولیم اور ڈورتھی کا موجودہ ٹھکانا کہاں ہے؟" جان رائٹ نے پوچھا۔

"بوم منسٹر عبدالبارق ان کا میزبان ہے۔" تھامس نے اسے مزید تفصیل سے آگاہ کیا۔

"او کے تھامس! چلتا ہوں اور آپ کو کو مزید ٹینشن لینے کی چنداں ضرورت نہیں۔"

"مجھے پتہ ہے جان۔ تم میری شرمندگی کا ازالہ کر دو گے۔" تھامس نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔ جان رائٹ اس سے پہلے کھڑا ہو چکا تھا۔

"سی یو تھامس۔" جان رائٹ نے مصافحہ کے لیے ہاتھ آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ تھامس نے گرمجوشی سے اس کا ہاتھ پکڑ کر ٹیک کیئر جان کہا تو جان رائٹ کمرے سے باہر نکل گیا۔ اس کے بعد تھامس ایک فائل پر جھک گیا جس پر سونے حروف سے پاکستان لکھا ہوا تھا۔



حمزہ، طلحہ اور اویس نے غیر معمولی کارکردگی دکھائی تھی۔ حمزہ نے کئی بروقت فیصلے کیے تھے۔ جو بہت عمدہ اور حسب حال فیصلے تھے۔ شانی کے کھائی میں گر جانے اور غیر ملکیوں کے پیچھے چلے جانے کے بعد حمزہ نے دس منٹ میں وہاں کے چپے چپے کا جائزہ لے لیا تھا۔ بکس کا ریموٹ اس کے ہاتھ میں تھا۔ عجلت میں نیچے جانے والوں نے اسے یونہی پھینک دیا تھا۔

"اویس! تم طلحہ کی خبر گیری کرو کہیں وہ نیچے جانے والوں سے ٹکرا نہ گیا ہو۔ احتیاط سے جانا۔ اویس مل جائے تو اسے لے کر اوپر آ جاؤ۔ بے ہوش لڑکی اور لڑکی کی لاش کو نیچے پہنچاؤ۔ میں یہاں کچھ کمپیوٹرز دیکھ چکا ہوں۔ شاید ان میں ہمارے مطلب کی انفارمیشن موجود ہو۔ ہری اپ۔" حمزہ کے انداز و اطوار میں انوکھا جذبہ جھلک رہا تھا۔ اویس بھی اسی جذبے سے لبالب بھرا ہوا تھا۔ او کے کہتے ہوئے نیچے چلا گیا تھا۔

حمزہ نے کمپیوٹر کا جائزہ لیا۔ اس کے خیال میں دو پرسنل کمپیوٹرز تھے جبکہ ایک سپر کمپیوٹر تھا۔ اس نے سپر کمپیوٹر سے فلاپی حاصل کی اور لیبارٹری کی تلاشی لینے لگا۔ لیبارٹری کی موجودہ حالت اس کے غیر استعمال ہونے کا پتہ دیتی تھی۔ تاہم کچھ آثار ایسے ضرور تھے جس سے اندازہ ہوتا تھا کہ اسے ماضی قریب میں خوب اچھی طرح استعمال کیا گیا ہے۔ لیبارٹری سے حمزہ نے چند شیشے کی چھوٹی بوتلیں اٹھائی تھیں۔ ان میں کیمیکل بھرا ہوا تھا۔ اس کے بعد تمام غاروں میں جا کر چھوٹے سائز کا جو بھی جدید اسلحہ تھا اسے قبضے میں کیا۔ اس دوران اویس اور طلحہ اوپر آ چکے تھے۔

"طلحہ! تم نے غیر ملکی مرد اور لڑکی کو نیچے دیکھا تھا؟" انہیں دیکھتے ہی حمزہ نے سوال پوچھا پھر فوراً گردن اویس کی طرف کرتے ہوئے بولا۔

"اویس! بکس پر نظر رکھنا۔"

"میں دیکھ رہا ہوں حمزہ۔"

"میں نے انہیں دیکھا تھا۔ تاہم چھیڑنے کی کوشش اس لیے نہیں کی کہ ان کے چہروں کی بدحواسی میرے دل کو تسلی دے رہی تھی کہ از کم تم دونوں خیریت سے ہو۔"

"گڈ میں بھی چاہتا تھا۔ انہیں چھیڑا نہ جائے۔ کیونکہ انہیں لوٹ کر واپس آنا ہے۔ ہمارے پاس وقت بہت کم ہے۔ وہ لوگ کسی بھی وقت آ سکتے ہیں۔" حمزہ نے تحسین آمیز نگاہ سے دیکھا۔

"تم ٹھیک کہتے ہو حمزہ! ہمیں جلدی کرنا ہوگی۔" طلحہ نے اس کی تائید میں کہا۔

"تم دونوں بے ہوش لڑکی اور مرنے والی لڑکی کو نیچے لے کر جاؤ۔ لاش کو پہاڑی کی جڑ میں رہنے دو اور بے ہوش لڑکی کو ساتھ لے جانا ہے۔ طلحہ تم لڑکی اور سامان لے کر تیسری بلڈنگ پہنچ کر سر جی کو اطلاع دو۔" سر جی امجد بخاری کا کوڈ نام تھا۔ امجد بخاری نے اپنے ہیڈ کوارٹر کو بلڈنگ کا نام دیا تھا۔ سیکنڈ ہیڈ کوارٹر کو دوسری بلڈنگ اور

تیسری بلڈنگ کے نام سے ایک بلڈنگ لی گئی تھی۔ جس کا بلڈنگ اور دوسری بلڈنگ سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ حمزہ نے وہاں سے حاصل شدہ سامان اور لڑکی کو اس لیے تیسری بلڈنگ لے جانے کا فیصلہ کیا تھا کہ کچھ سامان انتہائی جدید ٹیکنالوجی کا تھا۔ اس سے عین ممکن ہے وہ لوگ جگہ کا تعین کرلیں۔ اس لیے اسے بلڈنگ یا دوسری بلڈنگ سے دور رکھا جانا بہتر تھا۔ طلحہ کو ہدایت جاری کرنے کے بعد اولیس سے مخاطب ہوا۔

"تم نے فی الحال پیچھے رہ کر یہاں کی نگرانی کرنی ہے۔ وہ لوگ واپس آ کر یہاں کی یہ صورت حال دیکھ کر کسی دوسرے ٹھکانے کا رخ کریں گے تم نے اس کا تعاقب کرنا ہے اس طرح ہم ان کے ایک اور خفیہ ٹھکانے تک پہنچ سکتے ہیں۔"

"ٹھیک ہے حمزہ! اور تمہارا کیا ارادہ ہے؟"

"میں دریا کی طرف جاؤں گا۔ جس کھائی میں پاکستانی لڑکا گرا ہے۔ اس کے عین نیچے دریا ہے گو کہ اس بات کا امکان دس فیصد سے بھی کم ہے کہ انتہائی بلندی سے دریا میں گرنے کے باوجود بھی بچ جائے۔ مگر اللہ تعالیٰ چاہے تو یہ ناممکن نہیں۔ وہ لڑکا بہت ہی دلیر اور کمال کا لڑکا ہے۔ ہمارے لیے بہت سود مند ثابت ہوگا۔" حمزہ نے چند منٹوں میں سارا پروگرام ترتیب دیا تھا۔ طلحہ اور اولیس نے اس کی باتوں پر عمل کرنے میں کوئی کوتاہی یا تاخیر نہیں کی تھی۔

❀ ❀ ❀

جہاں لڑکا گرا تھا۔ وہاں دریا کا بہاؤ درازوا گاؤں کی طرف جاتا تھا۔ کھائی کے نیچے کا جائزہ لینے کے بعد حمزہ درازوا گاؤں تک پیدل چل کے گیا تھا۔ دریا کے ایک طرف پہاڑی سلسلہ تھا اور دوسری طرف مختلف دیہات تھے۔ پہاڑی سلسلے کے ساتھ ساتھ گھنے دراز جنگلات بھی کافی دور تک جاتے تھے۔ دیگر تمام دیہات دریا سے کافی ہٹ کر آباد تھے۔ تاہم درازوا گاؤں سے آگے مچھیروں کی کئی بستیاں دریا کے نزدیک آباد تھیں۔ لیکن اتنی جلدی دریا میں بہہ جانے والے شخص کے بارے میں کوئی معلومات ملنا بہت مشکل تھا۔ درازوا گاؤں تک کسی کو کچھ خبر نہیں تھی۔ کسی بھی شخص کو زندہ یا مردہ دریا سے نہیں نکالا گیا تھا۔ حمزہ کو ناکامی ہوئی تھی۔ وہ سر جی کے پاس دوسرے دن پہنچا تھا۔ سر جی نے اسے بلا تاخیر تفصیل بتانا شروع کر دی تھی۔

"جس لڑکی کو تم لوگ اٹھا لائے ہو اس کا نام ڈورتھی ہے اور یہ بلیک واٹر کی ایجنٹ ہے۔ بلیک واٹر، موساد اور را کے ایجنٹ مشترکہ مشن پر ہیں۔ یہ مشن کون سا ہے۔ فی الحال یہ پتہ چل نہیں سکا۔"

"سر جی! وہاں میں نے لیبارٹری کے آثار دیکھے ہیں۔ اپنی ساخت اور جسامت سے یہ ایک جدید لیبارٹری لگتی ہے کہیں ان کا کوئی سائنسی مشن تو نہیں؟ حمزہ تارپور کا علاقہ بہت بڑا ہے۔ اس کے گرد و نواح میں تقریباً ایک دوسرے میں گتھم گتھا دو سو دیہات ہیں۔ یہاں منرل واٹر کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا کیونکہ یہ تمام دیہات سلسلۂ کوہ سے آنے والے قدرتی پانی سے سیراب ہوتے تھے۔ جو پینے کے لیے ٹھنڈا اور میٹھا پانی تھا۔ مگر گزشتہ ایک سال میں افواہ پھیل گئی کہ پہاڑیوں کا پانی مضر صحت ہو چکا ہے۔ مجھے پہلے سے شک تھا کہ یہ اس غیر ملکی گروپ کی کارستانی ہے۔ تم نے جو محلول کی بوتلیں لائی ہیں وہ مضر صحت کیمیکل ہے۔ یقیناً یہ کیمیکل اس لیبارٹری میں تیار ہوا اور پھر اسے پانی میں ملا دیا گیا ہے۔"

"اوکے تو سر جی! اس قدر مربوط پلاننگ محض پانی کی فروخت کے لیے ہے۔"

"یہ بات محض منرل واٹر کی فروخت تک محدود نہیں۔ اس کے انتہائی گہرے مقاصد ہیں۔ اس پر پھر بھی بات کریں گے۔ فی الحال بس یہ سوچنا ہے کہ لیبارٹری کا کام ختم ہو چکا ہے۔ اس کے لیے بلائے گئے سائنسدانوں کا جو بھی گروپ تھا یقیناً واپس ہو چکا ہے۔ موجودہ گروپ کیونکر سرگرم ہے اس بات کا پتہ چلنا ضروری ہے۔"

"سر جی! انشاء اللہ پتہ چل جائے گا اور ہم انہیں تہس نہس کر دیں گے۔"

"انشاءاللہ حمزہ! اللہ تعالیٰ ہماری مدد فرمائے۔"

"سر جی! میں اویس کو نگرانی کے لیے چھوڑ گیا تھا اور اسے ہدایت کی تھی کہ سر جی کو براہ راست رپورٹ دینا۔ میں وہی بتانے جا رہا تھا۔"

"حمزہ! سر جی نے کہنا شروع کیا۔ اویس ڈیوٹی پر ڈٹا رہا۔ تمہارے اندازے کے مطابق وہ غیر ملکی مرد اور لڑکی واپس لوٹے تھے اور توقع کے عین مطابق بدلے ہوئے حالات دیکھ کر وہاں سے ضروری اشیاء اٹھا کر نکل گئے تھے۔ اویس نے ان کا تعاقب کیا ضرور تھا لیکن دیہاتوں میں رش نہ ہونے کے سبب سے جلد ٹریپ کر لیا گیا تھا۔ شہر آتے ہی وہ لوگ اسے ڈاج دے کر غائب ہو گئے تھے۔"

"اوہ نو! یہ بری خبر ہے۔ اس کا مطلب ہے سر جی ہم فی الحال اندھیرے میں جا چکے ہیں۔"

"ایسی بات نہیں ہے۔ سپر کمپیوٹر سے ہی کچھ ڈیٹا ملا ہے۔ جس کے اشارے ایم این اے فاروق بلوچ تک جاتے ہیں۔"

"ایم این اے فاروق بلوچ؟" حمزہ نے انتہائی حیرت سے دہرایا۔

"ہاں حمزہ! ایم این اے جیسے پاکستانی عوام نے اپنا مسیحا سمجھ کر ووٹ دیے اسے اسمبلی تک پہنچایا اور وہ....." سر جی نے انتہائی دکھ بھرے لہجے میں کہتے ہوئے فقرہ ادھورا چھوڑ دیا۔ شاید یہ بات ان کی برداشت سے باہر تھی۔

"میں انتہائی حیران ہوں سر جی! یہ کیسے لیڈر ہیں ہمارے؟"

"حیران ہونے کی ضرورت نہیں حمزہ! ایسی کالی بھیڑیں ملیں گی۔ جو ذاتی مفادات، عیش و عشرت اور بینک بیلنس کے لیے ملک کو داؤ پر لگائے ہوئے ہیں۔"

"لعنت ہے سر جی! ایسی دولت، عیش و عشرت پر جس کی بنیاد غداری پر رکھی گئی ہو۔ دعا کریں سر جی! ایسے لوگ میرے سامنے آجائیں۔ خدا قسم ان کی بوٹی بوٹی کر کے انہیں ایسا نشان عبرت بناؤں جسے دیکھ کر ان کی آنے والی نسلیں بھی پاکستان سے غداری کا تصور نہ کر سکیں۔" حمزہ کے چہرے پر غصہ چنگاریاں بن کر اڑ رہا تھا۔ اس کے لہجے میں شدید ترین نفرت تھی۔ سر جی نے اس کے جذبہ حب الوطنی کو دل ہی دل میں سراہا۔

"حمزہ! اس ملک میں اگر ایم این اے فاروق بلوچ جیسے غدار بستے ہیں تو اس ملک کا اثاثہ حمزہ جیسے نوجوان بھی موجود ہیں۔" سر جی نے آگے بڑھ کر محبت سے اس کی پیٹھ تھپتھپاتے ہوئے کہا۔

"سر جی! میں نے مقامی لڑکی کی لاش اس خیال سے پہاڑی کی جڑ میں ڈال دی تھی کہ نثار پور کا کوئی بندہ اسے دیکھ کر تھانے یا اس کے گھر اطلاع کر دے۔"

"حمزہ! تمہارا یہ فیصلہ بھی بروقت اور بالکل درست تھا لیکن نثار پور کے لوگ وہاں نہیں جاتے۔ انہیں بھری پنچایت میں ڈرا دیا گیا تھا۔ اس لیے میں نے شاہ میل کو بھجوا کر یہ کام کروا دیا ہے۔"

"سر جی! ڈورتھی اب کہاں ہے؟"

"اسے میں نے تیسری بلڈنگ میں رکھ دیا ہے۔ تین لڑکے نگرانی پر مامور کر دیے ہیں۔ تم چاہو تو اسے کل مل سکتے ہو تاکہ ہمیں مزید معلومات حاصل ہو سکیں۔"

"میں اس سے ضرور ملوں گا اور انشاءاللہ مزید کامیابی ملے گی۔"

امجد بخاری کی نظر میں یہ ان کے لیے بہت بڑی کامیابی تھی۔ وہ اس سے بہت آگے تک جا سکتے تھے۔ مگر یہ چوتھے دن کی بات تھی جب وہ حمزہ، شہریار اور شاہ میل کے ساتھ بیٹھے میٹنگ کر رہے تھے۔ فون کی گھنٹی نے ان کی میٹنگ میں خلل ڈالا تھا۔ سر جی نے ریسیور اٹھاتے ہوئے کہا۔

"یس پلیز! امجد بخاری بات کر رہا ہوں۔"

دوسری طرف سے جو کچھ کہا گیا تھا اسے سن کر سر جی کے چہرے پر پریشانی در آئی تھی۔ تفصیل سنتے وقت حمزہ، شہریار اور شاہ میل سر جی کے چہرے کے اتار چڑھاؤ محسوس کر رہے تھے۔ انہوں نے ایک دوسرے کی

طرف پریشان نظروں سے دیکھا۔ پانچ منٹ کی کال نے سرجی کو انتہائی پریشان کر دیا تھا۔

"خیریت تو ہے سرجی؟" ان کے ریسیور رکھتے ہی شہریار نے پوچھا۔ چند ثانیے توقف کے بعد سرجی نے غمزدہ لہجے میں بتایا۔

"تیسری بلڈنگ پر حملہ ہوا ہے۔ حملہ آور دوتھی کو چھڑا کر لے گئے ہیں۔" یہ خبر ان سب کے لیے غیر متوقع تھی۔ مگر دوسری خبر نے انہیں ذہنی طور پر مفلوج کر دیا۔

"ادریس شہید ہو چکا ہے۔ ہمدل اور عبداللہ شدید زخمی ہیں۔" سرجی کی اداسی برقرار تھی۔

"انا للہ و انا الیہ راجعون۔" حمزہ نے آسمان کی طرف چہرہ اٹھا کر کہا۔ اس کی آنکھیں بند تھیں۔ بند آنکھوں سے آنسوؤں کے قطرے مسلسل بہہ رہے تھے۔ ان کے گروپ کی پہلی شہادت ادریس کے مقدر میں لکھی تھی۔

❁ ❁ ❁

کنزہ کی ناگہانی موت پر صبر کا پتھر رکھ لینا بیگم کلثوم اور اس کے بچوں کے لیے بہت مشکل تھا۔ اوپر سے شانی کی پریشانی وہ دوہرے عذاب اور امتحان کا شکار تھے۔ ان کے گرد تاریکی کے سائے دراز ہوتے جا رہے تھے۔ اسد محمود خان کی وفات کے بعد مقدر کی بگاڑ نے ان کا در دیکھ لیا تھا۔ گزرنے والا ہر لمحہ پریشانی اور غم سونپ رہا تھا۔

مقدر کی دوسری کارستانی سے وہ بے خبر تھے۔ حمزہ کی خفیہ نگرانی مسلسل جاری تھی۔ نگرانی کے بارے میں شانی کو علم تھا۔ گوریا بستی سے لوٹنا شانی کے لیے بہت گراں گزرا تھا۔ اداسی کا ایک ہالہ تھا جو اس کے گرد لپٹ گیا تھا۔ دو جھیل جیسی گہری آنکھیں اس کے اندر تک اتر گئی تھیں۔ کلیوں کی طرح مہکتا اور چمکتا چہرہ آنکھوں کے پردوں میں رچ بس گیا تھا۔

نگرانی الحال اسے جانا تھا۔ گوریا بستی سے نکلتے ہی اس نے ہم نواز کو بلوا لیا تھا۔ جس نے آکر اطلاع دے دی تھی کہ نگرانی تاحال جاری ہے۔

"ہم نواز کچھ بھی ہو۔ مجھے گھر جانا ہے۔ ممی کے سینے میں جذب کنزہ کا غم ہلکا کرنا ہے۔ حمزہ کو باہوں میں لے کر اس کا درد بانٹنا ہے۔"

"شانی! تمہیں جانا چاہیے۔" روشن نواز نے فوراً اس کی تائید کر دی تھی۔

"میں خود بھی محسوس کر رہا ہوں۔ اس موقع پر تمہیں ممی اور کنزہ کے پاس ہونا چاہیے۔ ان کا غم بانٹنا چاہیے اور انہیں تسلی دینا چاہیے کیونکہ وہ صرف کنزہ کی موت کو نہیں رو رہی ہوں گی۔ شانی! تمہارے غم نے بھی انہیں ہلکان کر رکھا ہوگا۔ میں نہیں چاہتا کہ تم کسی بھی طرح نگرانی کرنے والوں کے ہتھے چڑھ جاؤ۔" ہم نواز نے روشن نواز کی باتوں کو یکسر مسترد کر دیا تھا۔ نگرانی میں پولیس اہلکار بھی ہیں لیکن وہ بندے یا تو کسی حساس ادارے سے تعلق رکھتے ہیں یا پھر کوئی پرائیویٹ گروپ ہے۔ وہ بھی مسلسل نگرانی پر مامور ہیں۔"

"اتنا کچھ ہو جانے کے بعد یہ قیاس بعید از امکان نہیں تھا۔ مجھے تو شروع سے ہی نگرانی ہو رہی تھی۔ مگر میں ان کے خوف سے مزید نہیں چھپ سکتا۔ پہلے کی بات اور تھی اب میری بہن کی موت ہوئی ہے۔ مجھے ہر صورت گھر جانا ہے۔ تم میری مدد کرو۔"

"کوئی بھی جذباتی قدم اٹھانے سے پہلے سوچ لو شانی۔"

"جانے دو ہم نواز۔ شانی ٹھیک کہتا ہے۔ ممی اور حمزہ کو شانی کی ضرورت ہے۔ یاران کا شانی کے سوا کون ہے جو انہیں سینے سے لگا کر درد کا بوجھ ہلکا کرے۔ اذان اور کامران شادیاں کر کے اور بچے پیدا کر کے یوں گھر سے بے فکر ہو چکے ہیں جیسے اب یہ ان کی ذمہ داری میں شامل نہیں۔" روشن اور شانی کے ساتھ کھڑا تھا۔ ہم نواز اس بار خاموش ہو گیا تھا۔

"ہم نواز! کیا تم نگرانی کرنے والوں کو کسی بھی طرح الجھا نہیں سکتے؟"

"میں چاہتا ہوں میرے گھر کے نگران کسی معاملے میں وقتی طور پر الجھ جائیں۔ ان کی توجہ بٹے اور میں عقبی راستے سے اندر داخل ہو جاؤں۔"

"نہیں شانی! میں ایسا نہیں کر سکتا۔ تمہیں کوئی طریقہ بتا سکتا ہوں مگر از خود انہیں کسی معاملے میں الجھا نہیں سکتا۔"

"تو پھر یہ رسک مجھے لینا ہی ہوگا۔" شانی کے لہجے میں قطعیت تھی۔

"ہم نواز! تم طریقہ کار کی بات کر رہے تھے۔"

"شانی! تم حلیہ بدل کر مین گیٹ سے اندر جاؤ۔ ان کی توجہ مین گیٹ سے زیادہ عقبی راستے اور دائیں بائیں کی گلیوں پر مرکوز ہے۔ شاید انہیں تمہارے سیدھے راستے آنے کی توقع نہیں ہے۔"

"بات معقول ہے۔" شانی نے سوچتے ہوئے کہا۔

ہم نواز کا آئیڈیا قابل عمل تھا، مگر مسئلہ حلیہ بدلنے کا تھا۔ اپنے ایک مزارع نذیر کے گھر چلا گیا۔ نذیر کی پگڑی، ڈھیلے ڈھالے پرانے کپڑے، پاؤں میں پھٹی چپل اور زمین پر کام کرنے والے ہاتھوں میں اٹھائے گئے اوزار وہ مکمل مزارع کا روپ دھار چکا تھا۔ مزارع نذیر اسے حیرت سے دیکھتا رہا تھا۔ شانی اسے مطمئن کر کے گھر کی طرف چل پڑا۔

"ہم نواز! تم مجھے کور کرنا۔ پہرہ داروں کی ہلکی سی بھی غیر معمولی حرکت نوٹ کرنا۔"

"ٹھیک ہے شانی! تم بے فکر رہو۔"

شانی کی چال بھی اجڈ دیہاتیوں جیسی تھی۔ اس نے پگڑی کا ایک پلو دانستہ چہرے کے سامنے گرا رکھا تھا۔ جس سے چہرہ بہت حد تک چھپ گیا تھا۔ اس کی خوش قسمتی تھی کہ مین دروازہ کی ذیلی کھڑکی کھلی تھی۔ ورنہ جو بھی باہر آتا شانی کے لیے مشکل بنتی۔ وہ بلا تامل گھر میں داخل ہو گیا۔

"ارے کون ہے کہاں منہ اٹھائے جا رہے ہو؟" وہ ابھی پورچ میں داخل ہوا تھا۔ کہ مالی کی عقب سے آواز سنائی دی۔

"غالب چچا! میں ہوں شانی۔"

"شانی بابو!" مالی کے قدم تھم گئے۔ وہ پریشان نظروں سے شانی کو سر تا پاؤں دیکھے جا رہا تھا۔

"آپ فوراً دروازے پر جاؤ اور کسی کو بھی اندر آنے مت دینا۔" شانی کے لہجے میں اس بلا کی تیزی اور تحکم تھا کہ مالی مزید کچھ بولے بغیر مین گیٹ کی طرف بڑھ گیا۔

ڈرائنگ روم میں ممی اور منزہ دونوں موجود تھیں۔ اس کی آواز سن کر دونوں صوفے سے یوں اچھل کر کھڑی ہوئیں جیسے صوفے میں بم پھٹ گیا ہو۔

"شانی..." دونوں کے منہ سے بیک وقت حیرت سے نکلا۔ شانی بھاگ کر ماں سے لپٹ گیا تھا۔

یہ دوسرا موقع تھا۔ وقت نے انہیں اس قدر بے چینی اور شدت کے ساتھ ملایا تھا۔ گھر کی سوگوار فضا میں خوشی نے ہلکی سی انگڑائی لی تھی۔ چند دن پہلے اس گھر میں کنزہ کی لاش پڑی ہوئی تھی۔ گھر میں آہیں سسکیاں اور رونے کی دل دہلا دینے والی آوازیں گونج رہی تھیں مگر اس وقت غم کا بوجھ صرف بیگم کلثوم اور منزہ اٹھائے ہوئی تھیں۔ شانی کے لوٹنے سے خوشی کی جو ہلکی سی کرن پھوٹی تھی اس کا دورانیہ بہت مختصر ثابت ہوا۔ اس کی جگہ غم کی ہچکیاں بلند ہونے لگی تھیں۔

"شانی بیٹا... ! کنزہ میری بچی دنیا میں نہیں رہی۔" بیگم کلثوم کی زبان ان کا ساتھ نہیں دے رہی تھی۔ منزہ کے آنسوؤں کی جھڑی بھی رواں تھی۔ شانی ساکت و جامد تھا۔

"ممی! کنزہ میری بہن شہید ہوئی ہے۔ بہن نے بھائی کی خاطر موت کو گلے لگایا ہے۔"

"شانی! تم کیا کہہ رہے ہو تم......؟ کنزہ کی موت کے بارے میں جانتے ہو۔"

"ممی! کنزہ نے میرے ان ہاتھوں میں جان دی۔" شانی نے دونوں ہاتھ اپنے سامنے پھیلاتے ہوئے کہا۔

"م... میں کچھ نہیں سمجھی شانی۔" بیگم کلثوم حیرانی سے شانی کے سپاٹ چہرے کو دیکھے جا رہی تھیں۔ منزہ بھی ناقابل فہم نظریں شانی پر پیوست کیے ہوئی تھی۔

"ممی! کنزہ کے سینے میں اترنے والی گولی کنزہ کے لیے نہیں میرے لیے تھی۔ میری بہادر بہن نے

مجھے بچا کر خود موت کو گلے لگا لیا ہے۔" جواباً شالی نے ساری روداد سنائی۔ جسے سن کر بیگم کلثوم کھڑی ہوتے ہوئے بولیں۔

"شالی بیٹا! میرے ساتھ آؤ۔ تم بھی آؤ منزہ۔" ان کا رخ بیڈ روم کی طرف تھا۔

بیڈ روم میں جاتے ہی وہ کسی چیز کو کھوجنے لگیں۔ شالی اور منزہ ممی کو دیکھ رہے تھے۔

"ممی! آپ کیا تلاش کر رہی ہیں؟"

"منزہ! تمہارے ڈیڈی کی پرسنل ڈائری تھی۔ ڈائری نہیں مل رہی بیٹا۔" بیگم کلثوم کے لہجے میں پریشانی تھی۔

"ممی! ڈیڈی کی ایک ڈائری مجھے اسٹڈی سے ملی تھی وہ میں ساتھ لے گیا تھا۔ جو پہاڑیوں میں گر گئی ہے۔" شالی کی بات سن کر بیگم کلثوم کے متحرک ہاتھ تھم گئے۔ وہ گھوم کر شالی سے بولیں۔

"بیٹا! تم نے ڈائری پڑھی تھی؟"

"اپنی گمشدگی کے بارے میں پڑھا تھا۔ اس کے سوا کچھ نہیں۔" بیگم کلثوم چل کر ان کے پاس بیٹھ گئی تھیں۔

"بیٹا! تمہارے ڈیڈی کی خواہش تھی کہ ہمارے بیٹوں میں سے کوئی ایک فوج میں جا کر وطن عزیز کی خدمت کرے لیکن کامران اور اذان دونوں بزنس کو ترجیح دیتے تھے۔ بحالت مجبوری انہیں خاموش ہونا پڑا۔ ورنہ وہ فوج کو جاب کی نظر سے نہیں دیکھتے تھے۔ قومی فریضہ سمجھتے تھے۔ یہ خواہش حسرت بن کر ان کے ساتھ چلی گئی....." بیگم کلثوم چند ثانیے کے لیے رک گئیں۔ انہوں نے اداس نظروں سے بچوں کو دیکھا اور پھر بولیں۔

"حالات کچھ ایسے رونما ہوئے کہ ہمیں کامران اور اذان کی اکٹھی شادیاں کرنا پڑیں۔ بعد کے حالات اس سے بھی زیادہ سرعت سے بدلے اور ہمارے بیٹے بیویوں کو لے کر کینیڈا چلے گئے۔ ایسے میں تمہارے ڈیڈی نے کہا تھا۔ میں شالی کو مجبور نہیں کروں گا۔ شالی بھی اپنے مستقبل کی راہ خود منتخب کر سکتا ہے۔"

"کاش ممی! آج ڈیڈی زندہ ہوتے۔ ہمارے دکھوں کا مداوا کر سکتے۔" شالی کی تھرتھراتی آواز کمرے کی سوگواری میں مزید اضافہ کر گئی تھی۔ منزہ بار بار نم آنکھیں صاف کر رہی تھی۔ بیگم کلثوم شالی کے پاس گئیں۔

"شالی! کھڑے ہو جاؤ بیٹا۔" ماں کے حکم کی تعمیل میں شالی کھڑا ہوا تھا۔

"مجھے لگتا ہے بیٹا تمہارے ڈیڈی کی ادھوری خواہش پوری ہونے والی ہے۔"

"وہ کیسے ممی؟"

"مقدر کی نسوں کا ریاں اپنا اثر پھوڑ رہی ہیں۔ ہمیں انہیں قسمت کا لکھا جان کر برداشت کرنا ہوگا اور مجھے ایک اہم قدم اٹھانا ہے۔" شالی اور منزہ کی سوالیہ نگاہیں ممی پر مرکوز تھیں۔

"شالی بیٹا! تمہیں وطن عزیز کی خدمت کرنا ہوگی۔ مرحوم باپ کی خواہش کو پورا کرنا ہوگا۔ شہید بہن کی روح کو خوش کرنا ہوگا۔"

"میں کیسے ممی....؟"

"اس ملک سے تمام سازشی ٹولے کو مٹا دو ان تمام سازشی عناصر کا قلع قمع کر دو۔ جنہوں نے پاکستان کو بلوچی، سندھی، پنجابی، پٹھان اور مہاجر میں بانٹ رکھا ہے۔ جنہوں نے فرقہ واریت کو ہوا دے کر ذاتی مقاصد کے محل تعمیر کیے ہیں۔ جنہوں نے ملک کو دونوں ہاتھوں سے لوٹا ہے۔ عوام کو لوٹا ہے۔ بیٹا! جس غیر ملکی گروپ کی گولی میری بہادر بیٹی نے سینے پر کھائی ہے تم انہیں نیست و نابود کر دو۔"

"میں سلام پیش کرتا ہوں آپ کی عظمت کو ممی! آپ عظیم ماں ہو۔ جو شوہر کی موت کا غم دل سے لگائے بیٹھی ہے۔ جواں بیٹی کی موت کا صدمہ ابھی تازہ ہے۔ دو بیٹے اس سے دور اپنی دنیا میں مگن ہیں اور پھر بھی آپ مجھے وطن پر قربان ہونے کے لیے بخوشی روانہ کر رہی ہیں۔ ممی میں وعدہ کرتا ہوں میں پاکستان سے تمام دشمنان وطن کو مٹا دوں گا۔ انہیں نشان عبرت بنا دوں گا۔"

بیگم کلثوم نے شالی کو آگے بڑھ کر سینے سے لگا لیا۔

"اللہ تعالیٰ تمہاری رکھوالی کرے بیٹا۔" ماں نے محبت سے بیٹے کے شانے تھپتھپائے۔ منزہ نم آنکھوں سے یہ منظر دیکھے جا رہی تھی۔ بیڈ روم میں عجیب قسم کی فضا ہلکورے لے رہی تھی۔

"شانی! صورت حال بگڑ گئی ہے۔ نگرانی کرنے والے دیوار پھلانگ کر اندر داخل ہو رہے ہیں۔" فوراً ہم نواز نے آکر اطلاع دی۔

"ممی! ہم پر حملہ ہو چکا ہے۔ آپ لوگ بیڈ روم کا دروازہ اندر سے لاک کر دیں۔" شانی نے باہر کی جانب دوڑ لگاتے ہوئے انہیں خبردار کیا۔

"شانی بیٹا! کس نے حملہ کیا ہے۔" عقب سے اسے ممی نے زور سے پکارا تھا مگر یہ وقت کچھ سننے یا سوچنے کا نہیں بلکہ عمل کرنے کا تھا۔ شانی پھرتی سے باہر نکل آیا تھا۔

"ہم نواز! بندے کس طرف ہیں؟"

"وہ پچھلی دیوار پھلانگ کر داخل ہوئے ہیں اور دو مین گیٹ سے مالی کو دھکیلتے ہوئے۔" ہم نواز ابھی تفصیل بتا رہا تھا کہ باہر سے فائرنگ کی آواز گونج اٹھی۔ تھوڑا دھیان دینے پر شانی کو اندازہ ہوا۔ دو گروپوں میں فائرنگ کا تبادلہ ہوا ہے۔ ہم نواز نے اس کے خیال کی تائید کر دی تھی۔ گھر میں داخل ہونے والے چار بندوں پر پولیس نے فائرنگ کھول دی تھی۔ جوابی وہ بھی فائرنگ کر رہے تھے۔ شانی اس موقع سے فائدہ اٹھا سکتا تھا۔ اس وقت کھڑکی سے نگاہ باہر کا جائزہ لے رہا تھا۔ وہ تنہا تھا عجلت میں بیڈروم سے ریوالور لانا بھی بھول گیا تھا۔ وہ فوراً بیڈروم کی طرف بھاگا۔

"ممی! مجھے ڈیڈی کا ریوالور چاہیے۔" بیڈروم کے دروازے پر پہنچ کر اس نے تیز آواز میں کہا۔ دروازہ فوراً کھل گیا تھا۔

"شانی! سامنے دراز میں ہوگا۔" بیگم کلثوم نے ایک طرف اشارے سے بتایا۔

"ممی! میرے لیے دعا کیجیے گا۔ میں ان شاء اللہ ڈیڈی کی خواہش ضرور پوری کروں گا۔" شانی کہتے ہوئے ریوالور میں گولیاں لوڈ کر رہا تھا۔

"اللہ تمہارا حامی و ناصر ہو بیٹا۔" بیگم کلثوم کا چہرہ سپاٹ تھا۔ انہوں نے ایک بار پھر شانی کے شانوں پر تھپکی دی۔ اس عمل نے شانی کے جذبات کو ہمت بخشی تھی۔ وہ لمحوں میں باہر نکل گیا تھا۔ بیگم کلثوم کے چہرے پر اب غم یا اداسی کی بجائے اطمینان بھری لہر تھی۔ منزہ حیرت سے ممی کو دیکھ رہی تھی۔ ایک سوال اسے الجھا رہا تھا۔ شانی کو حملے کا بیٹھے بٹھائے کیسے پتہ چل گیا تھا؟



"یہ مشن اتنا اہم ہے جان! جس کے لیے آپ کو بطور خاص بھیجا گیا ہے۔"

"ایک بات ہمیشہ یاد رکھنا ولیم! چھوٹے سے چھوٹے دشمن کو بھی کمزور مت سمجھو اور کمزور ترین کام کو آسان سمجھ کر سست روی سے مت کرو ورنہ شکست تمہارا مقدر بنے گی۔"

"میرا مقصد کچھ اور تھا جان! پاکستان اتنا اہم ملک ہے جسے ہم نے ٹاپ آف دی لسٹ رکھا ہوا ہے۔" ولیم نے اپنے سوال کو دوسرا رخ دے دیا تھا۔

"میں نے محسوس کیا ہے پاکستان پر ہمارے بڑے زیادہ توجہ مرکوز کیے ہوئے ہیں۔ نسبت دوسرے اسلامی ممالک کے۔" جان رائٹ نے ولیم کو دیکھا پھر ڈرائنگ روم میں بیٹھے مقامی شخص حیدر عباس پر اچٹتی نظر ڈالی۔ اسے ولیم کا سوال حیدر عباس کی موجودگی میں اچھا نہیں لگا تھا۔ حیدر عباس ان کا وفادار ساتھی تھا۔ وہ اور اس کا گروپ ان کے اشاروں پر ناچتا تھا مگر جان کسی کی بھی ایسے نازک پر بلا تکلف گفتگو پسند نہیں کرتا تھا۔ جو مشن کے اہم رموز کو ہٹ کرتا ہو۔

"مستقبل قریب میں تم خود اس اہمیت کی اہمیت کو دیکھ لوگے۔ پاکستان کردار اسلامی دنیا میں تم پر عیاں نہیں ہوا جب ہو جائے گا تمہیں خود بخود اندازہ ہو جائے گا۔" جان نے واضح الفاظ کی بجائے مبہم انداز میں جواب دیا تھا۔

بات کو مزید آگے بڑھاتے ہوئے وہ حیدر عباس سے مخاطب ہوا۔

"حیدر عباس! تم ہمارے سچے خیر خواہ ہو۔ میں تم پر یقین کر سکتا ہوں؟" جان کا انداز سوالیہ تھا۔ حیدر عباس کو جان کی منطق سمجھ نہیں آئی تھی۔ ایک طرف وہ اسے سچا خیر خواہ کہہ رہا تھا اور دوسری طرف اعتبار کا پوچھ رہا تھا۔ حیدر عباس نے اندرونی کیفیت کو چھپاتے ہوئے کہا۔

"جان! میں نے متعدد بار تھامس کے لیے کئی اہم کارنامے سرانجام دیے ہیں۔ ان میں تازہ ترین ہیلری کی رہائی ہے۔"

"جان! حیدر عباس نے ہیلری کو چھڑانے میں بہت پھرتی دکھائی تھی۔" ولیم نے حیدر عباس کو تعریفی نظروں سے دیکھا۔

"جب میں اور ڈورتھی نے پہاڑیوں کے بدلے حالات دیکھے تو ہمیں پتہ چل گیا تھا کہ یقیناً اس کی نگرانی بھی ہو رہی ہوگی اس لیے ہمیں وہاں سے نکلتے ہی اپنے تعاقب کا پتہ چل گیا تھا۔ تعاقب کرنے والا نوجوان شاید نو آموز تھا۔ ہم چاہتے تو اس پر با آسانی قابو پا سکتے تھے مگر میں نے فیصلہ کیا کہ اسے ڈاج دے کر اس کا تعاقب کیا جائے تا کہ ہیلری کے بارے میں کچھ پتہ چل سکے۔ ہم نے اسے ڈاج دیا اور پھر اسی کا تعاقب شروع کر دیا۔ وہ سیدھا وہاں پہنچا جہاں ہیلری کو قید رکھا گیا تھا۔ ہم نے فوراً حیدر عباس کو ساری صورت حال سے آگاہ کیا اور اس نے فوراً سے پہلے وہاں حملہ کر دیا۔ بدقسمتی سے وہاں سے ہمارے ہاتھ کوئی ایسا ثبوت نہیں آیا جس سے ہم اندازہ کر سکتے کہ یہ کون لوگ تھے۔ وہاں کوئی شخص زندہ بھی نہ بچ سکا۔ حیدر عباس اور کرم دین کا بطور خاص تھامس نے مجھے بتایا تھا۔" جان رائٹ نے تفصیل سننے کے بعد کہا۔

"میں ان لوگوں کی فائلیں پڑھ چکا ہوں۔ مجھے اُمید ہے حیدر عباس کے ساتھ کام کرتے ہوئے تم اپنی پوری صلاحیتوں کے جوہر دکھاؤ گے۔"

"جان! میں آپ کی توقعات سے بڑھ کر ثابت ہوں گا۔ میرا گروپ اپنے کام میں مشاق ہے۔ بس مجھے کسی اہم مشن کا انتظار ہے۔"

"گڈ حیدر عباس! میں ایسے ہی لوگوں کو پسند کرتا ہوں۔ میری ڈکشنری میں سست روی اور کاہلی کے لفظ نہیں ہیں۔ میں باتوں اور دعوؤں پر عمل کو ترجیح دیتا ہوں۔ حکمت عملی بناؤ اور فوراً عمل کر گزرو۔ ظاہری نمود و نمائش کی لمبی چوڑی میٹنگ کو میں اچھا نظریہ نہیں مانتا۔"

"ہمیں آپ کے بارے میں سب کچھ پتہ ہے جان! آپ میدان کے کھلاڑی ہیں اور میدان میں ہی کچھ ہوتا ہوا دیکھنا پسند کرتے ہیں۔ آپ ہمیں حکم کریں ہم آپ کے نظریات کو عملی جامہ پہنائیں گے۔"

"شانی! ہمیں شدید دھوکا پہنچا چکا ہے۔ اپنی غلطی کی پاداش میں ہمارے مخالف حریفوں کی لسٹ میں شامل ہے۔ اس لیے مجھے اپنے مشن پر توجہ مرکوز کرنی ہے۔ مگر شانی کو بھی قرار واقعی سزا دینی ہے۔ شانی کہاں ہے زندہ یا مردہ ہے ابھی تک تم لوگوں کو نہیں پتہ؟"

"نہیں جان! وہ دو ہزار فٹ بلند گہری کھائی میں گرا تھا اور یقیناً مر چکا ہوگا..." جان نے ہیلری کی بات کاٹ دی تھی۔ اس کے انداز میں غصہ تھا۔

"قیاس آرائی سے کام نہیں بنتے ہیں۔ شانی زندہ یا مردہ۔ مجھے صد فیصد درست تصدیق چاہیے۔"

"مجھے شانی عام نوجوان نہیں لگتا جان! اس کے ہاتھوں ہمارے مایہ ناز بندے موت کے منہ میں چلے گئے ہیں۔ ہمیں اسے نظر انداز نہیں کرنا چاہیے۔" ولیم نے کہا۔

"دنیا معجزات کا مجموعہ ہے۔ اس امر کا امکان بہرحال موجود ہے کہ شانی زندہ بچ گیا ہو۔ کیونکہ وہ میں دیکھا کے اوپر گرا تھا۔ شانی کے گھر میں کتنے افراد ہیں؟"

"شانی کی بہن منزہ، ممی بیگم کلثوم کے علاوہ تین ملازم ہیں۔ بڑے بھائی ان سے الگ کوئٹہ شہر میں رہتے ہیں۔"

"شانی کی ممی اور بہن کو اٹھا لاؤ۔ شانی زندہ ہوا تو سامنے آجائے گا۔ اس کے گھر کی نگرانی کے لیے دو تین شاطر بندے چھوڑ دو۔ جیسے ہی بل کی تھیلے سے باہر آنے کی سوچ لو۔"

"گھر کی نگرانی تو میں آل ریڈی کروا رہا ہوں۔ اب اس کی فیملی کو اٹھا لیتا ہوں۔" حیدر عباس نے اطلاع دی۔

"حیدر عباس! اب تم جا سکتے ہو۔ تمہارا رابطہ ولیم سے ہی رہے گا۔"

"ٹھیک ہے جان!" حیدر عباس کھڑا ہو چکا تھا۔ اس کا قد جونسن کو چھو رہا تھا۔ شانے چوڑے اور آنکھوں میں عیاری تھی۔ اس نے سب سے ہاتھ ملایا اور بائی کہتا ہوا باہر نکل گیا۔ جان اور ولیم اردو بول سکتے تھے بلیک واٹر کے اسٹر ایجنٹ دنیا کی بہت سی اہم زبانوں پر عبور رکھتے تھے۔

"ولیم! حیدر عباس کی نگرانی پر کرسچان کو لگا دو۔" حیدر عباس کے نکلتے ہی جان نے ولیم سے کہا۔

"اوکے جان! ویسے ایک بات کہوں؟"

"بولو......"

"حیدر عباس ہمارا قابل اعتماد ساتھی ہے فرقہ وارانہ وارداتوں میں اس کا کردار لاثانی ہے۔"

"میں جانتا ہوں ولیم! پھر بھی جو کہا ہے اس پر عمل کرو۔" جان نے تحکمانہ لہجے میں کہا۔

"ولیم! جتنے بھی مقامی گروپ ہیں ان کی نگرانی تم ہی کرو گے۔ میرا کسی سے براہ راست رابطہ نہیں رہے گا۔"

"ٹھیک ہے جان! میں سمجھتا ہوں۔"

"اوکے اب میں چلتا ہوں۔" جان خاموشی سے وہاں سے نکل کر ہوم منسٹر عبدالباری کے پاس پہنچا۔ وہ اپنے مشن کی جلد تکمیل چاہتا تھا۔

❁......❁......❁

وقفے وقفے سے فائرنگ جاری تھی۔ شانی کھڑکی سے لگا باہر جھانک رہا تھا۔ وہ کسی آدمی کو دیکھ نہیں پایا تھا۔ وہاں سے ہٹ کر وہ سامنے چلا آیا۔ کمرے کی کھڑکی سے پورچ اور مین گیٹ نظر آ رہا تھا۔ تھوڑا سا آگے نکل کر لان میں دیکھا جا سکتا تھا۔ فائرنگ کی آواز لان کی طرف سے آ رہی تھی۔ شانی نے سر باہر نکال کر دیکھا ایک شخص درخت کے عقب میں چھپا فائرنگ کر رہا تھا۔ اس کا رخ بیرونی طرف تھا۔ شانی کو وہ ایک رخ سے دکھائی دے رہا تھا۔ شکل و صورت سے مقامی شخص لگتا تھا۔

"ہم نواز! باہر سے کون فائرنگ کر رہا ہے۔" شانی کو کچھ اندازہ نہ ہوا تو اس نے ہم نواز سے مدد چاہی۔ ہم نواز نے اسے بتایا۔

"شانی باہر پولیس کے اہلکار ہیں۔ اندر والوں کو وہ تمہارے آدمی سمجھ رہے ہیں۔ اپنی دانست میں وہ شانی کے گروپ سے لڑ رہے ہیں۔ اب تک اندر کے دو، باہر ایک پولیس مین ہلاک ہو چکا ہے۔"

"اوہ! میرے لیے یہ صورت حال بہت خراب ہے۔ اندر کے آدمی مارے بھی جائیں تو انہیں میرے کھاتے میں ڈال دیا جائے گا۔ یعنی میرا گروپ جس نے پولیس اہلکار پر فائرنگ کی اور ایک پولیس والے کو مار دیا گیا ہے۔"

"شانی بظاہر ایسا ہی لگتا ہے۔"

"مجھے اب کیا کرنا چاہیے ہم نواز؟ میں خود کو حالات کے حصار میں کسا ہوا محسوس کرتا ہوں۔"

"ممی اور منزہ کو ساتھ لے کر نکلنا بہتر رہے گا۔ تم نہ گرفتار ہونے سے بچتے ہو نہ انہیں گھر میں تنہا چھوڑ سکتے ہو۔"

"تمہارے دو دشمن ہیں۔ نوید گروپ اور پولیس۔" ہم نواز ٹھیک کہہ رہا تھا۔ ممی اور منزہ کو بھی یہاں سے نکالنا ہوگا۔ باہر سے فائرنگ میں تیزی آگئی تھی۔ شاید فیصلہ کن معرکہ شروع ہو چکا تھا۔ شانی تذبذب میں تھا وہ کس کا ساتھ دے۔ پولیس کا یا سول گروپ کا جس نے اس کے گھر پر چڑھائی کی تھی۔ اس کے بعد ہوا سے کوئی کوئی خارج نہیں ہوئی تھی۔ باہر سے فائرنگ بند ہو گئی تھی۔ ہم نواز نے اسے بتایا۔

"اندر کے سارے آدمی مارے جا چکے ہیں۔ تین پولیس والے بھی خالق حقیقی سے جا ملے ہیں۔ صرف ایک بچا ہے۔" شانی بھاگ کر اندر داخل ہوا۔

"ممی، منزہ جلدی کریں ہمیں گھر سے نکلنا ہوگا۔"

"شانی! تم ٹھیک تو ہو ناں؟"

"ممی میں ٹھیک ہوں۔ آپ لوگ جلدی کیجیے پلیز۔" وہ انہیں گاڑی تک لے آیا۔ ملازم ایک کمرے میں خوفزدہ حالت میں دبک کر بیٹھے تھے۔ اتنا وقت نہیں تھا کہ انہیں کچھ بتایا جاتا۔ ممی اور منزہ اس کی چیروکی میں گاڑی کے

اندر بیٹھ چکی تھی۔

"ہم نواز مجھے کوئٹہ جانا ہے۔ راستوں کو چیک کرتے رہنا۔"

"فکر مت کرو شانی میں نظر رکھے ہوئے ہوں۔ تم چلتے جاؤ۔"

"شانی! یہ کون لوگ ہو سکتے ہیں؟"

"ممی! میرا شک ہے غیر ملکی گروپ کو مقامی لوگوں کی مدد حاصل ہے۔ کیونکہ ان کے بغیر غیر ملکیوں کا قدم جمانا ممکن نہیں۔ ہمارے گھر حملہ کرنے والے وہی غدار ہو سکتے ہیں۔ اچھا ہوا نہیں واصل ہو گئے ہیں۔"

"تب ہم کہاں جا رہے ہیں؟" منزہ کے لہجے میں پریشانی تھی۔ تاہم ابتداء کا خوف کم ہو چکا تھا۔ وہ کافی حد تک سنبھل گئی تھی۔

"میں آپ لوگوں کو اذان بھائی کے گھر چھوڑ دیتا ہوں۔"

"اور تم شانی؟"

"میری زندگی کا ایک مقصد بن چکا ہے۔ مجھے اپنے مقصد کے حصول کے لیے نکلنا ہے۔" شانی کہتے کہتے خاموش ہو گیا تھا۔ ہم نواز نے اسے عجیب خبر سنائی تھی۔ یہ انتہائی غیر متوقع اور افسوسناک خبر تھی۔ شانی کا دل اداسیوں کی اتھاہ گہرائیوں میں گر چکا تھا۔ اس کے گھر کو بم دھماکوں میں اڑا دیا گیا تھا۔ اس کا آبائی گھر منہدم ہو چکا تھا۔ خوش قسمتی سے وہ نکل آئے تھے ورنہ گھر کے ملبے تلے دبے ہوئے ہوتے۔ یہ افسوسناک خبر وہ ممی اور منزہ کو فی الحال نہیں بتا سکتا تھا۔

ہم نواز کہہ رہا تھا ہم اتنا طاقتور تھا کہ گھر خس و خاشاک کی طرح اڑ کر پرزے پرزے ہو چکا ہے۔ قریبی گھروں کو بھی نقصان پہنچا ہے۔ شانی کا دل مسوس ہو کر رہ گیا تھا۔ وہ چہرے کے تاثرات پوشیدہ نہ کر سکا تھا۔ ممی اسے بغور دیکھ رہی تھی۔

"شانی! تم ایک دم بہت رنجیدہ ہو گئے ہو۔"

"نہیں ممی ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ ہاں البتہ یہ پریشانی ضرور ہے کہ میں آپ لوگوں کو گھر سے نکال لایا ہوں۔"

"شانی بیٹا! اس بات کی فکر کرنا چھوڑ دو۔ ہم ایک گھر سے نکلے ہیں تو دوسرے گھر جا رہے ہیں۔ کامران اور اذان کے گھر میرے اپنے گھر ہیں بیٹا۔" بیگم کلثوم نے کہنے کو شانی کی تسلی کے لیے کہہ دیا تھا۔ مگر وہ جانتی تھیں ایسا نہیں ہے یہ بس مصلحت کا تقاضا ہے۔ وہ اسد محمود خان کی ہلاکت اور شانی کی غیر موجودگی میں بیگم کلثوم شدت سے گھر میں مرد کی کمی محسوس کرتی تھی۔ اس کمی کو پورا کرنے کے لیے وہ کامران یا اذان کو روکنا چاہتی تھی مگر اسے مایوسی ہوئی۔ اب بھی اس کے دل میں کئی بدترین خدشات جنم لے رہے تھے۔ مگر جانا مجبوری تھی۔ شانی نے جہاں ٹیکسی ملنے کا امکان تھا گاڑی چھوڑ دی تھی۔ اذان کے گھر تک اس نے تین ٹیکسیاں بدلی تھیں۔ اذان نے حال ہی میں یہ نیا گھر لیا تھا۔ اسی لیے شانی کو امید تھی کہ اسے ڈھونڈنے والے اتنی جلدی یہاں تک نہیں پہنچ پائیں گے۔ مگر اذان کو جب اصل صورت حال کا علم ہوا تو وہ بیٹا بائیں بغلیں جھانکنے لگا۔ اس کے رویے اور باتوں سے عیاں تھا کہ وہ ممی اور منزہ کو اپنے گھر رکھ کر اپنی بیوی بچوں کے لیے مشکلات نہیں خرید سکتا۔ شانی اسے انتہائی تاسف بھری نگاہوں سے دیکھ رہا تھا اسے اذان کا رویہ بہت گراں گزر رہا تھا۔

"اذان بھائی! یہ ماں ہے ہماری اور یہ بہن ہے۔ آپ انہیں گھر رکھنے سے کیوں خوفزدہ ہیں؟"

"میں ان سے نہیں آنے والے حالات سے خوفزدہ ہوں۔ میں بہت پرسکون زندگی گزار رہا ہوں۔ میں اپنی ہنستی بستی زندگی میں کوئی طوفان آتا نہیں دیکھ سکتا۔"

"چاہے یہ طوفان آپ کی ماں اور بہن کو اپنی لپیٹ میں لے لے۔" شانی نے انتہائی طنزیہ لہجے میں کہا۔ اذان نے اسے سخت نظروں سے گھورا۔

"یہ طوفان میں نے نہیں تم نے پیدا کیا ہے۔"

"اذان بھائی! یہ حالات تھے جنہوں نے یہ مصائب

کھڑے کر دیے ہیں آپ پلیز حالات کو سمجھو۔"

"میں سمجھ رہا ہوں۔ اپنے کیے کا سارا بوجھ تم ہم پر تھوپ کر خود نکل رہے ہو۔"

"کیا مطلب اذان بھائی! اماں بہن بوجھ ہوتی ہیں کیا؟" شانی کو زبردست شاک لگا تھا۔ بیگم کلثوم کو اس رویے کا پہلے سے خدشہ تھا۔ اذان کی بات پر شانی کے اندر غصے کی لہر دوڑ گئی تھی۔ اگر اذان اس سے چھوٹا ہوتا تو وہ تھپڑ مارنے سے دریغ نہ کرتا۔ اس نے بڑی مشکل سے ضبط کا دامن تھام رکھا تھا۔ بیگم کلثوم اور منزہ خاموش ہو گئی تھیں۔ اذان کی باتوں نے انہیں مایوس کیا تھا۔ اذان کی بیوی منہ بسورے صوفے پر خاموشی سے بت بنی بیٹھی تھی۔ اس کے لب خاموش تھے مگر چہرہ اور آنکھیں اندرونی جذبات کا اظہار کر رہی تھیں۔ وہ شانی کو متنفر نگاہوں سے دیکھ رہی تھی۔

"اذان بھائی میں چھپنے کے لیے کہیں نہیں بھاگ رہا۔ میں سب ٹھیک کر دوں گا۔ میں اس طوفان کا منہ موڑ دوں گا جس نے ہمارے گھر کا رخ کیا ہے۔"

"طوفان کا منہ موڑ دوں گا۔" اذان نے طنزیہ انداز میں اس کی بات دہرائی۔ "گھر کا اتنا ہی خیال تھا تو پہلے سوچ لیتا۔ ایسے حالات پیدا ہی کیوں کیے کہ گھر چھوڑ کر بھاگنا پڑا۔"

"حالات میں نے نہیں مقدر نے پیدا کیے ہیں۔"

"اپنے کیے کا الزام مقدر کو مت دو۔"

"اذان بھائی! یہ فضول بحث ہے۔ آپ ممی اور منزہ کو اپنے ساتھ رکھتے ہیں یا نہیں؟" شانی چاہتے ہوئے بھی لہجے کی تلخی کو روک نہ سکا تھا۔

"شانی بیٹا! اذان ٹھیک کہہ رہا ہے۔ ہمارا یہاں ٹھہرنا اس کی فیملی کے لیے خطرے کا باعث بنے گا۔ جو میں نہیں چاہتی۔"

"ممی..." اذان فوراً اٹھ کر ممی کے پاس چلا آیا تھا۔ "ممی! آپ پلیز میری مجبوری سمجھیں...... میں......"

"اذان بھائی! منانے کی ضرورت نہیں ہے۔" شانی نے تمام آداب کو بالائے طاق رکھتے ہوئے کہا۔

"آپ کو ممی اور منزہ کو ایک ہفتے کے لیے اپنے پاس رکھنا ہوگا۔"

"شانی! تم کس لہجے اور انداز میں بات کر رہے ہو۔"

"جو آپ سن اور دیکھ رہے ہو۔"

"یہ بات ہے تو جاؤ میں کسی کی ذمہ داری نہیں لیتا۔ جو تم نے گل کھلائے ہیں اس کی سزا بھی تمہی کو ملنی چاہیے۔ انہیں اپنے ساتھ لے جاؤ۔"

اذان کی ہٹ دھرمی شانی کے ضبط توڑ گئی۔ اس نے جنون میں سے ریوالور نکال لیا۔

"اذان بھائی! جی تو چاہتا ہے اس کی تمام گولیاں آپ کے سینے میں اتار دوں۔ جس ہٹ دھرمی سے آپ سگی ماں اور بہن کو دھتکار رہے ہو۔" شانی کا جنون دیکھ کر اذان کانپ کر رہ گیا تھا۔ اس کی بیوی کے چھکے چھوٹ گئے تھے۔ جن آنکھوں میں شانی کے لیے نفرت نظر آ رہی تھی وہاں خوف اور دہشت نے جگہ بنا لی تھی۔

"شانی! خود کو سنبھالو بیٹا، تمہارا بڑا بھائی ہے۔" بیگم کلثوم عجیب صورت حال میں گرفتار تھیں۔ منزہ کے پاس آنسو بہانے کے سوا کچھ نہیں تھا۔

"شانی! تم اس کے علاوہ کر بھی کیا سکتے ہو۔ تم جیسے شخص سے یہی امید کی جا سکتی ہے۔ جو طوائفوں کے کوٹھے پر ہنگامہ آرائی کرے۔ طوائف کو فارم ہاؤس میں لا کر نچائے ایسے اوباش اور عیاش بھائی سے اچھے کی امید نہیں رکھی جا سکتی۔"

"بس اذان بس۔" شانی حلق کے بل چیخا۔ بیگم کلثوم کنفرم ہو چکی تھیں۔ وہ سمجھ گئی تھیں حالات خطرناک صورتحال اختیار کر رہے ہیں۔ شانی انتہائی جذباتی تھا اور اذان اسے مسلسل غصہ دلا رہا تھا۔ ایسے میں کچھ بھی ہو سکتا تھا۔ وہ شانی کو بازو سے پکڑ کر بولیں۔

"آؤ شانی چلیں۔ ہمیں اذان کی پرسکون زندگی میں بھونچال لانے کا کوئی حق نہیں ہے۔ میں اس کی خوشیوں میں پریشانیوں کو نہیں دھکیل سکتی۔ میں ماں ہوں جو بچوں

کو کچھ نہیں دیتی بلکہ ان کے دکھ سمیٹتی ہوں۔"

"ممی! پلیز آپ مجھے معاف کر دیں میں" اذان کے چہرے پر الجھن اور بے بسی کے گہرے تاثرات تھے۔

"میں ابھی تم سے ناراض نہیں ہوں اذان بیٹا۔ میں نے تمہیں معاف کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ بھی تمہیں معاف کرے۔"

شانی ممی اور منزہ کے ساتھ باہر نکل آیا تھا۔ اس کے اندر پچھتاووں کے تیز ترین جھکڑ چلنے لگے تھے۔ اس کی غیر معمولی غلطیوں کی وجہ سے ماں اور بہن در در کی ٹھوکریں کھانے پر مجبور ہوگئی تھی۔ شانی کے اندر شرمندگی اور پچھتاوے کا آتش فشاں پھٹ گیا تھا۔

"شانی! میں نے تمہیں کیا کہا تھا؟ میری باتیں یاد ہیں۔" دفعتاً اس کی سماعت سے عاصم نواز کی آواز سنائی دی۔ وہ بری طرح چونک پڑا۔ عاصم نواز جسے اس نے اپنے ہاتھوں سے مار دیا تھا۔ جس پر پاؤں رکھ کر سر کچل دیا تھا۔ وہ اس کے سامنے کھڑا اسے اپنی باتیں یاد کروا رہا تھا۔ وہ باتیں جو تب شانی کو گراں لگتی تھیں۔ فضول اور لایعنی محسوس ہوتی تھیں۔ اب وہ بہت قیمتی اور بامقصد ہوگئی تھیں۔ انہیں نہ مان کر شانی نے بہت بڑی غلطی کی تھی۔ شانی کا بے رونق چہرہ انتہائی سخت اور سپاٹ نظر آرہا تھا۔ اس کے اندر دل پر آب نمکین گر رہا تھا۔ اس نے بچوں کی طرح روتے ہوئے عاصم نواز کے قدموں میں سر رکھ دیا۔

"مجھے...... مجھے معاف کر دو عاصم نواز۔ میں تمہارا ہی نہیں گھر والوں کا بھی مجرم ہوں۔" شانی کی آنکھیں مسلسل آنسو بہا رہی تھیں۔

"شانی! تم مرد ہو اور مرد روتے ہوئے اچھے نہیں لگتے۔ بیٹا تم نے ابھی بہت کچھ کرنا ہے۔" شانی ممی کی آواز پر چونک گیا۔ چند لمحے وہ بھول گیا تھا کہ وہ کہاں ہے۔ ممی اس کے سامنے کھڑی تھیں۔ شانی نے آستین سے فوراً آنسو صاف کیے۔ ممی کہہ رہی تھیں۔

"شانی! انسان ایک ایسی گٹھری ہے جس میں برائی نیکی، بدی سب بندھی پڑی ہے۔ اگر گٹھری کو کھول کر دیکھا جائے تو غلطیوں کی تعداد زیادہ ہوگی کیونکہ انسان غلطی کی پیداوار ہے۔ بیٹا غلطی ہو جانا اتنی بری بات نہیں اس پر شرمندہ نہ ہونا بہت بری بات ہے۔ کیونکہ بیٹا شرمندگی ازالہ کی پہلی سیڑھی ہے۔ تم بھی پہلی سیڑھی پر قدم جمانے کھڑے ہو۔ اپنے مشن کو پورا کرو ساری غلطیوں کا ازالہ ہو جائے گا۔"

"ممی! انشاء اللہ ایسا ہی ہوگا۔" شانی نے پرعزم لہجے میں جواب دیا۔

"آپ اور منزہ کو کامران بھائی کے پاس......"

"نہیں بیٹا! ہمیں وہاں نہیں جانا۔ بلکہ مجھے اپنے بھائی کے گھر جانا ہے۔" وہ باتیں کرتے ہوئے مین روڈ تک نکل آئے تھے۔ دو گاڑیاں اچانک برق رفتاری سے آکر ان کے سامنے رک گئیں۔ ان میں سے چار نقاب پوش باہر آئے اور آناً فاناً انہیں گن پوائنٹ پر دھکیلتے ہوئے گاڑیوں میں ٹھونس دیا۔ واقعہ اتنی تیزی اور ہوشیاری سے ہوا تھا کہ شانی کو مدافعت کا موقع نہیں مل سکا تھا۔ اسے الگ گاڑی میں رکھا گیا تھا۔ ممی اور منزہ کو لے جانے والی دوسری گاڑی تھی۔ شانی نے کچھ دیر مزاحمت کرنے کی کوشش کی تھی۔ مگر ریوالور کا دستہ اس کی کنپٹی پر اتنے زور سے پڑا تھا کہ وہ ہوش و حواس کی دنیا سے بے گانہ ہو چکا تھا۔

❁......❁......❁

ڈیوڈ تیز قدموں سے اندر داخل ہوا۔ ہال میں اس کے استقبال کے لیے تین اشخاص کھڑے تھے۔ سب سے پہلے اسرائیل کا مایہ ناز سائنسدان، جدید ریسرچ لیبارٹری کا انچارج ہاورڈ تھا جس نے آگے بڑھ کر ڈیوڈ سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا۔

"آیئے مسٹر ڈیوڈ! ہم آپ کو اپنی عظیم تجربہ گاہ میں خوش آمدید کہتے ہیں۔"

الٹے بانس

اسرار احمد

ایک چالاک اور شاطر قاتل کا احوال' اس نے اپنی بیوی کے قتل کا ایک صاف ستھرا اور بے داغ منصوبہ بنایا اور اس پر عمل درآمد بھی کرلیا' اس کے پاس واردات سے دوری کا ثبوت اور گواہ بھی تھا لیکن وہ پھر بھی قتل کے الزام میں گرفتار ہوگیا۔

جیسا کہ میں نے عرض کیا' کبھی کبھی حالات بڑے عجیب وغریب انداز میں پیش آتے ہیں۔ آپ کوئی شے تلاش کرتے ہیں اور وہ آپ کو نہیں ملتی پھر یکایک آپ کی نظر اس پر پڑتی ہے اور آپ چیخ پڑتے ہیں۔ ''وہ رہی۔'' کبھی آپ اپنے دوستوں کے ساتھ ان کی بیویوں کے رویے پر افسوس کا اظہار کرتے ہیں۔ ...اور پھر آپ خود کسی پیاری سی لڑکی سے شادی کر لیتے ہیں۔ شروع شروع میں آپ اس کی ہر بات کے جواب میں کہتے ہیں۔ ''ہاں جان..... نہیں جان ... جیسا تم کہو جان...... وغیرہ وغیرہ۔ لیکن پھر محبت کی گرمی کم ہونے لگتی ہے اور آپ انہی دوستوں کی صف میں کھڑے ہوجاتے ہیں اور وہ دوسرے دوست آپ کے حال پر ہمدردی کا اظہار کرنے لگتے ہیں۔

جیسا کہ میں نے عرض کیا..... کبھی کبھی حالات بڑے عجیب اور ناقابل یقین ہوتے ہیں جیسے کہ پچھلے اکتوبر میں میرے ساتھ پیش آیا۔ میں بذریعہ ٹرین لندن جارہا تھا کہ ایک شخص میرا ہم سفر بن گیا اور ہم دونوں نے اس طرح گفتگو چھیڑ دی گویا نہ جانے کتنے پرانے دوست ہوں۔ کتنی عجیب بات ہے' ایک شخص جسے آپ نے پہلے کبھی دیکھا تک نہیں وہ اتفاقیہ ملاقات پر آپ سے اس طرح گھل مل جاتا ہے' گویا شناسائی نہ جانے کتنی پرانی ہو حالانکہ آپ اس سے اس کا نام تک پوچھنے کی زحمت بھی نہیں کرتے لیکن میں نے یہ زحمت کی تھی۔ اس کا نام کرسٹوفر جونز تھا۔ ایک عام سا نام...... اور وہ ایک عام سا ہی آدمی تھا۔

کتنی حیرت کی بات ہے کہ میں اس رات اسی کے بارے میں سوچ رہا تھا اور حیران ہو رہا تھا' کیا ہم دوبارہ بھی مل سکیں گے؟ اور ساتھ ہی یہ بھی سوچ رہا تھا کہ آج این کے بغیر یہ گھر کتنا سونا سونا سا لگ رہا ہے...... کہ..... اچانک ہی دروازے کی اطلاعی گھنٹی بج اٹھی' میں نے اسے زیادہ اہمیت نہیں دی اور اک شان استغنا سے بڑھ کر دروازہ کھول دیا۔

سامنے دو افراد کھڑے تھے۔ دونوں خوب کیم شحیم تھے۔ ان میں سے ایک نسبتاً قوی ہیکل تھا۔ اس نے مجھے مخاطب کیا۔ ''کیا تمہارا نام آرتھر اسٹر یکر ہے؟''

''ہاں ...'' میں نے اس سے اتفاق کیا اور انہیں اندر آنے کی دعوت دی۔

وہی قوی ہیکل دوبارہ مخاطب ہوا۔ ''میرا نام سارجنٹ ڈان ہے اور یہ سارجنٹ اسمتھ ہے۔ ہم اسکاٹ لینڈ یارڈ سے تعلق رکھتے ہیں۔''

میں اس کی تردید کرنے کا حوصلہ نہیں رکھتا تھا لہٰذا سر کو اثبات میں جنبش دے کر رہ گیا۔

"میں تم پر یہ واضح کر دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ ہم تمہاری بیوی کی موت کے سلسلے میں تفتیش کرنے آئے ہیں۔ مقامی پولیس اس کیس کی تحقیقات کر رہی ہے۔" وہ خاموش ہو گیا اور کافی دیر تک خاموش رہا پھر اپنے پھیپھڑوں میں ڈھیر ساری ہوا بھر لینے کے بعد گویا ہوا۔ "ہم دراصل کرسٹوفر جونز کی موت کے سلسلے میں آئے ہیں۔" اس نے انکشاف کیا۔

"موت...؟" میں حیرت سے گنگ ہو گیا۔

"قتل۔" اس نے تصحیح کی اور قدرے سفاکی سے بولا۔ "جس رات تمہاری بیوی کا انتقال ہوا تھا اس رات تم نے لندن کا سفر اختیار کیا تھا تو اسی ٹرین اور اسی اپارٹمنٹ میں سفر کیا تھا جس میں کرسٹوفر سفر کر رہا تھا۔ اس بات کا تم پہلے ہی اعتراف کر چکے ہو۔"

ان سے بحث کرنے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔

وہ مجھے اپنے ساتھ لندن لے گئے۔ تمام وقت میں یہی سوچتا رہا کہ یہ ناممکن ہے لیکن یہ ناممکن نہیں تھا کیونکہ حقیقت میرے سامنے تھی۔ تفتیش کا ایک نہ ختم ہونے والا سلسلہ چل نکلا۔

سب سے پہلے شناخت پریڈ ہوئی۔ ایک گھبرائی گھبرائی سی عورت لائی گئی جسے میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ میں نے دیکھا کہ وہ مجھے دیکھ کر اثبات میں سر ہلا رہی تھی۔ اس کے بعد ایک اور عورت حاضر کی گئی۔ میں نے اس کی طرف دیکھا تھا تو وہ میری طرف غور سے دیکھنے لگی تھی۔ اس وقت وہ ہمارے اسٹیشن پر بوفے ٹرالی دھکیل رہی تھی۔ مجھے پہچانتے ہی اس کے ہونٹ بھینچ گئے پھر اس نے بھی اثبات میں سر ہلا دیا۔ اس کے بعد ٹکٹ کلکٹر آیا اس نے مجھے اتنی افسردہ نگاہوں سے دیکھا گویا میں کوئی ایسی بوڑھی سی غریب عورت ہوں جس کے پاس ٹکٹ نہ ہو اور جس کا دنیا میں کوئی دوست، کوئی ہمدرد اور کوئی غم گسار نہ ہو پھر اس نے بھی بڑی اداسی اور بڑی ہی سوگواری کے ساتھ دھیرے سے اپنا

وحدانیت

لوگوں کی اکثر یہ رائے ہے کہ اللہ تعالیٰ ہماری دعائیں نہیں سنتا کیا کبھی ہم نے یہ غور کیا ہے کہ ہم دعائیں کیا مانگتے ہیں۔ ان کی نیت کیا ہوتی ہے کیا ہم کامل یقین سے دعائیں مانگتے ہیں۔ نہیں قطعی نہیں مانگتے اگر ہم دعا مانگ بھی رہے ہوتے ہیں تو اس میں ہماری بھلائی اور دوسرے کا نقصان ہوتا ہے۔ مثلاً اے اللہ تو آج اتنی بارش دے کہ دل بھر جائے اس دعا سے ہمارا دل تو بھر جاتا ہے مگر دوسروں کا حال برا ہوتا ہے۔ دعا میں کاملیت نہیں ہوتی۔ اللہ مجھے فلاں چیز دے میں اس سے یہ دو کر دوں گا بھلا رب العزت کیسے وہ دعا قبول کر سکتا ہے جس میں ایک انسان کا بھلا ہو رہا ہو اور دوسرے کا نقصان۔ میرا ایمان ہے کہ جب بھی سچے دل سے نفع نقصان سوچے بغیر دعا مانگی جائے قبول ہوتی ہے۔ کہتے ہیں انسان سخت مشکل میں ہو تو اگر وہ کوئی دعا مانگے تو وہ قبول ہو جاتی ہے۔ اس وقت کی دعا کسی بھی نفع نقصان سے پاک ہو کر دل میں ایمان پختہ رکھ کر قبول ہونے کے یقین سے مانگی جاتی ہے اور قبول ہوتی ہے۔

حنا ناز ... پنڈدادن خان

میرا اثبات میں ہلا کر میرے تابوت میں آخری کیل ٹھونک دی۔

اس کے بعد قانونی کارروائیوں کا آغاز ہوا اور میں نے اس قوی ہیکل سارجنٹ ڈان کو بیان دیتے سنا جو کہہ رہا تھا۔ ''ملزم نے اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ جس رات اس کی بیوی ہلاک ہوئی تھی' اس رات وہ مسٹر کرسٹوفر جونز کے ساتھ اسی ٹرین اور اسی کمپارٹمنٹ میں سفر کررہا تھا۔'' اس نے مزید بتایا کہ جونز جب گھر واپس نہ پہنچا تو اس کی بیوی نے وہ رات کس پریشانی کے عالم میں گزاری کیونکہ گزشتہ شام ہی اس کی آمد متوقع تھی ...... اور پھر انہوں نے کسی طرح کرسٹوفر کی لاش' ریڈنگ اور میڈن لینڈ کے درمیان' ریلوے کے پشتے پر مسخ شدہ حالت میں دریافت کی ...... اور پھر بوسنے ٹرالی والی اس بوڑھی عورت نے کٹہرے میں کھڑے ہوکر بیان دیا کہ اس نے مجھے ٹرین میں سوار ہوتے اور کمپارٹمنٹ میں جونز سے باتیں کرتے دیکھا تھا اور اسے یقین تھا کہ یہ وہی رات تھی اور یہ بھی یقین تھا کہ وہ شخص میں ہی تھا۔ اس کے بعد میری جانب اپنی افسردہ اور سوگوار نظروں سے دیکھتے ہوئے بیان دیا کہ یقیناً اس نے مجھے کمپارٹمنٹ میں جونز کے ساتھ گفتگو کرتے دیکھا تھا اور پھر ریڈنگ گزرنے کے بعد میڈن لینڈ کے قریب پہنچنے تک اس نے دوبارہ مجھے اسی کمپارٹمنٹ میں تنہا دیکھا تھا۔ اس نے یہ اقرار بھی کیا کہ میں بے حد گھبرایا ہوا نظر آرہا تھا' لیکن اس وقت اسے کسی قسم کا شبہ نہیں ہوا تھا...... لیکن جب مسٹر جونز کی لاش دریافت ہوئی تو اسے میری گھبراہٹ یاد آگئی اور ساتھ ہی اس کی وجہ

سچ جو دل کو بھا جائے

☆ غلطی ماننے اور گناہ چھوڑنے میں کبھی دیر مت کیجیے کیونکہ سفر جتنا طویل ہوتا جائے واپسی اتنی ہی دشوار ہوتی ہے۔

☆ شکر ادا کرتے رہو اس رب کا جو برداشت سے زیادہ دکھ نہیں دیتا مگر اوقات سے زیادہ سکھ دیتا ہے۔

☆ زمانہ بُرے لوگوں کی برائی کی وجہ سے خراب نہیں ہوتا بلکہ اچھے لوگوں کی خاموشی کی وجہ سے خراب ہو جاتا ہے۔

☆ زندگی میں کامیابی حاصل کرنے کا سب سے بڑا راز یہ ہے کہ پریشانیوں میں گھرا ہونے کے باوجود ہمت اور حوصلے سے آگے بڑھا جائے۔

☆ موت کی طرح جدائی بھی محبوب کی یاد کو دھندلا دیتی ہے اور ہمیں محسوس بھی نہیں ہوتا کہ وقت نے بیچ میں کیسی کیسی دیواریں کھڑی کردی ہیں۔

☆ ہماری خوش قسمتی یہ ہے کہ ہم اللہ کو ایک مانتے ہیں لیکن ہماری بدقسمتی یہ ہے کہ ہم اللہ کی ایک نہیں مانتے۔

☆ ہر حال میں رب کا شکر ادا کرتے رہو بے شک خالق کائنات وہ جانتا ہے جو ہم نہیں جانتے۔

☆ ہماری ہر آزمائش کے پیچھے ہماری بھلائی پوشیدہ ہے کہ ہر آزمائش انسان کو کندن بناتی ہے اور نکھار پیدا کرتی ہے۔

☆ ناکامی جرم نہیں' مقصد کا پست ہونا جرم ہے۔

عاصمہ امداد علی...... گوجرانوالہ

بھی سمجھ میں آ گئی..... اور ہاں..... اسے یقین تھا کہ یہ سانحہ اسی رات پیش آیا تھا پھر نہ جانے میں نے اسے یہ ڈان کو یہ کہتے سنا کہ کرسٹوفر جونز سے جو ٹکٹ حاصل ہوا تھا' اس پر میرا فون نمبر تحریر تھا جونز نے یہ فون نمبر لکھا تھا اس طرح وہ تاریخ پا یہ ثبوت کو پہنچ گئی۔ ٹکٹ کلکٹر نے دوبارہ زور دے کر کہا کہ میں ریڈنگ اسٹیشن پر تو جونز کے ساتھ تھا لیکن میڈن لینڈ اسٹیشن پر تنہا دکھائی دیا تھا۔ میں دراصل اپنے انداز گفتگو کی وجہ سے اسے یاد رہ گیا تھا۔ اس نے کہا۔ ''میں لوگوں کی حرکات وسکنات کا مشاہدہ کرنے میں دلچسپی رکھتا ہوں۔ اگر ایسا نہ کروں تو بلا ٹکٹ سفر کرنیوالے مجھے آسانی سے غچہ دینے میں کامیاب ہو جائیں۔ بہرحال' یہ مشاہدہ ایک طرح سے میری فطرت ثانیہ بن گیا ہے اور میں نے اس ذات شریف کے انداز گفتگو میں خصوصی دلچسپی لی تھی۔''

''اس کے انداز گفتگو میں ایسی کیا خاص بات ہے؟'' اس سے سوال کیا گیا۔

''یہ ہر جملے کے آغاز میں کہتا ہے' جیسا کہ میں نے عرض کیا۔''

چلیے صاحب چھٹی ہوئی۔ میرا یہ اعتراف بھی اس سلسلے میں معاون ثابت ہوا تھا کہ میں نے اس رات لندن کا سفر اختیار کیا تھا۔ وہ لوگ قتل کے محرک کا سراغ لگانے میں کامیاب نہیں ہو سکے تھے لیکن جرم بہرحال جرم ہی تھا۔ بھلا میں کیا کہہ سکتا تھا؟ البتہ میں یہ ضرور جانتا تھا کہ بونے ٹرالی والی بڑھیا کو مغالطہ ہو گیا تھا اور ٹکٹ کلکٹر سفید جھوٹ بول رہا تھا اور میں اس کی وجہ بھی خوب اچھی طرح جانتا تھا جیسا کہ میں نے عرض کیا ہے کہ بعض اوقات بڑے عجیب وغریب واقعات رونما ہوتے ہیں اور یہ بھی اپنی نوعیت کا عجیب وغریب ہی واقعہ تھا۔ دراصل کرسٹوفر جونز سے میری ملاقات پچھلے اکتوبر میں لندن کے سفر کے دوران ہوئی تھی اور میں نے اسے اپنی بیوی کو قتل کرنے کے منصوبے سے آگاہ کرتے ہوئے موقع واردات سے اپنی عدم موجودگی ثابت کرنے کے لیے بطور گواہ تیار کیا تھا اور اس کے لیے ایک ہزار پونڈ کی پیش کش کی تھی۔ وہ رضامند ہو گیا تھا اور ہم نے تاریخ مقرر کر لی تھی لیکن ہمیں یہ معلوم نہیں تھا کہ ٹکٹ کلکٹر نے ہماری یہ باتیں سن لی ہیں اور وہ ہمارے منصوبے سے آگاہ ہو گیا ہے..... نہ صرف یہ بلکہ اس نے وہ تاریخ بھی نوٹ کر لی ہے جس روز مجھے اپنی بیوی کا قصہ پاک کرنا تھا۔ لہٰذا اس نے کرمس سے دو روز قبل کرسٹوفر کو ملے شدہ دن لندن کے سفر کے دوران ہلاک کر کے گاڑی سے نیچے پھینک دیا اور وہ ایک ہزار پونڈ اس سے حاصل کر لیے جو میں نے اسے روز کرسٹوفر جونز کو دا کیے تھے لیکن میں نے اس کے ساتھ لندن کا سفر نہیں کیا تھا۔ بھلا میں اس رات ٹرین پر اس کے ساتھ کس طرح موجود ہو سکتا تھا' جس رات میں نے اپنی بیوی کو قتل کیا تھا.....؟ لیکن اگر میں یہ کہتا کہ میں نے اس رات کرسٹوفر جونز کے ساتھ لندن کا سفر نہیں کیا تھا تو ظاہر ہے یہ ثابت کرنا کوئی مشکل کام ہوتا کہ میں ہی اپنی بیوی کا قاتل ہوں.....!

مردِ آہن

سید احتشام

وقت کسی کا نہیں ہوتا' وہ بس اسی کا ساتھ دیتا ہے جو دانش مندی سے اسے استعمال کرسکے' اس کا معاملہ بھی کچھ ایسا ہی تھا اس کی ایک حماقت نے آنے والے اچھے وقت سے اسے دور کردیا تھا' مگر اس نے پھر بھی ہمت نہ ہاری اور وقت کے بے لگام گھوڑے کو قابو کرنے میں کامیاب ہوگیا۔

جیل میں میری تین سالہ اسیری کی آخری رات بوند بوند ٹپک رہی تھی۔ میں بڑی دیر سے عالم بے چینی میں اپنے مقدر کی سحر کے طلوع ہونے کا منتظر تھا لیکن ایسا لگتا تھا کہ شب اسیری کی گھڑیاں طویل ہوگئی ہیں اور وہ سحر کبھی طلوع نہ ہوگی جو میری رہائی کا پیغام لائے گی۔ ہوسکتا ہے یہ محض میرا احساس ہو لیکن اس احساس نے طبیعت کو اضطراب آشنا کردیا تھا۔ میں نے اسیری کے یہ تین سال بے حد خاموشی سے گزار دیے تھے لیکن یہ نہیں جانتا تھا کہ اس زنداں سے رہائی کے بعد باہر کے شور شرابے کو کس طرح قبول کروں گا۔ میں نے غسل کرکے لباس پہنا اور سائرن بجنے کا انتظار کرنے لگا پھر سائرن کی آواز بلند ہوتے ہی محافظ نے میری کوٹھری کا دروازہ کھول دیا اور مسکرا کر مجھ سے مخاطب ہوا۔ "مبارک گھڑی آگئی ہے نا چارلی؟"

میں نے جواب دینا چاہا لیکن میرے حلق میں جیسے کوئی گولا پھنس گیا تھا۔ میں محض اثبات میں سر ہلا کر رہ گیا اور مجھے میس میں پہنچادیا گیا۔

ناشتہ آیا تو میں بے دلی سے زہر مار کرنے لگا۔ میری زبان ناشتے میں موجود چیزوں کا ذائقہ محسوس کرنے سے قاصر رہی۔ بھوک کا احساس بھی دم توڑ چکا تھا۔ میں میس ہال سے باہر نکلا تو سامنے کھڑے ہوئے محافظ نے پوچھا۔ "تمہارا نام چارلی وہائٹ ہے؟" میرے اثبات میں جواب دینے پر وہ مجھے ایک چھوٹے سے کمرے میں لے گیا یہاں ایک ہینگر پر میرے کپڑے ٹنگے ہوئے تھے۔ "لباس پہن کر اپنے جسم پر موجود یہ کپڑے سپلائی کلرک کے حوالے کردو پھر وہاں سے سیدھے نچلی منزل پر وارڈن کے دفتر میں چلے جاؤ۔" محافظ نے ہدایت دی۔

میں اس کی ہدایت پر عمل کرکے وارڈن کے دفتر پہنچ گیا۔ اس کی میز پر میری رہائی کے کاغذات رکھے ہوئے تھے۔ اس نے ان پر نگاہ ڈال کر میری جانب دیکھا اور گویا ہوا۔ "میں تم سے بہت کچھ گفتگو کرنا چاہتا ہوں وہائٹ۔ تمہاری کارکردگی یہاں کے عام قیدیوں کے مقابلے میں کہیں بہتر رہی ہے اتنا میں نہیں چاہتا کہ تم یہاں واپس آؤ لیکن اس وقت تمہارے ذہن پر اتنا دباؤ ہے اور دل خود ترسی کے جذبات سے لبریز ہے کہ میں اس سے زیادہ کہنا مناسب نہیں سمجھتا۔" اتنا کہہ کر اس نے ایک سربمہر لفافہ' ایک رسید' چند نوٹ اور چند سکے میز کے کونے پر رکھ دیے۔ "یہ رہے تمہارے پیسے جو تم نے یہاں آتے وقت جمع کرائے تھے۔ اب اس رسید پر دستخط کرکے اپنی رقم اٹھالو۔" وہ بولا۔

میں نے دستخط کرکے رقم اور لفافہ اٹھا لیا اور میری نگاہوں میں اپنی بیوی جیتھ کی شکل گھوم گئی۔ یہ لفافہ یقیناً اس نے بھیجا تھا۔ جیل کے پادری فادر ریلے نے مجھے جیتھ کے بارے میں اطلاع فراہم کی تھی۔ اس نے بتایا تھا کہ جیتھ پاسیڈینا سٹی کے ایک جنرل اسٹور میں کلرک کی حیثیت سے ملازمت کررہی ہے لیکن کیا وہ زوو کے بارے میں جانتی ہے؟ ہاں وہ اسے اچھی طرح جانتی تھی لیکن اگر اس نے طلاق کا مقدمہ دائر کردیا تھا تو اس کے کاغذات مجھ تک نہیں پہنچے تھے۔ میں نے رقم گنی۔ یہ ایک سو چھبیس ڈالر اور پچاس سینٹ تھے۔ میں نے لفافہ کھولنے کی زحمت نہیں کی۔

"خدا حافظ وہائٹ۔" میرے کانوں سے وارڈن کی آواز ٹکرائی۔

وارڈن اپنی نشست کی پشت گاہ سے ٹک گیا اور وردی پوش محافظ مجھے لے کر جیل کے پھاٹک کی سمت روانہ ہو گیا۔ میں اس کے ساتھ آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا ہوا احاطہ عبور کر کے آہنی پھاٹک سے باہر آ گیا۔ چہار سو دھوپ پھیلی ہوئی تھی۔ یہی دھوپ جیل کی دیواروں کے پیچھے تھی لیکن یہاں اس میں وہ چمک نہیں تھی جو یہاں جیل کے باہر تھی۔ میری آنکھیں چندھیا گئیں۔ میں چند لمحے کھڑا پارکنگ لاٹ میں موجود کاروں کا جائزہ لیتے ہوئے سوچنے لگا۔ اگر بیتھ مجھے لینے آئی ہے تو میں اس کے ساتھ چلا جاؤں گا۔ اگر نہیں تو پھر سینیور سیپو کی تلاش میں نکل کھڑا ہوں گا اور اسے شناخت کر کے ہلاک کر دوں گا۔ سینیور سیپو ایک پراسرار شخص تھا۔ میں اس سے آج تک نہیں ملا تھا نہ ہی اس کے صحیح نام یا حلیے سے واقف تھا۔ مقدمے کے دوران وکیل استغاثہ نے اس بات پر کافی واویلا مچایا تھا لیکن میں بھلا کیا کہہ سکتا تھا۔ مجھے اس کا صرف یہی نام معلوم تھا۔

پارکنگ لاٹ میں مجھے بیتھ کہیں نظر نہیں آئی۔ اس کا واضح مطلب یہ تھا کہ میں نے اسے کھو دیا۔ میں نے مایوسی سے سانس کھینچی۔ میں نے زندگی میں کیا کھویا اور کیا پایا تھا؟ ایک طرف اپنی بیوی اور اپنی فشنگ بوٹ کھو دی تھی اور ساتھ ہی تین سال کی قید حصے میں آئی تھی۔ دوسری طرف ہوانا میں شراب نوشی کا لطف اٹھایا تھا۔ ایک محبوبہ پال رکھی تھی اور خود کو اپنے ہم پیشہ کپتانوں سے کہیں افضل متصور کرتا رہا تھا اور اب زندگی بھر کی پونجی ایک سو چھبیس ڈالر اور پچاس سینٹ کی شکل میں میری جیب میں پڑی ہوئی تھی۔ میں نے اب تک یہی منافع کمایا تھا۔ اچانک میری نظر زورو پر پڑی۔ وہ پیلے رنگ کی ایک چھوٹی سی جیپ کی اسٹیئرنگ سیٹ پر بیٹھی ہوئی تھی۔ میں اس کی طرف بڑھا۔ اس نے ہاتھ لہرا کر مجھے اپنی جانب متوجہ کیا۔ "ہیلو جی۔"

میں اس کے قریب پہنچ گیا اور وہ ساتھ والی نشست پر کھسک گئی۔ "آؤ بیٹھو۔ اب تم ڈرائیو کرو گے۔" اس نے دعوت دی۔

"میں... ؟" میں نے حیرت سے کہا۔ "ڈرائیونگ لائسنس کے بغیر ہی؟ کیا تم مجھے قانون شکنی پر مجبور کرنا چاہتی ہو؟"

اس نے ایک لمحے کے لیے سوچا۔ "اچھا میں ڈرائیو کروں گی۔" دوسرے ہی لمحے وہ بول پڑی اور میرے جیپ میں سوار ہونے سے پہلے ہی اپنے پرس سے ہوانا بینک کی پاس بک نکال کر مجھے تھما دی جو کہ میری گرفتاری کے وقت سے اس کے پاس بطور امانت رکھی ہوئی تھی۔ "غلط خطوط پر سوچنے کی کوشش مت کرو۔" وہ بولی۔ "کسی نے بھی تمہیں پھنسانے کی کوشش نہیں کی تھی۔ مقدمے کی سماعت کے دوران باس خود کو ظاہر نہیں کر سکتا تھا کیونکہ اس صورت میں حالات مزید بگڑ جاتے۔"

گویا میں اب بھی اس گروہ کے لیے اہمیت رکھتا تھا اور سینیور سیپو میرے ایام اسیری کے دوران ہر ماہ میرے اکاؤنٹ میں ایک ہزار ڈالر جمع کراتا رہا تھا۔

"اب تو خوش ہو؟" زورو نے دریافت کیا۔

"ہاں۔" میں نے جواب دیا اور تلخی سے سوچا۔ "بیتھ جہنم میں جائے۔ مجھے اس سے کوئی سروکار نہیں۔ دنیا کی کسی چیز سے سروکار نہیں۔ سینیور سیپو کو ہلاک کرنے کی ضرورت بھی کیا ہے۔ میں اس مرغی کو کیوں ہلاک کروں جو اب تک سونے کے انڈے دیتی رہی ہے؟" میں جیپ میں سوار ہو گیا اور زورو نے جیپ اسٹارٹ کر دی۔ ہمارا رخ جنوب کی طرف تھا۔

"ہماری منزل کیا ہے؟" میں نے اس سے پوچھا۔

"مغربی ساحل۔" اس نے جواب دیا۔ "وہاں میں نے ایک جزیرے میں ایک کیبن کرائے پر لیا ہے لیکن ہم زیادہ عرصہ قیام نہیں کریں گے۔ ہمارے گروہ کا ایک فرد اپنی بوٹ پر ہمیں ہوانا لے جائے گا۔ ٹھیک ہے؟"

"ہاں، بے شک۔" میں نے اس کے سینہ واغ

شانوں پر لہراتی ہوئی زلفوں کی جانب دیکھ کر کہا۔ کچھ دیر ڈرائیو کرنے کے بعد اس نے جیپ سڑک کے کنارے روک دی اور رم کی ایک بوتل نکال کر میرے حوالے کر دی۔ "اب تم اطمینان سے پیتے رہو اور رنگین خواب دیکھتے رہو۔" اس نے کہا اور جیپ دوبارہ اسٹارٹ کر دی۔ سفر کافی طویل تھا۔ ہمیں دو جگہ رک کر پیٹ بھرنا پڑا۔ رم کی بوتل بھی خالی ہو گئی تھی۔ چنانچہ میں نے کراس سٹی سے نئی بوتل خرید لی۔

ہم سہ پہر میں کیبن پہنچے جو ساحل کے ایک ویران حصے میں کھجور کے درختوں میں گھرا ہوا تھا۔ اس کے عقب سے ایک ریتلی سڑک گزر رہی تھی اور اس سے قریب ترین مکان کم از کم ایک میل کے فاصلے پر واقع تھا۔ سامنے کی جانب نیلا اور بے کنار سمندر پھیلا ہوا تھا۔ میں غسل کرنا چاہتا تھا اور ساتھ ہی کافی پینے کی بھی خواہش ہو رہی تھی۔ میں نے زوکو اپنی دونوں خواہشوں سے آگاہ کیا۔ وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ "تم سمندر سے کافی عرصہ ...... دور رہے ہو جب ہی پانی دیکھ کر طبیعت تیرنے کو مچل اٹھی ...... خیر ...... جاؤ ...... وارڈروب میں تیراکی کا لباس موجود ہے۔ میں کافی چولہے پر چڑھا دیتی ہوں۔" اس نے کہا اور اسٹو کی جانب متوجہ ہو گئی۔ میں بیڈروم کی طرف بڑھ گیا لیکن جوں ہی اس کا دروازہ بند کیا میری سماعت سے کسی کی مردانہ آواز ٹکرائی۔

"تم اسے لے آئیں؟"

میں نے دروازہ کھول کر زو سے دریافت کیا۔ "یہ کون ہے؟"

اسٹو کے پاس کھڑی ہوئی زو میری جانب دیکھ کر مسکرائی۔ "تمہارے کان بج رہے ہیں ہنی۔ جاؤ غسل کرو۔ واپس آؤ گے تو کافی تمہیں تیار ملے گی۔"

اس وقت میں نے اس آواز کو اہمیت نہیں دی اور دروازہ بند کر کے اپنا کوٹ اتار کر ہینگر سے لٹکانے لگا۔ اسی کوشش میں کوٹ کی جیب سے ایک لفافہ نکل کر فرش پر گر گیا۔ اس پر نگاہ پڑتے ہی میں پہچان گیا۔ یہ وہی لفافہ تھا جو جیل سے رخصت ہوتے وقت وارڈن نے میرے حوالے کیا تھا۔ میں نے بستر پر بیٹھ کر لفافہ کھولا اور اس کے اندر سے دس دس ڈالر کے دو نوٹ اور پانچ ڈالر کا ایک نوٹ نکل کر گر پڑا۔ میں نے اس طرف توجہ نہیں دی بلکہ اس کے اندر موجود خط کی جانب متوجہ ہو گیا۔

"جانم! ہو سکا تو میں تمہاری رہائی کے موقعے پر وہاں موجود ہوں گی لیکن اگر یہ ممکن نہ ہو سکا تو خدارا برا نہ ماننا کیونکہ میں ملازمت کر رہی ہوں۔ لہٰذا اس صورت حال کے پیش نظر میں آخری ہفتے کی تنخواہ ٹرین کے کرائے کے طور پر ارسال کر رہی ہوں اور انتہائی بے چینی سے تمہاری منتظر ہوں۔

فقط تمہاری بیتھ"

خط پڑھ کر میری کیفیت عجیب سی ہو گئی۔ بیتھ اب بھی مجھ سے محبت کرتی تھی اور میری منتظر تھی اور میں ایک بار پھر زو کے چکر میں پڑ کر یہاں بیٹھا ہوا تھا۔ میں ان ہی خیالات میں کھویا نہ جانے کب تک کھڑا رہا کہ اچانک زو کی آواز نے مجھے چونکا دیا۔ "کیا بات ہے ڈارلنگ تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے اتنی دیر سے وہاں کیا کر رہے ہو؟"

"ہاں طبیعت تو بالکل ٹھیک ہے۔" میں نے وہیں سے جواب دیا اور صحیح سمت میں سوچنے لگا۔ "اگر بیتھ میری زندگی سے نکل گئی تو اس زندگی میں کچھ بھی نہیں رہ جائے گا۔ دولت، عیش و عشرت اور زو کوئی شے بیتھ کا نعم البدل نہیں ہو سکتی۔ وہ میری بیوی تھی اور میری زندگی تھی۔ میں اسے دل و جان سے چاہتا تھا۔ میں نے کوٹ ہینگر سے اتار لیا اور دروازہ کھول کر زو کے پاس آ گیا۔ "سوری زو۔" میں نے اسے مخاطب کیا۔ "اس وقت سے میری اور تمہاری راہیں جدا ہوتی ہیں۔ میں پاسیلو سٹی میں اپنی بیوی کے پاس واپس جا رہا ہوں۔"

"تم مذاق تو نہیں کر رہے ہو؟" اس کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔

"میں زندگی میں اتنا سنجیدہ کبھی نہیں ہوا تھا جتنا کہ اس وقت ہوں۔" میں نے جواب دیا۔

غصے کی شدت سے اس کا چہرہ بگڑ گیا اور آنکھیں سکڑ گئیں۔ "تم نے بات تو پی رکھی ہے یا پھر پاگل ہو گئے ہو۔ ماہی گیری کر کے اور کشتی چلا کر تم کتنا کما لو گے؟"

"اس کے باوجود میں بیتھ کے پاس جا رہا ہوں۔ وہاں کوئی ملازمت حاصل کر لوں گا اور اپنے پرانے آبائی مکان کو از سر نو آراستہ کروں گا اور ہمارے بچے اس کے آنگن میں کھیلیں گے۔"

یکایک اس کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔

"نہیں...." وہ دہشت سے چیخی۔ میں سمجھا کہ وہ مجھ سے مخاطب ہے لیکن دوسرے ہی لمحے میرے سر کے عقبی حصے پر ایک شدید ضرب پڑی۔ میری آنکھوں کے سامنے چنگاریاں رقص کرنے لگیں۔ میں نے شدت کرب سے پلٹ کر حملہ آور کو دیکھنے کی کوشش کی لیکن ایک دھندلی سی تصویر کے سوا مجھے کچھ بھی نظر نہ آ سکا۔ اسی وقت دوسری ضرب پڑی اور میں ہوش و خرد سے بیگانہ ہو گیا بے ہوش ہوتے ہوئے میں نے دھماکے کی آواز سنی تھی اور پھر میرا ذہن گہری تاریکی میں ڈوبتا چلا گیا۔

ہوش آیا تو دیکھا کہ میں فرش پر پڑا ہوں۔ میرے حواس کام نہیں کر رہے تھے۔ ذہن پر دھند سی چھائی ہوئی تھی پھر آہستہ آہستہ یہ دھند چھٹنے لگی...... مجھے یاد آیا کہ ابھی چند لمحے پیشتر میں نے بیتھ کا خط پڑھا تھا اور زو کو اپنی روانگی سے آگاہ کیا تھا لیکن اس اثنا میں کسی نامعلوم شخص نے میرے سر پر ریوالور کے دستے سے ضرب لگا کر مجھے بے ہوش کر دیا تھا لیکن کیوں؟ میں یہ سمجھنے سے قاصر رہا...... میں زو سے جذباتی طور پر وابستہ نہیں تھا نہ ہی میں نے اس سے یہ پوچھا تھا کہ میری تین سالہ اسیری کے دوران اس کی کیا مصروفیات تھیں؟ میری نگاہ میں اس کی کوئی اہمیت نہیں تھی لیکن شاید اس کا کوئی بوائے فرینڈ مجھے یہاں دیکھ کر حسد کا شکار ہو گیا تھا۔ یہ اسی حاسد شخص کا کارنامہ ہوگا لیکن جب اس مردود نے مجھے یہ کہتے ہوئے سن لیا تھا کہ میں اپنی بیوی کے پاس واپس جا رہا ہوں تو پھر اسے مجھ پر حملہ کرنے کی کیا ضرورت تھی......؟ میں نے حیرت سے سوچا اور پھر میرے ذہن میں وہ آواز گونج اٹھی جو میں نے بیڈ روم کا دروازہ بند کرتے وقت سنی تھی۔

"تم اسے لے آئیں؟" زو نے مجھے جھٹلایا تھا......

یقیناً...... ہمارے علاوہ بھی کوئی اس کیبن میں پہلے سے موجود تھا۔ اس جملے کی روشنی میں دیکھا جائے تو اس کا مطلب یہی نکلتا تھا کہ زو مجھے یہاں کسی کے حوالے کرنے لائی تھی لیکن پھر وہ دہشت سے چیخی کیوں تھی اور حملہ آور کو مجھے ضرب لگانے سے منع کیوں کیا تھا؟ سوچتے سوچتے میرا دماغ تھک گیا مگر میں کسی فیصلے پر نہ پہنچ سکا۔ تنگ آ کر میں نے سوچنا ترک کر دیا۔ کیبن کسی مچھلی کے بیوپاری کے دل کی مانند تاریک ہو رہا تھا۔ میں نے اٹھ کر لائٹ جلانی چاہی لیکن سوئچ ڈھونڈنے میں ناکام رہا اور ماچس کی تیلی جلائی۔ اس کی روشنی میں میں نے مینٹل پر رکھے ہوئے ٹائم پیس میں وقت دیکھا۔ اس کے مطابق میں کئی گھنٹے بے ہوش رہا تھا۔ اس وقت بارہ بجنے میں صرف چند منٹ رہ گئے تھے۔ رم کی بوتل میز پر رکھی ہوئی تھی۔ میں نے اسے کھول کر چند گھونٹ بھرے اور دوسری تیلی جلا کر بیڈ روم میں داخل ہوا لیکن اے کاش کہ نہ داخل ہوا ہوتا۔ بستر پر زو پشت کے بل دراز تھی۔

اس کی آنکھیں پھٹی ہوئی تھیں اور چھت کو گھور رہی تھیں لیکن وہ کسی خاص شے پر مرکوز نہیں تھیں۔ میں نے ایک اور تیلی جلائی اور اس کے قریب پہنچ کر اس کا جائزہ لیا۔ وہ مر چکی تھی۔ گویا وہ اس گولی سے مری تھی جس کا دھماکا میں نے بے ہوش ہوتے وقت سنا تھا اور وہ اس وقت سے مردہ تھی جس وقت میں بے ہوش ہوا تھا۔ وہ تیلی بھی بجھ گئی تو میں نے دوسری جلا کر کمرے کا جائزہ لیا۔ کمرے میں ابتری پھیلی ہوئی تھی۔ ایک کرسی الٹی پڑی تھی۔ بستر کے قریب رم کی بوتل ٹوٹ کر بکھری ہوئی تھی جب کہ دوسری فرش پر کھلی پڑی تھی اور ساری شراب قالین پر بہہ گئی تھی پھر میری نگاہ زو کے بے جان ہاتھ میں پکڑی ہوئی کسی سیاہ شے پر پڑی۔ میں نے وہ شے جھک کر اس کے ہاتھ سے لے لی۔ یہ مچھلی پکڑنے والی لوہے کی سلاخ

تھی۔ مجھے اسی سے مصروب کیا گیا تھا۔ میں دوسرے کمرے میں آیا۔ یہاں میرا کوٹ پڑا تھا۔ میں نے اس کی جیبیں ٹٹولیں۔ ایک جیب میں وہ پستول موجود تھا جس سے زرد ہلاک کی گئی تھی۔ میں تصور کی آنکھوں سے آئندہ روز اخبار میں شائع ہونے والی اس خبر کی سرخی پڑھ سکتا تھا۔ "جیل سے رہا ہونے والے قیدی نے رہائی کی خوشی میں منعقد کی جانے والی تقریب کے موقعے پر شراب کے نشے میں اپنی محبوبہ کو ہلاک کر دیا۔" اس لمحے دیوار گیر گھڑی نے وقت گزرنے کا اعلان کیا۔ پورے بارہ بج چکے تھے۔ ماچس کی تیلی میری انگلیوں کو جلانے لگی تھی لیکن مجھے جلن کا احساس نہیں ہوا۔ دوسرے کمرے میں زرد کی لاش پڑی تھی اور میں قاتل کی حیثیت سے یہاں موجود تھا۔ میں کھڑکی کے پاس آ کھڑا ہوا۔ رات گہری سیاہ تھی لیکن آسمان کے آنچل میں ستارے ٹنکے ہوئے تھے۔ یہ ستارے تھے یا آنسوؤں کے قطرے تھے؟ سمندر اتر گیا تھا۔ میرے دل میں کبھی زندہ رہنے کی اتنی شدید خواہش نہیں ابھری تھی جیسی کہ اس وقت ابھر رہی تھی۔ مجھے زرد سے کہے گئے الفاظ یاد آ گئے۔ "میں چیف کے پاس جا رہا ہوں۔ وہاں کوئی ملازمت حاصل کر لوں گا اور اپنے پرانے مکان کو از سر نو آراستہ کروں گا اور ہمارے بچے اس کے آنگن میں کھیلیں گے۔" لیکن مجھے یہ نہیں معلوم تھا کہ تقدیر مجھ پر ہنس رہی تھی۔ میں اپنی بیوی کے پاس نہیں بلکہ ریفورڈ کی جیل میں واپس جانے والا تھا۔ کم سے کم نصف درجن محافظوں نے مجھے زرد کی جیپ میں سوار ہوتے دیکھا تھا پھر ہم گیمبز ویل اور کراس سٹی میں کھانا کھانے کے لیے رکے تھے جہاں کی ویٹرس اس بات کی گواہی دے سکتی تھی کہ اس نے مقتولہ زرد کو میرے ہمراہ دیکھا تھا اور میں بری طرح پی رہا تھا۔ زرد کی جیپ کیبن کے سامنے بدستور کھڑی تھی۔ دانش مندی کا تقاضا یہ تھا کہ میں جیپ دوڑاتا ہوا قریبی فون بوتھ پہنچ جاؤں اور ریاستی پولیس کو اس واقعے کی اطلاع کر دوں لیکن کیا وہ میری کہانی پر یقین کریں گے؟ کوئی بھی یقین نہیں کرے

گا۔ میں قاتل کا حلیہ بتانے سے قاصر تھا۔ وہ میرے لیے سینیور سیبو کی طرح نامعلوم تھا۔ "سینیور سیبو" میں بڑبڑایا اور اس کے ساتھ ہی میرا ذہن ماضی میں چلا گیا۔ میری بربادی کا آغاز ایک ٹیلی فون کال سے ہوا تھا۔ "ہیلو کیپٹن وہائٹ میں سینیور سیبو بول رہا ہوں..... فوری پانچ ہزار ڈالر کمانے کے بارے میں کیا خیال ہے؟"

"مجھے کیا کرنا پڑے گا؟" میں نے اس سے دریافت کیا۔

"یہاں سے اسی میل دور ایک اسٹیمی بوٹ اینڈ روس اینگرا پولس خلیج میں کھڑی ہے۔ اس بوٹ سے چند واٹر پروف پیکٹ لانے ہیں۔ یہ پیکٹ تمہاری بوٹ کے چارہ رکھنے والے گڑھے میں بہ آسانی آ جائیں گے۔" اس آواز نے جواب دیا تھا۔

میں نہیں جانتا تھا کہ ان پیکٹوں میں کیا ہوگا؟ مجھے ان سے پوچھتے ہوئے خوف محسوس ہوا۔ کہیں میں ان پانچ ہزار ڈالروں سے ہاتھ نہ دھو بیٹھوں۔ مجھے اس رقم کی اشد ضرورت تھی۔

وہ آغاز تھا اس کے بعد مجھے ویرا کروز کا سفر کرنے کی ہدایت ملی۔ اس کے بعد "ہنارول ریو" اور پھر "ہوانا" جہاں زرد سے میری ملاقات ہوئی۔ اس کے بعد یہ سلسلہ چل نکلا اور میں اس دلدل میں پھنستا چلا گیا۔ مجھے جس شخص سے ملنے کی ہدایت کی جاتی اس سے ملتا اور اس سے جو چیز حاصل کرنے کا حکم ہوتا وہ چیز لا کر ہدایت کے بموجب مختلف جگہوں پر پہنچا دیتا لیکن میں نے خود کو ایک بات کا پابند کر لیا تھا اور وہ یہ کہ میں دوسرے ملکوں سے آدمیوں کو اسمگل نہیں کروں گا۔ ایک دفعہ انکار کرنے کے بعد سینیور سیبو نے مجھے دوبارہ اس بات پر مجبور نہیں کیا تھا۔ کوسٹ گارڈ کے سارے جوان مجھ سے اچھی طرح واقف تھے۔ ان کا بوڑھا آفیسر میرے باپ کا شناسا تھا۔ لہٰذا مجھے کسی نے نہیں روکا لیکن ایک روز انہیں شک ہو گیا اور انہوں نے میری بوٹ روک کر اس کی تلاشی لی۔ مچھلیوں کے چارے والا گڑھا ان پیکٹوں سے بھرا ہوا تھا

اور ان پیکٹوں میں چالیس ہزار قیمت فرانسیسی گھڑیاں اور فرانسیسی خوشبویات کی شیشیاں موجود تھیں جن کی کوئی ڈیوٹی ادا نہیں کی گئی تھی۔ میں گرفتار کر لیا گیا اور مجھ پر اسمگلنگ کے الزام میں مقدمہ چلا کر جیل میں ڈال دیا گیا۔ اس دوران سینیور سیبو کسی موقعے پر بھی سامنے نہیں آیا تھا۔ میں نے اب تک فون پر محض اس کی آواز سنی تھی میرا معاوضہ ڈاک کے ذریعے ارسال کر دیا جاتا تھا۔ جب قانون نے مجھ پر ہاتھ ڈالا تو بھی اس نے خود کو ظاہر نہیں کیا۔ لہٰذا جب مقدمے کے دوران وکیل استغاثہ نے مجھ سے دریافت کیا تھا کہ میں کس کے لیے یہ کام کر رہا تھا تو میں جواب میں سینیور سیبو کا نام لینے کے علاوہ انہیں کچھ نہ بتا سکا تھا۔

اور اب زوئی قتل کر دی گئی تھی اور میں اس میں ملوث ہو گیا تھا لیکن جب سینیور سیبو اس موقعے پر سامنے نہیں آیا تھا تو اس موقعے پر کیوں آتا؟ آسمان پر چمکتے ستاروں کو ٹکٹکی باندھ کر دیکھتے ہوئے میرے کانوں میں اس پیاری سی لڑکی کے الفاظ گونج رہے تھے۔ ”غلط خطوط پر سوچنے کی کوشش مت کرو۔ کسی نے بھی تمہیں پھنسانے کی کوشش نہیں کی تھی۔ مقدمے کی سماعت کے دوران باس خود کو ظاہر نہیں کر سکتا تھا کیونکہ اس صورت میں حالات مزید بگڑ جاتے۔“ زوئی کی اس بات میں وزن تھا۔ سینیور سیبو نے میرا کچھ نہیں بگاڑا تھا بلکہ وہ تو ہر ماہ ایک ہزار ڈالر میرے اکاؤنٹ میں جمع کرتا رہا تھا اور اب میرا بینک بیلنس چھتیس ہزار ڈالر تھا۔ اس کے علاوہ زوئی مجھے اس کی ہدایت پر ہوانا لے جا رہی تھی جہاں ایک شاندار مستقبل باہیں پھیلائے میرا منتظر تھا۔ سینیور سیبو نے یہ سب کچھ میری بہتری ہی کے لیے سوچا تھا۔ میں اسے مورد الزام نہیں ٹھہرا سکتا۔ یہ میرا، اس مقتولہ کا اور اس کے قاتل کا ذاتی معاملہ تھا۔

رات سرد تھی میں نے کوٹ پہن کر سگریٹ سلگایا ہی تھا کہ میری نگاہ چوتھائی میل کے فاصلے پر دو عدد متحرک ہیڈلائٹس پر پڑی۔ کار ہائی وے سے اس دیہاتی سڑک پر مڑ گئی جو کیبن کے عقب سے گزرتی تھی۔ میں جلدی سے کھڑکی کے دونوں پٹ کھول کر باہر کود گیا اور جیب میں پڑے ہوئے پستول پر ہاتھ رکھ کر تاریکی میں ایک درخت کے پیچھے چھپ کر انتظار کرنے لگا۔ چند ہی سیکنڈ میں ہیڈلائٹس قریب آ کر کیبن کے سامنے رک گئیں۔ یہ نیلے اور سفید رنگ کی مخصوص پولیس کار تھی۔ ان میں سے ایک نے اس میں سے برآمد ہوتے ہوئے خیال آرائی کی۔ ”یہ جگہ اس قدر سنسان ہے مجھے وہ اطلاع غلط معلوم ہوتی ہے۔“

”ممکن ہے۔“ اس کے ساتھی نے تائید کی اور کار کی سرچ لائٹ سے اطراف کا جائزہ لیا۔ میں بمشکل چند انچ سے بچ گیا پھر اس نے ساحل کی جانب روشنی پھینکی۔

”بالکل ویرانی ہے۔“ وہ بولا...... پھر دوسرے ہی لمحے ”خیر جاؤ دروازے پر دستک دے کر ان لوگوں کو جگاؤ اور پوچھو کہ وہ چیخ کس کی تھی؟“ اس نے اپنے ساتھی کو ہدایت کی۔

اس کے ساتھی نے بڑھ کر دروازے پر زور زور سے دستک دی۔ ساتھ ہی بلند آواز میں بولا۔ ”ریاستی پولیس۔“

لیکن اندر سے جواب نہ ملنے پر وہ دروازے پر دباؤ ڈال کر اندر گھس گیا اور فلیش لیمپ کی روشنی میں آگے بڑھتا چلا گیا۔ ایک لمحے کے بعد اس نے سیٹی بجائی۔ ساتھ ہی بیڈروم روشن ہو گیا اور اس نے چیخ کر اپنے ساتھی کو متوجہ کیا۔ ”تم یہاں آؤ۔ اس چھیرے نے غلط اطلاع نہیں دی تھی۔ چیخنے والی مردہ پڑی ہے۔“

اس کے اس جملے نے وضاحت کر دی کہ قاتل نے لاش کے دریافت کر لیے جانے کا انتظار کیا تھا لیکن جب ایسا نہیں ہوا تو اس نے فون پر ریاستی پولیس کو مطلع کر دیا تھا۔ وہ یقیناً مجھے پھانسنا چاہتا تھا اور اس کی یہ خواہش تھی کہ میں اگر ہوش میں آ بھی گیا تو زیادہ دور نہ جا سکوں۔ مجھے توقع تھی کہ دوسرا پولیس والا اندر جاتے وقت اپنی کار کی چابی اگنیشن میں چھوڑ جائے گا لیکن اس نے یہ غلطی کی

نہیں کی۔ ڈرائیونگ سیٹ سے اترتے ہوئے اس نے چابی اپنے بیلٹ میں اڑس لی اور ریوالور نکال کر کیبن کے اندر چلا گیا۔

میں بہ آہستگی جیپ کی جانب بڑھا۔ اب سے چند لمحے پیشتر میں خود ریاستی پولیس کو فون کر کے اس واقعے سے آگاہ کرنا چاہتا تھا لیکن اب میں ان سے دور بھاگ رہا تھا کیونکہ میں ریے فورڈ واپس نہیں جانا چاہتا تھا یا مرنا نہیں چاہتا تھا۔ کم از کم بیتھ سے ملے بغیر میں ایسا نہیں چاہ سکتا تھا۔ جیپ کی چابی اگنیشن میں بدستور موجود تھی۔

میں اس کی آڑ میں پولیس کار کی طرف بڑھا اور بے حد خاموشی سے اس کا بڈ اٹھا کر اس کے اندر موجود تاروں کا گچھا کھینچ دیا پھر اتنی ہی خاموشی سے اپنی جیپ میں سوار ہو کر جیپ اسٹارٹ کر دی۔ انجن سناٹے میں غرایا اور اس کی غراہٹ میں، میں نے کسی کی چیخ سنی۔ "یہ کون ہے؟"

میں نے جیپ کو بے حد تیزی سے یوٹرن دیا اور اپنے پیچھے گرد وغبار کا طوفان اٹھا کر ایکسیلیٹر پر پیر کا دباؤ بڑھاتا چلا گیا۔ جیپ بری طرح اچھل رہی تھی اور پولیس کے دونوں سپاہی چیختے ہوئے اس کے پیچھے بھاگ رہے تھے۔ میں نے ان کی کار کو عارضی طور پر بے کار کر دیا تھا اور اس طرح مجھے پانچ یا دس منٹ کی مہلت مل گئی تھی۔ اب میری جیپ ہائی وے پر آندھی کی رفتار سے بھاگتی چلی جا رہی تھی لیکن میں جانتا تھا کہ چند ہی منٹ میں ساری سڑکیں بلاک کر دی جائیں گی اور ملحقہ اطراف کے سارے قصبوں کی پولیس ہر طرح سے چوکنا ہو جائے گی۔

اس لیے قصبے کے واحد پیٹرول پمپ سے ایک پرانی سی کار روانہ ہوئی جس پر ٹینیسی کی نمبر پلیٹ لگی ہوئی تھی۔ کار کا حلیہ بتا رہا تھا کہ اس کا مالک سیاح ہے۔ میں ڈرائیو کرتا ہوا قصبے کے دوسرے سرے پر واقع دریا کے پل تک پہنچ گیا اور پل کے عین وسط میں جیپ روک کر اتر گیا۔ پل کے جنگلے میں ایک جگہ خلا تھا۔ میں نے جیپ کو دھکا دے کر اس خلا کے ذریعے نیچے لڑھکا دیا۔ ایک لمحے کے بعد زبردست چھپاکا ہوا۔ میرے پیچھے آنے والے سیاح نے قریب پہنچ کر اپنی کار روک دی اور کھڑکی سے سر باہر نکال کر مجھ سے پوچھا۔ "کیا ہوا؟ کیا تمہاری کار بے قابو ہو گئی تھی؟"

"نہیں۔" میں نے جواب دیا۔ "میں نے خود اسے دھکا دے دیا ہے۔" یہ کہتا ہوا میں اس کی کار کا دروازہ کھول کر اندر بیٹھ گیا پھر اسے بند کر کے پستول کی نال اس کی پسلی سے لگا دی۔ "سنو۔" میں نے کہا۔ "جہاں یہ سڑک یو ایس 19 سے ملتی ہے وہاں جگہ ناکہ بندی ہو گی لیکن مجھے اس ناکہ بندی سے پہلے وہاں سے گزر جانا ہے۔ تمہاری کھٹارہ کی انتہائی رفتار کیا ہے؟"

اس نے خوف زدہ نظروں سے پستول کی جانب دیکھ کر تھوک نگلا۔ "ت... تقریباً... نوے میل فی گھنٹہ۔"

"بس پھر اسی رفتار سے ہانکو۔" میں نے کہا اور کار روانہ ہو گئی۔

☆☆☆

ہو سکتا ہے پولیس نے اندازہ لگا لیا ہو کہ میں فرار ہو کر ہالینڈ سٹی ہی پہنچوں گا۔ لہٰذا میں نے ادھر کا رخ نہیں کیا بلکہ مختلف مقامات پر سواریاں بدل بدل کر ٹمپا پہنچ گیا اور دن کا بیشتر وقت ملبوسات خریدنے میں گزار دیا پھر نیا لباس اور نیا اسپورٹس کوٹ پہننے کے بعد میں کسی فشنگ بوٹ کے کپتان کے بجائے جنوبی علاقے کا سیاح نظر آنے لگا لیکن ٹمپا کے اخبارات چیخ چیخ کر میرا راز افشا کر رہے تھے۔ شام کے اخبار کی سرخی یہ تھی۔ "سابق قیدی نے اپنی محبوبہ کو ہلاک کر دیا۔" اس کی کہانی وہی تھی جس کی مجھے توقع تھی۔ اخبار کے مطابق میں نے اسے ہلاک کر دیا۔ اخبار نے یہ بھی رپورٹ دی تھی کہ مجھے مختلف مقامات پر دیکھا گیا ہے۔ یہ رپورٹ بالکل درست تھی۔ شاید قانون ابھی اس معاملے کی چھان بین کر رہا تھا پھر جوں ہی وہ کسی فیصلے پر پہنچ جائے گا۔ میرے گرد جال تنگ ہونا شروع ہو جائے گا۔ بیتھ پالمیٹو سٹی میں ہے ممکن ہے پولیس اس مکان پر چھاپہ مارے جس میں وہ سکونت پذیر ہے۔ میں ٹمپا سے بذریعہ طیارہ

پامیدو سٹی پہنچ گیا لیکن ہوائی مستقر سے بذریعہ ٹیکسی اس جگہ پر پہنچنے کی ہمت نہیں ہوئی جو اس نے اپنے خط میں درج کیا تھا۔ میں اسی شہر میں پیدا ہوا تھا اور شروع سے یہیں مقیم تھا۔ سارے ٹیکسی ڈرائیورز مجھے پہچانتے تھے اور میں بھی انہیں پہچانتا تھا۔ صرف یہی نہیں بلکہ میں قانون کے محافظوں کو بھی پہچانتا تھا۔ میرا ایک ہم جماعت کین اس وقت محکمہ سراغ رسانی کا لیفٹیننٹ انچارج تھا۔ میں ہوائی مستقر سے جتنی تیزی سے نکل سکتا تھا نکل کر مصنوعی بندرگاہ جانے والی سڑک پر گامزن ہو گیا جہاں دن اور رات میں کوئی فرق نہیں تھا۔ وہاں پہنچا تو تاریکی پھیل چکی تھی۔ میں جلد از جلد بیتھ کے پاس پہنچنا چاہتا تھا تاکہ اسے تمام واقعات سے آگاہ کر سکوں پھر اپنے ایک دو ہم پیشہ لڑکوں سے ملنا چاہتا تھا جو میرے ہمدرد تھے۔ اس کے بعد میں سینیئر سپو سے رابطہ قائم کرنا چاہتا تھا تاکہ اس سے آئندہ اقدام کے بارے میں دریافت کر سکوں۔ اگر اس نے مجھے دوبارہ اپنے گروہ میں شامل کرنے سے انکار کر دیا تو ہوائی بینک میں پڑے ہوئے چھتیس ہزار ڈالر سے میں بہت کچھ کر سکوں گا۔

آسمان پر چاند چمکنے لگا تھا اور سمندر چڑھ آیا تھا۔ رات کے ایک بجے میں نے اپنی جگہ سے حرکت کی۔ بیتھ کی جائے قیام وہاں سے ایک میل سے بھی کم فاصلے پر واقع تھی۔ میں جلد ہی پہنچ گیا۔ یہ ایک چھوٹا سا کاٹیج تھا اور اس اسٹور سے زیادہ دور نہیں تھا جہاں وہ ملازمت کرتی تھی۔ کاٹیج کی حالت خستہ تھی۔ شرم و احساس ندامت سے میرے کوٹ کے کالر میں گویا آگ لگ گئی اور گردن جھلسنے لگی۔ اسے ایسے خستہ حال کاٹیج میں نہیں رہنا چاہیے تھا۔ وہ یقیناً شیخ کے اس پار میرے مکان میں رہ سکتی تھی لیکن وہاں رہ کر ملازمت کی غرض سے روزانہ یہاں آنا امر محال تھا۔ شاید اس مکان میں اب سانپ بچھو اور دیگر حشرات الارض نے ڈیرے ڈال دیے ہوں گے۔ کاٹیج کے باہر کوئی پولیس کار نظر نہیں آئی۔ میں اس کی سیڑھیاں چڑھ کر دروازے پر پہنچ گیا اور دستک دی۔

"کون؟" فوراً ہی اس کی آواز آئی۔ شاید وہ جاگ رہی تھی یا پھر اونگھ رہی تھی۔ میں نے ایک گہری سانس لی۔

"چارلی۔"

جواب میں سناٹا چھا گیا پھر سینڈل کی کھٹ کھٹ کی آواز دروازے سے قریب ہو گئی پھر ایک کھٹاکے سے دروازہ کھلا اور وہ چاندنی میں نہا گئی۔ میں بھول بیٹھا تھا کہ وہ اس قدر حسین ہے۔ اس کے رخسار آنسوؤں سے تر تھے اور چاندنی میں چمک رہے تھے۔ اس کی آنکھوں کے گرد حلقے پڑ گئے تھے لیکن ان کے باوجود وہ بے پناہ حسین لگ رہی تھی اور مجھے یاد آ گیا کہ کبھی اس نے مجھے چاہا تھا لیکن میں زو کے چکر میں پڑ کر اس سے لاتعلق ہو گیا تھا۔ اس وقت وہ حسن سوگوار کی مکمل تصویر نظر آ رہی تھی۔

"تمہیں یہاں نہیں آنا چاہیے تھا چارلی۔" اس کے احمریں لبوں کو جنبش ہوئی۔ "اب سے دو گھنٹے پہلے پولیس یہاں آئی تھی اور میں نے کین سے وعدہ کیا ہے کہ تمہارے یہاں آتے ہی میں اسے تمہاری آمد سے مطلع کر دوں گی۔"

"تو تم سب کچھ جان گئیں؟" میں نے دھڑکتے دل سے پوچھا۔

"ہاں۔" اس نے اپنی پیشانی سے زلفوں کی ایک لٹ ہٹاتے ہوئے کہا۔ "میں جانتی ہوں اخبارات میں تفصیل شائع ہوئی ہے۔"

"لیکن بیتھ! میں نے کچھ نہیں کیا ہے۔ میں نے اسے قتل نہیں کیا ہے۔ میں نے تمہارا لفافہ اس کیبن میں پہنچنے سے پہلے نہیں کھولا تھا اور میں اس کے مضمون سے آگاہ نہیں تھا لیکن کیبن میں اسے پڑھتے ہی میں نے زو کو بتایا کہ میں اپنی بیوی کے پاس پامیدو سٹی جا رہا ہوں اور اور اسی وقت وہ ہو گیا...... کسی نے عقب سے میرے سر پر شدید ضرب لگا کر مجھے بے ہوش کر دیا اور ساتھ ہی زو کو بھی ہلاک کر دیا۔" میں ایک ہی سانس میں بولتا چلا گیا۔

"اور اب تم مجھ سے اس کہانی پر یقین کرنے کی توقع

رکھتے ہو؟"

"بیتھ!" میرا دل ڈوبنے لگا۔ "کیا میں نے کبھی تم سے جھوٹ بولا ہے؟"

وہ ایک لمحے کے لیے سوچ میں ڈوب گئی۔ "نہیں۔" دوسرے ہی لمحے اس نے سوچ سے ابھر کر کہا۔ "یہ واحد کام ہے جو تم نے نہیں کیا..... آؤ.....اس سے پہلے کہ پڑوسیوں میں سے کوئی تمہیں دیکھ لے اندر آجاؤ۔"

کمرے میں پہنچ کر میں نے اسے بانہوں میں بھرنا چاہا لیکن وہ جلدی سے پیچھے ہٹ گئی۔ "نہیں مجھے سوچنے کے لیے وقت درکار ہے۔ اب تم کیا کرنے کا ارادہ رکھتے ہو؟" اس نے پوچھا۔ میں نے اسے اپنے ارادے سے آگاہ کیا۔ میری بات سن کر وہ بولی۔ "گویا اگر قانون کی نظروں سے بچ کر تم ملک سے باہر جانے میں کامیاب ہو گئے تو وہی دھندہ دوبارہ شروع کرو گے۔ یعنی پھر سینڈ سیو کے لیے کام کرو گے.....؟"

"اس کے علاوہ میں کیا کر سکتا ہوں؟"

"انسان بنو۔" وہ بولی۔ "مگر تم نے اس لڑکی کو قتل نہیں کیا ہے تو کسی نہ کسی طریقے سے ہم یہ ثابت کر سکتے ہیں۔"

"کیسے.....؟"

"یہ میں نہیں جانتی۔" اس نے نفی میں سر ہلایا۔ "لیکن کوئی نہ کوئی صورت ضرور نکل سکتی ہے۔" اس نے عام عورتوں کی طرح ضد کی۔ "ممکن ہے میرے باس مسٹر کافنٹن اس سلسلے میں ہماری مدد کر سکیں۔"

مسٹر کافنٹن اس اسٹور کا مالک تھا جہاں وہ کام کرتی تھی۔ میں نے اس شخص کو کبھی پسند نہیں کیا تھا۔ پست قامت کلفنٹن بیس سال قبل اس شہر میں آیا تھا اور دیکھتے ہی دیکھتے یہاں کی تجارت پر چھا گیا تھا۔ اس کا اسٹور شہر کا سب سے بڑا اسٹور تھا۔ اگر کوئی تاجر اسے نیچا دکھانے کے لیے کوئی شے دو سینٹ کم قیمت پر فروخت کرتا تھا تو وہ اسے نیچا دکھانے کے لیے وہی شے پانچ سینٹ کم قیمت پر فروخت کر دیا کرتا تھا۔ لہٰذا شہر کے باسی اس کے اسٹور سے سودا خریدنے کو ترجیح دیتے تھے۔ اس نے ابتدا ایک بہت ہی چھوٹی دکان سے کی تھی لیکن اب اس کا اسٹور ایک وسیع و عریض چار منزلہ عمارت پر مشتمل تھا جہاں سوئی سے لے کر ہاتھی تک ہر شے دستیاب تھی اور اگر کوئی شے کلفنٹن کے اسٹور میں نہیں ہے تو گویا پورے شہر میں نہیں ہے۔

"وہ ہماری مدد کیوں کرنے لگا؟" میں نے بیتھ سے دریافت کیا۔

"وہ مجھ سے محبت کرتا ہے۔" بیتھ نے صاف گوئی سے کام لیا۔ "اس نے مجھے شادی کی پیش کش کی ہے اور اس پرانے مکان کو خریدنے کی بھی پیش کش کی ہے تاکہ میرے ہاتھ کچھ پیسے آجائیں اور مجھے ملازمت نہ کرنی پڑے لیکن یہ اس صورت میں ممکن ہے جب میں تمہیں طلاق دینے یا نہ دینے کا فیصلہ کر لوں۔"

"اوہ۔ اچھا!" میرے منہ سے بمشکل نکلا۔

"تمہیں میری بات یقیناً بری لگی ہوگی۔" وہ بولی۔

میں خاموشی سے بستر پر بیٹھ گیا اور اپنا سر دونوں ہاتھوں سے تھام لیا۔ "ٹھیک ہے بنی۔ مجھے تم سے کوئی شکایت نہیں ہے بلکہ افسوس ہے کہ میں نے تمہاری زندگی خراب کر دی۔"

وہ میرے پاس آبیٹھی۔ "ایسا مت کہو۔" اس نے کہا اور اپنا سر میرے شانے پر رکھ دیا۔ "حالات سنور جائیں گے جانم...... میں یہ تو نہیں جانتی کہ کیسے لیکن یقین ہے کہ ہم اسے سنوار لیں گے۔" اس کے لہجے میں گہرا اعتماد تھا۔ عین اسی لمحے ایک کار باہر رکی اور سیڑھیوں پر بھاری قدموں کی آہٹ پیدا ہوئی پھر دوسرے ہی لمحے دروازے پر دستک ہوئی۔ بیتھ اٹھ کھڑی ہوئی۔ "ہاں کون ہے؟"

"بیتھ...... میں کین ہوں۔" کین کی آواز آئی۔ "تمہارے آرام میں مخل ہونے پر معذرت چاہتا ہوں لیکن میں نے سوچا تمہیں اس بات سے آگاہ کر دوں کہ چارلی کو شمپا کی ایک ملبوسات کی دکان سے لباس خریدتے ہوئے دیکھا گیا اور ہم نے پامیلو سٹی کی تمام سڑکوں کی ناکہ بندی کر دی ہے۔"

"اوہ۔" بیتھ کے منہ سے نکلا۔

"میری خواہش ہے کہ وہ ادھر کا رخ نہ کرے۔" کین کی آواز تھکی تھکی سی تھی۔ "خدا جانتا ہے میں اسے نقصان پہنچانا نہیں چاہتا۔ وہ میرا بچپن کا دوست ہے لیکن تم ہی بتاؤ کہ میں کیا کروں؟"

"کین! ہو سکتا ہے کہ وہ قتل اس نے نہ کیا ہو؟"

"ہاں۔ ہو سکتا ہے۔" کین کا لہجہ تشکیک آمیز تھا۔ "خیر میں نے تمہیں آگاہ کر دینا بہتر سمجھا۔ تمہارا یہاں سے صرف ساٹھ میل کے فاصلے پر ہے۔ کیا میں یہاں کوئی محافظ بھیج دوں؟"

بیتھ کی انگلیاں میرے بازو میں دھنس گئیں۔ "نہیں کین میرے خیال میں یہ ضروری نہیں ہے۔ اگر وہ یہاں آیا بھی تو مجھے نقصان نہیں پہنچائے گا۔"

"ہاں۔" اس نے اتفاق کیا۔ "اچھا پھر ٹھیک ہے میں اس طرح اپنے ہر آدمی کو سڑکوں کی ناکہ بندی کے لیے استعمال کر سکوں گا لیکن وہ اگر کسی طرح سب کی نظروں سے بچ کر یہاں پہنچنے میں کامیاب ہو گیا تو فوراً مجھے مطلع کرنا۔" اتنا کہہ کر وہ مڑ گیا۔ ہم زینے پر اس کے قدموں کی دور ہوتی ہوئی آواز سنتے رہے۔ تھوڑی ہی دیر بعد کار اسٹارٹ ہونے کی آواز آئی اور رات کی خاموش فضا کو چیرتی ہوئی دور نکل گئی۔ میں اپنے رخسار پر بہتے ہوئے پسینے کو محسوس کر سکتا تھا۔ پولیس کے جوانوں نے میرے گرد جال پھیلا دیا تھا۔

بیتھ دوبارہ بستر پر بیٹھ گئی۔ "یہاں کوئی نہیں آتا۔" میں یہ مشورہ دینے والی تھی کہ مسٹر کلفٹن سے میرے مشورہ کرنے تک تمہیں قیام کرو لیکن اب معاملہ بگڑ گیا ہے۔ تمہارا یہاں ٹھہرنا خطرے سے خالی نہیں ہے۔ جب وہ لوگ تمہیں سڑکوں پر نہیں پائیں گے تو سمجھ جائیں گے کہ تم ناکہ بندی سے پہلے ہی یہاں آ چکے ہو اور پھر وہ اس مکان پر چھاپہ ماریں گے۔ اب تمہارے چھپنے کی ایک ہی جگہ رہ گئی ہے۔"

"کہاں؟" میں نے اس سے دریافت کیا۔

"پرانے مکان میں۔" اس نے جواب دیا۔ "تم اپنے مکان کو اور اس جزیرے کو کسی بھی شخص سے بہتر جانتے ہو۔ اگر تم نہ چاہو تو کوئی بھی تمہیں وہاں سے ڈھونڈ کر نکال نہیں سکتا۔ اب مجھے قید سے رہائی کے بعد سے اب تک کی تفصیل بتاؤ......؟"

میں نے اسے ایک ایک لمحے کی تفصیل سے آگاہ کیا لیکن کلفٹن کو اس معاملے میں گھسیٹا جانا مجھے اب بھی گوارہ نہ تھا۔ لہٰذا میں نے بیتھ پر اس کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ "تم کہتی ہو کہ وہ تمہاری محبت میں گرفتار ہے اور چاہتا ہے کہ تم مجھے طلاق دے کر اس سے شادی کر لو تو اس صورت میں جب اسے اس شہر میں میری موجودگی کا علم ہوگا تو وہ کس قسم کے ردعمل کا اظہار کرے گا؟ وہ یہ معلوم ہوتے ہی ایک لفظ کہے بغیر فون کی طرف ہاتھ بڑھائے گا اور پولیس کو طلب کر لے گا۔ وہ ایک تاجر ہے اور تاجرانہ ذہنیت رکھتا ہے۔ یہ سودا اس کے نزدیک بے حد سستا رہے گا۔ مجھے قتل کے جرم میں برقی کرسی نصیب ہوگی اور وہ بڑے آرام سے تمہیں حاصل کر لے گا۔ اس سے اچھی بات اور کیا ہو سکتی ہے؟"

"تم اس کے ساتھ انصاف نہیں کر رہے ہو؟" بیتھ نے جواب دیا۔ "وہ واقعی ایک بہت عمدہ اور معزز انسان ہے۔" وہ اپنے گھنگھریالے بالوں سے کھیلنے لگی پھر بولی۔ "اس کے علاوہ میں اس پر یہ ظاہر نہیں کروں گی کہ تم شہر میں موجود ہو ٹھیک ہے......؟"

میں نے اثبات میں سر ہلایا اور وہ دوبارہ گویا ہوئی۔ "میں اس کے سامنے صرف یہ خیال آرائی کروں گی کہ میں نہیں سمجھتی کہ تم نے اس لڑکی کو ہلاک کیا ہے۔ لہٰذا مجھے مشورہ دو کہ اس کی بے گناہی ثابت کرنے کے لیے کسی پرائیوٹ سراغ رساں کی خدمات حاصل کرنا کیسا رہے گا؟"

مجھے بیتھ کی یہ بات نامناسب نہیں لگی۔ وہ ایک شریف انسان تھا اور جزیرے کے بارے میں بھی بیتھ کا خیال صحیح تھا۔ میں وہاں غیر معینہ مدت تک پوشیدہ رہ

سکتا تھا۔

"ٹھیک ہے۔" میں نے تائید کی۔ "لیکن تم مجھ سے کس طرح رابطہ قائم کروگی؟"

"تم اس کی فکر مت کرو۔ کوئی نہ کوئی ایسی راہ نکال لوں گی کہ کین کو شک نہ ہو۔ آخر وہ ہمارا گھر ہے۔ مجھے وہاں آنے جانے سے کون روک سکتا ہے۔ ہوسکتا ہے میں اس کی مرمت کرانا چاہ رہی ہوں تاکہ فروخت کرسکوں۔" اس نے جواب دیا۔

"تم پچھلی بار وہاں کب گئی تھیں؟" میں نے دریافت کیا۔

"تمہاری اسیری کے فوراً بعد سے اب تک نہیں گئی۔" اس نے جواب دیا۔ "تمہاری عدم موجودگی میں وہ میری عدم توجہی کا شکار ہوکر رہ گیا لیکن اب تمہارے اس چکر سے نکلنے کے بعد ہم از سر نو اس میں رہائش اختیار کریں گے۔"

میں اٹھ کھڑا ہوا۔ بیتھ مجھے رخصت کرنے دروازے تک آئی اور مجھ سے مخاطب ہوئی۔ "چارلی! میں تم سے محبت کرتی ہوں۔"

"میں بھی تم سے محبت کرتا ہوں بیتھ۔" میں نے یقین دلایا۔ اب میں خود کو پہلے کی بہ نسبت بہتر محسوس کررہا تھا لیکن میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کوئی مجھے کس طرح بے گناہ ثابت کرسکتا ہے؟ میں وہاں رکنا چاہتا تھا۔ بیتھ کی بھی یہی خواہش تھی لیکن کین احمق نہیں تھا۔ میں اسے سڑکوں پر کہیں نظر نہیں آیا لہٰذا یہی اغلب تھا کہ اس بار وہ یقیناً یہاں چھاپہ مارے گا اور بیتھ کو اس سے آگاہ بھی نہیں کرے گا۔"

"میں جلد ہی تمہیں کوئی خوشخبری سناؤں گی ڈارلنگ۔" وہ محبت آمیز لہجے میں بولی۔

میں اسے خدا حافظ کہہ کر دبے پاؤں سیڑھیاں اتر کر چاندنی رات میں قریب ترین سڑک کی جانب روانہ ہو گیا۔ ابھی میں بمشکل بیس گز دور گیا تھا کہ کھجور کے درخت کے پیچھے سے ایک لمبا تڑنگا شخص نمودار ہوا۔

"اے۔" اس نے مجھے آواز دی۔ "تمہارا کیا نام ہے اور تم رات کے دو بجے ان اطراف میں کیا کررہے ہو؟"

میرا دماغ بھک سے اڑ گیا۔ سب سے پہلا خیال جو آیا وہ یہ تھا کہ کین نے یہاں اپنا محافظ متعین کردیا تھا۔ میرا ذہن تیزی سے سوچنے لگا۔ میں نے اسے اس سے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ وہ یقیناً محکمہ سراغ رسانی کا کوئی نیا ایجنٹ تھا۔ اگر اس نے مجھے گرفتار کرلیا تو اس کا واضح مطلب موت تھا۔ آلۂ قتل اس وقت بھی میری جیب میں پڑا ہوا تھا۔ وہ کوئی سوال کیے بغیر مجھے برقی کرسی پر بٹھا دیں گے۔ میرے پاس ایک ہی راہ تھی۔ یعنی اسے فریب دے کر بھاگ نکلوں......

"کیوں نہ...؟ میرا نام آسن ہے۔" میں نے جھوٹ کا سہارا لیا۔ "میں اس مکان میں رہتا ہوں۔" میں نے اس کی توجہ ہٹانے کے لیے ایک مکان کی جانب اشارہ کیا۔ "میں ایک کام سے شہر جارہا ہوں۔"

"اوہ۔ اچھا۔" اس نے جواب دیا اور اسی لمحے چاندنی میں اس کے ہاتھ میں موجود کوئی شے چمک اٹھی۔ پہلی نظر میں میں نے سمجھا کہ وہ مجھ پر ریوالور تاننا چاہتا ہے لیکن دوسرے ہی لمحے اس نے بازو پیچھے کرکے ایک قوس بنائی اور تب میں سمجھ گیا کہ اس کے ہاتھ میں کون سی شے ہے۔ میں اس کے بازو لہرانے سے پہلے ہی دو قدم پیچھے ہٹ گیا تھا اور ساتھ ہی اپنا پیٹ بھی پچکا لیا تھا پھر اس سے قبل کہ وہ سنبھلتا میرے وزنی ہاتھ کا آہنی مکا پوری قوت سے اس کے جبڑے پر پڑا۔ وہ اچھل کر دور جا گرا اور وہیں ساکت ہوگیا۔ وہ بے ہوش ہوچکا تھا۔ میں نے ماچس کی تیلی جلا کر اس کی روشنی میں اس کے چہرے کا قریبی جائزہ لیا لیکن یہ ایک نامانوس چہرہ تھا۔ میں اسے پہچاننے سے قاصر رہا۔ تاہم وہ جو کوئی بھی تھا پولیس آفیسر نہیں تھا اور اگر تھا تو یہ پہلا پولیس آفیسر تھا جس کے پاس میں نے چھ انچ کا چاقو دیکھا تھا۔ اسی لمحے قریبی مکان کی دوسری منزل کی کھڑکی کھلی اور کسی بوڑھی خاتون نے جھانک کر گھبرائے ہوئے لہجے

میں کہا۔ "کون ہے؟ یہاں کیا ہو رہا ہے؟"

میں نے جواب دینا مناسب نہیں سمجھا اور خاموشی سے تیز تیز قدم اٹھاتا چل دیا۔ بوڑھی خاتون نے بڑبڑا کر کھڑکی بند کر لی تھی۔

☆☆☆......

دریا کا پانی کافی گرم تھا لیکن ہوا سرد تھی۔ دریا اتر رہا تھا۔ میں نے تین سال سے تیراکی نہیں کی تھی جب میں عین وسط میں پہنچا تو میرا ایک جوتا اس تختے سے پانی میں گر گیا جس پر میں نے اپنا لباس اور جوتا رکھا تھا اور تیرنے کے ساتھ ساتھ اسے دھکیلتا بھی جا رہا تھا حالانکہ میں کوئی کشتی بھی چرا کر دریا عبور کر سکتا تھا لیکن یہ خطرے کو دعوت دینے کے مترادف ہوتا۔ اس چاقو بردار کے خیال نے مجھے پریشان کر رکھا تھا۔ وہ کون تھا اور اس نے یہ کیسے جانا تھا کہ میں بیتھ کے کاٹیج سے نکلوں گا؟ اس نے مجھے ہلاک کرنے کی کوشش کیوں کی تھی؟ یہ وہ شخص نہیں تھا جس نے زرو کو ہلاک کیا تھا؟ اس کا مجھے یقین تھا کیونکہ اس کی آواز اس آواز سے مختلف تھی جس نے پوچھا تھا۔ "تم اسے لے آئیں؟" نہ ہی یہ وہ شخص تھا جس نے مجھے ضرب لگائی تھی۔ یہ شخص تو دبلا پتلا تھا۔ اگر اس نے ضرب لگائی ہوتی تو میں موقع پر ہی ہلاک ہو جاتا۔

میں تیرتا ہوا ساحل پر پہنچ گیا اور لباس پہن لیا۔ اب میں محفوظ تھا۔ یہ میرا جزیرہ تھا۔ میرا پرانا جال اب بھی رسی پر لٹک رہا تھا اور میری کشتی آدھی ریت میں دھنسی ہوئی تھی۔ میرا مکان یہاں سے زیادہ فاصلے پر نہیں تھا۔ میں مکان کی طرف چل دیا۔ میرے پیر ننگے تھے لیکن مجھے امید تھی کہ میرے پیر کسی سانپ پر نہیں پڑیں گے۔ میں جنگل جھاڑیوں میں راستہ بناتا ہوا اپنی راہ پر گامزن تھا۔ مجھے بے حد محتاط رہنا تھا کیونکہ قیاس تھا کہ کہیں اس مکان پر بھی چھاپہ مارے گا پھر میرے ذہن کی باگ بیتھ کی جانب مڑ گئی اور اس کے حوالے سے مجھے یاد آ گیا کہ ہم دونوں کو خوراک کا خیال نہیں آیا تھا لیکن اب کیا ہو سکتا تھا؟ مجھے بھوکا رہنا تھا۔ ہاں ایک صورت ممکن تھی۔ وہ یہ کہ میں مچھلیوں اور خرگوشوں کا شکار کر کے اپنا پیٹ بھر سکتا تھا۔ میں اپنے مکان پر پہنچ گیا تھا۔ مکان کی حالت انتہائی ابتر ہو رہی تھی۔ یہ تین سال سے ویران پڑا تھا۔ ہر شے پر منوں گرد پڑی تھی اور جا بجا مکڑیوں نے جالے بن دیے تھے۔ کیا عجب کہ چمگادڑوں نے بھی بسیرا کر رکھا ہو۔ مکان کی کھڑکیاں بند تھیں۔ مجھے یہ سوچ کر حیرت ہونے لگی کہ کلفٹن نے اس مکان کو خریدنے کی پیش کش کیوں کی تھی؟ میں دروازہ کھول کر مکان میں داخل ہو گیا۔ سامنے والے وسیع و عریض کمرے میں سیلن کی بو رچی ہوئی تھی۔ میں نے ماچس کی تیلی جلائی اور اس کی روشنی میں ایک کیروسین لیمپ ڈھونڈ نکالا جس میں تھوڑا سا تیل تھا۔ میں نے اسے جلا دیا۔ تین سال کی ویرانی کے باوجود یہ گھر مجھے اچھا لگا۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ یہ میرا اپنا گھر تھا۔ کم از کم میں یہاں آزادی کی سانس تو لے سکتا تھا۔ بیتھ کا کلفٹن سے مشورہ کرنا مجھے اب بھی عجیب لگ رہا تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ بیتھ کو کوئی اچھا مشورہ کیوں دینے لگا۔ یہ خود اپنے پیروں پر کلہاڑی مارنے کے مترادف تھا۔ کچن میں خوراک کے چند سر بمہر ڈبے موجود تھے۔ خوراک کا مسئلہ حل ہو گیا تھا۔ میں ایک ہاتھ میں لیمپ پکڑے اس کی روشنی میں دوسری منزل پر پہنچ کر اپنی اور بیتھ کی خواب گاہ کے دروازے پر رک گیا۔ اچانک مجھے یوں محسوس ہوا کہ کوئی میری نگرانی کر رہا ہے۔ اس احساس نے میری ریڑھ کی ہڈی میں خوف کی ایک سرد لہر دوڑا دی۔ میں لیمپ کو اونچا کر کے خواب گاہ میں داخل ہو گیا۔ اس کی حالت خاصی ابتر ہو رہی تھی۔ بیتھ نے کبھی پلٹ کر اس کی خبر نہیں لی تھی۔ میں سگریٹ سلگانا چاہتا تھا کہ معاً خیال آیا کہ میرے پاس بمشکل دو تین سگریٹ ہوں گے۔ مجھے سگریٹ کا خیال بھی نہیں آیا تھا۔ میں سگریٹ پینے کا ارادہ ترک کر کے خواب گاہ سے ملحق بالا خانے کی جانب بڑھا اور اس کے وزنی دروازے پر دباؤ ڈال کر بالا خانے میں داخل ہو گیا۔ اچانک ہوا کے تیز جھونکے سے لیمپ

بجھ گیا۔ میں اس جھونکے کو کوستا ہوا دو قدم آگے بڑھ کر فرش پر بیٹھ گیا اور لیمپ کو دوبارہ جلانے کی خاطر ماچس کی تیلی جلائی اور پھر میں نے دیکھا میں تنہا نہیں تھا۔ کم از کم ایک درجن افراد دیوار گیر نشست پر بیٹھے تھے اور ان کے چہرے ہر تاثر سے عاری تھے۔ ان سب کی نگاہیں مجھ پر مرکوز تھیں۔ میں حیرت سے پھٹی پھٹی نظروں سے انہیں تکنے لگا پھر اچھل کر کھڑا ہو گیا۔ ”کیا بات ہے؟“

”کسی نے پھونک مار کر تمہارا لیمپ بجھا دیا تھا۔“ ان میں سے ایک پتلے چہرے والے کے لبوں پر جنبش ہوئی۔ دوسرے نے بڑھ کر لیمپ میرے ہاتھ سے چھین لیا۔ میں نے اس پستول کو ٹٹولا جس سے عذر کو ہلاک کیا گیا تھا لیکن وہ پستول میرے کوٹ میں تھا اور میں کوٹ کچن میں چھوڑ آیا تھا۔ دوسرے ہی لمحے کم از کم ایک درجن گھونسے میرے جسم پر تابڑ توڑ برسنے لگے۔ میں نے بھاگنا چاہا لیکن کسی نے اپنا پیر میرے پیر میں پھنسا دیا۔ میں منہ کے بل گرا اور پھر انہوں نے مجھے گھونسوں پر رکھ لیا۔ مجھے بے ہوش ہونے میں زیادہ دیر نہیں لگی۔

وہ شاید کوئی خواب تھا۔ میرا جسم بھیگا ہوا تھا...... میں کانپ رہا تھا اور سمندر کی تہہ میں بیٹھتا جا رہا تھا پھر اچانک ہی ذہن میں خطرے کی گھنٹی بجنے لگی اور میرے حواس بیدار ہو گئے۔ یہ کوئی خواب نہیں تھا بلکہ میں حقیقتاً ڈوب رہا تھا۔ میری کمر کے گرد رسی سے کوئی بھاری پتھر بندھا ہوا تھا...... میں اسی کے زور پر سمندر کی تہہ میں بیٹھتا جا رہا تھا۔ میں کسی نہ کسی طرح اپنی جیب میں سے چاقو نکالنے میں کامیاب ہو گیا اور اس کی مدد سے رسی کاٹ ڈالی۔ اس بندش سے آزاد ہوتے ہی میں تیزی سے ابھرتا چلا گیا...... اس سے قبل کہ میرے پھیپھڑے پھٹ جاتے میں سطح پر ابھر آیا۔ میں نے منہ کھول کر زور زور سے سانس لی اور دوبارہ غوطہ لگا کر ایک طرف تیرنے لگا اور جب دوبارہ اپنا سر ابھارا تو تقریباً پانچ سو فٹ کے فاصلے پر مجھے کسی کشتی کی گردش کرتی ہوئی روشنی نظر آئی۔ میں پانی کے بستر پر پشت کے بل دراز ہو کر خاموشی سے تیرتا ہوا ان سے دور ہونے لگا لیکن میری نظریں اس روشنی پر بدستور جمی ہوئی تھیں اور میں پوری طرح چوکنا تھا پھر وہ کشتی ساحل کی جانب روانہ ہو گئی...... اس کی روشنی مجھ سے دور ہوتی چلی گئی اور پھر غائب ہو گئی۔ میں کھلے سمندر میں تنہا رہ گیا۔ کچھ دیر کے بعد میں نے سر ابھار کر ساحل کی جانب دیکھا...... وہاں کوئی روشنی نظر نہیں آ رہی تھی۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ میں ساحل سے کافی دور تھا۔ میں دوبارہ پشت کے بل لیٹ کر تیرنے لگا۔ یہاں تک کہ میری سانس معمول پر آ گئی۔ میں اسی طرح نہ جانے کتنی دیر تک تیرتا رہا۔ یہاں تک کہ ساحل کی ایک روشنی کسی ستارے کی مانند جگمگاتی ہوئی نظر آنے لگی۔ میں نے اسی جانب تیرنا شروع کر دیا۔ اب میں ساری باتیں جان چکا تھا۔ میں یہ جان چکا تھا کہ عذر کو کس نے قتل کیا

خاموشی

خاموش رہنا بھی کبھی کبھی سوال بن جاتا ہے اگر یوں کہا جائے کہ خاموشی بے شک سوال تو غلط نہ ہوگا۔ خاموشی جہاں دوسروں کے لیے سوال بن جاتی ہے وہاں آپ کے لیے اس سوال کا جواب جو کوئی دوسرا فرد آپ کو نہیں دے سکتا۔ خاموشی تنہائی میں آپ کو وقت دیتی ہے خود کو جاننے پہچاننے کا۔ جہاں یہ آپ کا تعلق دوسروں سے توڑ دیتی ہے وہیں آپ سے آپ کا تعلق بے حد مضبوط بنا دیتی ہے مگر اس کا مطلب یہ نہیں کہ آپ سب سے اپنا تعلق توڑ لو اور خود میں ہی کھوئے رہو یوں تو ایسا ہوگا کہ آپ ہو یا نہیں کوئی فرق ہی نہیں پڑتا اور کبھی کبھی خاموش رہنا بے وقوفی کہلاتا ہے بولو ضرور پر وہاں جہاں بولنا ضروری ہو۔ آپ کے لیے اور سب کے لیے اس طرح خاموشی سوال نہیں بلکہ جواب کے روپ میں سوال بن جاتی ہے۔

مبشرہ سحر...... عبدالحکیم

ہے اور یہ کہ وہ مجھے لینے کے لیے کیوں آگئی تھی اور یہ بھی کہ میرے اکاؤنٹ میں پچیس ہزار ڈالر کیوں جمع کیے گئے تھے۔ میں نہ صرف یہ جان گیا تھا کہ اسے کس نے ہلاک کیا ہے بلکہ یہ بھی سمجھ گیا تھا کہ اسے کیوں ہلاک کیا گیا ہے...... مزید برآں میں یہ بھی جان گیا تھا کہ وہ ایک درجن بدمعاش میرے مکان پر کیوں اور کس طرح بھیجے گئے تھے۔

آسمان تاریک ہو چلا تھا۔ سارے ستارے نہ جانے کہاں غائب ہو گئے تھے۔ ساحل پر صرف ایک روشنی تاریکی دور کرنے کی کوشش میں مصروف تھی۔ میں ساحل پر پہنچ کر ایک طرف پڑے ہوئے کائی زدہ تختے پر لیٹ گیا اور سستانے کی غرض سے آنکھیں موند لیں۔ تھوڑی دیر کے بعد آنکھیں کھولیں تو سحر طلوع ہو رہی تھی۔ فضا سے اندھیرا دور ہو رہا تھا۔ میں اٹھ کر تیزی سے دوبارہ اپنے مکان کی سمت روانہ ہو گیا۔ مکان حسب معمول سنسان پڑا تھا۔ وہ ایک درجن جرائم پیشہ جنہوں نے مجھے دریا میں ڈبو کر ہلاک کرنا چاہا تھا وہاں نہیں تھے مجھے بھوک ستا رہی تھی لہٰذا میں نے کچن میں جا کر ایک سربند ڈبا کھولا اور جیسے تیسے پیٹ بھر لیا۔ میرا بھیگا ہوا لباس جسم سے چپک گیا تھا۔ مجھے یاد آیا کہ وارڈ روب میں میرے پرانے لباس رکھے ہوئے تھے۔ میں نے وارڈ روب کھولا تو چند جوڑے نظر آئے۔ میں نے جلدی جلدی بھیگا لباس اتار کر خشک لباس پہن لیا اور سگریٹ سلگا کر ایک کرسی پر خاموشی سے بیٹھ گیا۔ مجھے آٹھ بجنے کا انتظار تھا اور یہ وقت کسی نہ کسی طرح کاٹنا تھا۔ خدا خدا کر کے آٹھ بج گئے۔ کالفنن کا اسٹور صبح آٹھ بجے سے آدھی رات تک کھلا رہتا تھا جب میں وہاں پہنچا تو نو بج رہے تھے لیکن میں نے عام شاہراہ کے بجائے دوسری راہ منتخب کی تھی۔ سگریٹ کے کاؤنٹر پر رکھے ہوئے اخبار کی سرخیاں اب بھی چیخ رہی تھیں۔ ان کے مطابق میں اب تک پولیس کے ہاتھ نہیں آیا تھا۔ میں ان سڑکوں پر بھی نظر نہیں آیا جن کی ناکہ بندی کی گئی تھی نہ ہی پالسیوسٹی میں نظر آیا تھا۔ خبر میں میرا حلیہ بیان کیا گیا تھا۔ ساتھ ہی یہ بھی لکھا گیا تھا کہ میں مسلح ہوں۔ میں نے گہری نیلی قمیص اسپورٹس کوٹ اور سفید جوتے پہن رکھے ہیں اور سر پر ہیٹ نہیں ہے۔ میں نے خبر پڑھ کر اپنا جائزہ لیا۔ میرے پیروں میں سیاہ رنگ کے پرانے جوتے تھے جو میں نے اپنے مکان سے ڈھونڈ کر پہن لیے تھے۔ میرا اسپورٹس کوٹ اب بھی کچن میں پڑا ہوا تھا اور اس وقت میں نے بادامی رنگ کی قمیص اور بھوری پتلون پہن رکھی تھی۔ میں نے اخبار اٹھا کر تہہ کر لیا اور جیب سے میں سینٹ نکال کر سگریٹ کاؤنٹر پر موجود لڑکی کو دے دیے۔ ساتھ ہی اسے عام سے لہجے میں مخاطب کیا۔ ”سنا تھا کہ بیتھ نام کی ایک خاتون سگریٹ کاؤنٹر پر کام کرتی تھی۔ وہ اس وقت کہاں مل سکتی ہے؟“

”تم نے درست سنا تھا۔“ لڑکی نے میرے چہرے کی جانب دیکھ کر کہا۔ ”اس وقت وہ مسٹر کالفنن کے آفس روم میں ملے گی۔“

میں اس کا شکریہ ادا کر کے لفٹ کی جانب بڑھ گیا۔ لوگوں نے مجھے دیکھا لیکن ایک نظر دیکھنے کے بعد دوسری نظر ڈالنے کی زحمت نہیں کی۔ اپنے دھندوں سے فرصت نہیں تھی کہ مجھے شناخت کرتا۔ کالفنن کا دفتر چوتھی منزل پر تھا۔ لفٹ چوتھی منزل پر رکی تو میں باہر نکل آیا۔

یہ ایک بڑا سا سجا سجایا کمرہ تھا۔ میں نے شیشے کی دیوار کے اس پار سے کالفنن کو کہتے ہوئے سنا۔ ”مائی ڈیئر تم جانتی ہو کہ میں تمہاری مدد کرنا چاہتا ہوں لیکن میں نہیں سمجھتا کہ کوئی پرائیوٹ سراغرساں اس سلسلے میں کیا کر سکے گا...... تمہارے آج صبح یہ ذکر چھیڑنے کے بعد میں نے لیفٹیننٹ کین سے گفتگو کی تھی۔ اس کا کہنا ہے کہ اس میں شک و شبے کی کوئی گنجائش نہیں کہ مائٹ نے ہی لڑکی کو قتل کیا ہے۔“

”میں یقین نہیں کرتی۔“ بیتھ کا لہجہ سخت تھا۔

میں دروازہ کھول کر آفس میں داخل ہو گیا۔ کالفنن نے ہاتھ لہرا کر مجھے باہر نکلنے کا اشارہ کیا۔ ”مجھے افسوس ہے جناب۔“ اس نے کہا۔ ”اس وقت میں بے حد مصروف



ہوں۔ کسی اور وقت تشریف لائیں۔"

میں نے دروازہ اپنے عقب میں بند کر دیا۔ جیتھ نے گردن موڑ کر مجھے دیکھا اور منہ سے بلند ہونے والی چیخ روکنے کے لیے ایک ہاتھ کھلے منہ پر رکھ لیا۔ "چارلی۔" دوسرے ہی لمحے وہ حیرت سے تقریباً چیخ پڑی۔ "تم یہاں کیا کر رہے ہو؟"

میں نے جواب دینے کے بجائے ایک کرسی گھسیٹ کر بیٹھ گیا پھر گویا ہوا۔ "گزشتہ رات تم سے جدا ہونے کے بعد چند غیر معمولی واقعات پیش آئے ہیں اور جیسا کہ تم نے کہا تھا مسٹر کلفنٹن ہماری مدد کریں گے تو میں بھی سوچ کر آ گیا کہ دیکھوں یہ کس طرح ہماری مدد کر سکتے ہیں؟"

کوتاہ قامت بلند پیشانی' خضاب سے رنگے ہوئے بالوں اور بڑی بڑی آنکھوں والا کلفنٹن مجھے یوں گھور رہا تھا گویا میں بھوت ہوں۔ "کچھ نہیں۔" اچانک اس کے منہ سے نکلا۔ "یقیناً میں کچھ نہیں کر سکتا۔ ابھی میں یہی بات جیتھ کو...... میرا مطلب ہے مسز وائٹ کو بتا رہا تھا۔" اس نے جلدی سے تصحیح کی پھر گویا ہوا۔ "لیفٹیننٹ کین کہتا ہے کہ اس میں شک و شبے کی کوئی گنجائش نہیں ہے اور جہاں تک میری ذات کا تعلق ہے تو میں اس سارے معاملے میں ملوث ہونا نہیں چاہتا۔"

"ابھی تم کہہ رہے تھے کہ چند غیر معمولی واقعات پیش آئے ہیں۔ ان سے تمہاری کیا مراد ہے؟" جیتھ نے مجھے مخاطب کیا۔

میں نے سگریٹ سلگایا اور سارے واقعات شروع سے آخر تک بیان کر دیے۔ میرے خاموش ہونے پر کلفنٹن نے لب کھولے۔ "یہ بکواس ہے۔ بھلا وہ لوگ کون ہو سکتے ہیں؟"

"وہ کیوبا اور میکسیکو کے جرائم پیشہ افراد تھے جنہیں ایک دفعہ سینیور ریو نے میرے کسی ہم پیشہ ملاح کے ذریعے ان کے ملکوں سے یہاں اسمگل کیا تھا۔" میں نے جواب دیا پھر انگلی اٹھا کر گویا ہوا۔ "وہ مکان ایک بالکل

الگ تھلگ اور دور افتادہ گوشے میں واقع ہے اور اس کا جائے وقوع انتہائی شاندار ہے۔ کوئی بھی بوٹ انہیں وہاں اتار سکتی ہے...... اور وہاں سے مختلف جگہوں پر پھیلا بھی سکتی ہے۔ وہ سیاح کے بھیس میں ساحل ساحل پھیل سکتے ہیں اور جب تک کوئی انہیں شناخت نہ کر لے کہ وہ بھگوڑے ہیں جرائم پیشہ ہیں اور غیر قانونی طور پر اس ملک کی سرحد میں داخل ہوئے ہیں کوئی ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ میرا خیال ہے کہ ان کے پاس جعلی کاغذات ہیں اور مجھے ایسا لگتا ہے کہ وہ سینیور سیپو کے لیے کام کر رہے ہیں۔"

کلفشن سخت بدحزہ نظر آنے لگا تھا۔ "مجھے تمہاری باتوں پر یقین نہیں آیا۔" وہ بولا۔ "اگر تم نے اپنی کمر کی رسی کاٹ بھی لی ہوتی تو اتنی دور تک تیرنا ممکن نہیں تھا۔"

"چارلی کے لیے یہ ناممکن نہیں تھا۔" بیتھ بول پڑی۔ "یہ غضب کا تیراک ہے اور شاید تمہیں علم نہ ہو کہ جنگ کے دوران اس نے پانی کے اندر رہ کر بڑے بڑے کارنامے سرانجام دیے ہیں۔ یہ ایک ماہر غوطہ خور بھی ہے۔"

کلفشن کی آنکھوں میں میرے لیے احترام جھلکنے لگا پھر وہ سگریٹ سلگا کر گویا ہوا۔ "میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میں کیا کہوں اور کیا نہ کہوں......؟ اب یہ بتاؤ چارلی کہ تم مجھ سے کیا چاہتے ہو......؟"

"میں چاہتا ہوں کہ تم اور بیتھ میرے مکان تک چل کر میرے بیان کی تصدیق کرو۔ دیگر لفظوں میں مجھے ایک ایسے دوست کی ضرورت ہے جو غیر جانب دار اور معزز شخص ہو تاکہ جب میں عدالت میں یہ بیان دوں تو وہ میری اس کہانی کی تصدیق کر سکے۔"

اس نے ایک لمحے کے لیے میری بات پر غور کیا۔

"تمہارے خیال میں یہ سینیور سیپو کون ہو سکتا ہے؟"

"یہ میں نہیں جانتا؟" میں نے جواب دیا۔ "لیکن اتنا ضرور جانتا ہوں کہ یہ سینیور سیپو ہی تھا جس نے زوکو بلاک کر کے میری گردن پھنسوانے کی کوشش کی ہے یہ سینیور سیپو تھا جس نے گزشتہ رات بیتھ کے کاٹیج کے باہر ایک چاقو بردار شخص کو متعین کیا تھا تاکہ وہ مجھے قتل کر دے اور یہ سینیور سیپو ہی تھا جس نے اپنے آدمیوں کے ذریعے مجھے سمندر میں پھنکوا دیا تھا۔"

"لیکن کیوں؟" اس نے سوال کیا۔

"یہ میں نہیں جانتا؟" میں نے جواب دیا۔ "جب تک اس کی شخصیت سے پردہ نہیں ہٹتا میرے لیے یہ بتانا ممکن نہیں۔"

وہ سر جھکا کر چند لمحے غور کرتا رہا اور میز کی سطح پر انگلیاں بجاتا رہا۔ بیتھ اس کی جانب دیکھ کر مسکرائی۔ "پلیز۔"

اس نے واقعی اس کو تاہ قامت کو اپنی زلف کا اسیر بنا رکھا تھا۔ اس کی مسکراہٹ کام کر گئی۔

"اچھا ٹھیک ہے۔" بالآخر کلفشن کے منہ سے نکلا "لیکن بہتر ہے کہ وہاں جانے سے پہلے آپس میں ایک سمجھوتہ کر لیں۔ اور وہ یہ کہ اگر تمہارے بیان کی تصدیق...... نہ ہو سکی تو وہاں سے واپس آتے ہی تم فوراً خود کو قانون کے حوالے کر دو گے تاکہ وہ لوگ اپنی کاروائیاں شروع کر سکیں۔ ٹھیک ہے؟"

"ہاں ٹھیک ہے۔" میں نے جواب دیا۔

"پھر تم میری بوٹ پر جاؤ۔ ہم دونوں تمہارے پیچھے آ رہے ہیں۔" اس نے کہا۔

☆......☆......☆

ساحل کی جانب بڑھتے ہوئے میں چند پولیس والوں کے قریب سے گزرا لیکن وہ مجھے پہچان نہ سکے لہٰذا روکنے کی کوشش نہیں کی۔ ساحل پر کلفشن کی اڑتیس فٹ لمبی موٹر بوٹ کھڑی تھی۔ اس میں دو کیبن تھے۔ اگر وہ ایک اچھا تاجر نہ ہوتا تو ایک اچھا کپتان ضرور ہوتا۔ میرے وہاں پہنچنے کے تھوڑی ہی دیر بعد وہ بیتھ کے ہمراہ آ گیا اور ہم آبنائے کو عبور کر کے اپنی منزل کی سمت چل پڑے۔

دن کی روشنی میں وہ پرانا مکان رات کی چاندنی کی بہ نسبت بہتر لگ رہا تھا۔ میں سب سے پہلے کچن میں گیا جہاں میرا کوٹ رکھا ہوا تھا لیکن اب وہ کوٹ موجود نہیں تھا

اور اس کے ساتھ ہی وہ پستول بھی نہیں تھا جس سے زو کو ہلاک کیا گیا تھا۔ میں نے صبح اس جانب دھیان نہیں دیا تھا اور مجھے یاد نہیں آ رہا تھا۔ اس وقت وہ وہاں موجود تھا یا نہیں۔ یقیناً نہیں ہوگا بلکہ رات ہی میں ان لوگوں نے اسے غائب کر دیا ہوگا۔ کافمین بے چین نظر آ رہا تھا۔ "میرا خیال ہے ہم پہلے چل کر وہ بالا خانہ دیکھ لیں۔"

میں سیڑھیوں کی جانب بڑھ گیا۔ میرے پیچھے زینے طے کرتے ہوئے اس نے پوچھا۔ "کیا تمہارے پاس پستول ہے؟"

"نہیں۔" میں نے جواب دیا۔

"پھر میں نے اپنے ساتھ ایک پستول لا کر اچھا کیا۔" اس کا لہجہ واضح طور پر معنی خیز تھا۔ "خدا جانتا ہے میں مکڑیوں کے جالے سے بھرے ہوئے اس بالا خانے میں بغیر پستول کے نہیں جا سکتا تھا جس میں جرائم پیشہ جھگڑے موجود ہوں۔"

دوسری منزل پر پہنچ کر میں نے ایک طویل سانس لی اور بالا خانے کا بھاری دروازہ کھول دیا۔ بالا خانے کا فرش گرد سے اٹا ہوا تھا اور اس کی دیواروں کے ساتھ کوئی نشست نظر نہیں آ رہی تھی بلکہ قدیم فرنیچر پہلے کی طرح سجا ہوا نظر آ رہا تھا۔ بیتھ رونے لگی۔ کافمین ایک لمحہ خاموش کھڑا رہا پھر اس نے اپنا پستول نکال لیا اور مجھے بچلی منزل پر چلنے کا اشارہ کیا۔ "مجھے ڈر تھا کہ ایسا ہی ہوگا۔" اس نے کہا۔ "پھر تم پریوں کی داستان سنا کر اور ہم سے اس کی تصدیق چاہ کر کیا فائدہ حاصل کرنا چاہتے تھے؟"

"یہ پستول کیوں؟" میں نے پستول کی جانب اشارہ کیا۔

"تمہارا ذہنی توازن درست نہیں ہے۔" اس نے جواب دیا۔ "ہو بھی نہیں سکتا۔"

میں ایک سگریٹ سلگا کر اس سے ملحق خواب گاہ کے بند دروازے سے ٹک گیا۔ "ہو سکتا ہے۔" میں نے کہا۔ "خدا جانتا ہے کہ میں نے دنیا دیکھی ہے لیکن سینور سیو ایک بات بتاؤ۔ کیا تم نے کوئی ایسا بالا خانہ دیکھا ہے جو تین سال سے بند پڑا ہو اور اس کے باوجود وہاں کہیں مکڑیوں کے جالے کا نام و نشان تک نہ ہو۔"

"تم نے مجھے ابھی کس نام سے پکارا؟" اس کا لہجہ سرد تھا۔

"پہلے میری بات کا جواب دو لیکن نہیں۔ تم نے کبھی جواب نہیں دیا ہے پھر..... تم اپنے آدمیوں کو گزشتہ رات یہاں سے چلتا کر سکتے ہو تم دیوار گیر نشستوں کو ہٹا سکتے ہو اور ان کی جگہ پرانے فرنیچر کو دوبارہ سجا سکتے ہو لیکن مکڑی کے جالے کو دوبارہ نہیں بنا سکتے۔ یہ کام صرف مکڑیاں ہی کر سکتی ہیں۔"

اس نے اپنے خشک لبوں پر زبان پھیری اور کہا۔ "تم دیوانے ہو گئے ہو تمہارا دماغ چل گیا ہے۔"

"ہم یہ قانون پر چھوڑ تے ہیں اور جب قانون اس معاملے میں دلچسپی لے رہا ہے تو میں اس کے محافظوں سے درخواست کروں گا کہ وہ اس بات کو چیک کریں کہ جب زو ہلاک ہوئی تو تم اس وقت کہاں تھے۔ مجھے شک ہے کہ تمہارے پاس اپنی موجودگی کا ثبوت نہیں ہوگا۔ ہو بھی نہیں سکتا کیونکہ یہ تم ہی تھے جس نے مجھے ضرب لگا کر بے ہوش کرنے کے بعد زو کو ہلاک کیا تھا۔"

"میں ایسا کیوں کرنے لگا؟" وہ غرایا۔

میں نے بیتھ کی جانب اشارہ کیا۔ "میری بیوی کو حاصل کرنے کی خاطر تم نے ایسا کیا۔ تم مجھے خرید سکتے تھے لیکن اسے خریدنا تمہارے بس کی بات نہیں تھی۔ کسی کے بس کی بھی بات نہیں ہے۔ تم نے مجھے خریدنا چاہا تھا اور اسی لیے زو کو مجھ سے ملنے بھیجا تھا۔ اسی لیے تم نے چھتیس ہزار ڈالر ہوانا بینک میں میرے نام جمع کرائے تھے..... جب ہی تم نے زو کو ہدایت کی تھی کہ وہ مجھے لے کر ہوانا چلی جائے۔ یہی وجہ تھی کہ تم اس وقت کیبن میں موجود تھے تاکہ مجھے دیکھ سکو کہ اس نے تمہاری ہدایت پر عمل کیا ہے یا نہیں؟ اس وقت تک سب کچھ ٹھیک تھا لیکن جب میں نے بیتھ کا خط پڑھا تو اپنا ارادہ بدلنے پر مجبور ہو گیا۔ میں نے زو سے کہا کہ میں اپنی بیوی کے پاس

واپس جارہا ہوں۔ یہ تم تھے جسے دیکھ کر زو چیخی تھی پھر تم نے اسے گولی ماردی۔ تم نے ایسا اس لیے کیا کیونکہ تمہیں اپنے مقصد کے حصول کا کوئی اور ذریعہ نظر نہیں آیا۔ ظاہر ہے میں اس کے قتل کے الزام میں گرفتار ہو کر بیتھ کے پاس پہنچنے کے بجائے واپس رہے فورڈ جیل پہنچ جاتا اور اس طرح تمہارے راستے کا کانٹا ہمیشہ ہمیشہ کے لیے دور ہو جاتا۔"

سینیور سیپو ہنسا۔ "تمہاری یہ کہانی سن کر جیوری کے ارکان ہنسے بغیر نہیں رہیں گے۔"

"ٹھیک ہے ہم دونوں پولیس کے پاس چلتے ہیں۔ میں اپنی کہانی سناتا ہوں اور تم اپنی کہانی سنانا۔ فیصلہ وہ خود کر لیں گے۔"

"نہیں۔" اس نے نفی میں سر ہلایا۔ "میں ایسا ہرگز نہیں کر سکتا۔ میرے دشمن اس واقعے کی بھنک ملتے ہی اس کی تشہیر کر دیں گے اور اس سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کریں گے۔"

"تمہارے کہنے کا مطلب یہ ہے تم اس بات سے خوف زدہ ہو کہ پولیس تمہارے والو چرز کی چھان بین کرے گی اور اس بات پر حیران رہ جائے گی کہ تم وہ اشیاء کہاں سے حاصل کر کے اتنی کم قیمت پر فروخت کرتے رہے ہو جتنی قیمت پر دوسرے دکان دار وہی اشیاء ہول سیل میں خریدتے ہیں۔ واقعی سینیور سیپو تمہارے سوا کوئی دکان دار ایسا نہیں کر سکتا۔"

کوتاہ قامت سینیور سیپو نے ایک گہری سانس لی۔ "مجھے افسوس ہے۔" اس نے مجھ سے کہا۔ "میں اپنے متعلق ایسی کہانی کی تشہیر کسی قیمت پر پسند نہیں کروں گا۔ مجھے واقعی افسوس ہے۔ میں تمہیں بے حد خوش رکھنا چاہتا تھا لیکن اب....." اس نے انگلی ٹرائیگر پر رکھ دی۔

"اس طرح بات نہیں بنے گی کلفٹن۔ ہماری موت تمہارے ہاتھ کا لہو صاف نہیں کر سکے گی۔ بر سبیل تذکرہ تم ہماری لاش کا کیا کرو گے اور پولیس کے سامنے کس طرح صفائی پیش کرو گے؟"

"یہ بہت ہی آسان ہے۔" اس نے جواب دیا۔ اس کی آنکھیں چمکنے لگی تھیں۔ "میں انہیں وہی کہانی سنا دوں گا جو تم نے مجھے سنائی ہے پھر میں ان سے کہوں گا کہ جب میں نے تمہاری کہانی سننے کے بعد تمہیں جھوٹا کہہ کر پکارا تو تمہیں کوئی راہ فرار نظر نہ آئی اور تم نے اپنی بیوی کو ہلاک کر کے خودکشی کر لی۔" اتنا کہہ کر اس نے پستول سے میرا نشانہ باندھا لیکن اس سے قبل کہ وہ گولی چلاتا۔ بیڈ روم کا ایک دروازہ کھلا اور کین کمرے میں داخل ہوا۔ اس کے ہاتھ میں ریوالور تھا۔ "میں تمہارے آخری جملے پر کبھی یقین نہیں کروں گا مسٹر کلفٹن۔" اس نے کہا اور آگے بڑھ کر کلفٹن کے ہاتھ سے پستول چھین لیا پھر دوسرے دروازے سے کھلے اور ہر دروازے پر ایک آفیسر نظر آیا۔ ان کے ساتھ ہی ایک اور شخص تھا جو شارٹ ہینڈ میں تیزی سے کچھ لکھتا جا رہا تھا۔ کلفٹن کا چہرہ کفن کی مانند سفید پڑ گیا..... اس نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا لیکن آواز نہیں نکل سکی۔

"لڑکو! کلفٹن کو لے جاؤ۔ باقی باتیں عدالت میں ہوں گی۔" کین نے اپنے ماتحتوں کو اشارہ کیا اور وہ کلفٹن کو کھینچتے ہوئے لے گئے۔

ان لوگوں کے رخصت ہونے کے بعد کین نے مصافحے کے لیے میری جانب ہاتھ بڑھایا۔ "خوش آمدید چارلی۔" اس نے پر جوش لہجے میں کہا۔

میں اور بیتھ اسے رخصت کرنے نیچے تک گئے۔ اس کے جانے کے بعد میں نے گردن موڑ کر بیتھ کی جانب دیکھا جس کی نیلی آنکھوں میں خوشی کے آنسو چمک رہے تھے اور ہونٹوں پر دل آویز مسکراہٹ رقص کر رہی تھی۔



نئی شناخت

شمیم امان

انسان چاہے جتنی تدبیریں کرلے لیکن وہ قدرت کی انہونیوں کے سامنے بے بس ہوتا ہے۔ ضروری نہیں جو ہم چاہیں زندگی میں بالکل ویسا ہی ہو' ہوتا وہی ہے جو قدرت نے مقدر میں لکھا ہوتا ہے۔

ایک مجرم کا فسانہ عجیب' اس نے ٹلمی پر لگے خون کے دھبے دھو لیے تھے لیکن۔۔۔

جارج نے انگلیوں کی مدد سے چھوکر محسوس کیا کہ نرس اس کے لیے جو سوٹ لائی ہے وہ کارڈرائی کا بنا ہوا ہے اور یہ کپڑے اس کے اپنے نہیں ہیں۔

"تم سے غلطی ہوئی ہے۔ نرس یہ کپڑے میرے نہیں ہیں۔" اس نے جھلائی ہوئی آواز میں کہا۔

"تم ٹھیک کہتے ہو یہ کپڑے واقعی تمہارے نہیں ہیں کیونکہ تمہارے کپڑے حادثے میں بری طرح خراب ہوچکے تھے۔" نرس کے لہجے میں ہمدردی کا جذبہ نمایاں تھا۔

"اوہ! اور میری آنکھوں کی پٹیاں کب کھلیں گی؟" جارج نے پرسکون ہوتے ہوئے پوچھا۔

"ڈاکٹر آنے ہی والا ہے۔ جیسے ہی وہ آیا پٹیاں کھول دی جائیں گی۔"

"میرا خیال ہے مجھے اس کا انتظار کرلینا چاہیے کیونکہ پٹیاں کھلنے کے بعد ہی میں کپڑے پہن سکوں گا۔" اس نے آہستہ سے اپنا سر تکیے پر ٹکا دیا۔ وہ حادثے کی تفصیل پر غور کرنے لگا جس کی وجہ سے وہ اسپتال تک آپہنچا تھا۔

برتھا کے فارم ہاؤس کے پیچھے وسیع میدان عبور کرکے جنگل کے قریب واقع خشک کنویں کی تہہ میں پوشیدہ تیس ہزار ڈالر کی خطیر رقم اس کی منتظر تھی۔ رقم اس نے ایک برتن میں رکھ کر کنویں میں ڈال دی تھی۔

برتن کو کنویں سے باہر نکالنے کے لیے اس نے کوٹ کے ہینگر کو ایک ڈوری سے باندھا تھا اور ہینگر کے ہک میں برتن کا ہینڈل پھنسا کر اوپر کی طرف کھینچ لیتا تھا۔ لیکن وہاں جانے سے پہلے جارج نے رائی کی تیز شراب کے تین بڑے پیگ اپنے حلق میں انڈیل لیے تھے تاکہ اس کے حواس منتشر نہ ہوں لیکن بدقسمتی سے اس کا ناتواں جسم تیز شراب اور سخت دھوپ برداشت نہ کرسکا اور جب وہ اس وسیع میدان کو عبور کرکے کنویں تک پہنچا تو جسم کے ساتھ اس کا دماغ بھی جواب دے چکا تھا۔ ٹھوکر لگنے کی وجہ سے اس کا سر کنویں کی پتھریلی منڈیر سے ٹکرایا اور اس کا ذہن تاریکیوں میں ڈوبتا چلا گیا تھا۔

"تمہارے پاس گھڑی تو ہوگی؟" جارج نے نرس سے پوچھا۔

"ہاں۔ تقریباً پانچ بجے ہیں۔"

اس کا مطلب ہے چھ گھنٹے ضائع ہوچکے ہیں، جارج نے دل ہی دل میں سوچا۔ برتھا پام راک اسٹیشن پر پہنچ گئی ہوگی اور یقیناً بے چینی سے میری منتظر ہوگی۔ ممکن ہے اسے شک ہوگیا ہو کہ میں نے اس کے ساتھ دھوکا کیا ہے اور تیس ہزار ڈالر کی رقم لے کر فرار ہوچکا ہوں۔ ہوسکتا ہے وہ انتقام لینے کے لیے پولیس کو فون پر سب کچھ بتادے' جارج کو طرح

طرح کے خیالات پریشان کر رہے تھے' جتنی جلدی ممکن ہو سکے مجھے برتھا کے پاس پہنچ جانا چاہیے۔

جارج نے دل ہی دل میں فیصلہ کیا۔

"میں یہاں کیسے پہنچا تھا؟" اس نے نرس سے پوچھا۔

"جب تم کنوئیں کے قریب اس ویران علاقے میں بے ہوش پڑے ہوئے تھے تو ایک شکاری کی نظر تم پر پڑ گئی اور وہ از راہ ہمدردی تمہیں یہاں چھوڑ گیا۔ وہ تمہیں بمشکل تمام گھسیٹتے ہوئے اپنی کار تک لے گیا تھا اسی لیے تمہارے کپڑے خراب ہو گئے۔ اسپتال کے ایمرجنسی وارڈ میں تمہیں داخل کر لیا گیا تھا۔"

اس کا مطلب ہے میرے ہزار ڈالر ابھی تک کنوئیں میں محفوظ ہیں۔ اس نے اپنے دل میں شکاری کو صلواتیں سنائیں جس کی بے جا مداخلت نے سارا پروگرام چوپٹ کر دیا تھا۔

☆ ... ☆ ... ☆

کئی ماہ پیشتر وہ آوارہ گردی کرتا ہوا نیویارک سے اس چھوٹے سے قصبے اسپائلن میں وارد ہوا تھا۔ اس وقت رات کے دس بجے تھے قصبے کے لوگ جلد سو جانے کے عادی تھے اس لیے قصبے تک آنے والی واحد سڑک سنسان پڑی تھی۔ سڑک سے تقریباً سو گز کے فاصلے پر فارم ہاؤس میں روشنی نظر آئی تو وہ اسی طرف چل پڑا۔ دستک کے جواب میں برتھا نے دروازہ کھولا اور اسے اندر آنے کو کہا۔ جب جارج نے اسے بتایا کہ وہ نیویارک سے سیر و تفریح کی غرض سے یہاں تک آ پہنچا ہے تو برتھا نے نہ صرف اسے کھانے پر اپنے ساتھ شریک کر لیا بلکہ رات کو قیام کرنے کی اجازت بھی دے دی۔ دوسری صبح برتھا نے اسے بتایا کہ وہ ایک تنہا اور غریب بیوہ ہے اور اس کے پاس سوائے اس خستہ حال فارم ہاؤس کے اور کچھ نہیں ہے۔

جارج کو برتھا کے ساتھ رہتے ہوئے ایک ہفتہ گزر گیا تو دونوں ایک دوسرے کو خوب سمجھ چکے تھے اور آپس میں اعتماد کی فضا قائم ہو چکی تھی۔

ایک روز برتھا نے اسے بتایا کہ اس نے ایک نہایت سادہ اور آسان منصوبہ ترتیب دے رکھا ہے۔ اسے صرف ایک قابل اعتماد ساتھی کا انتظار تھا اگر جارج اس منصوبے میں شامل ہو جائے تو بڑی آسانی سے اور بغیر کسی خطرے کے ایک بڑی رقم ہاتھ لگ سکتی ہے۔ منصوبے کے مطابق فارم ہاؤس کے قریب سے جو سڑک گزرتی ہے اس پر کوئی دو فرلانگ کے فاصلے پر ایک کچا راستہ میکلن ٹول کمپنی تک جاتا ہے۔ اس علاقے میں سوائے اس کمپنی کے اور کوئی کارخانہ یا مکان نہیں ہے۔ ہر جمعہ کی سہ پہر تین بجے کمپنی کا مالک میکلن یہاں سے گزرتا ہے جس کے پاس ہفتہ واری تنخواہ کا تھیلا ہوتا ہے۔ یہ بوڑھا ہمیشہ تنہا ہوتا ہے اور اپنے ساتھ کسی قسم کا ہتھیار بھی نہیں رکھتا کیونکہ اس علاقے میں کبھی کوئی چوری یا ڈکیتی کی واردات نہیں ہوئی۔

برتھا نے منصوبے کی تفصیلات بتاتے ہوئے کہا کہ اسے صرف اتنا کرنا پڑے گا کہ جب میکلن اپنی کار میں تنخواہ کا تھیلا لے کر گزر رہے جو وہ ہر ہفتے بینک سے لے کر آتا ہے تو جارج کچی سڑک پر لیٹ جائے۔ میکلن جو کسی زمانے میں چرچ سے وابستہ رہ چکا ہے اسے دیکھ کر گاڑی ضرور روک لے گا اور جیسے ہی وہ گاڑی سے اتر کر قریب آئے اس پر قابو پانا مشکل نہ ہوگا۔ برتھا نے اسے ایک پرانا ریوالور بھی دیا تا کہ بوڑھے کو خوف زدہ کر کے رقم کا تھیلا چھین لیا جائے۔ اس دوران وہ خود پام رائے اسٹیشن پر جارج کا انتظار کرے گی جہاں سے وہ دونوں

نندیارک جانے والی بس پکڑلیں گے۔

"منصوبہ بہت سادہ اور آسان ہے۔" برتھا نے کہا اور جارج نے اس سے اتفاق کیا تھا۔

لیکن جب منصوبے پر عمل کا وقت آیا اور بوڑھے میکلن نے جارج کو سڑک کے درمیان پڑے دیکھ کر اپنی کار روکی اور جارج کے قریب آکر اس کا جائزہ لینے کے لیے جھکا تو جارج نے اچھل کر بوڑھے کو دھکا دیا اور پستول نکال کر اس سے رقم کا مطالبہ کیا تو بوڑھے میکلن نے جارج کے پستول کی پروا کیے بغیر پھرتی سے اپنا ریوالور نکالا اور ایک فائر جھونک مارا جواباً جارج نے بھی گولی چلادی۔ بوڑھے کی گولی جارج کے کان کے قریب سے گزر گئی تھی جبکہ جارج نے بوڑھے کے سینے میں دائیں طرف ایک سوراخ بنا دیا تھا۔ گولیوں کے اس غیر متوقع تبادلے نے جارج کو اس حد تک حواس باختہ کردیا تھا کہ وہ بوڑھے کی حالت کا اندازہ کیے بغیر کہ وہ زندہ ہے یا مرچکا ہے رقم کا تھیلا گاڑی سے نکال کر فرار ہوگیا۔ اسے یقین تھا کہ اس نے بوڑھے کو قتل کردیا ہے اور وہ ایک قاتل بن چکا ہے۔ قاتل ہونے کے احساس نے اسے اتنا خوف زدہ کردیا کہ وہ منصوبے کے مطابق پام رائے اسٹیشن جانے کے بجائے جہاں برتھا اس کا انتظار کررہی تھی فارم ہاؤس میں جاکر چھپ گیا۔ تاہم رقم کا تھیلا اس نے جنگل کے قریب اندھے کنویں میں چھپادیا..... اسے معلوم تھا کہ جب تک رقم پوشیدہ رہے گی برتھا اسے پناہ دینے پر مجبور ہوگی۔

بعد میں انہیں ریڈیو کی خبروں سے معلوم ہوا تھا کہ بوڑھا میکلن مرچکا ہے لیکن مرنے سے پہلے اس نے قاتل کا حلیہ تفصیل سے بیان کردیا تھا کہ ایک اندھا بھی جارج کو آسانی سے تلاش کرسکتا تھا۔ اس نے اپنے نزاعی بیان میں کہا تھا "ڈاکو ایک بہت ہی موٹا آدمی تھا اتنا موٹا آدمی زندگی میں میں نے نہیں دیکھا۔ اس کا قد پانچ فٹ اور چوڑائی بھی پانچ فٹ کے قریب ہوگی۔ اسے مسٹر 5x5 کہہ سکتے ہیں اس کی رانیں چلتے وقت آپس میں ٹکراتی ہیں۔ اس کی توند باہر کو نکلی ہوئی ہے آپ اسے لوگوں کی بھیڑ میں آسانی سے شناخت کرسکتے ہیں۔"

ان دونوں نے خبر ایک ساتھ سنی تھی اور یہ سوچ سوچ کر ان کا خون خشک ہورہا تھا کہ جیسے ہی جارج نے گھر سے قدم نکالا قصبے کا ہر شخص اسے پہچان لے گا۔

اچانک جارج کو ایک انوکھا خیال آیا۔ وہ مکان کے بالائی کمرے میں دو ماہ کے لیے قید ہوگیا۔ اس دو ماہ کے عرصے میں اس نے صرف اتنا کھانا کھایا کہ جسم اور روح کا رشتہ قائم رہ سکے۔ برتھا اس کے ناشتے میں ایک توس ایک کپ چائے لاتی تھی۔ دوپہر اور رات کے کھانے میں بھی صرف ایک توس اور ٹماٹر کی چٹنی ملتی تھی۔ دو ماہ کے اس طویل فاقے نے اس کا چربی جسم ہڈیوں کے ڈھانچے میں تبدیل کردیا تھا۔ وہ ایک مدقوق اور سنکی سے انسان کے روپ میں تبدیل ہوچکا تھا۔ چنانچہ اس نے فیصلہ کیا کہ اب باہر نکلنے میں کوئی قباحت نہیں ہے۔ اب کوئی شخص اسے مسٹر 5x5 کی حیثیت سے شناخت نہیں کرسکتا تھا۔

☆......☆......☆

اسپتال کے نرم بیڈ پر کروٹ لیتے ہوئے جارج نے سوچا دو ماہ کا طویل فاقہ رہائی کی تیز شراب اور شدید گرمی اسے بے ہوش کرنے کے لیے کافی تھی لیکن برتھا اس حادثے سے بے خبر پام رائے اسٹیشن پر بے چینی سے اس کی منتظر ہوگی اگر میں وقت پر وہاں نہ پہنچ سکا تو وہ میری طرف سے بدگمان ہوسکتی ہے ممکن ہے پولیس کو فون کرکے سب کچھ بتادے

جارج اس سے زیادہ نہ سوچ سکا۔
"کیا اسپتال سے جاتے وقت مجھے دستخط وغیرہ کرنا ہوں گے؟" اس نے نرس سے پوچھا۔
"نہیں ایسی کوئی بات نہیں..... تمہاری صحت اب بالکل ٹھیک ہے اور دماغ بھی ٹھیک کام کررہا ہے وہ ایک عارضی دورہ تھا' لو وہ ڈاکٹر بھی آ گیا۔" نرس نے دروازے کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔
جارج تکیے پر کہنیاں ٹکائے نرس سے باتیں کررہا تھا' ڈاکٹر کی آمد پر سیدھا ہو کر لیٹ گیا۔
"ہیلو" شائستہ اور نرم آواز کے ساتھ ہی اسے اپنے شانوں پر ڈاکٹر کے ہاتھوں کے لمس کا احساس ہوا۔
"ڈاکٹر..... میں آپ کا اور اسپتال کا بہت مشکور ہوں کہ آپ نے میری دیکھ بھال کے علاوہ مفت میں کپڑے بھی مہیا کیے ہیں لیکن یہ کپڑے میرے لیے بہت زیادہ ڈھیلے نہیں ہیں؟" جارج نے کارڈ رائی کے سوٹ کے بارے میں سوچتے ہوئے سوال کیا۔
"میرا خیال ہے یہ آپ کے جسم پر بالکل فٹ آئیں گے۔" ڈاکٹر نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔
"شاید آپ مذاق کررہے ہیں یہ تو کسی شامیانے کی طرح لمبے چوڑے ہیں۔"
"اوہ شاید تمہیں اندازہ نہیں ہے جب سے تم اسپتال آئے ہو بے تحاشہ کھاتے رہے ہو۔"
"لیکن میں تو آج صبح ہی یہاں لایا گیا تھا؟"
اس نے محسوس کیا کہ ڈاکٹر بہت احتیاط سے اس کی پٹیاں کھول رہا ہے۔
"اب میں تم سے پوچھتا ہوں کہ کون کس سے مذاق کررہا ہے؟ آج ستمبر کی سترہ تاریخ ہے اور تم اگست کے پہلے ہفتہ میں یہاں لائے گئے تھے۔ حادثے کی وجہ سے تمہاری آنکھوں اور دماغ نے کام کرنا چھوڑ دیا تھا۔ تم بالکل خالی الذہن ہو گئے تھے۔ بار بار پوچھنے کے باوجود تم نے اپنے بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا۔ شکر ہے کہ اب تم بالکل صحت مند ہو چکے ہو۔"
پٹیاں کھل چکی تھیں۔ جارج آہستہ آہستہ پلنگ سے زمین پر کھڑا ہو گیا پھر سست روی سے چلتا ہوا قد آدم آئینے کے سامنے جا کھڑا ہوا' اپنا سراپا دیکھ کر وہ حیران رہ گیا گرد و پیش سے بے خبر کافی دیر تک آئینہ ہی دیکھتا رہا۔ اس کی آنکھیں حیرت اور خوف سے پھیل گئی تھیں۔
وہ ایک مرتبہ پھر مقتول میکلن کے بیان کے مطابق مسٹر ۵ × ۵ بن چکا تھا اس کی توند باہر نکل آئی تھی اور رانیں موٹی ہو گئی تھیں اور شانوں پر گوشت لٹک رہا تھا۔
وہ جانتا تھا کہ جیسے ہی اس نے اسپتال سے باہر قدم نکالا پوشیدہ رقم تک پہنچنے سے قبل ہی گرفتار کرلیا جائے گا۔
"تم اب بالکل صحت یاب ہو چکے ہو اور جہاں جانا چاہو جا سکتے ہو۔" اس نے عقب سے ڈاکٹر کی آواز سنی۔
جارج نے کچھ کہنا چاہا لیکن آواز اس کے حلق ہی میں گھٹ گئی۔ اس کے ذہن میں صرف ایک لفظ گونج رہا تھا "نہیں نہیں نہیں میں کہیں نہیں جا سکتا۔"

قلندر ذات

امجد جاوید

قلندر دو طرح کے ہوتے ہیں ایک وہ جو شکر گزاری کے اعلیٰ ترین مقام تک پہنچ کر قرب الٰہی حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ رب تعالیٰ بھی ان کی خواہش کو رد نہیں کرتا۔ دوسرے وہ جو ذات کے قلندر ہوتے ہیں۔ ان کا پیشہ بندر، ریچھ اور بکرے نچانا ہوتا ہے۔ یہ کہانی ایک ایسے مرد آہن کی ہے جو ذات کا قلندر تھا۔ اس نے ان لوگوں کو اپنی انگلیوں پر نچایا جو اپنی دنیا مسخر کرنے کی دھن میں انسانیت کے دشمن بن گئے تھے۔ انسانی صلاحیتوں کی ان وسعتوں کی داستان جہاں عقل دنگ رہ جاتی ہے اور فکر حیران۔ اس داستان کی انفرادیت کی گواہی آپ خود دیں گے۔ کیونکہ یہ محض خامہ فرسائی نہیں مقاصد کا تعین بھی کرتی ہے

میرے چاروں طرف اندھیرا تھا اور میں فضا میں جھولتا ہوا جا رہا تھا۔ وہ روشنی بھی غائب ہو چکی تھی جو مجھ پر فوکس تھی۔ وہ کون لوگ ہیں اور کیا چاہتے ہیں، اس کا بھی اندازہ نہیں تھا۔ نجانے کتنا وقت گزر چکا تھا۔ پہلی بار مجھے یوں لگا جیسے میں بہت بری طرح پھنس گیا ہوں۔ اتنی بلندی سے اگر میں گر بھی گیا تو میرا بچنا ممکن نہیں تھا۔ میں یہی سوچ رہا تھا کہ اچانک مجھے یہ صدا آئی۔ ”تیرا گرنا ہی تیرا اٹھنا ہے، ہر زوال را کمالے“ ایک دم سے اندھیرا چھٹ گیا۔

مجھے کسی طرف بھی سورج دکھائی نہیں دیا اور نہ ہی اس کی سمت کا اندازہ ہوا۔ لیکن نیلا آسمان میرے سامنے واضح تھا۔ میں نے ارد گرد دیکھا، نزدیک ہی بادلوں کے ٹکڑے تھے۔ مجھے لگا۔ میں انہیں چھو سکتا ہوں۔ میں نے نیچے دیکھا تو ایک دم سے ساکت رہ گیا۔ نیچے تا حد نگاہ نیلا سمندر تھا۔ میری نگاہ پڑتے ہی سمندر کی پرسکون سطح پر ہلچل ہونے لگی۔ نیلی سطح پر سفید رنگ کی ایک لکیر ابھری، جو دیکھتے ہی دیکھتے دائرے میں گھومنے لگی۔ سمندر کا جھاگ اٹھنے لگا۔ کچھ ہی دیر بعد وہ دائرہ ایک بھنور میں بدل چکا تھا جس میں وسعت آتی چلی جا رہی تھی۔ وہ بھنور اتنا پھیلا کہ میرے سامنے سمندر کی نیلی سطح ایک سفید بھنور کی صورت اختیار کر گیا، جسے میں غور سے دیکھ ہی رہا تھا کہ مجھے یوں لگا جیسے میرے جال کی رسیاں ایک ایک کر کے ٹوٹتی چلی جا رہی ہیں۔

یہ ایک دوسری قسم کی مصیبت تھی۔ یہی وہ ایک لمحہ تھا جس نے مجھے حوصلہ دے دیا۔ اسی ایک لمحے میں یہ خیال آیا تھا کہ یہ اچانک روشنی، سمندر اور بھنور، یہ کچھ اور ہی ہیں۔ میں ایک مشاہدہ، مسافر شاہ کے تھڑے پر کر چکا تھا۔ اس وقت میری پشت پر بابا جی روٹی والے کھڑے تھے لیکن اس وقت تو میں فضا میں معلق تھا اور کسی لمحے جال ٹوٹنے کے باعث میں اس سمندر میں گر سکتا تھا۔ اور پھر وہی ہوا، جال ٹوٹ گیا اور میں سیدھا اس بھنور کی طرف بڑھنے لگا، یہاں تک کہ سمندر کی نمی نے میرے ہاتھوں کو چھو لیا۔ میں سمندر میں ڈوبتا چلا گیا تھا۔

میرے سامنے وہ نیلگوں ماحول تھا جو فجر کے بعد سے سورج کے طلوع ہونے سے پہلے وقت کا ہوتا ہے۔ میں سمندر میں گرتا چلا جا رہا تھا۔ یہاں تک کہ سمندر کی تہہ میں موجود غار تک جا پہنچا۔ ہر جانب نیلگوں روشنی تھی۔ دور دور تک صاف دکھائی دے رہا تھا۔ دفعتاً میری نگاہ اپنے وجود پر پڑی، جو بالکل ٹرانسپیرنٹ تھا۔ سفید دھوئیں کی مانند یا پانی کے بلبلے کی طرح۔ سانس لینے میں مشکل یا دباؤ جیسی کوئی کیفیت میں نے محسوس نہیں کی۔ میں اپنا جائزہ لے رہا تھا کہ

سامنے سے سیاہ دھبے واضح ہو کر رنگین مچھلیوں کے جھنڈ میں بدل گئے۔ سرخ پیلے اور نارنجی رنگ کے ساتھ سیاہ دھاریاں آنکھوں کو بہت بھلی لگ رہی تھیں۔ وہ سب میرے قریب سے گزر گئیں اور میں آگے بڑھتا چلا گیا۔ میری راہ میں کچھ دیر تک ایسی ہی بے شمار رنگ برنگی مچھلیاں دکھائی دیتی رہیں۔ میں جن کے رنگوں میں کھو کر رہ گیا۔ ایسے ایسے آبی پودے دکھائی دینے لگے جو پہلے کبھی نظر میں سے نہیں گزرے تھے۔

اچانک میری دائیں جانب سے شارک نمودار ہوئی، اس کا منہ کھلا ہوا تھا۔ وہ ان معصوم اور خوبصورت مچھلیوں کو نگلتی چلی جا رہی تھی۔ اس کے کھلے ہوئے منہ اور تیز دانتوں سے مجھے ایک دم سے نفرت ہونے لگی۔ میرا جی چاہا کہ میں اس کے ظلم سے ان چھوٹی مچھلیوں کو بچاؤں، یہ سوچ ابھی میرے دماغ میں گھوم رہی تھی کہ اچانک سامنے سے ایک دیو ہیکل دریائی گھوڑا نمودار ہوا۔ شارک اسے دیکھ کر بھاگنے لگی، مگر اس نے اپنا بڑا سا منہ کھولا اور سانس کے ذریعے اسے کھینچا، وہ شارک اس کے منہ میں آدھی ہی گئی تھی کہ دریائی گھوڑے نے اسے کاٹ لیا۔ شارک کے جسم کا آدھا حصہ پانی میں تیرنے لگا۔ خون کے پھیلنے کی وجہ سے پانی سرخ ہونے لگا۔ کچھ دیر بعد جب پانی صاف ہوا تو شارک کے جسم کا آدھا حصہ چھوٹے جیسی عجیب و غریب قسم کی آبی مخلوق کی زد میں تھا۔ وہ اسے لے کر نکل جانا چاہتے تھے، جبکہ دیو ہیکل دریائی گھوڑا پانی ہی میں لوٹ پوٹ ہو رہا تھا۔ وہ کچھ دیر ایسے ہی رہا اور پھر پرسکون ہو کر ایک جانب بڑھ گیا۔

میں بھی اس دریائی گھوڑے کے ساتھ چل دیا۔ وہ میرے آگے تھا اور میں اس کے پیچھے۔ پتہ نہیں ہم نے کتنا سفر طے کیا تھا۔ مجھے دکھائی دیا کہ سامنے لکیروں کی صورت میں کالی سارا پانی مختلف رنگوں کا تھا، جو گدلا ہو رہا تھا۔ دریائی گھوڑا اپنی مستی میں آگے ہی آگے بڑھتا چلا جا رہا تھا۔ اسے پتہ ہی نہ چلا کہ سانپ کے جیسے ایک بازو نے اسے اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ دریائی گھوڑا تڑپا، ایک ہی جھٹکے میں اس نے وہ بازو خود سے الگ کیا تب تک دو بازو اسے گھیر چکے تھے، دوان سے بمشکل آزاد ہوا تھا کہ ایک اور بازو نے اسے جکڑ لیا۔ وہ آکٹوپس تھا۔ دریائی گھوڑے نے بہت مزاحمت کی مگر وہ خود کو ان بازوؤں سے الگ نہ کر سکا۔ شارک کو نگل جانے والا دریائی گھوڑا، آکٹوپس کے سامنے بے بس تھا۔ یہاں تک کہ اس کی مزاحمت جاتی رہی۔ وہ بے بس ہو کر ساکت ہو گیا۔ آکٹوپس کے سبھی بازو اس سے چمٹ گئے۔ کچھ دیر بعد وہ بازو الگ ہوئے تو دریائی گھوڑا جیسے تھا ہی نہیں۔ وہ اس کے بازوؤں ہی میں تحلیل ہو گیا تھا۔ پانی ایک بار پھر سے گدلا اور سرخ ہو چکا تھا۔ جب ماحول صاف ہوا تو آکٹوپس بڑی مستی میں ایک جانب بڑھ گیا۔ مجھے تجسس ہوا کہ اس آبی دنیا میں اس پر بھی کوئی بھاری ہے؟ میں اس کے ساتھ ساتھ بڑھتا چلا گیا۔

بہت دور آگے گہرا اندھیرا بڑھنے لگا۔ لیکن اس گہرے اندھیرے میں رنگ برنگی روشنیاں ٹمٹما رہی تھیں۔ جیسے چھوٹے چھوٹے بلب جلتے بجھتے ہوئے دور تک جاتے دکھائی دیں۔ کئی لہریں دور تک جاتی ہوئی دکھائی دیں۔ آکٹوپس مستی میں آگے جا رہا تھا۔ وہ روشنیاں گہرے اندھیرے میں تھیں جو بہت خوبصورت دکھائی دے رہی تھیں۔ میرا دھیان اس کی خوبصورتی میں گم ہو گیا۔ اچانک آکٹوپس کے بازو لرزنے لگے جیسے بے جان ہو گئے ہوں۔ چند لمحے بعد بنا تڑپے وہ بے جان ہو گیا اور وہ کسی انجانے منہ میں غائب ہونے لگا۔ لمحوں میں اس آکٹوپس کو نگل لیا گیا تو گہرا اندھیرا چھٹنے لگا۔ روشنیاں بھی مدھم پڑنے لگیں۔ نیلگوں روشنی میں مطلع صاف ہوا تو دیکھا وہ ایک بہت بڑی نیلی نش تھی۔ اس نے اپنے کو چھپانے کے لیے آگے پیچھے ایسا گدلا پن چھوڑ دیا تھا کہ کوئی اسے نہ دیکھ سکے مگر اس نے اپنی طرف کشش کے لیے روشنیاں دکھائی تھیں۔ میں آبی دنیا کے مشاہدے میں تھا۔ میں یہ دیکھنا چاہتا تھا کہ اس سے بھی بڑی درندہ مخلوق کون سی ہے۔

❁.....❁.....❁

دوپہر ہو چکی تھی، جب رونیت کور کے ساتھ جسپال سنگھ پنج منزلہ عمارت کے سامنے رکشے میں آن رکا۔ چندی گڑھ کے وی آئی پی روڈ جس پر اسکی کئی عمارتیں ہیں۔ انہی میں سے ایک عمارت کی تیسری منزل پر رونیت کور کا فلیٹ تھا۔ لفٹ کے ذریعے وہ دونوں فلیٹ تک جا پہنچے۔ دروازہ کھولنے کے بعد وہ اندر گئے تو جسپال نے پہلے سادہ سی رونیت کور کو دیکھا، پھر ایک نگاہ فلیٹ کے اندر ڈالی۔ پھر اس نے ایک مہنگے صوفے پر بیٹھتے ہوئے خوشگوار لہجے پوچھا۔

"رونیت! یہ فلیٹ تمہارا ہی ہے نا، ہم کسی دوسرے کے فلیٹ میں تو نہیں گھس آئے؟"

"ہوں.... " رونیت کور نے ہنکارا بھرا اور پھر کھڑے کھڑے بولی۔ "یہاں آنے والے ہر بندے کو ایسا محسوس نہیں ہوتا، تم بیٹھو۔ میں آکر بتاتی ہوں، کچھ پینا چاہو تو فریج میں سے لے لو۔" یہ کہہ کر وہ اندر کی جانب چلی گئی۔ جسپال نے فریج میں سے ٹھنڈا مشروب نکالا اور دوبارہ پھر سے صوفے میں آ دھنسا۔ کچھ دیر بعد رونیت کور واپس آئی تو اس نے شارٹس کے ساتھ سلیولیس ٹی شرٹ پہنی ہوئی تھی۔ اس کا گورا بدن ہی نہیں جھلک رہا تھا، بلکہ فربہ مائل بدن کی چکناہٹ تک کا احساس ہو رہا تھا۔ اس نے اپنے گیسو پونی میں باندھے ہوئے تھے۔ وہ ننگے پاؤں اس کے پاس آکر صوفے کی دوسری طرف آلتی پالتی مار کر بیٹھ گئی۔

"تمہارا کون سا مذہب اصلی ہے؟" جسپال نے کہا ایک اور لمبا گھونٹ لیا۔

"دونوں ہی۔" اس نے مسکراتے ہوئے کہا پھر ایک لمحہ خاموشی کے بعد خوشگوار انداز میں بولی۔ "جسپال جی، گردوارے تو اس طرح نہیں جایا جا سکتا نا اور یہاں گھر میں ما ایسے ہی رہتی ہوں میں، یہ لگژری فلیٹ میں نے خود خریدا ہے اور یہاں جو کچھ دکھائی دے رہا ہے یہی میرا [illegible] ہے۔ تم مجھے مذہب کے معاملے میں بہت کٹر اور باقی زندگی میں الٹرا ماڈرن کہہ سکتے ہو۔"

"میرے کیا کام آ سکتی ہو؟" جسپال نے دوٹوک انداز میں پوچھا۔

"جیسا کام تم چاہو۔" اس نے جسپال کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

"تم نے مجھے اتنی جلدی اتنی ساری معلومات دے دی ہیں کلیان سنگھ کے بارے میں، اس سے لگتا ہے کہ تمہارا نیٹ ورک کافی مضبوط......" اس نے کہنا چاہا تو رونیت کور بولی۔

"نہیں، جس طرح تم سوچ رہے ہو، ویسا میرا کوئی نیٹ ورک نہیں ہے۔ ہاں کالج کا ایک گروپ ہے جو کافی مذہبی ہے۔ اس کے پیچھے میں نے اپنی زندگی وقف کی ہوئی ہے۔ کیونکہ اس کے علاوہ میرے پاس کوئی آپشن نہیں ہے۔ میں اکیلی ہوں اس دنیا میں۔ میں کمپیوٹر سوفٹ ویئر انجینئر ہوں۔ ہمارے ایک پروفیسر صاحب ہیں، وہ بھی بہت مذہبی ہیں۔ سمجھو، وہی ہمیں لیڈ کرتے ہیں، وہی ہمارے ذمے کام لگاتے ہیں اور ہم نے کبھی اس کام کے بارے میں نہیں پوچھا۔"

"میں بھی زیادہ تفصیلات میں نہیں جاتا، میں صرف یہ جاننا چاہتا ہوں کہ سندو کی تلاش ہم کیسے کر پائیں گے۔ اس کے بارے میں جو معلومات مجھے ملی ہیں، وہ میں نے تمہیں اور سیوک سنگھ کو بتا دی ہیں۔" جسپال نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا۔ رونیت کچھ بھی سوچنے والے انداز میں اس کے چہرے پر دیکھتی رہی۔ چند لمحے یونہی گزر گئے۔ پھر سرسرانے والے انداز میں بولی۔

"دیکھو، میں ایک سوفٹ ویئر انجینئر ہوں۔ میرے پاس جو مہارت ہے اس کی آخری حدوں تک میں تمہارا ساتھ دینے کے لیے تیار ہوں۔ میں نہیں جانتی کہ میری یہ مہارت تمہارے کس قدر کام آ سکتی ہے۔"

"یہ میرے کیا کام آ سکتی ہے؟" جسپال نے عام سے انداز میں پوچھا۔

"میں نے کہا نا کہ مجھے نہیں پتہ، ہاں لیکن تم جو سوچ رہے ہو، اس کے لیے میں کچھ نہ کچھ کر سکتی ہوں۔ اس کے لیے میں تمہیں ایک چھوٹا سا تماشا دکھا سکتی ہوں۔" رونیت کور نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"کیسا تماشا؟" وہ تیزی سے بولا۔

"ابھی دکھاتی ہوں۔" یہ کہہ کر وہ اٹھی اور اپنے بیڈ روم میں چلی گئی، واپس آئی تو اس کے ہاتھ میں مہنگا لیپ ٹاپ تھا۔ پھر چلتی ہوئی اس جگہ چلی گئی، جہاں شیشے کی مضبوط دیوار تھی۔ وہاں صوفے دھرے ہوئے تھے۔ وہاں سے وی آئی پی روڈ کا چوراہا صاف دکھائی دے رہا تھا۔ اس نے جسپال کو بھی وہیں بلا لیا۔ وہ آ کر بیٹھ گیا تو رونیت کور بولی۔ "جسپال، یہ سامنے چوراہا دیکھ رہے ہو، کس قدر ٹریفک رواں دواں ہے۔ ٹریفک میں کوئی خلل نہیں ہے، سب ٹھیک ٹھاک چل رہا ہے نا۔"

"بالکل ایسے ہی ہے۔" اس نے کہا۔

"چندی گڑھ کے آدھے سے زیادہ حصے کو ڈیجیٹل کر دیا گیا ہے، جس میں سیکورٹی سے لے کر ٹریفک کے اشارے تک کنٹرول کیے جاتے ہیں۔ میں جب چاہے اس کا سارا نظام درہم برہم کر دوں، جس کی بھی سیکورٹی ہو، جب چاہے ختم کر دوں۔ یہی چوراہا ہے، اسے صرف دو منٹ اپنی مرضی سے روکوں گی۔" اس نے انتہائی سنجیدگی سے کہا۔

"اس سے گاڑیوں کا نقصان بھی ہو سکتا ہے۔" جسپال نے تیزی سے کہا۔

"تو ہو جائے۔" اس نے لیپ ٹاپ کی اسکرین پر دیکھتے ہوئے اس قدر روکھے انداز میں کہا کہ جسپال کو اس کے اندر کی درندگی کا احساس ہونے لگا۔

"وہ دیکھو۔" رونیت نے کہا تو جسپال نے فوراً چوراہے کی طرف دیکھا۔ وہ کہہ رہی تھی "ابھی چاروں طرف کی ٹریفک ایک دم سے رک گئی۔" اس نے دیکھا ٹریفک رکنے لگی۔ "اب چاروں طرف سے چلے گی۔" چند لمحے گزرے، چاروں جانب کی ٹریفک چل پڑی۔ "دیکھنا کتنی گاڑیاں ٹکراتی ہیں۔" گاڑیاں ایک دم سے چلیں، کوئی اسپیڈ میں بڑھی، کوئی آہستگی سے، ساتھ ہی لمحے کئی گاڑیاں ایک دوسرے سے ٹکرا گئیں۔ یہ جسپال نے رونیت کی طرف دیکھا، وہ اسکرین پر دیکھ رہی تھی۔ اس نے پھر چوراہے پر دیکھا، وہاں ٹریفک بلاک ہو گئی تھی۔ رونیت نے لیپ ٹاپ ایک طرف رکھا اور اس کے ساتھ آ کر کھڑی ہو گئی۔ چوراہے پر گھمسان کا رن پڑا ہوا تھا۔ لوگ ایک دوسرے پر چیخ رہے تھے۔

"یہ تم نے کیسے کیا؟" جسپال نے پوچھا۔

"یہ تو کچھ بھی نہیں ہے، شہر کا نظام میری ان انگلیوں میں ہے۔ آؤ، ادھر بیٹھتے ہیں۔" یہ کہہ کر وہ اسی صوفے پر جا بیٹھی جہاں وہ پہلے جسپال کے ساتھ بیٹھی ہوئی تھی۔ وہ بھی وہیں جا کر بیٹھ گیا تو رونیت نے بتایا "کلیان سنگھ کے بارے میں تو میں نے بتایا، یہ وہ معلومات ہیں، جو ہم بندے کو پتے ہیں، یہ معلومات وہ خود لوگوں کو بتانا چاہتا ہے۔ میں تمہیں بتانا چاہتی ہوں کہ یہ پیرے کی بیٹ [illegible] کا کال [illegible] ہے۔"

"تو کیا تم کلیان سنگھ کے کمپیوٹر سے وہ ساری معلومات [illegible]" جسپال نے کہنا چاہا تو وہ بات اچکتے ہوئے اگلے ادا ہوئی۔

"یہ ہوئی نا بات، ایک لائن مل گئی نا، میں شام تک تمہیں وہ ساری معلومات دے دوں گی جو بھی مجھے ان کے ہاں سے ملیں گی، اس میں سے آگے تم جو چاہو۔"

"اپنے پروفیسر سے کب ملوا رہی ہو مجھے؟" جسپال نے پوچھا۔

"چاہے ابھی مل لو، ویسے تم نے ملنا تو ہے ہی ان سے، آخر لیڈ تو انہوں نے ہی کرنا ہے۔" رونیت نے کاندھے اچکاتے ہوئے کہا۔

"تو چلو ابھی ملتے ہیں۔" جسپال نے کہا۔

"آؤ۔" وہ اٹھی اور باہر کی طرف چلی۔

"اس حلیے میں؟" اس نے تیزی سے پوچھا۔

"ارے کیا فرق پڑتا ہے، آؤ۔" یہ کہہ کر وہ [illegible]

گئی۔ دیپالی اس کے پیچھے لپکا۔ وہ بالکل سامنے والا دروازہ کھولے کھڑی تھی۔ اس نے اندر آنے کا اشارہ کیا اور خود اندر چلی گئی۔

بہت سجا ہوا ڈرائنگ روم تھا، جس میں بسنتی رنگ زیادہ تھا۔ ایک سیاہ صوفے پر موٹا سا ادھیڑ عمر سکھ بیٹھا ہوا تھا۔ جس کی داڑھی سفید تھی۔ آنکھوں پر نظر کا چشمہ تھا۔ سفید شلوار قمیص پر گہرے نیلے رنگ کا ویسٹ کوٹ پہنا ہوا تھا اور اسی رنگ کی پگڑی باندھی ہوئی تھی۔

"آیئے آیئے، جسپال سنگھ جی آیئے۔ ست سری اکال جی۔" اس نے کھڑے ہو کر فتح بلائی اور ہاتھ جوڑتے ہوئے بولا۔ "مجھے پروفیسر ازویندر سنگھ کہتے ہیں، تم مجھے صرف پروفیسر کہہ سکتے ہو۔" جسپال نے بھی فتح بلائی اور دونوں بیٹھ گئے۔ روبیت کور اندر کی طرف چلی گئی۔

"[illegible] انڈر ورلڈ [illegible] کہاں تلاش کریں اسے اور کیسے؟" جسپال نے کسی تمہید کے بنا مطلب کی بات کی تو پروفیسر [illegible] ہوئے بولا۔

"ملنے جانے کا [illegible] وہاں انڈر ورلڈ [illegible] جس کا تعلق اسے [illegible] میں وہ بہت [illegible] لڑکا تھا، بہت اچھی [illegible] اسی [illegible] ہمیشہ [illegible] ہمیں کوئی بات بتا [illegible] میں نے ساری خبر اسے تلاش کرنے دی۔"

"مطلب آپ کا رابطہ [illegible]" جسپال نے [illegible] چاہا۔

"یہ پوچھو کہ میں ایک دوسرے سے رابطہ رہتا ہی نہیں ہے۔" پروفیسر [illegible] نے اس کی بات قطع کرتے ہوئے تیزی سے [illegible] ایک لمحہ توقف کے بعد بولا۔ "تم نے بہت اچھا سوچا ہے کہ اس کے اردگرد سے سراغ لیا جائے۔ صرف کالیان [illegible] کو نہیں دیکھنا اس کے اور بہت سارے دوست بھی ہو سکتے ہیں جیسے اس کی دوست نیا [illegible] ہی تو ہے، بہت کچھ اچانک میں بھی ہو سکتا ہے۔ خیر روبیت آج شام تک یا صبح تک کوئی نہ کوئی راستہ نکال دے گی۔" پروفیسر نے تسلی سے کہا۔

"تب تک..." جسپال نے اس کے چہرے پر دیکھتے ہوئے فقرہ ادھورا چھوڑ دیا۔

"بہت کچھ ہو رہا ہے۔ لیکن جب تک ہمارے پاس کوئی راستہ نہیں ہوگا تب تک ہم کیا کریں گے۔" پروفیسر نے سکون سے کہا۔

"کون کر رہا ہے؟" جسپال نے پوچھا۔ جس پر پروفیسر اس کے چہرے پر دیکھتا رہا، چند لمحوں بعد اس نے ایک گہرا سانس لیا اور بولا۔

"بیٹا! میں نے اپنی زندگی دھرم کے لیے دے دی ہوئی ہے۔ میں نہیں سمجھتا کہ ہم سن سینتالیس میں آزاد ہوئے تھے، کیونکہ سن چوراسی میں ہمیں یہ یقین دلا دیا گیا کہ ہمارا کوئی وطن نہیں ہے، ہم بے وطن ہیں۔ اس وقت میں نیا نیا پڑھانے لگا تھا۔ بس پھر میں نے اپنا مشن بنا لیا اور تب سے میں دھرم کے لیے کام کر رہا ہوں۔"

"اب ریٹائر ہو گئے ہیں آپ؟" جسپال نے پوچھا تو وہ بولا۔

"ہاں اور میری ساری زندگی کی جمع پونجی یہ چند بچے ہیں، جنہیں میں نے تیار کیا ہے۔ یہ سارے بچے کسی نہ کسی حوالے سے سن چوراسی کے زخم خوردہ ہیں اور کالج ایک ایسی جگہ ہے جسپال، جہاں سے کیریئر کی سمت کا تعین ہو جاتا ہے۔ میں نے اس دور سے بڑا تجربہ لیا ہے۔ خیر تم شاید یہ سمجھ رہے ہو کہ میں اکیلا بوڑھا یہاں بیٹھا باتیں کر رہا ہوں، ایسا نہیں ہے وقت آنے پر سب کچھ سامنے آ جائے گا۔"

"یہ تو سچ ہے پروفیسر صاحب ہم سکھوں کا کوئی وطن نہیں لیکن اس میں غلطیاں تو ہمارے بڑوں کی بھی ہیں سا تھا اس (تاریخ) کو بدلا نہیں جا سکتا۔" جسپال نے دکھی لہجے میں کہا۔

"جسپال! شاید ابھی تم نے اس دنیا کو سمجھنے کی کوشش نہیں کی۔" پروفیسر نے جذباتی ہوتے ہوئے کہا، پھر خود پر قابو پا کر بولا۔ "شطرنج کی بساط بچھائی جاتی ہے تو مہروں کے ذریعے کھیل کھیلا جاتا ہے۔ مہرے بے جان ہوتے ہیں اور ان مہروں کو خبر بھی نہیں ہوتی کہ ان کے ذریعے کون شاطر کھیل رہا ہے۔ بے چارے مہرے ان مہروں کی نہ مات ہوتی ہے اور نہ جیت۔ اسی طرح کٹھ پتلی کو بھی پتہ ہوتا کہ کون مداری اسے اپنی انگلیوں پر نچا رہا ہے۔ مداری یا تماشہ باز پس پردہ ہوتا ہے۔ کٹھ پتلی کی جیت ہوتی ہے نہ ہار۔ اس کا کام صرف انگلیوں پر ناچنا ہے۔ فائدہ تماشہ دکھانے والا مداری لے جاتا ہے۔ یہی حال اس دنیا کا ہے، تم کیا بننا پسند کرو گے، مہرہ، شاطر، کٹھ پتلی، مداری، تماشہ باز؟" وہ اس سے بھی زیادہ دکھ سے بولا۔

"ایک تیسری قسم قلندر کی ہوتی ہے، جو زندہ خونخوار جانوروں کو اپنے اشاروں پر نچاتا ہے۔ یہاں آدمی نما جانور بہت ہیں اور انسان بہت کم ہیں اس دنیا میں اور سمجھو کہ یہ دنیا انہی انسانوں کی وجہ سے چل رہی ہے۔" جسپال نے جذبات سے عاری لہجے میں کہا۔

"تم ٹھیک کہتے ہو جسپال سنگھ، لیکن کیا تم جانتے ہو یہ سارے کھیل تماشے کیوں ہوتے ہیں؟" پروفیسر سنگھ نے پوچھا۔

"آپ بتائیں، آپ بہر حال مجھ سے زیادہ جانتے ہیں۔" وہ پرسکون لہجے میں بولا۔

"ہر زمانے اور ہر دور میں انسان پر انسان نے حکومت کی ہے، یہ کوشش بھی ایک کھیل کی مانند ہوتی ہے۔ کھیلنے والے پس پردہ ہوتے ہیں، کسی مہرے کو کوئی پتہ نہیں ہوتا کہ وہ کس گیم کا حصہ بن گیا ہے۔ آج بھی "گریٹ گیم" جاری ہے۔ جس میں سرحدیں کوئی معنی نہیں رکھتیں ہیں۔ وقت کے ساتھ ہتھیار بھی بدل گئے ہیں۔ پرانے ہتھیاروں پر یقین رکھنے والی قومیں، نئے ہتھیاروں کا مقابلہ نہیں کر پا رہی ہیں، ہمارے سامنے کے حالات ہمیں یہی سبق دے رہے ہیں۔ جیسے میڈیا، کبھی ایک آلہ تھا، اب ایک ہتھیار بن چکا ہے۔ "گریٹ گیم" کھیلنے والے اس ہتھیار کو جس طرح استعمال کر رہے ہیں، تم اس سے بخوبی واقف ہو۔ شطرنج پر تو مخصوص مہرے ہوتے ہیں، لیکن گریٹ گیم کی بساط پر نجانے کتنے مہرے ہوتے ہیں، کیونکہ گریٹ گیم کا پھیلاؤ بہت بڑا ہے۔ سمجھو ان دیکھی بساط، جس کا کوئی سرا کنارا نہیں ہے

اور ممکن ہے تم اور میں کسی گریٹ ٹیم کا حصہ ہوں۔" پروفیسر نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"میں تو ایک بات جانتا ہوں دنیا کی کوئی بھی گریٹ ٹیم ہو، وہی تو مہرہ چنتی ہیں، جنہیں اپنے آپ کا شعور نہیں اور جنہیں اپنے آپ کا شعور ہوتا ہے وہ ایسی کئی گریٹ ٹیم اپنی چٹکی میں پکڑ کر ایک طرف پھینک دیتی ہیں۔ یہ میڈیا تو کوئی شے ہی نہیں، انسان کا پختہ ارادہ ہی سب کچھ ہے۔ آپ غم نہ کریں، مہاگرو نے جو آپ کے ذمے کام لگایا ہے، اسے کریں۔" جسپال نے کہا۔

"وہی تو کر رہا ہوں پتر! گرو مہاراج نے ہمیں پانچ ککے کیوں دیئے؟ ابلیسی ارادے، طاقت کی جانب اور منفی طاقت فطری طور پر حکومت کرنے کی طرف لے چلی ہے۔ جس مقصد کی بنیاد منفی رویے ہوں، ایسی حکومت ظلم کی حکومت ہوتی ہے۔ گروؤں نے پانچ ککے اسی لیے دیئے ہیں۔ کنگھا اس لیے کہ اپنے دماغ کو سنوار کر رکھو، بکھرنا نہ دو، کچھا اس لیے کہ اپنی شہوت پر قابو رکھو، کیس، فطرت کے ساتھ رہو، جو حسد سے دور رکھتی ہے، کڑا، کسی بھی لالچ کی جانب ہاتھ بڑھاؤ تو تجھے احساس ہو جائے کہ یہ انسان کے لیے غلط ہے۔ کرپان، اپنی خواہشوں کو کاٹ کر رکھو۔" پروفیسر نے سکون سے کہا تو جسپال بولا۔

"پتر ہم سوچتے ہیں، تاریخ پر..."

"سکندر اعظم سے لے کر اشوکا تک، بلبن سے لے کر رنجیت سنگھ تک اور مغلوں سے لے کر اندرا گاندھی تک۔ سب کو دیکھ لو، کس نے کیا کیا، یہی سب اتہاس ہے۔" وہ تیزی سے کہتا چلا گیا۔

"پروفیسر صاحب! باقی رب جانتا ہے، جو کام رب کے کرنے والے ہیں وہ رب کرے، جو ہمارے کرنے والے ہیں، وہ ہمیں کرنے چاہئیں۔" جسپال نے بے حد جذباتی ہوتے ہوئے کہا۔ اس پر پروفیسر نے کچھ کہنا چاہا ہی تھا کہ اندر سے ایک ادھیڑ عمر خاتون باہر آئی اور بڑے ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولی۔

"آؤ جی، پرشاد لے چھک لو۔"

"یہ میری سرداری ہے جسپال، آؤ، کھانا کھاتے ہیں۔" یہ کہتے ہوئے پروفیسر اٹھ گیا۔

وہ کھانا کھا کر وہیں ڈائننگ ٹیبل پر بیٹھے باتیں کرتے ہوئے چائے پی رہے تھے کہ رونیت کور وہیں آگئی۔ اس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔ اور ایک طرف آ کر بیٹھی اور پرجوش لہجے میں بولی۔

"کلیان سنگھ عرف کلی کا میں نے سب کچھ دیکھ لیا، اس نے بہت بلیک منی بنائی ہے۔ جس کا کچھ حصہ میں نے اپنے اکاؤنٹ میں ٹرانسفر کر دیا ہے۔ لیکن مجھے ابھی سندو جی کے بارے میں پتہ نہیں چلا، مگر ایک اشارہ ملا ہے۔"

"وہ کیا؟" پروفیسر نے پوچھا۔

"ہمارے ان چندی گڑھ کے ایم ایل اے ہر ٹیک سنگھ چاولہ کے ساتھ کلیان سنگھ کا اس وقت سے کاروباری تعلق ہے جب سے سندو غائب ہوا ہے۔ شراکت داری میں ایک بڑی رقم لگائی گئی ہے۔ اس کی ایف آئی آر بھی ان دونوں نے جا کر لکھوائی تھی۔ سندو کا پتہ ان دونوں میں سے باہر آئے گا۔ یہ مجھے یقین ہو گیا۔ اصل حقیقت کیا ہے یہ......" رونیت کور نے کہنا چاہا

"پتہ کر لیتے ہیں۔" جسپال نے اس کی بات اچک لی۔ پھر اس کے چہرے پر دیکھا

"ٹھیک ہے، میں ابھی تمہیں بتاتی ہوں۔" اس نے کہا اور اٹھ گئی۔ جسپال نے گہرا سانس لیا اور کسی بھی ہنگامی صورت حال کے لیے خود کو تیار کرنے لگا۔ کسی وقت بھی کچھ ہو سکتا تھا۔



نیلگوں روشنی چھٹ چکی تھی اور آہستہ آہستہ نارنجی روشنی زرد رنگ میں بدلتی جا رہی تھی۔ ایک تند و تیز لہر آئی اور اس نے مجھے ساحل سمندر پر یوں پھینک دیا، جیسے اس سمندر نے مجھے اگل دیا ہو۔ میرا وہ جسم، جو تب آپ ٹرانسپیرنٹ ہو گیا تھا، اب مجھے یوں دکھائی دینے لگا تھا جیسے مادی وجود تو ہو لیکن نہ اس کا وزن ہو اور نہ ہی

احساس۔ میں نے اپنے اطراف میں دیکھا تو میں ایک خاردار جھاڑی کے ساتھ لپٹا ہوا تھا۔ جھاڑی کی ایک شاخ کے سرے پہ موجود ایک خار کو دیکھا۔ ایسے ہی اس پر نگاہ پڑی تھی۔ نوکِ خار پہ پانی کا ایک قطرہ محوِ رقص تھا۔ وہ ایک عام سا قطرہ تھا۔ نہ آبگینے کی مانند اس میں سے روشنیاں پھوٹ رہی تھیں۔ نہ ایسا تھا کہ کوئی ہیرا سورج کی روشنی میں دمک رہا ہو۔ بس وہ ایک شفاف قطرہ تھا۔ ہلکی ہلکی ہوا میں خار جیسے جھوم رہا تھا۔ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ سورج کی روشنی میں اس کے رنگ بدلتے، کبھی دھنک رنگ اور کبھی طلسماتی رنگ پھوٹتے لیکن ایسا کچھ بھی نہیں تھا۔ میں اس کی بے رنگی کے بارے میں سوچ رہا تھا کہ ایک دم سے اس قطرے میں سے آہ و بکا کی آوازیں پھوٹنے لگیں۔ میں حیران ہو گیا کہ قطرے کی چمک دمک تو ہوتی ہے لیکن یہ دونے آہ و بکا کی آوازیں کیسی ہیں؟ میں جب پوری طرح اس میں کھو گیا تو ایک صدا ابھری۔

"میری آہ و بکا میں نہ کھو کر رہ جا، میرے اندر کی صاف صدا سن۔"

میں اس قطرے کی جانب دیکھنے لگا۔ بلاشبہ یہ اسی قطرے کی آواز تھی۔ میں نے اسے دیکھا۔ اس کی آہ و بکا عروج پر تھی۔

"میں سن رہا ہوں، تو بتا تو ہے کیا؟" میں نے پوچھا۔

"میں ایک قطرہ ہوں۔ سمندر سے الگ ہوا قطرہ، آنکھ سے ٹپکا ہوا یا بارش کا قطرہ۔ وہ قطرہ، جس میں تخلیق کا جوہر پوشیدہ ہوتا ہے اور یہ جان لو قطرہ اسی وقت بنتا ہے جب وہ الگ ہو جائے۔"

"تمہاری آہ و بکا، یہ کیا ہے؟" میں نے اس کے رقص اور اس کی تڑپ کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"تو میری آہ و بکا تو سن رہا ہے لیکن میں نے تم سے کہا ہے کہ میرے اندر کی صدا سن۔"

"کیا ہے تمہارے اندر کی صدا؟"

نوکِ خار پہ میرا رقص، میری تڑپ دیکھو۔ میں اپنے سمندر سے الگ ہوں اور سمندر کے کنارے پڑا ہوں۔ کیا تم دیکھتے نہیں ہو کہ سارا سمندر میرے اندر پڑا ہے۔ میری صدا میری جدائی ہے۔ کیا تو میری جدائی میں میرا وصال نہیں دیکھ رہا۔ کیا تو مجھ میں ایک سمندر کی پیاس نہیں دیکھ رہا۔ میرے اندر ایک کھلی ہوئی کائنات موجود ہے۔ کیا تم یہ نہیں دیکھ رہے ہو کہ میری تڑپ اور سمندر کی تڑپ ایک جیسی ہے۔ میں سمندر سے الگ ہو گیا ہوں تو مجھے پتہ چلا ہے کہ پیاس کیا ہوتی ہے؟ مجھے جدائی اور وصال کی لذت سے آشنائی ہوئی ہے۔ میں سارے سمندر کی قوت ہوں۔ میری اسی حرکت میں تو سمندر کی حرکت پوشیدہ ہے۔ میں تڑپتا ہوں تو سمندر بھی تڑپتا ہے۔"

"یہ تو تم اپنی تعریف میں کہہ رہے ہو۔ ایسا ہے بھی؟"

"میں سمندر کی پیاس ہوں اور سمندر میری پیاس ہے۔ اس سے بڑا ثبوت میں تمہیں اور کیا دوں۔ تم نہیں جانتے تو اسی میں تصور تمہارا نہیں تم خود سے غافل ہو۔ خود پر غور کرو۔ کیا تم بھی ایک قطرہ نہیں تھے۔ کیا آج تم میں کائنات کو تسخیر کرنے کی خواہش نہیں ہے؟ یہ تڑپ انہی میں نہیں ہوتی جو خود سے غافل ہیں اور خود سے غفلت سب سے بڑی غلطی ہے۔"

"غلطی، یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟"

"جدا ہونے کے بعد بھی، جدائی کو محسوس نہ کرنا ہی سب سے بڑی غلطی ہے اور دیکھو، غلطی کا احساس ہی اس کے سدھارنے کی سمت کا تعین کرتا ہے۔ غلطی بذاتِ خود کہہ رہی ہے کہ یہ تمہاری کوتاہی ہے اس کی تکمیل کرو اور مکمل ہونے کی کوشش کرو۔"

"چند قدم پر تو یہ سمندر پڑا ہے، جاؤ اس میں جا کر مل جاؤ، یہ آہ و بکا کیوں؟"

"میں آہ و بکا نہیں کر رہا بلکہ یہ اعلان کر رہا ہوں کہ مجھے وہ راز مل گیا۔ اب مجھے دیکھو میں سمندر سے الگ ہوا تو مجھ میں جدائی پیدا ہو گئی۔ اب تو بھی جدائی دیکھ اور جدائی میں پڑا ہوا وصال دیکھ۔ ہجر میں وصال ہے اور وصال میں ہجر۔"

"یہ راز چاہے ہو نہ ہو لیکن......"

"نگاہ پیدا کر، جو تجھے میری آہ و بکا لگتی ہے اس میں میری ہمت دیکھ، میرا ولولہ دیکھ کہ میں جدائی ہونے کے باوجود وصل کی کوشش میں لگا ہوا ہوں۔ اب میرا سمندر سے ملنا یونہی نہیں ہوگا۔ مجھ میں جدائی نے یہ ہمت پیدا کر دی ہے کہ اب بارش کی صورت میں سمندر سے جا ملوں گا۔"

"تو پھر یہ آہ و بکا اور شور و غل کیوں؟"

"مجھے یہ سمجھ آگئی ہے کہ جب میں بارش کے قطرے کی صورت میں سمندر سے ملوں گا تو سمندر سے نہیں ملنا، بلکہ سیپ میں جا کر ایک انمول موتی بننا ہے۔"

"یہ راز تجھے کس نے بتایا؟"

"میرے ہونے نے، میں جدائی میں جلا ہوں اسی لیے مجھ میں سوز پیدا ہو گیا ہے اور وہ ظرف پیدا ہو گیا ہے۔ تو بھی خود میں ظرف پیدا کر کہ ہر بندہ اپنے ظرف کے مطابق مانگتا ہے۔"

"یہ کیا ظرف ہے کہ جس نے تم سے تیری رنگینی ہی چھین لی، قطرہ تو چمکتا ہے، اس میں رنگینی ہوتی ہے، لیکن تو اتنا سادہ کیوں ہے؟"

"دلکش تو ہوں نا، صرف ان کی نگاہ میں جو فطرت کی حقیقت کو سمجھتے ہیں۔ اسی ہجر نے میری رنگینی کو مجھ سے جدا کر دیا ہے۔ دیکھنا جب یہ سادہ سا قطرہ موتی بنا تو انمول ہو جائے گا، دیکھنا۔"

دیکھتے ہی دیکھتے وہ قطرہ مزید تڑپنے لگا۔ وہ جدائی کے رقص میں آ گیا اور پھر سورج کی تیز دھوپ میں اس کا وجود آسمانوں کی جانب اٹھ گیا۔ ایک لمحے کے لیے تو مجھے یوں لگا جیسے وہ قطرہ تحلیل ہو گیا۔ مگر ایسا نہیں تھا، ایک دم سے بادل آسمان پر چھا گئے۔ سورج ان کی اوٹ میں چھپ گیا۔ ہزار ہا قطرے بادلوں سے گرنے لگے۔ ان میں سے وہ قطرہ جانے کیسے کیسے رنگ لیے سمندر سے جا ملا، ایک دم سے اس کی روشنیاں تیز ہو گئیں۔ ایک سیپ اس کے لیے منتظر تھی۔ وہ اس میں واصل ہو گیا۔

مجھے اگلی منزل کے لیے اٹھنا تھا۔ میں راز جان گیا تھا کہ قطرے کو گہر بننے کے لیے جدائی ضروری ہے، وصل کی تڑپ ہی اس کے گہر بن جانے کا راز ہے۔ ایک قطرہ، قطرہ ہی نہیں، قلزم بے ساحل بھی بن سکتا ہے۔ میں ساحل سے اٹھ کر آگے بڑھ گیا۔



جسپال اور رونیت کور فور وہیل جیپ کی پچھلی نشست پر تھے۔ اگلی سیٹ پر ڈرائیور کے ساتھ سیوک سنگھ تھا۔ ان کی پچھلی سیٹ پر دو لڑکیاں بیٹھی ہوئی تھیں، جن کا تعارف نہیں کرایا گیا تھا۔ سہ پہر ہونے والی تھی۔ یہ وہ وقت تھا جب سڑکوں پر ٹریفک بہت بڑھ جاتا ہے۔ ان سب نے یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ کلیان سنگھ کو اٹھا لیا جائے۔ کیونکہ ہرنیک سنگھ سے اس کی دوستی اور کاروباری تعلق سب کچھ سمجھا گیا تھا۔ ہرنیک سنگھ کے بارے میں انہیں شک تھا کہ وہ کوئی ایجنٹ ہے یا کسی کے لیے وہ کام ضرور کرتا ہے۔ اب معلومات لیں تو کڑیاں اس شک کو مزید پختہ کرنے لگیں۔ کلیان سنگھ کے بارے میں یہ فیصلہ اس شک کے بارے میں یقین کرنا تھا۔

وہ انتہائی اونچی اونچی عمارتوں میں سے ایک تھی جو سکھنا جھیل کے جنوب میں واقع تھیں۔ یہ ایک بڑا کاروباری مرکز مانا جاتا تھا۔ اس سفید عمارت میں بہت سارے دفاتر تھے۔ جسپال اور رونیت کور عمارت کے سامنے اتر گئے جبکہ باقی جیپ سمیت تہہ خانے پارکنگ میں چلے گئے۔ وہ دونوں لفٹ کے ذریعے کلیان سنگھ کے آفس کے سامنے پہنچ گئے۔ بدیسی سوٹ پہنے دیسی لڑکی نے صاف انگریزی میں ان سے پوچھا۔

"میں آپ کی کیا خدمت کر سکتی ہوں؟"

"کلیان سنگھ سے ملنا ہے، بہت ضروری۔" رونیت نے کہا۔

"جی بالکل، آپ دیکھیں، ہم وقت پر پہنچے ہیں۔" رونیت نے پورے اعتماد سے کہا تو وہ دیسی لڑکی بولی۔

"آپ کا نام پلیز؟"

"مسز اینڈ مسٹر اروڑ فرام دہلی، چیمبر آف کامرس"

"ٹھیک۔" دیسی لڑکی نے کہا اور کمپیوٹر میں دیکھنے

تھی۔ چند لمحوں بعد وہ مسکراتے ہوئے بولی۔
"ٹھیک ہے آپ جاسکتے ہیں۔"
وہ دونوں اندر کی جانب بڑھ گئے۔ رونیت کور نے جب لان کا کمپیوٹر ہیک کیا تھا، اسی وقت اس نے ایک نام پڑھ لیا تھا اور وہ اسی وقت کے حساب سے وہاں پہنچ گئے تھے۔ اب جو وہ کرنے جارہے تھے، اس دوران مسز اینڈ مسٹر اروڑہ فرام لدھیانہ چیمبر آف کامرس کو نہیں آنا چاہیے تھا۔ وہ کلیان سنگھ کے آفس میں داخل ہوگئے۔
وہ سامنے ایک بڑی ساری کرسی پر بیٹھا ہوا تھا۔ جسپال نے نگاہیں اس کے چہرے پر رکھیں۔ انہیں دیکھتے ہی اس کے چہرے کا رنگ بدل گیا، اس نے غصے میں کہا
"کون ہو تم لوگ، اروڑہ صاحب تو......"
لفظ اس کے منہ ہی میں رہ گئے تھے۔ جسپال اپنا پسٹل نکالتے ہوئے بولا۔
"ہمارے بارے میں سنو گے تو اچھا نہیں ہوگا۔ لہٰذا آرام سے بیٹھ جاؤ، ہمارے......"
"میں پوچھتا ہوں، کون ہو تم؟" اس نے بنا کسی خوف کے کہا تو جسپال بنا کچھ کہے آگے بڑھا اور اس کی گردن پر ہاتھ ڈال دیا۔ جس پر کلیان سنگھ نے اس کی کلائی پکڑ کر مروڑنا چاہی
"جلدی کرو، ہمارے پاس وقت نہیں ہے۔" رونیت کور نے دبے ہوئے لہجے میں تیزی سے کہا تو جسپال نے پسٹل کلیان سنگھ کے ماتھے پر مارا، وہ ایک دم سے چکراتے ہوئے کرسی پر ڈھ گیا۔ جسپال نے اس کی گردن نہیں چھوڑی۔ بلکہ اس کی آنکھوں میں دیکھتا رہا
"کک...... کک...... کون ہو تم؟" کلیان کے منہ سے غصے اور نفرت سے نکلا، جس میں خوف کا شائبہ تک نہیں تھا۔
"ہمیں صرف ایک سوال کا جواب چاہیے، ہمیں جواب دو گے یا ہمارے ساتھ جانا ہے، یا پھر......" جسپال نے غراتے ہوئے کہا۔
"کیسا سوال؟" اس نے آنکھیں سکیڑتے ہوئے پوچھا۔
"سندیپ اگروال عرف سندو تمہارا دوست، کہاں ہے؟ صرف اسی کا جواب چاہیے۔ اب یہ مت کہنا کہ مجھے پتہ نہیں؟" جسپال نے کہا تو وہ بری طرح چونک گیا۔ پھر ایک دم سے خود کو ڈھیلا چھوڑتے ہوئے بولا۔
"مجھے نہیں پتہ تم کون ہو، لیکن میں بھی اسے تلاش کر رہا ہوں۔ اس کے مجھ پر بڑے احسان ہیں۔ مجھے کچھ بھی ہو جائے لیکن اس کا پتہ چل جائے، میں حاضر ہوں۔"
"تو چلو پھر ہمارے ساتھ چل کر تلاش کریں۔" جسپال نے اسے اٹھاتے ہوئے کہا تو وہ ایک دم سے اٹھ گیا۔ اس کے ماتھے پر خون تھا۔ جسے اس نے ٹشو پیپر سے صاف کیا۔ اس نے میز کی دراز کھولی، اس میں سے سیل فون نکالا، پھر چابیاں نکالیں، اس کے ساتھ ہی اس نے پسٹل نکال کر ان پر تانتے ہوئے نفرت سے بولا۔ "مجھے اس کی تلاش تو ہے، لیکن تم جیسے غنڈوں کے ساتھ یوں آسانی سے چلا جاؤں، پسٹل پھینکو۔"
"گلی، یہ تم نے بہت اچھا کیا، ابھی سامنے آگئے، اب تجھے معافی نہیں ہے۔" یہ کہتے ہی جسپال نے اسے جھکائی دی، کلیان نے فائر کر دیا۔ جس کی آواز پورے اپارٹمنٹ میں پھیل گئی۔ جسپال اس پر جا پڑا تھا۔ وہ دونوں فرش پر تھے، رونیت نے کلیان کی کلائی پر زور سے ایڑی ماری، اس کا پسٹل چھوٹ گیا، جسے رونیت کور نے تیزی سے اٹھا لیا۔ جسپال اسے لگاتار مار رہا تھا۔ پھر اسے اٹھایا اور پوری قوت سے دروازے میں دے مارا۔ باہر سیکورٹی والے آگئے تھے اور انہوں نے پوزیشن لی ہوئی تھی۔ مگر ان سے بھی پیچھے دو لڑکیاں گنیں لیے کھڑی تھیں۔ انہوں نے سیکورٹی والوں کو کور کیا ہوا تھا۔ رونیت نے یہ منظر دیکھا تو وہاں موجود سب کی طرف دیکھ کر کہا۔
"کسی نے بھی حرکت کی تو سمجھو وہ اوپر......"
جسپال نے کلیان کو اٹھایا اور سیڑھیوں کی جانب بڑھا۔ ان کے درمیان طے تھا کہ لفٹ ان کے لیے پنجرہ

ثابت ہو سکتی ہے۔ گھومتی ہوئی سیڑھیوں کے نیچے تک وہ تیزی سے آ رہے تھے۔ یہ ممکن ہی نہیں تھا کہ عمارت کی سیکورٹی کو پتہ نہ چلے اور انہوں نے پولیس کو اطلاع نہ دی ہو۔ سیڑھیوں کے نیچے سات آٹھ نوجوان کھڑے تھے۔ جسپال تھٹکا تو رونیت کور نے کہا۔

"جلدی نکلو۔ یہ اپنے ہی ہیں۔"

انہوں نے نیچے سب کو کور کیا ہوا تھا۔ وہ کلیان کو لے کر جیسے ہی سیڑھیاں اترے، وہاں موجود لڑکوں نے کلیان سنگھ کو قابو میں کر لیا۔ وہ اسے باہر گاڑی تک لا رہے تھے کہ ایک سیکورٹی والے نے فائر کر دیا جو ایک لڑکے کو لگا۔ تبھی انہوں نے ایک بم سے زوردار فائرنگ شروع کر دی، جس سے وہ عمارت ہی نہیں پورا علاقہ گونج اٹھا۔ تبھی ایک لڑکے نے زخمی لڑکے کو قابو میں کرتے ہوئے کہا۔

"آپ نکلیں آپ۔ میں سب سنبھال لیتا ہوں۔"

ڈرائیور ان کی گاڑی لے آیا تھا۔ انہوں نے کلیان سنگھ کو اس میں پھینکا اور تبھی بیٹھ کر چل دیے۔

ڈرائیور بہت ماہر دکھائی دے رہا تھا۔ وہ تیز رفتاری سے نکلتا چلا گیا تھا۔ سڑک پر ٹریفک کا بہاؤ تھا۔ کلیان سنگھ کو جسپال نے دبایا ہوا تھا۔ رونیت اپنے لیپ ٹاپ میں مصروف تھی۔ وہ شہر کی ان سڑکوں کو بلاک کر رہی تھی، جو ان کی راہ میں تھیں۔ تقریباً پندرہ منٹ کے بعد وہ مضافاتی علاقے کی جانب بڑھتے ہوئے ایک زیر تعمیر بلڈنگ میں گاڑی سمیت آ گئے۔ جہاں پہلے ہی سے چند لوگ تھے۔ وہ اسے تیسری منزل کے اس کمرے میں لے گئے جہاں کاٹھ کباڑ پڑا ہوا تھا۔ جسپال نے اسے زور سے دھکا دیا تو کلیان فرش پر جا گرا۔ اس کے چہرے پر چوٹ آئی تھی۔

"بولنا شروع ہو جاؤ، تمہیں بتانے گا تو اس قدر تشدد ہوگا کہ تو موت چاہے گا مگر نہیں ملے گی۔" جسپال نے کہا۔

"میں سچ کہتا ہوں، مجھے سندو کے بارے میں کچھ پتہ نہیں ہے۔" کلیان نے بے خوفی سے جواب دیا۔

"رونیت، تم باہر جاؤ اور لڑکوں کو اندر بھیجو، وہ اس کے کپڑے اتاریں، پھر اس کی....." جسپال نے کہنا چاہا مگر کلیان تیزی سے بولا۔

"مجھے اس کے بارے میں پتہ نہیں، لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ میں تمہاری مدد نہیں کروں گا۔ مجھے خود سندو کی تلاش ہے۔"

"کیوں نہیں ہوگی، وہ تمہارا بہترین دوست تھا اور تمہیں اس کے بارے میں سب پتہ تھا اب تم یہ بھی کہو گے کہ تمہیں اس کے گم ہو جانے کا بھی پتہ نہیں!" رونیت نے کہا۔

"لیکن یہ سچ ہے کہ مجھے اس کے بارے میں کچھ پتہ نہیں، میں خود آج تک حیران ہوں۔" وہ یوں بولا جیسے احتجاج کر رہا ہو۔

"تو پھر یہ ہرنیک سنگھ کون ہے، جو اب تمہارا بہت اچھا دوست ہے، جس کے تمہارے ساتھ بہت اچھے کاروباری مراسم ہیں، یہ انہی دنوں تمہارا دوست بنا تھا جن دنوں سندو گم ہو گیا تھا۔" جسپال نے کہا تو وہ دھیرے سے ہنس دیا۔

"کیا یہی تمہیں شک ہے؟ ہو سکتا ہے کہ شاید ہرنیک ہی نے غائب کیا ہو مگر مجھے ایسا نہیں لگا۔ اسے سندو سے" کلیان نے کہا تو رونیت نے طنزیہ انداز میں کہا۔

"تمہیں یہ پتہ ہے کہ ہرنیک کیا ہے اور تم سمجھتے ہو، تمہیں نہیں پتہ ہے جسپال، یہ ایسے نہیں مانے گا۔ تم جتنی باتیں کرو گے۔" یہ کہہ کر وہ باہر چلی گئی۔

"اب بھی وقت ہے۔" جسپال نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"مجھے جسپال کے غائب ہونے کا پتہ ایک ہفتے بعد لگا تھا۔ وہ اکثر ایسے غائب ہو جاتا تھا۔ میں یہ بھی مانتا ہوں کہ ہرنیک سنگھ ایک نیتا ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ اس کے دو نمبر دھندے بھی ہیں۔ مجھے ان دونوں میں کوئی ایسی وجہ نہیں ملتی جس سے شک ہی ہو سکے کہ....." کلیان نے اسے سمجھانے والے انداز میں کہا، تب تک لڑکے اندر آ گئے تھے۔ انہوں نے آتے ہی اس کی پگڑی کو بڑی احتیاط سے اتارا اور ایک طرف رکھ دی۔ پھر ایک نے اس

کی شرٹ اتاری، دوسرے نے پینٹ اتاری تو فقط کچھا رہ گیا۔ لڑکوں نے ڈنڈے اٹھائے اور اسے پیٹنا شروع کر دیا۔ چند منٹ بعد ہی اس نے ہاتھ اٹھا دیے۔ پھر کراہتے ہوئے بولا۔

"رب کے لیے میری بات سنو۔"

جسپال کے اشارے پر لڑکے رکے تو اس نے پوچھا۔

"بولو، کیا کہتے ہو؟"

"مجھے ہرنیک پر ہی شک ہیں، ممکن ہے اسی نے سندو کو غائب کیا ہو۔ لیکن مجھے کیا پتہ کہ تم ہرنیک سنگھ کے بندے ہی ہو؟"

اس کے یوں کہنے پر جسپال ایک دم سے ٹھٹک گیا۔ اس کا مطلب تھا کہ اسے پتہ ہے لیکن وہ اعتماد نہیں کر رہا تھا لیکن یہ طے تھا کہ معاملہ اس کے اور ہرنیک کے درمیان تھا اور انہیں سے پتہ چل سکتا ہے۔

"چلو، اتنا بتا دو کہ سندو زندہ ہے؟" جسپال نے پوچھا۔

"اسے زندہ ہونا چاہیے۔" وہ کراہتے ہوئے بولا۔

"ٹھیک ہے، تم ہمارے مہمان رہو۔ اس وقت تک، جب تک ہرنیک ہمارے ہاتھ نہیں آجاتا۔" جسپال نے کہا تو وہ بولا۔

"بہت مشکل ہے تب تک وہ مجھے ڈھونڈ لے گا۔"

"دیکھتے ہیں۔" جسپال نے کہا اور لڑکوں کو اشارہ کر کے باہر نکل گیا۔

سورج مغرب کی اوٹ میں چھپ گیا تھا۔ چندی گڑھ کی روشنیاں جگمگا اٹھی تھیں۔ جسپال اور رونیت موہالی کی طرف جانے والی سڑک پر موجود ایک بڑے بنگلے میں تھے۔ بظاہر وہ ایک فیکٹری سے ملحقہ دفتر تھا۔ جس میں کام کرنے والے لوگ جا چکے تھے اور تھوڑے سے لوگ وہاں تھے۔ وہ دونوں ایک کمرے میں تھے۔ ان کے پاس امبیت سنگھ اور سانولے چہرے والی پتلی سی گرلین کور تھی۔ وہ چاروں کمپیوٹر کے پاس تھے۔ تبھی رونیت کور نے جسپال سے کہا۔

"لو ہم یہاں آگئے ہیں، اب بتاؤ، میرے سامنے سمجھو پورا چندی گڑھ ہے۔ جہاں کی نشان دہی کرو گے وہیں میں اسے تلاش کر لوں گی۔"

"یہاں کوئی سیکٹر سولہ ہے؟"

"بالکل ہے۔" یہ کہتے ہوئے رونیت کور نے کمپیوٹر کے کی بورڈ پر انگلیاں چلائیں۔ چند لمحوں بعد اس نے کہا۔ "یہ سامنے سیکٹر سولہ ہے۔"

تب جسپال نے اسے ہندسوں میں لوکیشن بتائی وہ رونیت اس کے مطابق کمپیوٹر میں فیڈ کرتی رہی۔ کچھ دیر بعد رونیت کور سر ہلاتے ہوئے سنجیدہ لہجے میں بولی۔

"یہ سرخ دھبہ ہرنیک کی نشان دہی کر رہا ہے اور نقشے کے مطابق وہ اس وقت سیکٹر سولہ میں ہے۔ مطلب بقول تمہارے اس کے سیل فون کی لوکیشن ہے۔"

"مزید دیکھو، وہ جگہ کون سی ہے لڑکے پہنچ جائیں گے وہاں۔" امبیت نے تیزی سے کہا۔

"وہ لڑکوں کے بس کی بات نہیں ہوگا۔" گرلین کور نے اس سے بھی تیز لہجے میں کہا۔

"مگر یہ تو یقین ہو جائے گا کہ وہ وہیں ہے۔" امبیت نے کہا۔

"یہ ٹھیک ہے، مگر کوئی ایکشن نہیں۔" یہ کہہ کر رونیت کور نے جسپال کی طرف دیکھا اور پوچھا۔ "جسپال یہ پکا ہے نا؟"

"ایک دم پکا۔" اس نے کہا۔

تبھی امبیت نے فون نکالا اور کسی کو ہدایات دینے لگا جہاں پر سرخ دھبہ تھا۔ وہ لوکیشن بتائی۔ وہ فون کر چکا تو رونیت نے گرلین سے کہا۔

"تم رہو ادھر اور ہمیں اپ ڈیٹ کرتے رہنا، ہم نکلتے ہیں ادھر ادھر کا بھی خیال رکھنا۔"

"میں جانتی ہوں، مجھے کیا کرنا ہے۔" اس نے اعتماد سے کہا۔

وہ چاروں ایک سیاہ فور وہیل گاڑی میں سوار تیزی سے سیکٹر سولہ کی طرف جا رہے تھے۔ ڈرائیو رونیت کر رہی تھی لیکن گاڑی

انہوں نے بدل لی تھی۔ جسپال تیزی سے سوچ رہا تھا۔ جو منظر اس کے سامنے آیا تھا، اس نے بے چین کر دیا تھا۔

اگرچہ شہر جدید طرز پر آباد تھا، لیکن سیکٹر سولہ کی آبادی قدرے گنجان لگ رہی تھی۔ وہاں زیادہ رش تھا۔ ایک ہال میں تقریب جاری تھی۔ لڑکوں نے یہی بتایا تھا کہ ہرنیک سنگھ اندر موجود ہے۔ وہ اس تقریب کا مہمان خصوصی ہے اور اسٹیج پر بیٹھا ہوا ہے۔

"کافی ہنگامہ ہو سکتا ہے۔" جسپال نے دھیمے سے کہا۔

"اس کے ساتھ سیکورٹی بھی بہت زیادہ ہوتی ہے، ایسے میں ہمارا نقصان بھی ہو سکتا ہے۔" رونیت کور نے ہولے سے اپنی رائے کا اظہار کیا

"مجھے بس چند منٹ دیں گے؟" ابھیت نے اجازت طلب انداز میں پوچھا۔

"کیا کرو گے تم؟" جسپال نے پوچھا۔

"صرف اتنا کہ یہاں ہنگامہ کر دوں، افراتفری پھیلا دوں، اس دوران......"

"وہ پہلے ہی کلیان سنگھ کی وجہ سے چوکنے ہوں گے۔ اس طرح وہ زیادہ چوکنے ہو جائیں گے۔" رونیت کور نے بدحزہ ہوتے ہوئے کہا۔

"لیکن اس طرح تو وہ تقریب کے بعد سیکورٹی کے گھیرے میں یہاں سے نکل جائے گا۔ وہ پچھلے دروازے سے نکلیں گے۔" ابھیت نے کہا۔

"ڈن کرو۔" جسپال نے ایک دم سے کہا۔

"آپ پیچھے چلو۔" ابھیت نے کہا اور کار سے اتر کر لڑکوں سے رابطہ کرنے لگا۔

جسپال اور رونیت اپنے ڈرائیور کے ساتھ اس عمارت کی پچھلی طرف چلے گئے، جہاں سنسان سی تنگ گلی تھی۔ جس میں بہ مشکل ایک چھوٹی گاڑی جا سکتی تھی۔ ڈرائیور گاڑی وہیں میں رہا اور وہ اس متوقع جگہ جا پہنچے جہاں سے ان کا خیال تھا کہ ہرنیک نکلے گا۔ اس طرف ہال کی اندر کی بہت دھیمی آواز آ رہی تھی۔ کوئی بڑے زوروں سے تقریر کر رہا تھا۔ اچانک ہال میں دھماکہ ہوا۔ جس سے اندر افراتفری پھیل گئی تھی۔ تھوڑی دیر بعد گلی کی طرف سے ایک دروازہ کھلا۔ کرتا پاجامہ اور ویسٹ کوٹ پہنے ہوئے بھاری جثے والے سردار کو کافی سارے لوگ گھیرے میں لے کر نکلے۔

"یہی ہے ہرنیک سنگھ....." رونیت کور نے تیزی سے کہا۔ جس پر جسپال نے پسٹل نکالا اور تیزی سے آگے بڑھا۔ وہ لوگوں کے اس گھیرے میں گھس گیا جو ہرنیک کے ارد گرد تھا۔ وہ وہاں کے لوگوں کو یہی باور کرانے لگا، جیسے وہ اسی کا باڈی گارڈ یا سیکورٹی والا ہے۔ جسپال نے اسے پکڑا اور گلی میں سے باہر نکلنے لگے۔ نکلتے ہی لمحے کسی نے ہرنیک کا ہاتھ چھڑوالیا۔ ہرنیک ان کے ہاتھوں سے نکل گیا۔ سامنے گلی میں سے چند لڑکے تیزی سے اندر آ گئے اور سیکورٹی والوں اور ان کے درمیان میں دیوار بن گئی۔ شاید وہ لوگ سمجھ گئے تھے، اسی لیے ایک دم سے انہوں نے لڑکوں پر حملہ کر دیا۔ وہ سب ایک دوسرے سے دست و گریبان تھے۔ گلی میں گھمسان پڑ گیا۔ دو سیکورٹی والوں نے جسپال کو دونوں بازوؤں سے پکڑ لیا تھا۔

یہی وہ لمحہ تھا جب گلی کے باہر ایک زوردار دھماکہ ہوا۔ دھماکے کی گونج ابھی ختم نہیں ہوئی تھی۔ فطری طور پر وہ سب چونکے لیکن جسپال نے اسی لمحے سے فائدہ لے لیا۔ ان کی توجہ بٹ چکی تھی۔ اس نے اپنے دونوں طرف کھڑے لوگوں کے پیٹ میں پوری قوت سے کہنیاں ماریں، یہ دیکھے بغیر کہ وہ دوہرے ہو گئے ہیں، اس نے وہیں اپنے پیروں پر سے چھلانگ لگائی اور ہرنیک سنگھ کے منہ پر گھونسہ مارا اور پھر اس پر جا پڑا۔ وہ دونوں ہی فرش پر تھے۔ تب تک اس نے ہرنیک کی گردن اپنے قابو میں کر لی تھی۔ اسی وقت رونیت کور اپنے ارد گرد کھڑے لوگوں سے بھڑ چکی تھی۔ وہ چار تھے اور رونیت اکیلی۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا۔ صرف اپنا دفاع کر رہی تھی اور جو بھی جسپال کی طرف بڑھتا، اسے روک لیتی۔ اس لیے لہولہان ہو رہی تھی۔ گلی کے باہر فائرنگ بڑھتی چلی جا رہی

تھی۔ چاروں طرف یوں دستی بم کے دھماکے ہو رہے تھے کہ جیسے کسی فوج نے حملہ کر دیا ہو۔ جسپال پوری توجہ سے ہرنیک سنگھ کو قابو میں کرنے کے لیے اس پر ٹوٹا پڑا تھا۔ اس نے ماتھے اور ناک کے درمیان ایسا زوردار پنچ مارا کہ اگلے ہی لمحے وہ بے ہوش ہو گیا۔ رونیت بے حال ہو چکی تھی۔ جسپال اسے بچانے کے لیے بڑھا تو ایک گارڈ نے پسٹل تان لیا۔ جسپال نے ایک دم سے اسے جھکائی دی، فائر تو ہوا لیکن پسٹل اس کے ہاتھ سے جسپال کے ہاتھ میں منتقل ہو گیا تھا۔ باقی تینوں نے رونیت کو چھوڑ دیا اور اپنے پسٹل نکال کر جسپال پر تان لیے تھے۔ انہیں دیر ہو گئی تھی۔ جسپال فوراً ہی زمین پر لیٹا اور گھومتے ہوئے بغیر کسی تردد اور وقت ضائع کیے ان پر فائر کر دیے۔ رونیت کور کا برا حال تھا۔ جسپال نے اسے سہارا دیا تو وہ کراہتے ہوئے بولی۔

"بلاشبہ گلی کے باہر ہمارے ہی لوگ ہوں گے۔ مجھے چھوڑو، باہر دیکھو، کیسا ماحول ہے۔"

جسپال کسی بحث کے بغیر اسے یونہی گلی میں چھوڑ کے باہر کی جانب بڑھا۔ باہر مسلسل فائرنگ ہو رہی تھی۔ کچھ لڑکے اندر آنے کی کوشش میں تھے مگر سامنے کی فائرنگ سے رکے ہوئے تھے۔ جسپال نے تاک کر انہیں نشانہ بنایا تو راستہ صاف ہو گیا۔ وہ فوراً اندر آ گئے۔

"میں ہرنیک کو لے کر آتا ہوں۔ مجھے گاڑی تک کور دینا۔" جسپال نے تیزی سے کہا اور ہرنیک کو اٹھا لیا۔ وہ بہت بھاری تھا لیکن پھر بھی جیسے تیسے وہ اسے گاڑی تک لے گیا۔ تبھی اسے آواز سنائی دی۔ جسپال نے دیکھا ان کا ڈرائیور گاڑی لیے کھڑا تھا۔ اس نے ہرنیک سنگھ کو گاڑی میں پھینکا۔ رونیت کور اس کے ساتھ جا بیٹھی۔ لڑکوں نے انہیں کور دیا۔ وہ وہاں سے نکلتے چلے گئے۔ جیسے ہی وہ روڈ پر آئے رونیت کور نے ڈرائیور کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"میرا اسیل فون اور لیپ ٹاپ کدھر ہیں۔ میں راستہ صاف کر لی ہوں۔ تم بہت احتیاط سے نکل چلو اور رابطہ کر کے گرلین کو اپنی پوزیشن بتا دو۔"

"او کے۔" اس نے کہا اور تیز رفتاری سے چل دیا۔ وہ اسی عمارت میں آ گئے، جہاں انہوں نے کلیان سنگھ کو رکھا ہوا تھا۔ وہ ہرنیک کو دوسرے کمرے میں لے گئے تھے۔ تبھی ایک لڑکے نے جسپال کو پیغام دیا۔

"سر کہہ رہے ہیں کہ زیادہ وقت نہیں، ہائی الرٹ ہو گیا ہے۔ چندی گڑھ ہمارے لیے چوہے دان ثابت ہو سکتا ہے، اگر احتیاط نہ کی گئی تو۔"

"ٹھیک ہے، یہاں دو لڑکوں کے علاوہ سب چلے جائیں۔ گاڑی چھپا دو، روشنی وہی جو معمول کے مطابق ہو۔ رونیت کو لے جاؤ، وہ بہت زخمی ہے۔" جسپال نے کہا۔

"او کے۔" لڑکے نے کہا اور باہر کی طرف چلا گیا۔

ایک نیم تاریک کمرے میں جسپال سنگھ کے سامنے گرلین کور، ابھیت سنگھ اور ایک نیا لڑکا ہرپال سنگھ بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے ان تینوں کی طرف دیکھا اور بولا۔

"ہم سب جانتے ہیں کہ یہ ہمارا پہلا بڑا مشن ہے۔ پہلے ہم نے اتنے بڑے پیمانے پر کچھ نہیں کیا۔ بظاہر یہی لگتا ہے کہ ہرنیک کو پکڑنے کے بارے میں کوئی جانتا ہے اور اس نے ہرنیک کو بتا دیا۔ اسی لیے سارا پلان پہلے ہی سے تیار تھا۔ کیا خیال ہے؟"

"معاف کرنا ابھیت، یہ سب اشارہ تمہاری طرف جاتا ہے۔ اس دنیا میں سب کچھ معاف کیا جا سکتا ہے لیکن غداری نہیں، کیا تم اس کے بارے میں کچھ کہہ سکتے ہو؟" ہرپال سنگھ نے سرد سے لہجے میں اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"میں مانتا ہوں کہ حالات سب میرے بارے میں شک پیدا کر رہے ہیں، لیکن میں نے ایسا کچھ نہیں کیا، میں مر تو سکتا ہوں لیکن غداری کا سوچ بھی نہیں سکتا۔ تم لوگ مجھے جو بھی سزا دو مجھے قبول ہوگی۔ مگر مجھے ایک موقع ضرور دیا جائے کہ میں یہ ثابت کر سکوں کہ میں غدار نہیں ہوں۔" ابھیت نے پورے اعتماد سے کہا۔

"ٹھیک ہے، وقت نہیں، اس لیے ہرنیک اور کلیان

کے بارے میں جو فیصلہ کرنا ہے تم نے ہی کرنا ہے، صرف بیس منٹ ہیں تمہارے پاس، کلیان کو لاؤ۔" ہرپال نے کہا۔

"اوکے۔" ابھیت نے کہا اور اٹھ گیا۔ وہ تینوں بھی اس کے ساتھ اٹھ گئے۔

ملگجے اندھیرے میں ہرنیک سنگھ فرش پر پڑا ہوا تھا۔ وہ چاروں اس کے پاس چلے گئے۔ آہٹ پا کر وہ سیدھا ہوا تو جسپال نے انتہائی طنزیہ لہجے میں کہا۔

"نیتا جی، سکون سے میرے سوالوں کا جواب دو گے یا مار کھا کے بکواس کرو گے؟"

"تم نہیں جانتے کہ تم نے موت کو آواز دے لی ہے۔ سارا چندی گڑھ تجھے تلاش......"

لفظ اس کے منہ ہی میں رہ گئے، کہ ابھیت، کلیان کے ساتھ کمرے میں داخل ہوا۔ اس نے لفظ سن لیے تھے اس لیے اس نے آگے بڑھ کر اس کے منہ پر تھپڑ دے مارا، پھر سخت لہجے میں بولا۔

"سن ہرنیت! ہمیں تم سے کوئی لینا دینا نہیں، صرف ایک سوال ہے، اس کا جواب چاہیے، جھوٹ بولو گے تو موت، سچ بولو گے تو جانے دیں گے تم بھی جانتے ہو کہ وقت بہت کم ہے۔" یہ کہہ کر اس نے اپنا پسٹل نکالا، سیفٹی کیچ ہٹایا تو اس کی آواز ہی سے ہرنیک سہم گیا۔

"بولو، کیا پوچھنا ہے؟" وہ تیزی سے بولا۔

"سندیپ اگروال عرف سندو کہاں ہے؟" ابھیت نے پوچھا تو اس کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں، پھر کلیان کی طرف دیکھ کر بولا۔

"میرا اس سے کوئی تعلق نہیں، وہ تو کلیان سنگھ کا دوست تھا اور..."

"اسی کلیان نے تمہارا پتہ بتایا ہے۔ جھوٹ بولتے ہو؟" یہ کہہ کر اس نے پسٹل اس کے ماتھے پر رکھ دیا تو چند لمحے تذبذب میں رہا، پھر مردہ سی آواز میں بولا۔

"میں نے اس کے اغوا کی ڈیل کی تھی۔ اسی لیے کلیان کے قریب ہوا۔ میں نے اسے اغوا کر بھی لینا تھا، مگر مجھ سے پہلے ہی کسی نے اسے اٹھا لیا۔ میرا خیال ہے وہ "را" والوں نے......"

"اب تمہیں کوئی پتہ نہیں؟" ابھیت نے پوچھا۔

"نہیں۔" وہ اعتماد سے بولا۔

"ہمارے بارے میں تجھے پہلے سے کس نے بتا دیا کہ تجھے اغوا کرنے آئیں گے۔" ابھیت نے پوچھا۔

"وہ تو کل کا بتایا جا رہا تھا کہ کوئی مجھے اغوا کرنا چاہتا ہے۔ وہ تو کوئی اور ڈیل تھی۔ سندو والا معاملہ ہی نہیں تھا۔"

"سندو کے معاملے میں تمہاری ڈیل کس سے ہوئی تھی؟" جسپال نے پوچھا۔

"گرباز سنگھ نام کا آدمی تھا، اس نے بہت بڑی رقم دی تھی۔ سندو کے گم ہو جانے کے بعد سے اس کے ساتھ کوئی رابطہ نہیں ہے اور نہ ہی اس نے مجھ سے رقم واپسی کا مطالبہ کیا ہے۔" ہرنیک نے کہا۔

"تم چندی گڑھ کے سیاست دان ہو، کیا سمجھتے ہو، ہمیں بے وقوف بنا لو گے۔ سندو کو پتہ بتاؤ یا گرباز سنگھ کا، ورنہ ابھی قتل کر دوں گا۔" ابھیت نے سرد لہجے میں کہا تو جسپال نے ہرپال سنگھ کی طرف دیکھ کر گرباز کے بارے میں پوچھا۔

"اس نام کا شخص، ادھر کہیں رہا ہے؟"

"ممکن ہے اس نے نام بدل کر یا کسی دوسری طرح ان کے قریب ہوا ہو۔ لیکن جو بھی کرنا ہے، پانچ دس منٹ میں کر کے نکل جاؤ، پولیس اور خفیہ پورے شہر میں پھیل چکی ہے، وقت بہت کم ہے۔"

"اوکے، ابھیت مار دو گولی اسے۔ کلیان کو بھی ختم کرو اور چلو۔"

"نہیں، رب کے لیے نہیں، میں سچ کہتا ہوں۔ وہ پانچ لڑکے میرے پاس ہیں میں وہ دے دیتا ہوں۔" وہ چیختے ہوئے بولا۔

"کہاں ہیں وہ لڑکے؟" جسپال نے چونکتے ہوئے کہا تو وہ بولا۔

"وہ میرے فارم ہاؤس پر ہیں، آرام سے ہیں۔"

جیسے ہی ہرنیک نے کہا تو جسپال کو غصہ آ گیا۔اس نے اہمیت کا پسٹل ہٹایا اور پوری قوت سے گھونسہ اس کے منہ پر مارتے ہوئے کہا۔

"بے غیرت، تو نے اب تک مذاق بنایا ہوا ہے۔ قسطوں میں معلومات دے کر کیا کرنا چاہتا ہے۔" یہ کہہ کر اس نے ہرنیک کو مارنا شروع کر دیا۔اس کی اچھی ٹھکائی کرنے کے بعد جسپال نے اپنی پنڈلی سے لگا خنجر نکالا اور اس کی ایک ران میں دبا دیا، پھر چیرتے ہوئے باہر نکال لیا۔اس کے ساتھ ہی ہرنیک تڑپنے لگا۔ کچھ دیر بعد تڑپتے ہوئے گھٹی ہوئی آواز میں بولا۔

"رب کے لیے...... بخش دو...... میں...... سب بتا...... دیتا ہوں۔"

"ایک منٹ میں بتا دو، تمہیں آخری موقعہ ہے، اب گولی تیرے دماغ کے پار ہوگی۔" یہ کہتے ہوئے اہمیت نے اس کی کنپٹی پہ پسٹل کی نال رکھ دی۔

"گرباز کا...... فون نمبر...... بتا دیتا ہوں۔ وہ مجھ سے...... دو چار بار ہی ملا ہے...... ہمارا رابطہ فون پر ہی تھا...... مجھے کلیان کے ذریعے...... سندو کی حرکات و سکنات کے بارے میں پتہ چل جاتا تھا...... جو میں گرباز کو بتاتا تھا...... کلیان کو نہیں معلوم...... کیا ہوا سندو کے ساتھ...... اس لیے تعلق رکھا ہوا تھا...... کہ اگر سندو کے بارے میں...... یا ان پانچ لڑکوں کے بارے میں...... کوئی پوچھے...... تو مجھے فوراً پتہ چل جائے۔"

"نمبر بولو۔" جسپال نے کہا تو اس نے نمبر بول دیا۔جسپال نے کال ملائی تو دوسری جانب اس کی توقع کے مطابق فون بند تھا۔ ہرنیک کے چہرے کا رنگ اڑ گیا۔

"لگتا ہے تو اپنا انتم سنسکار بھی نہیں کروانا چاہتا۔ میں نے تجھے ٹھوک دیا تو لاش باہر پھینک دینی ہے جہاں جنگل کوے تجھے کھائیں گے۔"

"اب میں کیا کروں، مجھے فون دو، میں ابھی اس کے جہاں کہو پہنچا دیتا ہوں۔" اس نے اذیت بھرے لہجے میں

تیزی سے بے چارگی کے ساتھ کہا۔

"میں تیری بات کروا دیتا ہوں، نمبر بول۔" جسپال نے کہا تو نے نمبر بتایا۔ جسپال نے اپنے فون سے اس مخصوص جگہ فون کیا، نمبر بتایا۔ کچھ دیر بعد کال آ گئی تو اس نے اسپیکر آن کر کے فون ہرنیک کو دے دیا۔

"ہیلو کون بول رہا ہے۔"

"سردار جی آپ، کہاں ہیں، ٹھیک تو ہیں آپ؟"

"میں ٹھیک نہیں ہوں، اگر تم لوگ میری زندگی چاہتے ہو تو فارم ہاؤس سے وہ پانچ لڑکے واپس اسی گردوارہ صاحب پہنچا دیں۔"

"جی، لیکن یہ نمبر تو...." دوسری طرف سے کسی نے کہا تو جسپال نے اس کی بات کاٹ کر سرد لہجے میں کہا۔

"اوئے تم جو بھی ہو، اگر سمارٹ بننے کی کوشش کی تو یہ تیرا سردار زندہ نہیں رہے گا۔ صرف دس منٹ ہیں تیرے پاس، اگر لڑکے نہ پہنچائے تو...."

"تم کوئی آسمان پر نہیں ہو، اگر سردار جی کو کچھ ہو گیا تو ہم تیرے...." دوسری طرف سے کہا گیا تو ہرنیک بولا۔

"جیسا کہہ رہے ہیں ویسا کرو، جلدی۔" ہرنیک نے کہا تو جسپال نے کہا۔

"سالے نمبر سے ہمیں ٹریس کرنے کی کوشش میں وقت ضائع کرنے کی بجائے کام پہلے کرو، تیرے سردار کی ایک ٹانگ ہم نے چیر دی ہے، خون بہہ رہا ہے، ذرا دیر کرو گے تو سمجھو کیا ہو گا۔"

"کیا یہ سچ ہے سردار جی؟" تشویش زدہ لہجے میں پوچھا گیا

"ہاں، سچ ہے۔" ہرنیک نے کہا۔

"نہیں، ابھی کرتا ہوں۔" دوسری طرف سے کہا گیا، تو جسپال نے فون بند کر دیا

"کیڑا ہے نا دماغ میں، اب تم کیا کہتے ہو کلیان جی۔" جسپال نے ان دونوں کی طرف دیکھ کر پوچھا تو کلیان سنگھ بولا۔

"میرا قصور تمہارے سامنے ہے۔"

"تم کرباج کو جانتے ہو؟" ابھیت نے پوچھا۔

"ہاں، میں اس کے ساتھ کئی بار اس سے ملا ہوں، لیکن یہ پتہ نہیں تھا کہ وہ کیوں ہرنیک سے ملتا ہے، یہ آج پتہ چلا۔ مجھے آپ جو کہو، میں کرنے کو تیار ہوں۔" اس نے کہا تو جسپال بولا۔

"کلیان سنگھ جی، کرباز چاہئے یا سندو کا پتہ۔"

"میری فون پر بات کراؤ یا مجھے جانے دو۔ کل شام تک میں اس کا کھوج نکال لوں گا، اگر اعتماد کرتے ہو تو۔" کلیان نے اعتماد سے کہا تو جسپال نے ہرپال سنگھ کی طرف دیکھا تو ابھیت بولا۔

"یہ میری ذمے داری ہے، میں اس سے رابطے میں رہوں گا۔"

"کلیان سنگھ کو چھوڑ دیں، جیسے ہی لڑکے واپس ملتے ہیں اس ہرنیک کو گولی مار دیں، ہم جا رہے ہیں۔" یہ کہتے ہوئے وہ کمرے سے باہر جانے لگے تو ہرنیک چیخنے لگا۔

"نہیں.... ایسے نہیں مارو۔"

جسپال رک گیا اور اس کی طرف دیکھ کر بولا۔

"تمہیں کرباز چاہئے، دے سکتے ہو؟"

"ہاں، مگر...." وہ بے چارگی سے بولا تو ابھیت نے پسٹل سیدھا کیا اور اسے ڈانٹتے ہوئے بولا۔

"پھر نئی بے غیرتی کرو گے۔"

"وہ بہت خطرناک لوگ ہیں، میں نے ان کے بارے میں بتایا تو مجھے ہی نہیں میرے سارے پریوار کو مار دیں گے یہاں تو میں اکیلا ہی مروں گا۔"

"یہ میرا وعدہ رہا، تجھے کچھ نہیں کہوں گا، اگر کرباز کا پتہ دے دو تو؟"

"میں ابھی بات کرتا ہوں، ایک دوسرے نمبر پر بات کرو۔" ہرنیک نے کراہتے ہوئے کہا۔

اسی طرح دوبارہ کال ملائی گئی۔ رابطہ ہوا تو ہرنیک نے کہا۔

"کرباز کہاں ہو تم، مجھے بچاؤ۔"

"سوری اب وہم تک آ چکے ہیں، اب تجھے مرنا ہی ہوگا۔" دوسری طرف سے بھاری آواز میں کہا گیا

"تم تو میرے دوست ہو، میں مشکل میں۔" ہرنیک نے کہا۔

"تم نے بھاری معاوضہ لیا ہے اس کام کا، اب بھگتو، اور ہاں، دوبارہ فون مت کرنا، تیرے مرنے کی اطلاع مجھے ہو جائے گی۔" اس نے کہا اور فون بند کر دیا۔ ہرنیک یوں ہو گیا جیسے اس میں جان ہی نہ رہی ہو۔

"ہر پال، لڑکے مل جائیں تو ان دونوں کو کہیں چھوڑ کے نکل جاؤ۔ یہ جگہ اب صاف کر دو۔ گرلین آؤ میرے ساتھ۔"

"اس ہرنیک کو چھوڑ دیا تو......" لکھیت نے کہنا چاہا

"یہ اب کچھ نہیں کر سکتا اور اب کوئی جتنا بھی چھپنا چاہے، مجھ سے نہیں بچ پائے گا۔ آؤ۔" جسپال نے کہا اور وہاں سے گرلین کور کے ساتھ نکل گیا۔



میرے سامنے ایک عظیم صحرا تھا۔ سورج چمک رہا تھا۔ بھوری، سنہری ریت تاحد نگاہ پھیلی ہوئی تھی۔ ایک پر ہول سناٹا تھا، جس میں فقط ہوا کی دہشت ناک سنسناہٹ تھی۔ میں چلتا چلا جا رہا تھا۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ میں کس طرف اور کیوں چلتا جا رہا ہوں۔ اچانک صحرا میں تاریکی چھانے لگی۔ جس کے ساتھ ہی ماحول میں دہشت بڑھنے لگی۔ سورج سیاہ دھوئیں کی اوٹ میں چھپ گیا تھا۔ میں ایک ٹیلے پر چڑھا تو سامنے کا منظر حیرت زدہ کر دینے والا تھا۔

ایک دائرے میں بے شمار عجیب و غریب قسم کے جانور بیٹھے ہوئے تھے۔ ان میں سے کچھ جانور رینگ رہے تھے اور کچھ عجیب الخلقت تھے۔ ان میں سب سے آگے ایک الو، چمگادڑ، اور گدھ بیٹھے ہوئے تھے۔ ان کے بالکل سامنے کی طرف ریچھ، لنگور اور بندر تھے۔ ان کی دائیں جانب رال ٹپکاتے ہوئے کتے بیٹھے ہوئے تھے اور بائیں جانب لومڑی اور سانپ تھے۔ ان کے علاوہ کافی سارے ایسے جانور بھی تھے جنہیں میں نہیں جانتا تھا اور نہ ہی انہیں کبھی دیکھا تھا۔

یہ عجیب میلہ لگا ہوا تھا۔ وہ سارے ہی بار بار آسمان کی جانب دیکھ رہے تھے۔ شاید انہیں کسی کا انتظار تھا۔ کتنا ہی وقت یونہی گزر گیا۔ اچانک آسمان کی طرف سے ایک چمکتا ہوا انڈہ ریت پر آن گرا۔ جو کچھ لمحے تو پڑا رہا، پھر جلنے لگا۔ اسی طرح جلتے ہوئے وہ ٹوٹ گیا۔ اس کے ٹوٹتے ہی ہر جانب سڑاند پھیل گئی۔ سارے جانور سجدے میں گر کر شور مچانے لگے۔ کسی کی سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ وہ کیا کہہ رہا ہے۔ اس ٹوٹے ہوئے انڈے میں سے ایک گرگٹ نے سر اٹھایا۔ چند لمحوں میں اس نے نہ صرف اپنے رنگ بدلے بلکہ اس کا چہرہ بھی تبدیل ہوتا رہا۔ یہاں تک کہ ایک بھیانک چہرہ واضح ہو گیا۔ اسی لمحے وہ سارے جانور سجدے میں سے اٹھ گئے۔

"میرے چیلو، تمہیں انسان کی بربادی مبارک ہو۔ تمہاری درخواست پر میں نے اجلاس بلا لیا ہے، کہو کیا کہنا چاہتے ہو؟" اس نے اپنی بھدی اور خرخراتی ہوئی آواز میں کہا تو میں سمجھ گیا۔ وہ ابلیس تھا۔ اور اس کے ارد گرد سارے اس کے چیلے تھے۔ تبھی ایک عجیب الخلقت جانور نے آگے بڑھ کر ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا۔

"بے شک انسان کی بربادی آپ ہی کی وجہ سے ہے گرو جی، ہم کیا چیز ہیں۔ آج کے اس اجلاس کی درخواست آپ سے اس لیے کی گئی ہے کہ آپ کا ہر چیلا بڑھ چڑھ کر اپنی خدمات سرانجام دے رہا ہے۔ اب وہ یہ فیصلہ چاہتے ہیں کہ ان میں بڑا کون ہے؟"

اس پر ابلیس چند لمحے خاموشی سے سب کو دیکھتا رہا پھر اپنی بھدی اور خرخراتی ہوئی آواز میں بولا۔

"تم وہ ہو جو انسان کو اپنے جیسا بنا لیتے ہو۔ انسان کتنا پاگل ہے، اپنی انسانیت چھوڑ کر جانور بن جاتا ہے۔ تم وہ صفت اور صلاحیت ہو، جو کسی انسان میں داخل ہو جاؤ تو وہ اپنی انسانیت کو بھول جاتا ہے۔ مجھے تم سب پر فخر ہے۔ خیر اجلاس کی ابتدا کرتے ہیں۔" یہ کہہ کر اس

نے سب کی طرف دیکھا پھر اُلّو پر نگاہ ٹکا کر بولا۔ "اے اُلّو، میرے دانشور، تجھے تو شروان حاصل ہے۔ میرے اس دانشور کی شان یہ ہے کہ جب انسان کے لیے سورج غروب ہوتا ہے تو اس کے لیے طلوع ہوتا ہے، یعنی کالی رات میں اس کا دن طلوع ہوتا ہے۔ بتا اے دانشور اُلّو تو کس حد تک کامیاب ہے۔"

اس پر اُلّو آگے بڑھا اور ہاتھ باندھ کر بولا۔

"جناب یہ آپ ہی کی مہربانی ہے کہ مجھے شروان دیا۔ میرا یہ شروان ایسا ہی ہے کہ میں انسانوں کے ذہن میں وسواس پیدا کرتا ہوں۔ جس سے ان کی فکری پختگی ختم ہو جاتی ہے۔ اس کے ساتھ ہی میں ان میں خوف پیدا کر دیتا ہوں، ہر طرح کا خوف، موت کا خوف، بھوک کا خوف، ان کے اپنے وجود کا خوف۔"

"تم اس کی کوئی مثال دے سکتے ہو؟" ابلیس نے چلبلاتے ہوئے پوچھا۔

"بے شمار ہیں۔ ایک چھوٹی سی مثال یہ ہے کہ میں نے انسان میں خوف پیدا کر دیا ہے کہ اس زمین سے پانی ختم ہو جائے گا، پھر کیا ہوگا؟ اس خوف کا پیدا ہونا ہی تھا کہ آپ نے دیکھا، انسان اسی لیے بڑے بڑے اجلاس بلا رہا ہے، حالانکہ اسے یہ نہیں معلوم کہ جس نے انسان کو پیدا کیا، وہ پانی ختم نہیں ہونے دے گا۔ اس نے کہہ دیا ہوا ہے کہ جتنا پانی میں نے دے دیا، وہ کبھی ختم ہونے والا نہیں۔ کیونکہ خالق نے ہر شے کو پانی سے زندگی بخشی ہے۔ زندگی اور پانی لازم و ملزوم ہیں۔ میں نے ایسا ابہام پیدا کیا کہ کوئی کچھ سوچ ہی نہیں رہا۔"

"اور بڑی مثال؟"

"انسان کی جس میں حقیقی آزادی ہے، میں نے اسے غلامی بنا کر مکر و فریب پیدا کر دیا اور جو غلامی ہے، اسے آزادی بنا دیا ہے۔ آپ دیکھ رہے ہیں، میں نے ہر جگہ آگ لگائی ہوئی ہے، کسی کو سمجھ ہی نہیں آنے دے رہا ہوں کہ حقیقی آزادی ہے کیا؟"

"کوئی اور بات کرنا چاہتے ہو؟"

"جناب میں نت نئے مکر و فریب گھڑ کر فکری فلسفہ میں انتشار بڑھا رہا ہوں۔ آپ نے دیکھا نہیں عورتوں سے امامت تک کروا دی گئی۔ مرد اس کے پیچھے نماز پڑھ رہے ہیں۔ یورپ کی عورتیں بچے پیدا نہیں کر رہی ہیں۔ میں نے عورت سے اس کا عورت پن چھین لیا آزادیٔ نسواں کے نام پر۔ یہی حال اب برصغیر کی عورتوں کا ہے، وہ اندھی ہو چکی ہیں۔ انہیں معلوم ہے کہ یورپ کی عورتوں کا کیا حشر ہو چکا ہے، پھر بھی آزادیٔ نسواں کی تحریکیں چلا رہی ہیں۔ آقا میری کیا کیا خدمات نہیں ہیں۔"

"ٹھیک ہے۔" یہ کہہ کر ابلیس نے چمگادڑ کی طرف دیکھا اور کہا۔ "اے اُبھائی، تمہارا آسمان اُلٹا ہے، ہاں اب تم بولو۔"

"آقا میں زیادہ باتیں کر کے دماغ خراب نہیں کرتا۔ میں نے جو کیا ہے اس کی تصویری جھلک دکھاؤں گا تاکہ ہر شے واضح ہو جائے۔" چمگادڑ نے دست بستہ ہو کر کہا۔

"تو پھر کھولو اپنی تھیلی اور دکھاؤ، کیا دکھاتے ہو۔" ابلیس نے اپنے دانت نکوستے ہوئے کہا۔

چمگادڑ نے اپنی تھیلی کھولی، اس میں سے سیل فون نکالا، اس نے اپنے ہاتھوں کو پھیلا کر سیل فون اس پر رکھا تو وہ آئی پیڈ بن گیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے اس کی اسکرین بڑی ہوئی لیپ ٹاپ جیسی ہو گئی، پھر وہ ٹی وی جیسا بن گیا۔ جس کی جسامت لمحہ بہ لمحہ بڑھ رہی تھی اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے وہ سینما اسکوپ سائز کی اسکرین بن گئی۔ سبھی اس طرف دیکھ رہے تھے۔ اسکرین پر سب سے پہلے ایک نائٹ کلب کا منظر ابھرا۔ نوجوان جوڑے مستی میں ایک دوسرے سے جڑے ناچ رہے تھے۔ ہر جوڑا ہوش سے بیگانہ تھا۔ کسی کو کسی کی خبر نہیں تھی۔ اس کے ساتھ ہی چمگادڑ کی آواز ابھری۔

"میں نے ہر جگہ یہ کلچر متعارف کرا دیا ہے۔ یہ صرف انہی ملکوں میں نہیں ہے، جہاں اجازت ہے، بلکہ میرا کام

تو یہاں آسان ہوتا ہے جہاں لندن نائٹ کلب پر پابندی ہوتی ہے، وہاں یہ نوجوان چھپ کر موج مستی کرتے ہیں، یہ دیکھو ان کے گھروں کا منظر، میں نے ان کے گھروں کو نائٹ کلبوں میں بدل دیا ہے۔"

اس کے ساتھ ہی منظر بدل گیا۔ گھروں میں نوجوان جوڑے ناچ رہے تھے۔ شراب عام بہہ رہی تھی۔ اس میں کئی منظر بدلے۔ نائٹ کلب، ہوٹل، رقص گاہیں، گھروں میں مخلوط پارٹیاں، جہاں رشتے ناتوں کی کوئی پروا نہیں تھی، نہ کسی رشتے کے تقدس کا احساس اور نہ احترام۔ اس کے ساتھ ہی منظر بدلا، سمندر کنارے برہنہ عورتیں نمودار ہوئیں۔ اس کے ساتھ بڑے بڑے سوئمنگ پول میں نہاتے جوڑے، اٹھکیلیاں، قہقہے، شور شراب، ایک دوسرے سے لپٹے ہوئے۔ ان سارے مناظر میں یوں دکھائی دے رہا تھا کہ جیسے یہ سارے جسم اور بدن کے پجاری ہوں اور بدن کی ہوس نے سب کو حیوانی سطح پر لا کھڑا کیا ہو۔ انہیں دوسرا ہوش ہی نہ ہو۔

"شاباش ان ترقی پذیروں کو جلد از جلد ترقی یافتہ بنا دو۔" ابلیس نے خوش ہوتے ہوئے کہا۔

"میرا اگیان اگر دیکھنا ہے تو میرے سامنے بیٹھے ریچھ، بندر اور لنگور کو دیکھو، یہ وہ آئینہ ہیں جس میں انسان کو یہ باور کرایا کہ ان کے آباؤ اجداد یہ جانور ہیں۔ ڈارون کی تھیوری کو ایک زمانہ تسلیم کرتا ہے، کتنا احمق ہے یہ انسان۔ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ یہ سائنسی اصول ہر زمانے میں، ہر جگہ ایک ہی نتیجہ دیتا، مگر انسان کی عقل پر قربان جاؤں، بن دیکھے یہ تسلیم کرلیا کہ جس حقیقت کا وجود ہی نہیں، اسی کو تسلیم کیے بیٹھے ہیں۔ ان عقل کے اندھوں سے پوچھا جائے کیا اب لنگور اور بندر سے انسان بنتے ہیں؟ جو انسان کی اولاد کہلوانا عار سمجھتے ہیں اور جانوروں میں اپنے آباؤ اجداد کو تلاش کرتے ہیں۔ آخرکار صدیوں سے انسان کی عقل فکر میں نہ آنے والے ان رازوں نے اپنی منزل کو پالیا۔ ان کی باسوں سے اپنے آباؤ اجداد کی بُو کا ادراک پایا۔"

"واہ! تم نے خوب کام کیا۔" ابلیس نے تعریف کرتے ہوئے خوشی کا اظہار کیا۔

"اور تو اور میرے اگیان کو مغربی مفکرین جس طرح پیش کر رہے ہیں، وہ میری طاقت کا مظہر ہیں۔ میں وہ گیان عام ہونے نہیں دیتا، جس میں انسان کو عقل آ جائے، جیسے آئن سٹائن کی تھیوری کو قانون بننے میں کتنا وقت لگا۔ اب بھی اس میں شک ڈال دیا ہے میں نے، اس کی طرف کسی کو آنے ہی نہیں دیتا کہ کسی انسان کو اس کی سمجھ آ جائے مگر یہ وہ راز ہے جسے اگر انسان سمجھ لے تو اپنے وجود ہی کے بہت سارے انکشافات اس کے منتظر ہیں، جس سے وہ حقیقت کو سمجھنے کے قابل ہو سکتا ہے۔"

"ہاں! انسان کو اندھیرے میں رکھو، اندھیرا ہی ظلمت ہے جو کفر کی طرف لے جاتا ہے۔ ان کو نفس کے جسم میں الجھا دو، اسی لذت میں گم کر دو۔ ان بھیدوں کی طرف نہ جانے دو جس سے انسان شعور پا جائے۔" ابلیس نے چیخ کر کہا، پھر کرگس کی طرف دیکھ کر کہا۔ "بولو تیرا اوصیان کیا کہتا ہے؟"

کرگس آگے بڑھا اور اپنی بھدی آواز میں بولا۔

"میرے آقا! کیا آپ دیکھ نہیں رہے میں نے کس قدر موت بانٹنی شروع کر دی ہے۔ شروان والا انگو تو اس طرف لاتا ہے، اگیان والی تو ہوش سے بیگانہ کرتی ہے اور انہیں الجھا دیتی ہے، لیکن اصل کام تو میں کرتا ہوں۔ میں موت بانٹتا ہوں۔ دیکھ نہیں رہے انسان کس قدر ذلیل و خوار ہو کر مر رہا ہے۔ روئے زمین پر اس وقت سب سے ارزاں خون مسلمان کا ہے، مجھے ان پر محنت نہیں کرنا پڑتی، یہ تو پلیکن کی طرح ہیں جو اپنا لہو خود ہی پی رہے ہیں۔ ایسی قتل و غارت کبھی پہلے دیکھی تھی آقا؟"

"شاباش، تمہارا کام بہت اچھا ہے۔" یہ کہہ کر اس نے کتے اور سانپ کی طرف دیکھا۔ کتا آگے بڑھا تو ابلیس نے کہا۔ "تم تو پیچھے ہٹ جاؤ، تم میں جو انسان سے وفاداری کی فطرت ہے وہ مجھے کھٹکتی ہے، تم سے تو اچھا یہ سانپ ہے۔ تم آگے آؤ اور بتاؤ۔"

سانپ تیزی سے آگے بڑھا اور پھن اٹھا کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے اپنی نیلی آنکھیں تیزی سے گھمائیں۔ پھر اپنے روپ بدلے اور بولا۔

"یہ شیروان، دھیان اور گیان والے ایک طرف، موت بانٹنے والی بھی ایک طرف، یہ سب اس وقت تک ناکارہ ہیں، جب تک میں سازش نہ کروں۔ یہ میری سازش کا کمال ہے کہ انسان آپس میں لڑتے ہیں۔ اگرچہ انسان مجھے کتے سے بھی بدتر سمجھتے ہیں لیکن میں ان میں ایسے چہرے کے ساتھ جاتا ہوں کہ وہ مجھے گلے لگانے پر مجبور ہوتے ہیں۔ میرا احترام کرتے ہیں۔ میں انہی کے اندر کے تکبر، لالچ اور بھوک کو استعمال کرتا ہوں۔ میرا سب سے بڑا ہتھیار وہ سکالر ہیں جو کتابوں کو ہاتھ میں رکھ کر ان سے علم حاصل کرنے کی بجائے، دوسروں پر تنقید کے جواز تلاش کرتے ہیں۔ میری سازش ہی سے وہ ہمارے جال میں آتے ہیں۔ اس سے آگے ہی یہ شیروان، گیان اور دھیان والے کام کر سکتے ہیں۔"

سانپ کے کہنے پر ایک دم سناٹا چھا گیا۔ ابلیس خاموش تھا۔ چند لمحے یونہی گزر گئے، پھر وہ بولا۔

"میں خوش ہوا کہ میرے چیلے ایک سے بڑھ کر ایک ہیں۔ میں ان میں کوئی فرق نہیں کر پا رہا ہوں۔ مجھے یقین ہو گیا ہے کہ میرا ایجنڈا، پروپیگنڈا اور ہتھکنڈہ مضبوط ہاتھوں میں ہے۔ تم سب بڑے ہو، بس تم میں سے وہ بڑا ہے جو زیادہ انسانوں کو بہکا دے۔ تم سب نے بڑے بڑے کام کر لیے مگر ایک خطرہ اب بھی ہے، میں اسی سے ڈرتا ہوں۔"

"آپ بھی ڈرتے ہیں آقا؟" ایک سڑاند مارتے ہوئے جانور نے حیرت سے پوچھا۔

"یہ ڈر، خوف نہیں ہے، بلکہ یہ ڈر وہ ہے جس سے حضرت انسان آگہی پا سکتا ہے، پھر ہماری طاقت وہاں پر سلب ہو جاتی ہے۔ یہ اجلاس جس مقصد کے لیے تھا، لیکن تمام جنیات کو یہاں بلانے کا مقصد کچھ اور بھی ہے۔ کیا میں وہ نہ بتاؤں؟" ابلیس نے دردمندی سے کہا تو تمام جنیات اور جانور اچھل اچھل کر ابلیس کی تائید کرنے لگے۔

"آقا، جیسا آپ چاہیں۔" کسی طرف سے بھی آواز بلند ہوئی تھی۔

"سنو میں کیا چاہتا ہوں، یہ میں بعد میں بتاتا ہوں، پہلے یہ جان لو کہ ہم اس وقت برصغیر کی اس دھرتی پر کھڑے ہیں، جسے چاہے تقسیم کر دیا ہے، مگر میں اس کی تقسیم کو نہیں مانتا۔ مجھے سرحدوں سے کوئی غرض نہیں ہے۔ یہاں سے مجھے ڈر لگ رہا ہے۔ میرے تھنک ٹینکوں نے مجھے بتایا ہے کہ یہاں کے انسان ہمارے ایجنڈے، پروپیگنڈے اور ہتھکنڈے کو ختم کر سکتے ہیں۔ یہ بات تم لوگوں کو ایسے سمجھ نہیں آئے گی، اس کے لیے تمہیں ماضی میں لے جانا پڑے گا۔" ابلیس بے حد جذباتی ہو گیا تھا۔

"کہو آقا کہو۔" ایک شور اٹھا

"جیسا کہ آپ جانتے ہیں کہ میری دشمنی انسان سے ہے، اور ان میں سے سب سے بڑا دشمن مسلمان ہے۔" یہ کہہ کر وہ لحہ بھر کو رکا پھر کہتا چلا گیا۔ "یہ انتہائی نازک لمحات ہوتے ہیں جو صدیوں کے بعد قوموں پر آتے ہیں، وہ لمحات ہوتے ہیں آزادی کے۔ میری بھرپور کوشش ہوتی ہے کہ میں ان لمحات کو ٹال دوں۔ حقائق عالم سے ان کی آنکھیں بند کر دوں۔ تاکہ وقت گزر جائے۔ جب وقت گزر جاتا ہے تو پھر کچھ نہیں بچتا۔ کیونکہ آزادی کے لمحات صدیوں بعد ہی قوموں پر آتے ہیں۔ حقائق عالم کو ان کی نگاہوں سے اوجھل کرنے کے لیے میں مذہبی، عوامی سیاسی اور معاشرتی گروہوں میں گھس جاتا ہوں۔ ہر طرح سے انہیں گمراہ کرتا ہوں۔ ان کے اندر نفرت، حسد اور کینہ بھر دیتا ہوں۔ یہ بہت آسان ہے۔ صرف یہ کرنا ہوتا ہے کہ ان سب کو ایک دوسرے سے بڑا کر کے دکھا دوں۔ انہیں یہ باور کرا دوں کہ تم سب سے بڑے

ہو۔ میں نے بھی ایسا ہی کیا۔ میں نے ہر ایک کو یہ باور کرایا کہ تم سب سے بڑے حریت پسند ہو۔ ساری حریت تمہارے پاس ہے۔ میں نے سب کے ہاتھوں میں حریت تھما دی اور ان کا شیرازہ بکھر گیا۔ اس کے بعد میں نے بڑا اور یہ کیا کہ انہیں جتایا تم ہی سب سے اعلیٰ اور برتر قوم ہو۔ اپنی قوم کے لیے سب سے بہتر فکر کرنے والا دوسرا کون ہے۔ انہیں لڑنے مرنے کے لیے تیار کر لیا۔ انہیں کہا کہ اپنے ماننے والوں کو الگ کر لو۔ ورنہ جسے تم اچھا سمجھتے ہو اس کے ساتھ مل کر آزادی حاصل کرو۔ سبھی آزادی کے متوالے حریت پسند بن گئے۔ میں نے اپنی ہنر مندی سے اس وقت کو ان کی آنکھوں سے اُڑا دیا۔ ان قیمتی لمحات کو اپنے دامِ فریب سے الجھا دیا۔ میں کامیاب تھا کہ انسان پر انسان کی غلامی کا تسلسل قائم رہتا۔ اپنی ہی غلامی میں نسل در نسل انسان خود پر ظلم کی انتہا کرتا رہتا۔ میں کامیاب تھا۔ اس وقت دو چار لوگ جو مذہب، سیاست اور آزادی سے واقف تھے کچھ نہیں کر سکتے تھے۔ میں نے انفرادی طور پر ان کے دماغ میں بھی ڈال دیا تم ہی حریت پسند ہو اور بڑے گروہ والے ہو۔ یوں وہ اپنے ماننے والوں کو لے کر الگ ہو گئے۔ میں نے اصل میں انہیں ٹکرا کر کے انہیں اپنی ہی قوم کا دشمن بنا دیا۔ یہ ثابت کر دیا کہ وہ جاہل اور ظالم ہیں۔ میں کامیاب تھا مگر......"

"مگر کیا ہوا آقا؟" ایک شور اٹھا۔

"اس وقت میرے ارادوں کو ایک مردِ حریت کی آنکھ دیکھ رہی تھی۔ اس نے میرے ہتھکنڈوں کو بھانپ لیا۔ اس نے بروقت دو قومی نظریہ پیش کر کے نہ صرف میرے مکر و فریب کے جال کو ان کی نگاہوں پر ظاہر کیا اور ان کے مقصد کو واضح کیا۔ جسے میں اپنے جال کے پیچھے چھپائے ہوئے تھا۔ میں چاہتا تھا کہ پوری مسلمان قوم کو غلامی میں رکھوں۔ اس مردِ حریت نے کہا غیر کی طرف مت دیکھو اپنی طرف آؤ۔ اپنوں سے مل کر آزادی حاصل کرو۔ غیر کے ساتھ ملنے سے رسوائی کے سوا کچھ نہیں۔ اپنی آزادی آپ حاصل کرو اور غیر کو اپنے ارادے سے نکال دو۔ یہی حریت و خودداری ہے۔ خود اپنی قوت سے آزادی حاصل کرو۔ یہی میرے لیے موت تھی۔"

"پھر آپ نے کیا کیا آقا؟"

"کیا تم نے نہیں دیکھا اس غلامی کی اندھیری رات میں بھٹکی ہوئی قوم کو اس ملک کے دل میں اس نے ان کے محبوب رہنما قائداعظم کا دیدار کرایا۔ اور یقین کی روشنی سے صورت کو ان کے دلوں میں اتارا۔ میرے پھیلائے ہوئے جال کو پھاڑ دیا اور اپنے مقصد کو حاصل کر لیا۔ ایک صورت سامنے کر دی، جس پر یقین کو قوت بنا دیا لیکن میں بھی اپنا کام کر چکا تھا۔ میں نے اس خطے میں انتشار پیدا کر دیا تھا۔ مگر پھر بھی اس قلندر لاہوری کی آواز جس کے کانوں میں بھی پڑی اس پر آزادی کا جنون طاری ہو گیا۔ کیا تم نے نہیں دیکھا اس قلندر کی نواؤں کی بجلیاں جہاں گرتی تھیں، وہاں سے آزادی کی تلواریں پھوٹتی تھیں اور میں سب بے بس ہو گیا۔" ابلیس یہ کہہ کر خاموش ہو گیا۔

"خاموش کیوں ہو گئے آقا؟" چیلے چیخ اٹھے تو وہ چند لمحے چپ رہنے کے بعد رقت آمیز لہجے میں بولا۔

"وہ وقت قابلِ دید ہوتا ہے جب آزادی کے متوالوں کے جذبے آسمان سے بلند ہوتے ہیں۔ ان کے حوصلے ایسے ہوتے ہیں کہ ہر قربانی سے گزر جاتے ہیں۔ وہ میرا جال کاٹ کر نکل گئے۔ وہ "لا الہ الا اللہ" پر گئے۔ انہوں نے ایک نیا جہان بنا لیا۔ کائنات میں اپنا آپ ظاہر کر کے "اللہ" کی قوت کا مظہر بن گئے۔ یہ لوگ موت سے بے تیغ و سناں گزر گئے۔ انہیں موت بھی نہ روک سکی۔ وہ قلندر کی ڈھلی ہوئی صورت میدان میں ڈٹی رہی۔ اس کی صدائیں بلند ہوتی رہیں۔ وہ میرے اندر کے فتنے کو دیکھ رہا تھا۔ میں ننگا ہو کر ناچا۔ وہ قلندر تھا اور اس نے مجھے نیچا کر رکھ دیا۔ وہ صاحبِ بصیرت میری چالوں کو سمجھتا تھا۔ ورنہ میں کسی کی سمجھ میں آنے والا نہیں ہوں۔ اس نے لا الہ الا اللہ سے سفر کیا اور ایک نیا جہان بنا

کہ محمد رسول اللہ کی طرف بڑھنے کو تیار کردیا۔ جو لوگ حریت انہیں ان کا دین دیتا ہے وہ سینے سے لگا کر موت سے بھی گزر گئے۔ اس وقت جو میرا جال ٹوٹ گیا تھا، وہ دوبارہ نہیں بن سکا۔ اس کا تانا بانا آج تک بکھرا ہوا ہے۔ وہ وقت میرے لیے بڑا دردناک تھا۔ اس وقت جو اپنی قوت بازو سے نکل گئے، سو نکل گئے۔"

"پھر کیا ہوا؟" چیلے چیخے۔

"اس مرد قلندر نے میرے سارے منصوبے ختم کر دیئے لیکن میں نے بھی اس سے بڑا انتقام لیا۔ ان کے ہاتھوں قتل و غارت گری کا بازار گرم کردیا۔ میں نے اس جاہل قوم کی سوچ ہی سلب کرلی۔ یہ کیسے بے ہوش لوگ ہیں، جنہیں آزادی کا احساس تک نہیں ہوا۔ اس وقت یہ سمجھ رہے تھے کہ انہوں نے آزادی حاصل کرلی، کیا تم نے نہیں دیکھا کہ چوراہی میں، ان کے ساتھ میں نے کیا کیا۔ میری ابلیسیت ننگا ہو کر ناچی۔ آزادی کا خمار ان کے ذہنوں سے نکل گیا۔ ہر اس قوم کے ساتھ ایسا ہی ہوتا ہے جو غیر کے ساتھ مل کر آزادی حاصل کرتے ہیں۔ آزادی صرف اپنی قوت بازو سے نصیب ہوتی ہے۔ انہوں اب پھر حریت کا نعرہ لگا دیا ہے۔ ان کی عقل میں مزید جوئیں ڈال دو۔ تاکہ انہیں ہوش تک نہ آئے۔ اگر کہیں انہیں آزادی کا پتہ چل بھی جائے اور یہ آزادی ان کے سینے میں ابھرے تو بارود سے ان کے سینے ٹھنڈے کردو۔ یہی اس قوم کا مقدر ہے۔"

"ہمارے سب سے بڑے دشمن مسلمانوں کے ساتھ کیا کیا؟" ایک چیلا دست بدستہ بولا۔

"اسی دن سے میرا اگلا مقصد شروع ہوگیا۔ تاکہ یہ جو سلامتی کے نام پر جہان بنایا گیا ہے، یہی سلامت نہ رہے۔ اس پر کبھی شباب نہ آسکے۔ یہ خزاں رسیدہ بنا رہے۔ یہاں پھول کی بجائے خون بہے۔ پہلے میں نے ان کی شہ رگ پر چھری رکھ دی۔ سو کچھ ہی سال بعد میں نے سن پینسٹھ میں اس پر حملہ کر دیا۔ میں نے تو یہ سوچا تھا کہ یہ ابھی کمزور ہے، یہاں کے لوگ بھوکے ہیں لیکن مجھے کیا پتہ تھا کہ شہادت ان کی سب سے بڑی قوت ہے۔ میں نے ان کے دل پر شب خون مارا۔ اس کے شہیدوں نے میرے مذموم منصوبوں کو ناکام بنا دیا۔ انہوں نے شہادت کی روایت کو برقرار رکھا۔ کیونکہ اس جہان کی بنیاد ہی شہیدوں کے لہو پر ہے۔ میں کہاں سکون سے بیٹھنے والا تھا۔ چند سال بعد ہی میں نے اس کا ایک بازو کاٹ کر رکھ دیا۔" یہ کہتے ہوئے اس نے پنڈال کی طرف فخر سے دیکھا تو سانپ نے اٹھ کر کہا۔

"لیکن کیا آپ نے نہیں دیکھا آقا! انہوں نے ظاہری شباب حاصل کرلیا، اس نے ایٹم بم کی صورت میں اپنا ایک خوفناک بازو پیدا کرلیا ہے؟"

اس کے یوں کہنے پر ابلیس نے غضب ناک انداز میں اسے دیکھا اور خرخراتی ہوئی آواز میں انتہائی غصے میں کہا۔

"احمق تم نے میرے زخم جگر پر ناخن مار دیا۔ اس بے غیرت کو یہاں سے اٹھا کر پچھلی نشستوں پر دھکیل دو، مجھے برداشت نہیں ہو رہا۔" یہ کہتے ہوئے اس نے اپنا لباس تار تار کر دیا۔ اس کے سیاہ بدن پر نشان واضح تھے۔ "یہ دیکھو میرے جسم پر، میرے ظاہر اور باطن پر یہ جو شکست کے داغ ہیں، یہ اس مرد قلندر کے پے در پے وار کرنے کے نشان ہیں۔ اس نے وہ تلوار ان لوگوں کے ہاتھ میں دے رکھی ہے جو مسلسل چلتی چلی جا رہی ہے۔ اس لیے اب میری ترجیح بدل گئی ہے۔"

"کون سی ترجیح آقا؟" چیلے بولے

"یہ جو لا الہ الا اللہ کی بنیاد پر ملک بنا، اسے چلانا تو انسانوں ہی نے ہے نا۔ میں نے اس ملک کے باسیوں کو اس تلوار سے غافل کر دیا ہے جس کی طرف مرد قلندر نے توجہ دلائی تھی۔ جو ان میں بجلی کی سی صلاحیت بھر دینے کے لیے کافی ہے۔ میری نگاہیں ادھر ہی گڑی ہوئی ہیں۔ میں کوئی لمحہ خالی نہیں جانے دیتا۔ افسوس اس نے ظاہری شباب حاصل کرلیا۔ چاغی کے پہاڑوں نے اس کا جلال دیکھا، جس سے میں خوف زدہ ہو گیا ہوں۔ سو تب سے میرا مقصد صرف یہی ہے کہ میں اسے روحانی

اور باطنی طور پر اس قدر کمزور کر دوں کہ یہ تلوار ہی نہ اٹھا سکیں۔ میں اسے باطنی شباب حاصل کرنے کے قابل ہی نہیں چھوڑنا۔ کیا تو نہیں دیکھا، جن اسلامی ممالک کے دماغوں میں طاقت کا جنون پیدا ہوا میں نے ان کے ساتھ کیا کیا۔"

"وہ اپنی موت آپ مرتے جا رہے ہیں۔" چیلوں نے خوشی سے بغلیں بجاتے ہوئے کہا۔

"نہیں، وہ مرتے نہیں ہیں، یہی تو سب سے بڑی مصیبت ہے۔ وہ پھر سے زندہ ہو جانے کی قوت رکھتے ہیں۔ میں نے ان کے لیے کچھ اور ہی سوچ لیا ہے۔"

"کیا سوچا ہے آقا۔" چیلوں نے پوچھا۔

"اس ملک نے ظاہری عالم میں تو شباب حاصل کر لیا ہے، میں انہیں روحانی شباب پر ہی نہیں آنے دوں گا۔" ابلیس نے زور سے کہا تو ایک چیلا اٹھ کر بولا۔

"آقا یہ روحانی شباب کیا ہے؟"

"اس قوم کی اکثریت عشقِ رسول (ﷺ) میں ہے۔ وہی پیدا نہ ہونے دو۔ یہی ان کا روحانی شباب ہوگا۔"

"میں نے انہیں باطنی طور پر کمزور کرنے کے لیے ساری قوت لگا دی ہے۔ کیا تم نے نہیں دیکھا کہ الو، چمگادڑ، سانپ کیا کیا کر رہے ہیں۔ تم میرے ساتھ آؤ ہر شعبہ زندگی میں اچھا ہے وہ سیاسی ہے، مذہبی یا معاشرتی علمبردار ہیں۔ میڈیا ہے، جو بہت کچھ کر سکتی ہے، زندگی کے ہر شعبے میں میرے ساتھ لگ جاؤ۔ تم نے دیکھا نہیں اس وقت سب سے زیادہ مذہبی منافرت پھیلی ہے۔ جو ملک مذہب کے نام پر بنا۔ یہاں کے لوگ مذہب کے لیے نہیں، فرقوں کے لیے لڑتے ہیں۔ اس سے بڑی کامیابی کیا ہوگی۔ اب میں کامیاب ہوں، بڑی دیر ہوگئی میرے مقابل کوئی نہیں آ رہا۔ میں نے ہر جانب فحاشی پھیلا دی ہے۔ میری خواہش ہے کہ اب کوئی میرے مقابل آ کر مجھے شکست دے۔ ایسا ہمیشہ چلتا رہے گا اگر...." ابلیس یہ کہہ کر خوف زدہ انداز میں خاموش ہو گیا۔

"مگر کیا آقا؟" چیلے تشویش زدہ لہجے میں بولے۔

"یہ ملک ایک وجود کی مانند ہے اور اس کا ایک دل ہے، جسے عالم جاوید کہتے ہیں۔ اسی عالم سے، اسی دل سے ہمہ وقت صدائیں اٹھ رہی ہیں۔ میں نے پوری کوشش کر کے انہیں ان صداؤں سے دور رکھا ہوا ہے۔ طوفانِ بدتمیزی اس قدر برپا ہے کہ انہیں آواز سنائی نہیں دینے دیتا۔ میں نے پورا زور لگایا ہوا ہے کہ ان کے کانوں میں عالمِ جاوید کی آواز نہ پڑے۔ میں نے ان کے کان بند کر دیے ہوئے ہیں۔"

"ایسا کیا ہے اس آواز میں آقا؟" ایک چیلے نے پوچھا تو ابلیس کو جھرجھری آ گئی اس نے کہا۔

"تم نے نہیں دیکھا، انہی صداؤں نے پہلے کیا کیا ہے۔ اس عالم میں ایک جہان پیدا کر دیا۔ مجھے ڈر ہے کہ کہیں پھر سے اس جہان میں انہی کی روح نہ پیدا ہو جائے۔ وہ قوانین جو ان کی آنکھوں پر کھل نہیں رہے جو چودہ صدیاں پہلے تجربات سے گزر چکے ہیں۔ آج بھی وہ اسی طرح کامیاب ہیں، جیسے پہلے تھے اور ابد تک رہیں گے۔ ان قوانین کو ان کی آنکھوں سے دور رکھا، کہیں پھر سے وہ انقلاب پیدا نہ ہو جائے، جس میں تین سو تیرہ عالم کفر پر بھاری تھے۔ فرشتے ان کی نصرت میں آج بھی اتر سکتے ہیں۔"

"کیا ایسا ہو جائے گا؟" چیلا ڈرتے ہوئے بولا تو ابلیس نے ایک زوردار قہقہہ لگایا اور نخوت سے بولا۔

"جو اپنے آپ کو بھول گئے ماضی کیا یاد آئے گا۔" یہ کہہ کر اس نے سنجیدگی سے سب کی طرف دیکھا اور بولا۔ "سنو، نوجوانوں کو تعلیم سے عاری کر دو، نصاب سے اسلاف کے کارنامے اڑا دو، میں نے بھی ایٹم بم بنا لیا ہے۔ بے غیرتی، عیاشی، فحاشی اور بدمعاشی پھیلا دو۔ ہر شعبہ فکر میں پھیلا دو۔ دوسری بات سنو، یہ مذہب جو عورتوں کو عزت اور احترام دیتا ہے۔ عورت ہی کو اس کے مقام سے گرا دو۔ عورتوں میں آزادی کی لہر کو تیز کر دو، انہیں غلامی کا احساس دلاؤ۔ انہیں مذہبی اور دنیاوی تعلیم سے بیگانہ کر دو۔ عورتوں کی بلاوجہ بازاروں میں گردش بڑھا

دو پٹے، لہنگے، ولائے بیچنے میرے ماننے والوں کو چوراہوں میں تعینات کر دو۔ عورتوں کی دینی اور دنیاوی تعلیم روک دو۔ تاکہ بیماری کی صورت میں مرد معالج ہی انہیں دیکھیں۔ مرد خود مجبور ہو جائیں اپنی عورتوں کو غیر مردوں کے آگے ڈالنے کے لیے۔ یہ جو نئے نئے دو تحفے میں نے بتائے ہیں یہ رنگ رنگیلے نشے ہیں۔ قوموں کا سرمایہ نوجوان ہوتے ہیں۔ نیا شباب بگڑتے جاؤ اور انہیں ان نشوں پر لگا دو۔ انہیں اخلاقی، فکری، شعوری طور پر تباہ و برباد کر دو۔ حتیٰ کہ یہ اپنے حوصلے کھو بیٹھیں۔ جب یہ خود سے بےگانہ ہو جائیں گے تو یہ خود ہی میں نہیں رہیں گے۔ تو پھر دین اور مذہب کہاں رہیں گے۔ کہیں پیر تعویذ بیچیں گے اور کہیں مولوی فتویٰ فروشی کریں گے۔ دین اور دین دار کہاں رہے گا؟ انہی کے ہاتھوں انہیں ختم کر دوں گا۔ میں ساری ذمہ داری پوری کرنے کے بعد خود بری الذمہ ہو جاتا ہوں اور سارا الزام حالات پر ڈال دیتا ہوں کہ وقت کا یہی تقاضا تھا۔ تم بھی ایسے ہی کرو، بلکہ یہ انسان پر ہی ڈال دو۔"

"یہ تو ہم کرتے ہی رہیں گے۔ کوئی نئی بات بھی ہے آقا؟" چیلا آگے بڑھ کر بولا۔

"میں اس ملک کی نسلوں کو تباہ کرنے کا ارادہ رکھتا ہوں اور میرے جال سنہرے ہیں۔ رنگ رنگیلے خوبصورت ہتھیار جو بغیر دھماکے کیے اندر تک فنا کر دیتے ہیں۔ سن لو میرا ایجنڈا، میرا پروپیگنڈہ اور ہتھکنڈہ مضبوط ہاتھوں میں ہے۔ میرا منشور واضح اور صاف ہے۔ بےغیرتی، فحاشی، بدمعاشی اور عریانی کو عام کر دو۔ عام لوگ میری بات نہیں سمجھتے۔ اس کا حل میں نے یہ نکالا، میں نے اپنا منشور دس روپے کی سی ڈیز میں ریڑھیوں پر رکھ دیا ہے تاکہ یہ اپنی آنکھوں سے اس کے معانی اور مقصد کا مشاہدہ کر لیں۔ تاکہ ان پڑھ بھی میرے پروگرام سے استفادہ کریں۔ کہو تا ستا ہتھیار کس کے پاس ہے؟"

"آقا، آپ ہی کے پاس ہے۔" چیلوں نے شور مچا دیا۔ کان پڑی آواز سنائی نہ دے رہی تھی۔ ابلیس نے انہیں خاموش ہونے کے لیے ہاتھ کا اشارہ کیا۔ وہ چپ ہو گئے تو وہ بولا۔

"میرے جال نعرے نہیں، میں اپنے ارادے کو عملی جامہ پہناتا ہوں۔ یہ سب انسان ہی کرتے ہیں جو میرے چیلے ہیں۔ کیا یہ اب بھی نہیں سمجھتے کہ میں ان کی آزادی کا کتنا خواہاں ہوں! تم اس وقت کا ادراک ہی نہیں کر سکتے کہ میرا کیا حال ہوتا ہوگا، جب میں ان دانشوروں کی عقل کی گہرائیوں میں ان حسین افکار کو اتارتا ہوں۔"

"ہمارے لیے کیا حکم ہے آقا؟" ایک بڑے چیلے نے پوچھا جواب تک خاموش تھا۔

"ہم نے اس ملک کے دل کو قابو کرنا ہے۔ یہی ہماری منزل ہے۔ ذرا جلدی قدم بڑھاؤ، ہمارا سفر اس ملک خداداد کے دل کی طرف ہے۔"

"اس سے کیا ہوگا آقا؟" چیلے نے پوچھا۔

"پھر سن لو، یہ موت سے گزر کر لا الٰہ الا اللہ تک تو آن پہنچے ہیں۔ میری پوری کوشش ہے کہ یہ محمد رسول اللہ تک نہ پہنچیں۔ کیونکہ ان انسانوں میں کلمے کی حقیقی روح سامنے نہ آ جائے جو پہلے ہی ان میں بسی ہوئی ہے۔ محمد رسول اللہ ہی ان کی روحانی تکمیل ہے۔ اسی سے یہ پوری دنیا پر چھا جائیں گے۔ پھر یہاں میری کسی سازش کا اثر نہیں ہوگا۔ میں بےبس ہوں گا۔" یہ کہہ کر وہ تھک سا گیا اور اس نے اپنی گردن جھکا لی۔

اس کے ساتھ ہی شور مچ گیا۔ ابلیس کا ہر چیلا تیار تھا۔ اس کے ساتھ ہی ابلیس گرگٹ کی طرح رنگ بدلنے لگا۔ سبز اندھا دھند چاروں جانب پھیلنے لگی۔ مجھ سے وہاں کھڑا نہیں ہوا جا رہا تھا۔ تبھی وہ انڈا پھر سے بند ہونے لگا۔ اس میں سے مختلف رنگ نکلنے لگے۔ اور وہ واپس آسمان کی جانب اٹھ گیا۔ سارے چیلے شور مچاتے وہاں سے بھاگ کھڑے ہوئے۔

سورج کی روشنی تیز ہونے لگی۔ جیسے جیسے وہ صحرا ان ابلیسی چیلوں سے خالی ہونے لگا، اسی طرح ریت بھی

سرکنے لگی۔ یوں دکھائی دے رہا تھا جیسے انہی کی نحوست کی وجہ سے ویرانی چھائی ہوئی تھی۔ وہ صحرا میدان بنتا چلا گیا، یہاں تک کہ میں نے خود کو درختوں کے ایک جھنڈ کے پاس پایا۔



رونیت کور بستر پر میرے سامنے پڑی ہوئی تھی۔ اس کی چیاں کی ہوئی تھیں اسے کافی زخم آئے تھے۔ ان پانچ لڑکیوں کے بارے میں اطلاع مل گئی تھی کہ وہ ایک گردوارہ میں پہنچ کر محفوظ ہوگئے تھے۔

"اب یہ گرباز کہاں سے ملے گا۔" رونیت نے پوچھا تو جسپال مسکرادیا، پھر بولا۔

"تم فکر مند ہو تو کیا ہم نہیں ہوسکتے۔ وہ جو کوئی بھی ہے، ان چڑھنے سے پہلے میں تیری اس سے ملاقات کروادوں گا۔"

"یہ کیسے ہوگا؟" رونیت کور نے اٹھنے کی کوشش کرتے ہوئے پوچھا تو جسپال نے اسے کاندھوں سے پکڑ کر لٹاتے ہوئے کہا۔

"جس فون نمبر سے اس نے بات کی ہے، وہ ایک ایسی جگہ محفوظ ہوگیا ہے، جہاں سے اس کی ساری حرکت کا پتہ چل جائے گا۔ اب تک اس کی لوکیشن کا پتہ چل گیا ہوگا۔ صرف تصدیق کی جارہی ہوگی اور جیسے ہی اس کے بارے میں......"

لفظ اس کے منہ ہی میں رہ گئے، اس کا سیل فون بج اٹھا۔ وہ یوں خاموش ہوگیا جیسے وہ اسی کال کا منتظر تھا۔ اس نے کال ریسیو کی اور دوسری طرف سے سنتا رہا۔ چند منٹ بعد کال ختم ہوگئی۔ اس نے جلدی سے فون کانوں سے ہٹایا اور ان باکس میں جا کر ایس ایم ایس دیکھا۔ پھر فون رونیت کور کی جانب بڑھا کر بولا۔

"یہ دیکھو اس سالے گرباز کی لوکیشن اور مجھے بتاؤ کہ میں نے وہاں کیسے پہنچنا ہے۔"

رونیت کور نے ایس ایم ایس پڑھا اور سائیڈ ٹیبل پر پڑا اپنا لیپ ٹاپ اٹھالیا۔ کچھ دیر بعد اس کے چہرے پر خوشی دوڑ گئی۔

"یہ ایئر پورٹ جانے والے راستے میں پڑتا ہے۔ سیکٹر اکتیس میں یہ گھر موجود ہے۔ اس کی مزید تفصیلات......"

"مجھے بعد میں بتانا، پہلے کال کر لڑکوں کو، ابھی اور اسی وقت اسے پکڑنا ہوگا۔ پلان بنانا ہے۔"

"اوکے۔" یہ کہہ کر اس نے اپنا فون اٹھایا اور کال کرنے لگی۔ کچھ دیر بعد اس نے کہا۔ "وہ تمہیں سیکٹر اکتیس کے میڈیکل چوک پر ملیں گے۔ انہیں ابھیت سنگھ اور ہرپال سنگھ ہی لیڈ کریں گے۔ وہاں تک تمہیں میں لے جاتی ہوں۔"

"تم کہاں جاؤ گی، کچھ ہوش کرو۔" جسپال نے فوراً کہا تو ایک لمحہ سوچ کر اس نے کہا۔

"میں ابھی گرلین کور کو بلا لیتی ہوں۔" یہ کہہ کر اس نے کال ملادی۔

کچھ دیر بعد وہ گرلین کور کے ساتھ سڑک پر جیپ بھگائے جارہا تھا۔ راستے میں رونیت کور انہیں دستیاب معلومات دے رہی تھی۔ ان سب کے درمیان رابطہ تھا۔ سیکٹر اکتیس کے چوراہے پر ابھیت اور ہرپال ایک گاڑی میں کھڑے تھے۔ ان کے آتے ہی انہوں نے نزدیکی کمیونٹی پارک کی پارکنگ میں گاڑیاں لگائیں اور اندر چلے گئے۔ وہ چاروں ایک دوسرے کے سامنے کھڑے تھے اور ان کے درمیان ایک ہی سوال تھا کہ گرباز سنگھ تک کیسے پہنچا جائے اور اس کا پلان کیا ہو؟

میرے خیال میں ایک چکر اس کے گھر کا لگایا جائے، وہاں صورت حال دیکھیں کیا ہے۔ پھر اسی مناسبت ہی سے دیکھیں گے کہ کتنے لوگوں کی ضرورت ہے۔" ابھیت نے کہا۔ اس سے پہلے کہ وہ کوئی بات کرتے جسپال کا سیل فون بج اٹھا۔ وہ چند لمحے فون سنتا رہا۔ فون بند کر کے خوشگوار لہجے میں بولا۔

"دیکھو جب قسمت اچھی ہو، لیکن اگر ہم اپنی قسمت کو خراب نہ کریں۔"

"کہنا کیا چاہتے ہو؟" گرلین کور نے آنکھیں سکیڑتے ہوئے تیزی سے پوچھا۔

"گرباز کے جس سیل فون کی نشاندہی پر ہم یہاں پہنچے ہیں، وہ اس وقت ہمارے انتہائی قریب ہے بلکہ یوں کہوں اسی پارک میں، مجھے کہا گیا ہے کہ وہ سیل فون اس وقت میرے سیل فون کے بالکل قریب ہے۔"

"مطلب گرباز یہیں اس پارک میں ہے؟" ہرپال نے ہولے سے پوچھا۔

"میں نے گرباز کے فون کی بات کی ہے۔ ممکن ہے اس کا کوئی نوکر ہو۔" جسپال نے فوراً محتاط لہجے میں کہا۔

"اب پتہ نہیں وہ دیکھنے میں کیسا ہوگا؟" گرلین کور نے کہا تو ہرپال نے شوخی سے کہا۔

"تو نے اس سے شادی کرنی ہے۔"

"پھر اس کی طرف سے پہلی گولی میں تجھے ماروں گی۔" گرلین نے ہنستے ہوئے جواب دیا۔

"کلیان سے پوچھ لیں کہ گرباز دیکھنے میں کیسا ہے؟" ابھیت نے تیزی سے کہا۔

"نہیں، کسی کو معلوم نہ ہو کہ ہم کہاں ہیں۔ میں سوچتا ہوں۔" جسپال نے کہا اور پارک میں دیکھا۔ وہاں کافی لوگ تھے۔ عورتیں، مرد اور بچے تھے۔ کئی لوگ خوش گپیوں میں لگے ہوئے تھے۔ کوئی کھانے پینے میں مصروف اور چند لوگ جاگنگ ٹریک پر تھے۔

"یار، تمہیں معلوم ہو سکتا ہے کہ وہ ہم سے کتنے فاصلے پر ہے؟" ہرپال نے پوچھا۔

"نہیں پتہ کرتا ہوں۔" جسپال نے کہا اور فون نکال لیا۔ چند منٹ بعد اسے پتہ چلا کہ وہ فون مسلسل ایک دائرے میں گھوم رہا ہے، کبھی دور ہو جاتا ہے کبھی نزدیک۔ وہ سمجھ گیا کہ گرباز اس وقت جاگنگ کر رہا ہے۔ یہی معلومات اس نے سب سے شیئر کی تو وہ سب ہی تیار ہو گئے۔ انہوں نے جاگنگ کرتے چند لوگوں کو دیکھا۔ انہیں ایک آدمی پر شک ہو گیا۔ وہ کیم تھا، خاصا بھاری، لمبے قد کا۔ وہ کلین شیو تھا۔ اس نے سفید ٹی شرٹ اور نیلا ٹراؤزر پہنا ہوا تھا۔ شک کی وجہ یہ تھی کہ اس سے دو قدم پیچھے دو نوجوان بھی بھاگ رہے تھے۔ وہ ان سے ذرا فاصلے پر تھے۔ اور انہی کی طرف آ رہے تھے۔ وہ کچھ دیر میں ان کے قریب سے گزر جاتے۔

"یہ بالکل اس کے باڈی گارڈ ہیں۔ میں اسے کال کرتا ہوں۔ فون ان سے نکلا تو ارد گرد کے لوگوں پر نظر رکھو کہ..."

"سمجھ گئے۔ کال کرو۔" ابھیت نے کہا تو جسپال نے نمبر ملایا۔ ایک نوجوان کے ہاتھ میں پکڑا ہوا سیل بج اٹھا۔ ان کے قدم ذرا سے ڈھیلے ہوئے۔ جسپال نے فون بند کر دیا۔ وہ آپس میں بات کرنے لگے۔ جسپال نے پھر کال ملا دی۔ وہ ان کے بالکل قریب تھے۔ بھاری بدن والا تشویش سے کہہ رہا تھا۔

"اس فون پر اب کس نے کال کر دی۔"

تب تک اس کے پیچھے والے نوجوان نے فون اسے تھما دیا۔ اس نے کان سے لگا کر کہا۔

"ہیلو کون؟"

"میں جسپال ہوں۔ مجھے ہرنیک سنگھ جی نے آپ کے پاس بھیجا ہے۔ آپ کہاں ہو۔ مجھے آپ سے فوری ملنا ہے۔"

یہ کہتے ہوئے وہ اس کے قریب سے گزر گیا۔

"تم کون ہو، میں کسی ہرنیک سنگھ کو نہیں جانتا۔"

"وہ بہت زخمی ہیں، اسپتال میں ہیں، مجھے آپ سے بہت ضروری بات کرنی ہے آپ کو خطرہ ہے۔"

"میں اپنے آپ کو خود سنبھال لوں گا۔ اور پھر جب میں کسی ہرنیک کو نہیں جانتا تو میں کیوں اس کا پتہ کرتا پھروں۔"

"ٹھیک ہے۔" جسپال نے کہا اور فون بند کر دیا یہ تصدیق ہو چکی تھی کہ گرباز سنگھ وہی ہے۔ اب سب نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا تو ہرپال بولا۔

"اسے پارکنگ میں گھیرتے ہیں۔ وہاں تک لے جانا مشکل ہو جائے گا لوگ متوجہ ہو جائیں گے۔"

"خواہ مخواہ پولیس پیچھے لگے گی وہیں پارکنگ میں۔"
خاموشی سے۔" ابھیت نے ہاں میں ہاں ملاتے ہوئے کہا۔ اگلے منٹ میں انہوں نے پلان ترتیب دے لیا۔

گرباز سنگھ نے اسی وقت اپنی جاگنگ ختم کی اور باہر کی جانب چل پڑا۔ اس نے پارک کا گیٹ پار کیا اور پارکنگ کی جانب بڑھا۔ وہ اپنی کار کے پاس پہنچا۔ اس کے گارڈز اس کے پیچھے تھے۔ گرباز نے گاڑی کا اگلا دروازہ کھولا ہی تھا کہ ساتھ کی گاڑی کی اوٹ سے جسپال سنگھ نکلا اور اس کی کنپٹی پر پسٹل رکھتے ہوئے بولا۔

"کوئی حرکت مت کرنا، ورنہ گولی ماردوں گا۔"

گرباز ایک دم سے ساکت ہو گیا۔ اس سے پہلے کہ اس کے گارڈز اپنی گنیں سیدھی کرتے ابھیت اور ہرپال ان پر اپنے پسٹل تان چکے تھے۔

"کون ہو تم اور کیا چاہتے ہو؟" گرباز نے خود پر قابو رکھتے ہوئے رعب دار آواز میں کہا۔

"ہرنیک سنگھ جی نے بھیجا ہے۔ تمہیں ساتھ لے جانا ہے، انہیں تم سے کام ہے۔" جسپال نے کہا۔

"گنیں پھینک دو۔" ہرپال نے سرد لہجے میں کہا۔

انہوں نے گنیں پھینکنے کی بجائے جیسے ہی سیدھی کرنا چاہیں تو ابھیت نے فائر کر دیا۔ جو ایک گارڈ کے لگا اس کے ساتھ ہی ہرپال اور ابھیت نے زوردار انداز میں پسٹل گارڈز کے سر پر مارے۔ وہ زمین بوس ہو گئے۔ گرلین کور آگے بڑھی اس نے گنیں اٹھا لیں۔

"چلو۔" جسپال نے اسے کالر سے پکڑ کر اپنی کار کی جانب دھکا دیا۔ کچھ دیر بعد وہ وہاں سے نکلتے چلے گئے۔ گرلین کور نے ساری صورت حال رونیت کور کو بتا دی تھی۔ آگے اسی نے بندوبست کرنا تھا۔

اس وقت رات کا پہلا پہر ختم ہونے کا تھا۔ جب وہ ایک بنگلہ نما گھر میں جا پہنچے۔ پورچ ہی میں ایک بندے نے انہیں اندر کا راستہ دکھایا۔ وہ گرباز سنگھ کو لے کر ایک کمرے میں آ گئے، جس میں سامان نام کی کوئی شے نہیں تھی۔ راہنمائی کرنے والے لڑکے نے کہا۔

"یہ لیں جی، کمرہ بند کر لیں، یہ ساؤنڈ پروف ہے، یہاں کوئی جتنا بھی شور کرے، اس کی آواز نہیں آتی۔ جو کرنا ہے کھل کر کریں۔ کوئی شے منگوانی ہو تو یہ بٹن دبا دیں۔" یہ کہتے ہوئے اس نے دروازے کے ساتھ لگے سرخ بٹن کی طرف اشارہ کیا اور باہر کی طرف چلا گیا۔

وہ گرباز کو فرش پر بٹھا چکے تھے۔ جسپال نے اس کی طرف دیکھ کر کہا۔

"سیدھے سبھاؤ میرے سوالوں کا جواب دو گے یا تشدد کے بعد منہ کھولو گے۔"

"بولو۔" اس نے اختصار سے کہا۔

"سندو کہاں ہے؟" جسپال نے دھیمے لہجے میں انتہائی سنجیدگی سے کہا تو گرباز سنگھ نے اسے یوں دیکھا جیسے بم پھٹ گیا ہو یا پھر وہ کسی دوسری ہی دنیا کا بندہ دکھائی دے رہا ہو۔ اس کی آنکھیں پھیلی ہوئی تھیں۔

"کک.... کون.... ہو تم؟"

اس قدر اسے حیرت ہوئی تھی، جسپال اس کی حیرانی پر حیرت زدہ رہ گیا۔ اس قدر شدید ردعمل کی اسے توقع نہیں تھی۔

"تمہیں ہرنیک سنگھ نے بھیجا؟" گرباز نے پوچھا تو جسپال بولا۔

"نہیں، مجھے اس نے نہیں بھیجا۔"

"پھر تم کون ہو؟" اس نے بھوئیں سکیڑتے ہوئے پوچھا۔ اس کے چہرے پر ابھی تک حیرت جمی ہوئی تھی۔

"میں جو کوئی بھی ہوں، تم صرف میرے سوال کا جواب دو۔" جسپال نے انگلی سے اس کی ٹھوڑی اٹھاتے ہوئے کہا۔

"تمہیں کس نے بتایا کہ میں کسی سندو کو جانتا ہوں، اگر ہرنیک نے تجھے میرے پیچھے لگایا ہے تو پھر تم بہت بڑا دھوکہ کھا چکے ہو۔"

"کیسا دھوکہ گرباز سنگھ؟"

"یہ مجھے نہیں معلوم، مگر مجھے اتنا پتہ ہے کہ میری ہرنیک کے ساتھ دشمنی چل رہی ہے۔ ممکن ہے تو کسی

کرباز سنگھ کو تلاش کر رہے ہو، اس نے مجھے میری راہ پر لگا دیا۔ میں اس کے ساتھ دشمنی کی تصدیق کر سکتا ہوں۔"

"اوکے۔" جسپال نے کہا اور اجیت کی طرف دیکھا تو وہ ہنستے ہوئے بولا۔

"اس بھڑوے نے کہہ دیا اور ہم نے مان لیا۔ یار ہمارے ماتھے پر بے وقوف لکھا ہوا ہے یا ہم کسی کامیڈین فلم میں کام کرتے ہیں۔"

"دیکھیں میں ایک شریف آدمی ہوں، اس وقت میں بے بس ہوں۔ یہاں تو میں ایسا کوئی ثبوت نہیں دے سکتا کہ جس سے یہ ظاہر ہو جائے کہ میں آپ لوگوں کا مطلوبہ بندہ نہیں ہوں۔" اس نے منت بھرے لہجے میں کہا تو اچانک جسپال کے ذہن میں ایک خیال آیا۔ وہ کرلین کور کو لے کر کمرے سے باہر آ گیا۔

"ایک طریقے سے تصدیق ہو سکتی ہے۔ وہ وہی کرباز سنگھ ہے جسے ہم تلاش کر رہے ہیں یا پر نیک سنگھ نے ہمیں غلط ٹریک پر ڈال دیا ہے۔"

"وہ کیسے؟" وہ الجھتے ہوئے بولی۔

"ابھی دیکھو۔" یہ کہہ کر اس نے اپنا فون نکالا اور کلیان سنگھ کو فون ملا دیا۔ لمحوں میں رابطہ ہو گیا تو دوسری طرف سے وہ تیزی سے بولا۔

"شکر ہے اور بتا تیرا فون آ گیا، میرے پاس تو تمہارا نمبر ہی نہیں تھا۔"

"کیا بات ہے کلیان سنگھ، خیر تو ہے؟" جسپال نے کہنا چاہا، اس نے بات کاٹ کر تیزی سے کہا۔

"میں نے آتے ہی بندے اس کی تلاش میں لگا دیئے تھے۔ کرباز آج دوپہر ہی سے غائب ہے، جس گھر میں وہ رہتا تھا وہ خالی ہے، کوئی اس کا بندہ نہیں، مجھے پورا یقین ہو گیا ہے کہ سندو کو غائب کرنے والا وہی ہے، اسے پتہ چل گیا ہے کہ۔"

"اچھا مجھے یہ بتا، وہ دیکھنے میں کیسا ہے، اس کا کوئی حلیہ، کوئی تصویر اس کی ہے تمہارے پاس۔" اس نے پوچھا تو کلیان نے کہا۔

"تصویر تو نہیں، آفس کے کیمرے کی ریکارڈنگ میں وہ ہو سکتا ہے، وہاں سے اس کی تصویر مل سکتی ہے۔" کلیان نے کہا تو جسپال کو یہ سمجھ بھی آ گئی کہ ان کی بھی ریکارڈنگ وہاں ہو گی۔ وہ کہہ رہا تھا "نین نقش تو اس کے عام سے ہیں، قد بھی کوئی ساڑھے پانچ فٹ کے قریب رہا ہو گا۔ بیکا رنگ ہے اس کا، پگڑی باندھتا ہے، ناک تلوار ہے اس کی، درمیانہ سا بدن، نہ موٹا اور نہ پتلا، کیس نہیں رکھے ہوئے اس نے۔" جیسے جیسے کلیان بتاتا جا رہا تھا، ویسے ہی کمرے کے اندر والے کرباز کے بارے میں اس کا یقین پختہ ہو گیا کہ وہ اس کا مطلوبہ بندہ نہیں ہے۔ لیکن جب اس نے کرلین کو بتایا تو وہ بھی تشویش سے اسے دیکھتے ہوئی بولی۔

"روئیت کورسے کریں بات؟"

"میں ان دونوں کو باہر بھیجتا ہوں، انہیں ساری بات بتاؤ، پھر جو فیصلہ ہوگا۔" یہ کہہ کر جسپال اندر گیا۔ وہ مخمصے میں تھا۔ پر نیک سنگھ نے اسے ایسا جل دیا تھا کہ وہ خود کو بے وقوف سمجھ رہا تھا۔ وہ کمرے میں آیا تو تینوں نے اس کی طرف دیکھا۔ اس نے دونوں کو باہر بھیج دیا۔

"کیا تم کوئی تصدیق کر رہے ہو؟" کرباز نے پوچھا۔

"اگر ہو گئی تو، ورنہ تمہارے ساتھ ہی کام چلانا پڑے گا۔" جسپال نے ہنستے ہوئے کہا تو وہ بھی مسکرا دیا۔

"دیکھو، تم جو چاہو تصدیق کرو۔ جب تم لوگوں کو اطمینان ہو جائے تب مجھے جانے دینا۔"

اس پر جسپال نے اسے کوئی جواب نہیں دیا، بلکہ کمرے میں ٹہلنے لگا۔ اس کا مطلب یہ نہیں تھا کہ وہ اس کی طرف سے غافل ہے۔ کچھ ہی منٹ بعد وہ تینوں اندر آ گئے۔ ان کا چہرہ بھی بجھا ہوا تھا۔

اسی لمحے میں سیل فون بج اٹھا۔ وہ کرباز کا فون تھا، جسے کرلین کور نے پکڑ لیا تھا۔ اس نے بجتا ہوا فون جسپال کو تھما دیا۔ سکرین پر ایک تصویر جگمگا رہی تھی۔ اس کے اوپر لکھا ہوا تھا "بالی لوٹ"۔ جسپال کی نگاہیں اس تصویر پہ ٹک کر

رہ لیں۔ فون خاموش ہو گیا۔ اگلے ہی لمحے فون دوبارہ بجا تو جسپال نے وہ تصویر گرباز کو دکھاتے ہوئے پوچھا۔

"یہ کس کی تصویر ہے، بہت خوبصورت ہے۔"

"یہ میری بیوی کی تصویر ہے، اسی کا فون آرہا ہے۔ وہ پریشان ہوگی۔"

"اوکے، اسے ایس ایم ایس کر دیتے ہیں کہ تم مصروف ہو، بعد میں دیکھتے ہیں۔" جسپال نے صلاح دی اور ایس ایم ایس کر دیا۔ پھر سر اٹھا کر اپنے تینوں ساتھیوں کی طرف دیکھ کر دروازے کے ساتھ لگا سرخ بٹن دبا دیا۔ چند لمحوں ہی میں ایک لڑکا اندر آکر بولا۔

"جی باؤ جی۔"

"یہاں جو لڑکے ہیں ان میں سے دو چار کو بلا لاؤ۔"

"ابھی آتے ہیں باؤ جی۔" یہ کہہ کر وہ غائب ہو گیا۔

"دیکھو گرباز، میں تمہیں صبح تک کا وقت دیتا ہوں۔ تم مان گئے اور میرے سوال کا جواب دے دیا تو ٹھیک، ورنہ تجھے میں گولی مار دوں گا۔ صبح تک یہ لڑکے تمہاری اچھی طرح سیوا کرتے رہیں گے۔" جسپال کے یوں کہنے پر تینوں نے اسے چونک کر دیکھا۔ گرباز کے چہرے کا بھی رنگ اُڑ گیا تھا۔ اس نے تیزی سے کہا۔

"تم ابھی تصدیق......"

"بکواس بند کرو۔ میں سمجھ گیا ہوں کہ تو خود کو بہت عقل مند سمجھتا ہے، تمہاری عقل اب ٹھکانے لگے گی۔"

لڑکے اندر آ گئے تھے۔ تبھی پہلا گھونسہ جسپال نے اس کے منہ پر مارا، تبھی وہ چار لڑکے اس پر پل پڑے۔ تقریباً آدھے گھنٹے تک وہ اس کی دھنائی کرتے رہے۔ وہ سر سے پاؤں تک لہولہان ہو گیا۔ وہ بے بس ہو گیا تھا۔ تبھی اس نے کہا۔

"میں بے قصور ہوں، مجھے چھوڑ دیں۔"

"اوکے۔ میں ابھی جا رہا ہوں، صبح ناشتے پر ملاقات ہوگی۔ میں ناشتہ بھی کروں گا، اگر تم مجھے میرے سوال کا جواب دے دو گے یا میں تجھے گولی نہ ماردوں۔" یہ کہہ کر اس نے لڑکوں کی طرف دیکھا اور کہا۔ "ہر آدھے گھنٹے کا آرام ہے کر اس کی سیوا کرتے رہو، مرتا ہے تو مر جائے، مجھے میرے سوال کا جواب دینے والا مل گیا ہے۔ میں جا رہا ہوں، آؤ انیت۔"

جیسے ہی یہ لفظ اس نے کہے گرباز سنگھ بری طرح چونک گیا۔ پھر تیزی سے بولا۔

"ٹھہرو، تم انجانے ہی میں سہی، مجھ تک پہنچ گئے ہو اور سندو کے بارے میں سوال کرنا ہی بڑی بات ہے۔ میں نہیں جانتا کہ تم مجھ تک کیسے پہنچے ہو، لیکن، میں تمہارے سوالوں کا جواب دے بھی دوں، پھر بھی تم سندو تک نہیں پہنچ پاؤ گے۔" اس بار اس نے سکون سے کہا جیسے وہ خود پر قابو پا کر کوئی فیصلہ کر چکا ہو۔

وہ تینوں اس کی بات سن کر چونک گئے۔ لیکن جسپال نے بڑے تحمل سے کہا۔

"گرباز مجھے محسوس ہو رہا ہے کہ تم کوئی معمولی چیز نہیں ہو، تم دھوکے میں یا پھر اپنے زعم میں مار کھا گئے ہو، تمہارا کوئی گروہ بھی ہو سکتا ہے۔ یہ مت کہنا کہ میں نے تمہیں نکلنے کا راستہ نہیں دیا۔ ہمت ہے تو جا سکتے ہو۔ تمہیں شاید یہ خیال بھی نہیں ہوگا کہ تم یوں میرے ہاتھوں چوہے کی مانند پھنس جاؤ گے۔"

"بات تمہاری ٹھیک ہے جسپال، نہ میں دھوکے میں مارا گیا ہوں نہ زعم میں، یہ تقدیر کی طرف سے ہے۔"

"چلو صبح تک آرام کرو۔" یہ کہہ کر جسپال آگے بڑھا، اس نے ہاتھ میں پکڑا پسٹل کا دستہ اس کے سر پر مارا۔ وہ چکراتے ہوئے فرش پر جا پڑا۔

"یہ مر گیا؟" ہرلین نے پوچھا۔

"نہیں، بے ہوش ہے، اسے انجکشن دے دو، صبح تک اسے ہوش نہ آئے، ابھی چھوڑو اور کام کرنا ہے۔" یہ کہہ کر وہ باہر نکل گیا، وہ تینوں بھی اس کے ساتھ باہر آ گئے۔

"یہ کیا تم نے اسے ....؟" ہرپال نے پوچھا۔

"یہ ابھی آدھی کہانی ہے، یہ صبح تک پوری ہوگی۔ تم میرے ساتھ چلو، یہ انیت اور ہرلین اس کا خیال رکھیں گے، یاد رہے اور اس سے ایک لمحہ بھی غافل نہیں ہونا، یہ

گینگسٹر ہے۔ اس کے قاتل ہونے میں کوئی شک نہیں، غفلت نہیں کرنی، اچھا ہو تو یہاں کچھ سیکورٹی بڑھا لو۔"

"او کے سمجھ گئے۔" اہمیت نے سر ہلاتے ہوئے کہا تو جسپال تیزی سے چل دیا۔ ہرپال اس کے ساتھ تھا۔

رات کا تیسرا پہر شروع ہونے کو تھا۔ جسپال سنگھ کار سے اتر کر اسی بنگلے کے سامنے جا رکا، جہاں سے وہ صبح چلا تھا۔ گیٹ پر ایک چوکیدار تھا۔ جسپال کو پورا یقین تھا کہ وہ اسے پہچان نہیں پائے گا۔ اس لیے وہ جا کر بولا۔

"یار جاؤ اور گرمیت کو بلا کر لاؤ۔"

"دیکھیں جی ہماری ڈیوٹی ادھر ہے، آپ کون ہیں میں نہیں جانتا، ایسا ہی ہے تو آپ انہیں فون کر لیں۔"

"ہاں یہ ٹھیک ہے۔" جسپال نے کہا، فون کرنے کے لیے وہاں سے ہٹتا ہوا گیٹ سے ہٹ گیا۔ اس نے فون نہیں کیا۔ کچھ دیر بعد چوکیدار کے پاس جا کر بولا۔ "دیکھو وہ فون نہیں اٹھا رہا، میں واپس چلا جاتا ہوں، صبح بتا دینا کہ امر سنگھ آیا تھا دلی سے اب کسی ہوٹل میں ٹھہروں گا۔"

"ٹھیک ہے صاحب بتا دوں گا۔" چوکیدار نے کہا اور لوٹ کے گیٹ کے اندر چلا گیا۔ یہ سارا ڈرامہ اس نے یہ دیکھنے کے لیے کیا تھا کہ اندر کیا صورت حال ہے۔ وہ وہاں سے چلتا ہوا کار تک گیا، اور پھر اہمیت کو کار ایک طرف لے جانے کا کہا۔ بنگلے کے دائیں جانب اس نے کارروائی کو اس کی چار دیواری کے پاس جا کر ادھر ادھر دیکھا اور پھر اگلے چند لمحوں میں وہ دیوار پر تھا۔ اس نے اہمیت کو جانے کا اشارہ کیا۔ ان کے درمیان طے تھا کہ انہوں نے کیا کرنا ہے۔ رات گئے وہاں گاڑی کھڑی دیکھ کر کوئی بھی آ سکتا تھا۔

جسپال دوسری جانب اتر گیا۔ چند منٹوں میں وہ بنگلے کے پچھلی والے دروازے تک پہنچا۔ وہ بند تھا۔ اس نے تار نکالی اور چند منٹ میں تالا کھول لیا۔ وہ احتیاط کے ساتھ اندر اندھیرے میں گھس گیا۔ وہ بے آواز قدموں سے چلتا ہوا ڈرائنگ روم کی سیڑھیوں تک آیا، پھر چڑھتا چلا گیا۔ اوپر کے ڈرائنگ روم میں ٹی وی چل رہا تھا اور نیہا ٹراؤزر، شارٹس اور ڈھیلی ڈھالی شرٹ پہنے بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کی نگاہیں ٹی وی پر جمی ہوئی تھیں۔ ہاتھ میں گلاس تھا۔ سامنے شراب کی بوتل تھی۔ وہ یہ سوچ ہی رہا تھا کہ گرمیت کہاں ہو سکتا ہے کہ وہ ایک دم سے نمودار ہوا۔ اس کے ہاتھ میں پلیٹ تھی جس میں کچھ کھانے کو تھا۔ جسپال نے ادھر ادھر دیکھا۔ سیڑھیوں کے پاس دو گملے پڑے ہوئے تھے۔ اس نے ایک گملا لڑھکا دیا۔ اندر دونوں ہی نے چونک کر دیکھا۔ پھر گرمیت باہر دیکھنے کو آیا۔ جسپال ایک دم سے دیوار کے ساتھ لگ گیا۔ گرمیت جیسے ہی باہر آیا، جسپال نے ایک زوردار مکا اس کی گردن پر مارا۔ وہ چکرا گیا۔ دوسرا مکا اس کے ماتھے پر مارا تو وہ بے سدھ ہو کر گر گیا۔ ایک لمحے میں اس نے گرمیت کی تلاشی لے ڈالی، اس کے پاس کچھ نہیں تھا۔ تبھی اندر سے آواز آئی۔

"کیا ہوا گرمیت؟"

جسپال نے گرمیت کو اس کے کالر سے پکڑا اور اندر کی طرف لے گیا۔ نیہا گرو نیلی اسے دیکھ کر ایک دم سے چونک گئی۔ چند لمحے اس کے منہ سے کچھ بھی نہ نکلا۔ بس پھٹی پھٹی رہ گئی۔

"جسپال تم اور ایسے؟"

"تم مجھے یہ بتاؤ، یہ تمہارا نوکر ہے یا شوہر؟" جسپال نے اسے ڈانٹتے ہوئے پوچھا۔

"ہوا کیا ہے؟" نیہا نے حیرت سے پوچھا۔

"ابھی بتاتا ہوں۔" یہ کہہ کر اس نے پنڈلی سے بندھا ہوا خنجر نکالا۔ اس سے ڈرائنگ روم کے پردوں کی رسیاں کاٹیں اور اس سے گرمیت کو باندھ دیا۔

"یہ کیا کر رہے ہو جسپال؟" وہ روہانسا ہوتے ہوئے بولی۔ مگر اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اسے نیہا کے بیڈ روم میں گھسیٹ کر لے گیا۔ نیہا اس کے پیچھے ہی آ گئی۔ "کچھ بولو گے بھی، یہ کیا ہو رہا ہے؟"

"ہاں، ادھر آؤ، میں بتاتا ہوں کہ کیا ہو رہا ہے۔" جسپال نے اس کا ہاتھ پکڑا اور بیڈ پر بیٹھا لیا اور اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پوچھا۔

"مجھے ایک ہی سانس میں بتادو کہ سندیپ اگروال عرف سندو کہاں ہے؟"

"یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟" وہ انتہائی حیرت سے بولی تو جسپال نے ایک زوردار تھپڑ اس کے منہ پر مارا تو وہ الٹ کر بیڈ پر جا پڑی۔ چند لمحوں بعد اس نے سر اٹھایا تو اس کے ہونٹوں سے خون بہہ نکلا تھا۔

"مجھے اداکاری نہیں چاہئے۔" وہ سرد لہجے میں بولا۔

"تجھے ہو کیا گیا ہے، ایسا کیوں کر رہے ہو؟" اس نے روتے ہوئے کہا۔

"میں یہ جانتا ہوں کہ تم بہت بڑی اداکار ہو لیکن اب تمہاری اداکاری نہیں چلنے والی۔" یہ کہہ کر اس نے نیہا کا سیل فون اٹھایا جو اس کی شارٹس میں سے نکل کر بیڈ پر پڑا تھا۔ پھر گرباز کا سیل فون نکال کر نمبر ملائے ہو تو اس کا سیل فون بج اٹھا۔ نیہا نے اٹھایا اور حیرت سے جسپال کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"یہ سیل، تم نے کال ملائی۔ گرباز کہاں ہے؟"

"اب سمجھ گئی ہو، میں کیا کہنا چاہتا ہوں اس وقت یہ میرے قبضے میں ہے۔"

"مجھے کچھ سمجھ میں نہیں آرہا ہے۔" نیہا نے کہا اور یوں سر پکڑ لیا جیسے اس کا سر چکرا رہا ہو۔ اس پر جسپال نے ایک اور تھپڑ اس کے منہ پر مارتے ہوئے کہا۔

"میں تجھے اس سے پہلے لٹکا دوں گا یا پھر..." اس نے فقرہ ادھورا چھوڑا اور خنجر نکال کر اس کی گال پر رکھ کر نوک چبھو دی۔ اس پر نیہا نے ہکلاتے ہوئے کہا۔

"میں سب بتا دیتی ہوں۔"

"لیکن یہ یاد رکھنا، اگر جھوٹ ہوا تو ایک دم نہیں ماروں گا۔ بھی لا" اس نے دھمکی دی۔ وہ چند لمحے خود پر قابو پاتی رہی، پھر بولی۔

"میں ایک پیگ؟"

"ٹھہرو، میں دیتا ہوں۔" جسپال نے اٹھتے ہوئے انجیت کو کال ملا دی۔ بوتل اٹھاتے ہوئے اس نے کہا۔ "اوپر والی منزل پر، سب خالی، چوکیدار کی طرف سے آجاؤ۔"

یہ کہہ کر جسپال نے بوتل اٹھائی اور نیہا کے پاس بیڈ پر جا بیٹھا۔ اس نے بوتل پکڑ کر منہ کو لگالی، چند گھونٹ لینے کے بعد بولی۔

"گرباز سے میری ملاقات ایک سال پہلے ہوئی تھی۔ ان دنوں ایک فلم کی شوٹنگ چل رہی تھی۔ وہ اپنے دوست کے ساتھ ڈائریکٹر کو ملنے آیا تھا۔ وہ سارا دن ہمارے ساتھ رہا۔ بہت گپ شپ ہوئی۔ وہ کوئی فلم بنانا چاہتا تھا۔ یوں اس سے ملاقاتیں شروع ہو گئیں۔ یہ ملاقاتیں بڑھتیں اور دوستی سے بھی آگے بڑھ گئیں۔ ہم نے فیصلہ کر لیا کہ ہم شادی کر لیں گے۔"

"سندو کو اس کا پتہ نہیں تھا؟" جسپال نے پوچھا۔

"بالکل بھی نہیں۔ میں نے اسے پتہ ہی نہیں چلنے دیا۔ میں نے دراصل یہ سوچا تھا کہ سندو نے مجھے اپنی رکھیل ہی رکھنا ہے۔ جب یہ جوانی میرا ساتھ چھوڑ جائے گی، پھر کون پوچھنے والا ہوگا۔ سندو کے دھندے ہی ایسے تھے، وہ نجانے کب اور کس وقت یہ دنیا ہی چھوڑ جائے۔ گرباز سنگھ کی کینیڈین شہریت ہے۔ شادی کے بعد ہم نے وہیں بس جانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ چھ ماہ پہلے ہم نے کینیڈا میں شادی کر لی تھی۔ وہاں ہم ایک ماہ رہے تھے ایک فلم کی شوٹنگ کے لیے۔ اس دوران اس نے میری پسند کا ایک گھر خرید کر دیا، جہاں ہم نے رہنا ہے۔ میں سندو سے علیحدگی کی بات کرنا ہی چاہ رہی تھی کہ وہ غائب ہو گیا۔"

"تو پھر اب سندو کو تلاش کیوں کر رہی ہو۔ تمہیں کیا وہ مرے یا جیئے؟" جسپال نے کہا۔

"اس کے بعد کچھ اچھا نہیں ہوا۔ سندو کے ساتھی مارے جانے لگے۔ خود مجھے چھپنا پڑا۔ گرباز بھی مجھے بہت محتاط ہو کر ملتا تھا۔ میں بس یقین کر لینا چاہتی تھی کہ سندو اب بھی زندہ ہے یا......"

"تم اب بھی جھوٹ بول رہی ہو۔ تم نے اور گرباز دونوں نے سندو کو غائب کیا ہے۔ یا پھر تم استعمال ہوئی

ہو، اصل کہانی کیا ہے وہ مجھے بتا دو۔"

"میں کچھ نہیں جانتی جسپال، لیکن اب لگتا ہے کہ کوئی گڑبڑ ہے ضرور۔" اس نے کہا اور بوتل منہ سے لگا کر چند گھونٹ لے لیے۔ پھر بولی۔ "اگر ایسا ہے تو بہت بڑا دھوکا ہوگا، اس نے میرے ساتھ شادی کی ہے۔ یہ دیکھو، میری شادی کی تصویریں۔" یہ کہہ کر اس نے اپنا سیل فون لیا اور اس میں سے ایک تصویر نکال کر جسپال کے آگے کر دی۔ "یہ میں اور گرباز، کینیڈین عدالت میں۔"

جسپال نے وہ تصویر دیکھی تو بری طرح چونک گیا۔ یہ تو وہی تھا جس کا حلیہ کلیان سنگھ نے بتایا تھا تو پھر ان کے پاس گرباج ہے، وہ کون ہے؟ وہ چکرا کر رہ گیا۔

وہ خاموش بیٹھا یہی سوچتا چلا جا رہا تھا کہ ابھیت سنگھ اندر آ گیا۔ نیہا اسے دیکھ کر چونکی پھر یوں ہو گئی جیسا سے کوئی سروکار نہ ہو۔ وہ سمجھ گئی تھی۔ اس نے ابھیت کو ایک طرف لے جا کر ساری بات بتائی تو وہ پہلے حیران ہوا، پھر ایک دم چونک کر بولا۔

"ابھی میں سے بات نکلے گی۔ دیکھنا۔" یہ کہہ کر وہ آگے بڑھا اور جاتے ہی نیہا کو مارنا شروع کر دیا۔ وہ چیخنے لگی تو اس نے نیہا کے منہ پر ہاتھ رکھا اور سیڑھیوں کے پاس لے آیا۔ "اگر صاف بک دو گی تو ٹھیک، ورنہ یہاں سے نیچے پھینک دوں گا۔ بچ گئی تو ساری زندگی کے لیے اپاہج ہو جاؤ گی۔"

"نہیں تم ایسا نہیں کر سکتے، چھوڑو اسے؟" گرمیت نے کہا تو انہوں نے چونک کر اسے دیکھا۔ وہ ان پر پسٹل تانے کھڑا تھا۔ اس کے لبوں پر بڑی زہریلی مسکراہٹ تھی۔ جسپال اور ابھیت نے ایک دوسرے کی جانب دیکھا تو جسپال نے ایک خفیف سا اشارہ ابھیت کو کرتے ہوئے ہاتھ اٹھا دیے۔

"جسمندر نے کیا بے وقوف بندہ ہمارے متھے لگا دیا۔ جس نے ہماری ہی تفتیش شروع کر دی۔ تمہیں سندو کو تلاش کرنے کا کہا تھا اور تم نے ہمیں ہی نشانہ بنا لیا۔"

"سندو کی تلاش ہی میں تم تک پہنچے ہیں۔" جسپال نے کہا تو نیہا اگروال ہلکی ہلکی تالیاں بجاتی ہوئی بولی۔

"یہ تو ماننا پڑے گا گرمیت کہ بندہ بے وقوف نہیں سمجھدار ہے۔ اتنی جلدی کوئی عام آدمی ہم تک نہیں پہنچ پایا۔ گرمیت پسٹل مجھے دو اور انہیں باندھ کر پولیس کو فون کر دو۔ کہو ڈاکو ہیں، لیکن پہلے کچھ لوگوں کو بلا لو، جو انہیں ختم کر دیں۔"

جس وقت نیہا نے گرمیت سے پسٹل پکڑا، جسپال کو اتنا ہی وقت کافی تھا، مگر اس نے کوئی حرکت نہیں کی۔ گرمیت نے رسیاں لے کر انہیں باندھ دیا۔ تبھی نیہا نے آگے بڑھ کر جسپال کے منہ پر تھپڑ مارتے ہوئے نفرت سے کہا۔

"سندو کی تلاش چاہیے تھی نا۔ وہ مر گیا ہے یا زندہ ہے، یہی تصدیق چاہیے تھی، مگر تم تو پانچ پیاروں کو آزاد کروا کر دھرم کا پالن کرنے لگے۔"

"تو پھر تم ہو جو سب کچھ جانتی ہو، مجھے وہی بتانا تھا نا؟" جسپال نے یوں کہا جیسے اس سے شکوہ کر رہا ہو۔

"مجھے صرف یہ چاہیے تھا کہ گرباز کو لوگوں کے سامنے لا کر سندو کا معاملہ یہیں گول کر دوں۔ مگر تم کچھ اور ہی کرنے لگے۔ خیر، مجھے افسوس ہے کہ تمہیں معاوضے کی بجائے موت مل رہی ہے۔"

"تم اگر مجھے مار دو گی تو گرباز، جو تمہارا شوہر ہے، وہ تو ہمارے قبضے میں ہے، کیا تم اسے نہیں بچانا چاہتی۔"

"اسے ویسے بھی مارنا تھا۔ وہ نہیں رہے گا تو لوگ تلاش کرتے رہیں گے، جبکہ ہمیں یہاں رہنا ہی نہیں ہے۔"

"وہ تمہارا شوہر ہے، جس کی تصویر تمہارے اس سیل فون میں ہے، جس کے ساتھ تمہاری شادی..."

"جس بی تم نے تصویر دیکھی ہے اور جسے تم نے پکڑا ہوا ہے، وہ مچھلی پکڑنے کا ایک چارہ تھا، بے چارہ، وہ کرائے پر لیا ہوا تھا۔ مارنا چاہو تو مار دو، آزاد کرنا چاہو تو کر دو، بعد میں بھی تو اس نے جیل ہی بھگتنی ہے۔"

"میں نے بندے بلوا لیے ہیں، وہ ابھی پانچ منٹ میں آتے ہیں۔" گرمیت نے کہا۔

"تم ان کا انتظار مت کرو، بیگ اٹھاؤ، ہم یہاں سے نکلیں۔" نیبا تیزی سے بولی۔

"یہ ٹھیک ہے۔" گرمیت نے کہا تو جسپال نے پوچھا۔

"یار گرمیت، تم اتنے شارپ نہیں لگتے، جتنا تم نے کام دکھایا، تم آزاد کیسے ہو گئے۔"

"جس وقت تم بوتل اٹھانے گئے تھے، نیبا نے تمہارا خنجر میری طرف کھسکا دیا، تمہارے ہی خنجر سے آزاد ہوا ہوں۔" یہ کہہ کر اس نے ہلکا سا قہقہہ لگایا تو جسپال نے کہا۔

"میں خنجر کے بغیر بھی آزاد ہو جاتا ہوں، یہ دیکھو۔"

وہ اگلے ہی لمحے آزاد ہوا۔ تبھی نیبا نے فائر کر دیا۔ جسپال وہاں نہیں تھا، وہ اچھل کر نیبا پر جا پڑا۔ وہ اگلا فائر ہی نہ کر سکی۔ اس نے پسٹل والے ہاتھ کو قابو کرنا چاہا۔ نیبا نے پسٹل پھینک دیا۔ جسپال نے اسے زور سے دھکا دیا۔ وہ فرش پر جا پڑی۔ گرمیت اس پر پل پڑا۔ وہ ایک اچھا فائٹر ثابت ہوا۔ اس نے اپنی کہنی نیبا کی گردن پر ماری، اور گھٹنا اس کے پیٹ میں مارا۔ جسپال کو غصہ آ گیا۔ اس نے تھپڑ منہ پر مارا۔ تب تک نیبا بھی اٹھ کر اس کے مقابل آ گئی۔ ماحول بہت سخت ہو گیا تو جسپال نے یہ کھیل ختم کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ ممکن ہے گرمیت نے بندے بلوائے ہی ہوں اور وہ آ جائیں۔ جسپال اٹھا اور اس نے گرمیت کو پلٹا۔ اس نے جسپال کی گردن قابو کرنا چاہی مگر اسے دیر ہو گئی۔ جسپال نے اسے اٹھایا اور سر سے اوپر لے جا کر زور سے فرش پر مارا۔ وہ اٹھ ہی نہ سکا۔ پھر اس نے نیبا کو پکڑا اور زور سے اس کے سر پر مکا مارا۔ وہ چکرا کر گر گئی۔ جسپال نے انجیت کو کھولا۔ پھر دونوں اسے ڈنڈا ڈولی کر کے نیچے لے گئے۔ انہوں نے بڑی احتیاط سے ڈرائنگ روم پار کیا اور پورچ میں کھڑی کار تک آ گئے۔

اس بنگلے میں سکون تھا، جہاں انہوں نے گرباز کو رکھا ہوا تھا۔ وہاں تک جاتے ہوئے راستے میں نیبا کو ہوش آ گیا تھا۔ ہرپال سنگھ کو ان کے آنے کی خبر تھی اس لیے پورچ میں کھڑا تھا۔ جسپال نے نیبا کو اتارا اور دھکا دے کر آگے لگا لیا۔ یہاں تک کہ وہ اس کمرے تک جا پہنچے۔ جیسے ہی نیبا کی نگاہ گرباز پر پڑی تو اس کی چیخ نکل گئی۔ وہ شدت حیرت سے بولی۔

"تم گرباز یہاں ان کے پاس.....؟" پھر جیسے اسے ہوش آ گیا۔ وہ یوں ہو گئی تھی جیسے اس کی چوری پکڑی گئی ہو۔ تبھی جسپال نے کہا۔

"تم نے کیا کہا، میں نے اُسے یہاں رکھا ہوا ہے جس کی فوٹو تم نے مجھے دکھائی۔ تم اس گرباز کو محفوظ سمجھ کر مجھے دھوکا دے رہی تھیں؟" یہ کہہ کر اس نے اپنا پسٹل نکالا اور غصے میں بولا۔ "جو سچ ہے، وہ بک دو، ورنہ میں کیا کروں تم نہیں سمجھ سکتی، بہت پیار ہو گیا تم لوگوں سے؟"

"نیبا، میرے خیال میں قسمت نے ہمیں ہرا دیا ہے یہ بات مان لینا چاہیے۔ باوجود ایک بڑا کھیل کھیلنے کے، آخر یہ ہم تک پہنچ گئے۔" گرباز نے شکست خوردہ لہجے میں کہا۔

"سچ کیا ہے؟" جسپال نے پاؤں کی ٹھوکر گرباز کے منہ پر ماری۔ اس کے ہونٹوں سے خون کی دھار بہہ نکلی، جسے وہ صاف کرتے ہوئے بولا۔

"یہ سچ ہے کہ سندو کو میں نے غائب کیا ہے اور وہ زندہ ہے۔ نہ وہ خود یہاں آ سکتا ہے اور نہ ہی تم اس تک پہنچ سکتے ہو۔ یہ بھی سچ ہے کہ میں نے اسے غائب کرنے کے لیے بہت بڑی رقم لی۔"

"کلیان اور ہرنیک وغیرہ کو....."

"وہ میں نے اپنا ایک ڈمی بنایا تھا۔ پکڑا جاتا وہ یا اب وہ غائب ہو گیا ہے تو اسی کی تلاش ہوتی۔ میں نے دو دن بعد یہاں سے چلے جانا تھا۔"

"سندو کو غائب ہوئے تین ہفتے ہو گئے، تم اب تک یہاں کیوں ہو، کرا سے ہی غائب کرنا تھا؟" انجیت نے پوچھا تو وہ بولا۔

"سندو کے غائب کرنے کے بعد میرے پاس تین ٹاسک تھے، ایک سندو کی ساری دولت اکٹھا کر کے

کینیڈا ٹرانسفر کرتا۔ دولت میں نے اکٹھا کر لی ہے لیکن اب صرف ٹرانسفر رہتا تھا جو میں نے منیج کرنا تھی۔ دوسرا اس دوران میں نے سندو گینگ ختم کرنا تھی۔ وہ بہت حد تک میں نے ختم کر دیا۔ ان دو کاموں کے لیے نیہا نے میری بہت مدد کی۔"

"اور تیسرا ٹاسک؟" امر جیت نے پوچھا۔

"ان پانچ پیاروں کو ختم کرنا لیکن جسپال ضرورت سے زیادہ تیز نکلا۔ میرے خیال میں یہ ایک ہفتہ تک یہیں بھول بھلیوں میں بھٹکتا رہتا۔ اور مجھے دو دن چاہیے تھے۔ سارا کام اس وجہ سے ڈسٹرب ہو گیا کہ اس نے آج ہی سب کچھ کر کے پانچ پیارے بھی چھڑوا لیے۔ اس پر لازمی وہ نقلی گرباز پکڑا جاتا۔ میرے لیے مشکل ہو جاتی اور میں نے اسے دوپہر کے وقت ہی اٹھا لیا۔" یہ کہہ کر اس نے سانس لیا پھر بولا۔ "مجھے ایک بات بتاؤ گے جسپال؟"

"بولو۔" جسپال نے کہا۔

"آخر تم مجھ تک اتنی جلدی کیسے پہنچ گئے، میں حیران ہوں ایسا ممکن نہیں ہو سکتا؟" اس نے حیرت سے پوچھا۔

"یہ بہت لمبی کہانی ہے گرباز، میں تمہیں بتا دوں لیکن ایک بات اگر تم بتاؤ تو؟"

"پوچھو۔" اس نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔

"تمہیں اس کام پر کیوں لگایا گیا؟"

"نیہا نا بھول بھلیوں کے لیے۔ تم کیا سمجھتے ہو تم پولیس اور خفیہ کی نگاہوں میں نہیں تھے۔ میں نے انہیں اس ٹریک پر ڈال دیا تھا۔ یہاں تک کہ یہ یقین کر دیا تھا کہ وہ اغوا ہونے والا ہے۔ پھر بھی وہ سیکیورٹی کر لیں۔ جیسے ہی وہ اغوا ہوا، میں نے اپنا فیصلہ کر لیا تھا۔ کوئی مجھ تک نہیں پہنچ سکتا تم نے پارک میں مجھے کیوں سے پکڑا، کیسے؟"

اس پر جسپال ہنس دیا۔ وہ سمجھ رہا تھا کہ بلاشبہ قسمت نے ہی ساتھ دیا ہے، ورنہ ایک سیل فون کال کی وجہ سے وہ پکڑا نہ جاتا۔ اسے یہ بات سمجھ نہیں آسکتی تھی۔ اس لیے وہ ان سے کہنے لگا۔

"دیکھو لالچ بہت بری بلا ہے، یہ ہم بچپن سے پڑھتے اور سنتے آئے ہیں، پھر بھی سبق نہیں لیتے۔ تم نیہا اگروال کو استعمال کر کے اور ساری دولت لے کر غائب ہونے والے تھے۔ یہ تمہارا شروع ہی سے پلان تھا ورنہ تم بھی نقلی گرباز کو کھڑا نہ کرتے، کیا میں سچ کہہ رہا ہوں؟"

"بالکل، ایسا ہی ہے۔" اس نے جواب دیا تو جسپال نیہا اگروال کے پاس گیا، اس کے گالوں پر پسٹل کی نال پھیرتے ہوئے بولا۔

"ایسا ہی تیری اس نقلی محبوب نے کیا، وہ تجھے پھنسا کر ساری دولت......"

"بکواس کر رہا ہے تو، نہیں ایسا......" نیہا نے چیخ کر اس کی بات کاٹی۔

"اس کا حق ہے یہ ایسا کرتی، جو یہ کر رہا تھا اس کے ساتھ، خیر جو ہوا، وہ ہو گیا، حقیقت یہ ہے کہ ہم تیرے قبضے میں ہیں اب بتاؤ کیا چاہتے ہو؟"

"مجھے دولت سے کوئی غرض نہیں، اس جیسے پتہ نہیں کتنے لوگ ایسے بے نام موت مر جاتے ہیں، دھرم کی خدمت میں نے کر دی، ان پانچ پیاروں کو بچا کے۔ اب صرف دولت ہی باقی ہے جو دوست دو تم آزاد ہو۔"

"مجھے پتا ہے، دولت مل لی لیکن دھوکا نہیں کرنا۔" اس نے سنجیدگی سے کہا۔

"دولت ملنے کے بعد جہاں چاہو گے ہم اپنی حفاظت میں تمہیں وہاں چھوڑ دیں گے۔" جسپال نے کہا اور امر جیت سے بولا۔ "جیسے چاہو ان کرو یہ اب تم لوگوں کی ذمہ داری ہے۔" یہ کہہ کر اس نے کرلین کو اشارہ کیا اور باہر نکل گیا۔ پورچ میں اس نے جا کر کرلین سے کہا۔ "رونیت کور کے پاس چلو۔"

"اوکے۔" اس نے کہا اور گاڑی کی جانب بڑھ گئی۔

جسپال بیڈ پر بیٹھا ہوا تھا اور رونیت کور بیڈ کے ساتھ ٹیک لگا کر نیم دراز تھی۔ اس کے چہرے پر گہری سنجیدگی تھی۔ جسپال نے اسے ساری روداد سنا دی تھی۔

"جسپال! ایک طرح سے دیکھا جائے تو جو کام تیرے ذمے تھا، وہ ہو گیا ہے۔ ہمیں سمیدر کو بتا دینا

چاہیے اور وہ بھی جو موجودہ صورت حال ہے۔" رونیت کور نے اسی سنجیدگی سے کہا۔

"وہ تو ٹھیک ہے، لیکن مجھے سمجھنا یہ ہے کہ گرباز کا یہ کھیل کیسا تھا، کیوں کھیلا اس نے اتنا بڑا کھیل، کیا تم یہ سمجھ نہیں رہی ہو کہ جس قدر یہ بڑا کھیل تھا، اسی قدر اس کے پیچھے کوئی بڑا مفاد ہو سکتا ہے۔"

"گریٹ گیم کا یہ حصہ ہے جسپال، کوئی شاطر کہیں بیٹھا یہ کھیل کھیل رہا ہوگا۔ اس نے مہرے ادھر ادھر کیے اور یہ حقیقت ہے کہ ہم بھی اس کھیل میں مہروں سے زیادہ کوئی حیثیت نہیں رکھتے ہیں۔ میرا تو خیال ہے جسمیدر بھی اس کھیل میں مہرہ بن کر استعمال ہو گیا ہے، ہمارے ہاتھ کیا آیا فقط سندو کی وہ دولت جو گرباز لے کر جا رہا تھا، وہ بھی ہمیں ملی نہیں۔" رونیت کور بڑے درد سے بولی۔

"دیکھو دولت ایک بڑی حقیقت ہے۔ کسی بھی تحریک کے لیے وسائل کی ضرورت ہوتی ہے اور وسائل دولت سے حاصل ہوتے ہیں۔ دوسری بات تم بھول رہی ہو، ہم نے ان پانچ پیاروں کو بھی تو بچا لیا ہے۔ واہگرو نے ہم سے یہ سیوا لے لی۔ یہ تھوڑی بات ہے۔" جسپال نے کہا۔

"میں تمہاری بات سے انکار نہیں کرتی۔ دولت بھی حقیقت ہے۔ ماب دیکھو اگر ہمارے پاس وسائل نہ ہوتے تو ہم کچھ بھی نہیں کر سکتے۔ جیسے کہ ان پانچ پیاروں کی بازیابی اور کینیڈا پہنچا دینے تک کی حفاظت وہ اب ہماری ذمہ داری بن چکے ہیں۔" رونیت کور نے اس کی بات سمجھتے ہوئے کہا۔

"لیکن رونیت، کیا تمہارا نہیں خیال کہ ہم اس کھیل کو ذرا مزید دیکھیں۔"

"بات تو تمہاری ٹھیک ہے، دیکھنا چاہیے، لیکن پروفیسر صاحب کا خیال ہے کہ اپنی حد میں رہ کر کام کرنا ہے۔ جس دن ہم اپنی حد سے نکلے، وہ ہمارے لیے ٹھیک نہیں ہوگا۔" رونیت کور نے گول مول جواب دیا۔

"ہم اپنی حد خود بڑھا لیتے ہیں، جب ہم نے کام ہی اپنے دھرم کے لیے کرنا ہے تو۔" اس نے کہا تو رونیت

تاثیر لفظوں کی

☆ ہم جذبہ محبت کی تخلیق پر قادر نہیں ہیں۔ اسے مدت تو کیا صدیوں میں بھی تخلیق نہیں کیا جا سکتا۔

☆ مصروفیت اپنے اصل سے فرار ہے۔ دنیا نفس ہے اور نفس کے شور میں کھو کر روح کی پکار پر کیوں کر دھیان دیا جا سکتا ہے۔

☆ زخم ہمیشہ اسی سے ٹھیک ہوتے ہیں جو انہیں عنایت کرتا ہے لیکن کبھی کبھی تو یہ اس کے بس کی بھی بات نہیں رہتی۔

☆ یاد کرنے کے لیے تصویر کا ہونا ضروری تو نہیں۔ کچھ صورتیں دل پر بھی نقش ہو جایا کرتی ہیں۔

(صبا سلیم۔ ٹنڈو جان محمد)

کور نے پیار سے اس کے گال پر ہاتھ پھیرا اور تیکھے ہوئے لہجے میں بولی۔

"تم بہت تھک چکے ہو، تم ابھی سکون کرو، فریش ہو جاؤ گے تو باتیں کریں گے، اس پر بھی سوچیں گے۔ آؤ لیٹ جاؤ۔" رونیت کور نے کہا اور جہازی سائز کے بیڈ کی ایک طرف ہو گئی۔ جسپال نے اس کی طرف دیکھا اور پھر لیٹ گیا۔ اسے نیند آتے ہوئے زیادہ وقت نہیں لگا۔



میں نے جیسے ہی درختوں کا جھنڈ پار کیا، میرے سامنے ایک بہت بڑے پاٹ والا دریا تھا۔ اس دریا کے اوپر سے ایک پل تھا جو دیکھنے میں بڑا نازک لگ رہا تھا۔ میں جیسے ہی اس پل پر آیا تو دریا کی سطح دیکھ کر ششدر رہ گیا۔ پل کے ایک طرف بڑا صاف اور شفاف پانی آ رہا تھا لیکن جیسے ہی پل کے نیچے سے دوسری طرف نگاہ پڑی، وہاں کا منظر ہی کچھ دوسرا تھا۔ دریا کا پانی دو حصوں میں تقسیم تھا۔ دائیں جانب صاف ستھرا اور نیلگوں پانی تھا۔ اس میں پھول تھے اور خوشبو اٹھ رہی تھی۔ اسے دیکھ کر فرحت کا احساس ہو رہا تھا۔ دور تک نارنجی رنگ برنگے پھول کھلے

ہوئے تھے۔ درخت تھے، پرندے تھے اور ہریالی تھی جو نگاہوں کو بھلی لگ رہی تھی۔

اس کے ساتھ ہی گدلا، سیاہی مائل اور سڑاند مارتا ہوا تعفن زدہ پانی بہہ رہا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے اس میں پیلی پیلی پیپ اور سرخ رنگ کا خون بہہ رہا ہو۔ اس کے کنارے سڑے ہوئے گوشت کے لوتھڑے، آدھے ادھورے کھائے ہوئے انسانی بدن، بوڑھا بچے اور ہڈیاں پڑی ہوئیں تھیں۔ اس کے ساتھ ہی گدھ بیٹھے انہیں بھنبھوڑ رہے تھے۔ ایسا دریا میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ دونوں پانی باہم بہہ رہے تھے۔ ایک دوسرے میں مل نہیں رہے تھے۔ میں یہ سوچ ہی رہا تھا کہ ایک دم سے آواز آئی۔

"کیوں حیرت زدہ ہو؟"

"اس دریا کو دیکھ کر۔" میں نے تیزی سے کہا۔

"غور سے دیکھو، یہ دریائے شہوت ہے۔ جو پیچھے کا پانی ہے، وہ دیکھو انسان کی وہ عمر ہوتی ہے جب وہ معصوم ہوتا ہے۔ لیکن جیسے ہی وہ بالغ ہونے کے قریب پہنچ جاتا ہے تو شہوت کے دو ہی راستے ہیں۔ جن کا مشاہدہ تم کر رہے ہو۔ ایک وہ جو فطری راستہ ہے۔ اس میں سکون اور اطمینان ہے۔ غور سے دیکھو تخلیقی نسل کو قوت بھی خوش آمدید کہہ رہا ہے۔ وہاں زندگی ہے۔ جبکہ دوسری طرف موت کا پر ہول سناٹا ہے۔ یہ شہوت کا غیر فطری بہاؤ ہے۔ جس کا انجام تم کناروں پر دیکھ سکتے ہو، جہاں صرف موت ہے۔"

"یہ فطری اور غیر فطری شہوت کے بہاؤ؟" میں نے الجھتے ہوئے پوچھا۔

"یہ شہوت اس قدر قوت ہے کہ اس کو نہ صرف قابو کرنے کی بڑی ضرورت ہے بلکہ پاکیزہ رکھنا اس سے بڑی ضرورت۔ یہ تخلیق کا منبع ہے۔ سنو، اگر آج عورت یا مرد میں سے کسی ایک کی تخلیقی قوت سلب ہو جائے تو اس زمین پر زندگی کب تک رہے گی۔ زیادہ سے زیادہ ڈیڑھ سو سال، یا اس سے ذرا زیادہ۔ غیر فطری بہاؤ تخلیقی قوت کو ضائع کر دینے کے مترادف ہے۔ یہی وہ راستہ ہے جو انسانی نسل کو ختم کر دیتے اور اس پر موت طاری کر دینے کی وجہ ہے۔ شہوت کا غیر فطری ذریعہ انسانی زندگی ہی کے لیے نہیں انسانی بقا کے لیے بھی خطرناک ہے۔"

میں اس دریا کو دیکھتا رہا اور اس آواز کا منتظر رہا لیکن کافی دیر تک خاموشی رہی۔ میں نے پل پار کرنے کے لیے قدم بڑھا دیئے۔ تو وہ پل میرے قدموں کے نیچے سے سرکنے لگا۔ ان لمحوں میں دریا پار کر گیا تو میرے سامنے ایک پہاڑ تھا۔ میں پہاڑ پر چڑھنے لگا۔ یہاں تک کہ میں اس کی چوٹی پر چڑھ گیا۔ دوسری جانب میرے لیے ایک اور حیرت تھی۔

بے حد اداس لوگ ہی لوگ تھے۔ بھی شور کر رہے تھے۔ کوئی ایک دوسرے کی جانب نہیں دیکھ رہا تھا۔ جیسے کان پڑی آواز نہیں سنائی دے رہی ہو۔ ان کی نگاہ زمین پر تھی۔ ان سب کی آگے کھانے پینے کی چیزوں کا ڈھیر تھا۔ وہ ڈھیروں سے بہت بلند تھا۔ کوئی بھی اور نہیں دیکھ رہا تھا، یا تو لوگ اس ڈھیر میں سے کھانے پینے کی چیزیں نکال نکال کر کھا رہے تھے یا ایک دوسرے سے چھین کر کھا رہے تھے۔ کوئی ذخیرہ کر رہا تھا کسی کی زبان اتنی لمبی تھی کہ ان سے کھانا ہڑپ کر جاتا تو پھر سے ان پر کھانے رکھنے شروع کر دیتا۔ میں ان کی طرف دیکھ رہا تھا اور حیران ہو رہا تھا۔

"یہ وادی جوف ہے۔ جسے تم پیٹ کی وادی بھی کہہ سکتے ہو۔"

"یہ کیسی وادی ہے، یہاں لوگ ہلکان کیوں ہو رہے ہیں۔" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"اصل میں یہ کم ظرف لوگ ہیں۔ وہ دیکھ ہی نہیں رہے ہیں کہ رزق کا اتنا بڑا ذخیرہ ہے اس کی طرف تو دیکھتے نہیں۔ وہ تو اپنے نفس کی طرف دیکھ رہے ہیں۔ رزق کی کمی نہیں، ان کی نیت میں کمی ہے۔ اس لیے ایک دوسرے سے چھین رہے ہیں اور وہ دیکھو ایسے بھی ہیں اپنے حصے سے وافر اور اپنا بھی دوسروں کو دے رہے ہیں،

وہ لوگ دیکھو، کتنے مطمئن ہیں۔"

"ہاں میں دیکھ رہا ہوں، جو جتنا زیادہ ذخیرہ کر رہے ہیں ان کے پاس سے اتنا زیادہ تعفن اٹھ رہا ہے۔"

"وادی جوف کے لوگ صرف پیٹ سے سوچتے ہیں، جو جتنا پیٹ سے سوچتا ہے اتنا ہی زیادہ تعفن پھیلاتا ہے اور وہ تعفن اس کی ذات تک محدود نہیں رہتا، بلکہ اس سے دوسرے بھی اثر انداز ہوتے ہیں۔"

"کیا اب مجھے بھی اس وادی کو پار کرنا ہوگا۔"

"نہیں تجھے پیٹ تک کا مشاہدہ کروا دیا گیا ہے۔ آگے تو سوچ تجھے کیا کرنا ہے۔ تو جس منزل کا راہی ہے، وہ منزل ابھی دور ہے۔ تجھے ابھی سفر میں رہنا ہے، یہاں تک کہ تیری منزل آجائے۔"

میں ان لفظوں پر غور کر ہی رہا تھا کہ ایک دم سے اندھیرا چھا گیا۔ مجھے لگا جیسے میں نیند سے جاگا ہوں یا پھر بے ہوشی کے عالم سے ہوش میں آیا ہوں۔ میں ویسے ہی جال میں پھنسا ہوا تھا۔ تیز ہوا پھڑ پھڑا رہی تھی اور میں نجانے کس منزل کی جانب جا رہا تھا۔ کچھ دیر بعد مجھے لگا میں نیچے کی طرف جا رہا ہوں۔ اس کے ساتھ ہی ہیلی کاپٹر کی سرچ لائیٹ روشن ہوگئی۔ میں نے نیچے دیکھا، وہاں درخت ہی درخت تھے۔ اور میں جال سمیت تیزی سے نیچے جا رہا تھا۔

❁ ❁ ❁

دوپہر کے بعد جسپال کی آنکھ کھلی تو رونیت کور نے اس سے کہا۔

"تیار ہو جا، پروفیسر صاحب کے پاس جانا ہے۔ وہاں پر سینئر ساتھی آ رہے ہیں۔"

"ٹھیک ہے۔" یہ کہہ کر وہ بیڈ سے اٹھ گیا۔ کچھ دیر بعد وہ پروفیسر کے گھر تھے، جہاں تین سکھ جوان اور ایک عورت بیٹھی ہوئی تھی۔ ان کے درمیان گہری سنجیدگی تھی۔ وہ بھی جا کر بیٹھ گئے۔ تو پروفیسر نے ان کا تعارف کراتے ہوئے کہا۔

"یہی وہ لوگ ہیں جن کے ساتھ میں کسی بھی اہم

> **غیرت مند**
>
> ایک سکھ لڑکا روزانہ اپنی بہن کو چھوڑنے کالج جاتا تو راستے میں چند آوارہ لڑکے اس پر آوازیں کستے۔ "جہاں نوں لے کے کتھے چلے او۔" وہ لڑکا خاموش رہتا۔ تنگ آ کر اس کی بہن نے کہا۔ تمہارا میرے ساتھ آنے کا کیا فائدہ بھیا۔ وہ لوگ کتنی غلیظ باتیں کرتے ہیں۔ تم انہیں بتاتے کیوں نہیں کہ میں تمہاری بہن ہوں۔ لڑکے کی غیرت جاگی۔ جوش میں ساری رات کروٹیں بدلتا رہا۔ بس صبح میں ان بے غیرتوں کی بات کا منہ توڑ جواب دوں گا۔ چنانچہ جب وہ صبح اپنی بہن کو چھوڑنے گیا تو لڑکوں نے کہا۔ "جہاں نوں لے کے کتھے چلے او۔" لڑکا پرجوش انداز میں چلایا۔ او بے غیرتو! اینہ تُسی ہوروں کُجھ تہاڈے میری سکی بھین اے۔"
>
> عبدالصبور خان...... کوہاٹ

مسئلے پر مشورہ لیتا ہوں۔" پھر ان کی طرف دیکھ کر بولا۔ "یہ ہے وہ نوجوان جس نے کرپال جیسے بندے کو ایک ہی رات میں پکڑ لیا۔"

"واہ بھئی واہ میرے خیال میں جس طرح اس نے اپنا سیٹ اپ بنایا تھا، سے پکڑنا بہت مشکل تھا۔ اس نے نکل جانا تھا۔" ایک نے کہا تو پروفیسر صاحب بولا۔

"وہ تو جو ہونا ہے وہ ہو گیا۔ ہرپال، امیت اور گرلین کی ذمے داری ہے کہ وہ اب انہیں سنبھال لیں گے۔ ایک دو دن میں اس کا سب ہو جائے گا۔ اصل معاملہ یہ ہے کہ اب کیا کرنا ہے؟"

"کس معاملے میں؟" ایک نے پوچھا۔

"یہی سندو کے معاملے میں دیکھو، سندو کی دولت ہمارے ہاتھ لگ جاتی ہے تو اس کے بعد ہمیں اس سے کوئی سروکار نہیں ہوگا۔ اگر سندو مل جاتا ہے تو اس کا دوہرا فائدہ ہے، وہ ہماری طاقت بن سکتا ہے۔ دولت تو ہاتھ آ ہی جائے گی۔ تیسری بات یہ جو پانچ پیاروں کی واپسی ہے، اس سے خالصتان تحریک اور اس کے ساتھ جڑے ہوئے جو لوگ بھی ہیں، ان میں ہماری ساکھ بن چکی

ہے۔ ہم کوئی جرائم پیشہ لوگ نہیں، ہم بھی تو اپنے انداز میں دھرم ہی کا کام کر رہے ہیں۔" پروفیسر نے تفصیل سے بتایا تو دوسرے نے کہا۔

"تو آپ کا مطلب ہے کہ سندو کو تلاش کیا جائے؟"

"یہی تو میں نے آپ سب سے مشورہ کرنا ہے۔" پروفیسر نے ان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"میرے خیال میں تو اسے تلاش کرنا چاہئے، اگر مل جائے تو اچھا ہی ہے۔" ایک عورت نے صاف کہہ دیا

"کیوں آپ سب کیا کہتے ہیں؟" اس نے پوچھا تو کچھ دیر بعد وہ سب اسی بات پر راضی ہو گئے کہ سندو کو تلاش کرنا چاہئے۔ یہ کیسے ممکن تھا، یہ بعد کی بات تھی۔

کھانے کے بعد وہ سب لوگ چلے گئے۔ یہ ذمہ داری جسپال ہی پر ڈال دی گئی کہ وہ سندو کو تلاش کرے۔ جسپال جیسے ہی واپس رونیت کے گھر آ کر صوفے پر بیٹھا تو صوفے کے دوسرے سرے پر بیٹھتے ہوئے رونیت کور نے پوچھا۔

"کیوں، کرو گے نا تلاش اسے ہمارے ساتھ مل کر؟"

"تم اگر میرے ساتھ رہو تو میں کوشش کروں گا۔" اس نے مسکراتے ہوئے پوچھا تو وہ ہنستے ہوئے بولی۔

"میں اسے مذاق سمجھ کر نہیں لوں، تم کوئی شرط لگا رہے ہو؟" رونیت کور نے اس کی طرف دیکھ کر پوچھا۔

"جو تم سمجھو۔" اس نے بھی گول مول سا جواب دیا تو ایک دم سے خاموشی ہو گئی۔ تبھی جسپال کا فون بج اٹھا۔ اس نے اسکرین پر نگاہ ڈالی تو وہ روہی سے معلوم ہوا تھا۔ وہ کچھ دیر باتیں سنتا رہا۔ اس کے چہرے پر حد درجہ سنجیدگی طاری ہو چکی تھی۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ جمال کو میلے والے میدان سے اٹھا لیا گیا ہے۔ فون بند کرنے کے بعد اس نے رونیت کی طرف دیکھا اور بولا۔

"ہو سکتا ہے میں اب تم لوگوں کی مدد نہ کر سکوں۔ مجھے ایک اہم ذمہ داری نبھانے کے لیے جانا ہوگا۔ بہت معذرت کے ساتھ، پروفیسر صاحب کو بتا دینا۔"

"یہ کیا کہہ رہے ہو تم، ایسی کون سی افتاد پڑ گئی ہے؟" وہ حیرت زدہ ہوتے ہوئے بولی۔

"یہ میرے لیے سب سے بڑی اور سب سے اہم ذمہ داری ہے۔ جسے میں نظر انداز نہیں کر سکتا۔ سوری۔" اس نے کہا تو رونیت کور اس کی طرف یوں دیکھنے لگی جیسے وہ کسی دوسری دنیا کی مخلوق ہو۔

"لیکن کیا تم اکیلے یہ سب کر لو گے جو تم کرنے جا رہے ہو؟" اس نے پوچھا۔

"یہاں بھی تو میں اکیلے ہی آیا تھا۔" وہ بولا۔

"مگر تمہیں ہماری مدد لینا پڑی تھی۔" اس نے جواب دیا تو جسپال نے ایک لمحہ کو سوچا۔ تبھی رونیت نے کہا۔

"تم میرے ساتھ چلو پروفیسر کے پاس، ہم کوئی راستہ نکالتے ہیں، ہم تمہاری مدد کر سکتے ہیں۔"

"اوکے۔" اس نے ایک دم سے کہا اور اٹھ گیا

❁ ❁ ❁

یہ کوئی مشاہدہ نہیں تھا بلکہ میں پورے ہوش و حواس کے ساتھ وہ منظر دیکھ رہا تھا۔ اندھیرے میں پتہ نہیں چل رہا تھا کہ وہ کتنا بڑا ہے۔ میں صرف اتنا ہی دیکھ سکتا تھا، جہاں سرچ لائٹ کی روشنی پڑ رہی تھی۔ اس سے آگے کچھ بھی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ درختوں کے جھنڈ میں ایک بڑا سارا میدان تھا۔ میں دھیرے دھیرے نیچے آ رہا تھا۔ اس میدان میں کافی ساری گاڑیاں کھڑی تھیں۔ یہاں تک کہ میرے قدم زمین سے جا لگے۔ اس کے ساتھ ہیلی کاپٹر سے جال الگ ہو گیا۔ ذرا سی کوشش کے بعد میں جال سے باہر آ گیا۔

ہیلی کاپٹر جا چکا تھا۔ میرے سامنے بہت ساری مختلف ماڈل اور میک کی گاڑیاں کھڑی تھیں۔ ہر طرف ملگجا اندھیرا تھا۔ کافی فاصلے پر کوئی عمارت کا شائبہ تھا، جو بہت زیادہ روشن تھی۔ میں کہاں تھا؟ اس بارے میں مجھے کچھ پتہ نہیں تھا۔ تبھی عمارت کی طرف سے تیز روشنی ہوئی۔ وہ گاڑیوں کا ایک قافلہ تھا، جو لمحہ بہ لمحہ نزدیک ہوتا چلا جا رہا تھا۔ پھر مجھ سے ذرا سے فاصلے پر رک گیا۔ ہیڈ لائٹس مجھ پر پڑ رہی تھیں۔ ان گاڑیوں میں سے کئی لوگ

باہر نکلے۔ وہ کالی ساڑے تھے۔ ان میں ایک لمبا سا آدمی آگے بڑھتے ہوئے میری طرف آ کر چند قدم کے فاصلے پر رک گیا۔

"اس جزیرے پر خوش آمدید۔ میں مانتا ہوں کہ تمہیں یہاں لانے کا طریقہ کچھ ٹھیک نہیں تھا، مگر اس کے سوا کوئی اور راستہ بھی نہیں تھا۔ اس کے لیے ہم معذرت خواہ ہیں۔"

"یہ کون سا جزیرہ ہے اور تم کون ہو۔" میں نے اس سے پوچھا۔

"دیکھو جمال! ہم تمہارے کسی سوال کا جواب دینے کے پابند نہیں ہیں لیکن ہم تمہارے ساتھ بہت ساری باتیں کرنے والے ہیں۔ شرط صرف یہ ہے کہ تم یہاں دوست بن کر رہو۔ ہم نہیں چاہتے کہ خون خرابہ ہو لڑائی جھگڑے میں کوئی مارا جائے۔" اس نے تحمل سے کہا۔

"ایسا کیوں چاہتے ہو تم؟" میں نے پوچھا۔

"ہم تمہیں اپنا مہمان بنا کر رکھنا چاہتے ہیں، جب تک تم کسی کو کچھ نہیں کہو گے۔ تم اس جزیرے پر آزاد ہو۔ فرار ہونے کی کوشش بھی کرو گے تو ہم روکیں گے۔ کیونکہ تم فرار ہو نہیں پاؤ گے۔" اس نے اسی تحمل سے کہا۔

"مجھے یہاں لانے کا مقصد؟" میں نے پھر پوچھا۔

"یہی تو ابھی تو بتانا ہے بلکہ سمجھانا ہے، اور وہ ہمارا باس تمہیں بتائے گا۔ اگر تم یہ بات سمجھ گئے ہو تو آؤ چلیں۔" اس نے ساتھ ہی ہاتھ کا اشارہ کیا تو میں آگے بڑھ کر اس کے پاس چلا گیا۔ اس نے ہاتھ ہی کے اشارے سے ایک گاڑی کی طرف راہنمائی کی۔ میں اس میں جا کر بیٹھ گیا۔ چند منٹ بعد یہ قافلہ واپس جا رہا تھا۔

وہ ایک شاندار عمارت تھی۔ اس جنگل میں ایک محل کا ہونا حیران کن ہی تھا۔ اس کی چار دیواری کی اونچائی بہت زیادہ تھی۔ میں پورچ میں اتر کر یہی دیکھ رہا تھا کہ میرا میزبان بولا۔

"یہ چار دیواری اس لیے اونچی بنائی گئی ہے اور اس پر لوہے کا جنگلا اس لیے لگایا گیا ہے کہ اس جزیرے کے خونخوار درندے اور وحشی لوگ ادھر نہ آ جائیں۔"

وہ میری نگاہیں بھانپ کر مجھے ایک دوسرا نیا پیغام دے کر سمجھا گیا تھا۔ میں اس کے ساتھ اندر کی جانب بڑھ گیا۔ سامنے ہی ایک وجیہہ مرد اور حسین عورت کھڑے تھے۔ اس نوجوان نے مجھے ان کے حوالے کیا۔ وہ مجھے لیتے ہوئے ایک شاندار کمرے میں لے گیا۔ جو کسی فائیو سٹار ہوٹل کے سوئٹ جیسا تھا۔

"تمہیں یہاں رہنا ہے۔ تم فریش ہو جاؤ، تو پھر تمہارے لیے یہیں کھانا لاتے ہیں۔ کیونکہ باقی سب کھا چکے ہیں۔" اس مرد نے کہا اور باہر چلا گیا

"اس جانب باتھ روم ہے۔ جاؤ، میں تمہارے لیے کپڑے نکالتی ہوں۔" اس عورت نے لپک کر کہا اور ایک جانب چلی گئی۔ مجھے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ میں یہاں قیدی ہوں یا مہمان؟ رات گئے میرے سو جانے تک انہوں نے میرے ساتھ مہمانوں والا سلوک ہی رکھا۔

میں سو جانے کے لیے بیڈ پر دراز ہوا تو میلے والے میدان سے لے کر یہاں آ جانے تک جو مشاہدہ کروایا گیا تھا، میں اس پر غور کرنے لگا۔ یہ مشاہدہ بے مقصد نہیں تھا۔ لازمی طور پر میری آنے والی زندگی میں اس کی ضرورت تھی۔ مجھے ایک ایک واقعہ یاد آ رہا تھا۔ اس مشاہدے میں مجھے کیا کیا بات سمجھائی گئی تھی، اس کا ظہور ہونا باقی تھا۔ نجانے کب میری آنکھ لگ گئی۔

میں صبح جب بیدار ہوا تو ہر جانب اجالا پھیلا ہوا تھا۔ میں اٹھ کر کھڑکی میں گیا تاکہ باہر کا نظارہ کر سکوں۔ میرے سامنے ایک گہرا سبزہ زار تھا اور اس سے آگے گہرے سبز اور شاداب درخت۔ میں نے کھڑکی کھولی تو خوشگوار ہوا سے ایک دم میرے اندر خوشگواریت اتر گئی۔ میں کافی دیر وہیں کھڑا رہا۔ تبھی مجھے پشت پر سے نسوانی آواز سنائی دی۔

"آپ تیار ہو جائیں، کچھ دیر بعد میٹنگ ہے۔"

میں نے گھوم کر دیکھا جین اور ٹی شرٹ پہنے ایک لڑکی کھڑی تھی۔ اس کے بال کھلے تھے اور چہرے پہ سکوت طاری تھا۔ اس کی آواز اس کے چہرے کا ساتھ

نہیں وہ سے رہی تھی۔

"او کے۔ تم جاؤ" میں نے کہا۔

"نہیں، میں آپ کو تیار کروں گی۔" اس نے کہا تو میں نے کاندھے اُچکا دیے۔

وہ ایک بڑا ہال تھا۔ جس کی چھت خاصی اونچی تھی۔ وہ خالی تھا۔ وہاں کرسیاں لگی ہوئی تھیں۔ ہر ایک کے سامنے میز تھا۔ میں نے بزنس سوٹ پہنا ہوا تھا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے کہ میں کوئی بزنس میٹنگ میں جا رہا ہوں۔ درمیان میں ایک میز خالی پڑی ہوئی تھی۔ جس کے دونوں جانب کرسیاں پڑی ہوئی تھیں۔ وہی لڑکی مجھے ایک خالی کرسی پر بٹھا گئی۔ میرے بیٹھتے ہی ہال کی دائیں جانب سے ایک دروازہ کھلا اور ایک ادھیڑ عمر شخص نمودار ہوا۔ وہ آتے ہی بیٹھ گیا۔ اس نے میری طرف دیکھا اور پھر شفاف انگریزی میں بولا۔

"جمال! تمہیں یہاں خوش آمدید کہتا ہوں۔ ہر والدین کی طرح بچپن میں، میرے والدین نے بھی میرا ایک نام رکھا تھا، جس سے میں جان چھڑا چکا ہوں۔ وہ نام ایک خاص مذہب اور قوم کی نمائندگی کرتا تھا۔ جب مجھے شعور آیا تو میں نے اس سے جان چھڑوالی۔ میں آزاد ہو گیا۔ اگر تم مجھے پکارنا چاہو تو اپنی زبان میں "آزاد" کہہ سکتے ہو۔" یہ کہہ کر وہ ایک لمحے کے لیے رکا پھر کہتا چلا گیا۔ "میرا تمہیں یہاں لانے کا طریقہ بہت غلط تھا۔ یوں جیسے کسی کو اغوا کر کے لایا جاتا ہے۔ لیکن یہ میری مجبوری تھی۔ یہاں تمہاری طرح کئی لوگ ہیں۔ جن کو ایسے ہی لایا ہوں۔ سب سے الگ الگ بات کرنے میں وقت لگ جاتا۔ یہاں سب سے فوراً بات ہو سکتی ہے۔ اب دیکھو لوگوں کو یہاں اکٹھا کرنے میں تین ہفتے لگ گئے۔ الگ الگ بات کرنے اور سمجھانے میں کتنا وقت لگتا۔"

"تم مجھ سے کیا بات کرنا چاہتے ہو۔" میں نے تحمل کے ساتھ اس سے پوچھا۔

"طاقت، اور بہت زیادہ طاقت۔ اس خطے پر حکومت چاہتا ہوں، جس کے میں اور تم باسی ہو۔ سرحدوں کی کوئی اہمیت نہیں، مذہب، زبان، رنگ نسل کسی کی کوئی اہمیت نہیں، ان سب سے ماورا ہو کر اس خطے پر حکومت کرنی ہے، جس پر صدیوں سے دوسرے لوگ ہمیں محکوم بنائے رہے۔ وہ تھے تو دور دراز کے لوگ ہم پر حکومت کر رہے ہیں۔ کیوں؟"

"شاید اس لیے کہ ہم محکوم رہنا پسند کرتے ہیں" میں نے تلخی سے کہا۔

"تاریخ یہ بتاتی ہے کہ اس خطے پر آریان نے قبضہ کیا۔ انہوں نے انسانیت پر ظلم یہ کیا کہ مذہب کو استعمال کیا، انسان پر انسان کی حکومت کے لیے۔ شودر بھی تو انسان تھے انہیں ذلیل کر کے رکھ دیا۔ یہ ان کا مذہب نہیں بلکہ ان کا خوف تھا کہ ہم سے اپنا وطن واپس نہ چھین لیں۔ یہ حربہ کامیاب رہا۔ یہاں تک کہ انگریزوں نے بھی یہی حربہ مسلمانوں کے لیے استعمال کیا۔ خیر، آج بھی ایسے ہی تقسیم جاری ہیں۔ سرحدوں نے ملک بنا دیے، لیکن ہر ملک میں انسان کا استحصال جاری ہے۔ غربت، بھوک، بیماری اور ذلالت، انسان کا مقدر ہی کیوں؟ دنیا سے چند مٹھی بھر لوگ اتنی دولت رکھتے ہیں کہ ان کا شمار نہیں۔"

"تو کیا ہم ان کی دولت چھین کر ان غریبوں میں بانٹ دیں؟" میں نے سکون سے کہا۔

"ضروری نہیں کہ چھین لیں، طاقت کے آگے ہر شے بے بس ہو جاتی ہے۔ میں یہ نہیں چاہتا، میں تو اس سے بھی آگے کا سوچ رہا ہوں۔ اگر تم لوگ میرا ساتھ دو تو ہم اس خطے میں اپنی مرضی کی حکومت بنائیں، جب چاہیں اور جو چاہیں کریں، لیکن باہر کی طاقتوں کو یہاں گھسنے نہیں دیں۔"

"مطلب تم، کسی کی گریٹ گیم کے مہرے ہو، اور آگے ہمیں مہرے بنانا چاہتے ہو۔" میں نے کہا۔

"تم اسے اس طرح سوچ سکتے ہو، لیکن میں کسی کا مہرہ نہیں، میں تو اس گریٹ گیم سے نکلنے کا کہہ رہا ہوں۔ چھپے ہوئے ہاتھ جب چاہیں اور جس کا چاہیں

خون بہاتے ہیں۔ کیا تم نے کبھی کسی معصوم بچے کی خون میں نہائی ہوئی یا ادھ جلی لاش دیکھی ہے؟ اگر دیکھی ہے تو کیا جذبات تھے تمہارے؟"

"مجھے جذباتی کرنے کی کوشش مت کرو۔ سیدھی بات کرو، مجھے ہی کیوں چنا، اور تم نے کیسے مان لیا کہ میں تمہاری بات مان جاؤں گا؟"

"نہ مانو، جبکہ مجھے یقین ہے کہ تم میری بات سے انکار نہیں کر پاؤ گے۔ میں پچھلے ایک سال سے تمہیں دیکھ رہا ہوں۔ تم میں ہمت ہے، حوصلہ ہے، کچھ کرنے کی قوت بھی ہے لیکن تمہارے پاس کوئی مقصد نہیں۔ حالات نے تمہیں جس راہ پر ڈال دیا، تم بلاتکلف بھاگے جا رہے ہو۔ تم میں صرف ایک خوبی ہے، جس کی وجہ سے میں نے تمہیں یہاں لانے کا تردد کیا، تم مجرمانہ ذہن نہیں رکھتے ہو۔ ورنہ دولت، طاقت اور حکومت کسے نہیں چاہیے۔ جرائم پیشہ لوگوں کی یہاں میں لائنیں لگا دیتا، جس کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔" یہ کہہ کر وہ سانس لینے کے لیے رکا پھر بولا۔ "تم میرے مہمان ہو، یہاں سکون سے رہو۔ سوچو اور پھر فیصلہ دینا۔ ایک دن تم واپس بھی چلے جاؤ گے۔ جانے بنا چارہ بھی نہیں۔ حتمی فیصلہ تمہیں ہی کرنا ہوگا۔"

"تم ہو کون؟ اور اصل مقصد...؟"

"یہ قبل از وقت سوال ہے۔ میں اپنے بارے میں بھی بتاؤں گا۔ میرا مقصد کیا ہے یہ بھی معلوم ہو جائے گا۔ لیکن اتنا بتا دوں۔ میں بے جا خون بہانے کے خلاف ہوں، مجھے نفرت ہے جو ساز شیں کرتے ہیں، مذہب کی آڑ لے کر اپنے غلیظ مقاصد پورے کرتے ہیں۔ انسانیت کا نام لے کر مکروہ منصوبے گھڑتے ہیں۔ تم صرف ایک ہفتہ رہو، سب سمجھ جاؤ گے۔"

"اور اگر میں ایک ہفتے سے پہلے ہی یہاں سے چلا گیا تو...." میں نے اس کی طرف دیکھ کر کہا۔

"یہ تمہاری شدید غلط فہمی ہوگی۔ میری مرضی کے بغیر تم یہاں سے جا بھی نہیں سکتے ہو۔ ابھی تم نے یہ جگہ نہیں دیکھی، خیر، اگر تم پھر بھی یہاں سے چلے جاؤ تو تم جو کہو گے میں وہ کرنے کو تیار ہوں گا۔"

"یہ لفظ یاد رکھنا مسٹر آزاد، کیونکہ مجھے تمہاری باتوں سے بدبو آ رہی ہے۔ تم بھی انہی بے غیرت لوگوں میں سے ہو، جو انسانیت اور غریب لوگوں کا نام لے کر درندگی پر اتر آتے ہیں۔ خود کو سیکولر کہلوا کر مذہبی خونخواری کرتے ہیں۔ میں تمہارا نقاب اتار دوں گا۔" میں نے سخت لہجے میں کہا تو وہ ایک دم سے ہنس دیا۔ پھر بولا۔

"چلو، ایسے ہی سہی، میں چاہتا تھا کہ ہم سکون اور پیار سے بات کو سمجھتے لیکن تم کچھ اور ہی چاہ رہے ہو۔ آج کی میٹنگ یہیں ختم کرتے ہیں۔ باقی باتیں کل سہی۔" اس نے یہ کہا اور میری طرف دیکھتا ہوا اٹھ گیا۔

میں اس ہال سے باہر نکلا تو میں بہت حد تک سمجھ گیا تھا کہ وہ کیا چیز تھا۔ اس کے عزائم کیا ہو سکتے تھے۔ مجھے اس کی باتوں نے ذرا سا بھی متاثر نہیں کیا تھا۔ میری ساری توجہ وہاں سے فرار ہونے کی جانب ہو گئی۔

میں گل کی راہداریوں سے ہوتا ہوا باہر جانے لگا۔ میں باہر آ گیا۔ میرے سامنے ایک لمبا راستہ تھا، جس کے دونوں طرف سبزہ زار تھے۔ بیرونی گیٹ پر کوئی چوکیدار یا سیکورٹی والا نہیں تھا۔ مجھے تھوڑی سی حیرت تو ہوئی کہ سیکورٹی گارڈ کے نام پر کوئی بندہ نہیں تھا۔ اس کے ساتھ ہی یہ خیال آیا کہ اس نے کوئی جدید قسم کا سیکورٹی سسٹم بنایا ہوگا۔ جسے بہرحال سمجھنا ضروری تھا۔ میں سیڑھیاں اترتا چلا گیا۔ میں نے جیسے ہی گیٹ کی طرف جانے والے راستے کی طرف قدم بڑھائے ایک دم سے زوردار قہقہوں کی آواز سنائی دیے۔ میں نے اس جانب دیکھا تو چند مرد اور تین عورتیں بیٹھے ہوئے تھے۔ وہ بھی میری جانب دیکھ رہے تھے۔ ایک مرد نے ہاتھ ہلا کر مجھے اپنی طرف بلایا۔ میں ایک لمحہ سوچے بغیر ان کی طرف بڑھ گیا۔ میں ان کے پاس گیا اور ایک خالی کرسی پر بیٹھ گیا۔ تبھی وہی مرد بولا۔

"یہ تو ہمیں معلوم ہو ہی گیا ہے کہ تم یہاں پر نئے ہو۔ تمہارے انداز سے لگتا ہے کہ تم مسٹر آزاد سے میٹنگ

بھی کر آئے ہو۔ اور اب تم یہاں سے بھاگ جانے کی سوچ بھی رہے ہو گے؟"

"تمہاری ساری باتیں درست ہیں۔" میں نے اعتراف کر لیا تو سارے ہنس دیئے

"یہ تو ٹھیک ہے فوراً مان گیا؟" ایک عورت نے کہا۔

"کیا ہم پوچھ سکتے ہیں کہ تم کون ہو اور کہاں سے اغوا کر لائے گئے ہو؟" مرد نے پوچھا تو میں نے اپنے بارے میں بتا دیا

اس کا مطلب ہے تم پنجابی سمجھ سکتے ہو؟" ایک نوجوان نے کہا۔

"ہاں، کیا تم بھی پنجابی ہو؟" میں نے اس کی طرف دیکھ کر پوچھا۔

"ہاں، میں بھی ہوں۔" اس نے ہنستے ہوئے بتایا

"اور تم لوگ؟" میں نے سب کی طرف دیکھ کر کہا تو پہلے والی عورت بولی۔

"ہماری تفصیل ذرا لمبی ہے، بتا دیں گے، لیکن اتنا بتا دیں کہ ہم بھی تمہاری طرح یہاں مہمان ہیں۔" یہ کہہ کر اس نے زوردار قہقہہ لگا دیا

"تم باہر کی طرف اس لیے جا رہے تھے تاکہ یہاں سے فرار ہو سکو؟" پہلے والے مرد نے پوچھا پھر فوراً ہی بولا۔ "اور یہ بات یقینی ہے کہ تمہارے پاس کوئی ہتھیار بھی نہیں ہوگا؟"

"تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔" میں نے صاف کہہ دیا

"تو پھر سن لو تم یہاں سے باہر نہیں جا سکتے۔ میرے خیال میں تمہیں یہ بھی معلوم نہیں ہوگا کہ تم اس وقت ہو کہاں پر۔"

"میں جہاں بھی ہوں، ہوں تو اسی زمین پر نا۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"زمین پر۔" اس نے طنزیہ انداز میں کہا، پھر یوں بولا جیسے وہ مجھے اس دنیا کا احمق ترین آدمی سمجھ رہا ہو "اگر یہاں سے نکلنا اتنا آسان ہوتا تو ہم سب یہاں سے کب کے جا چکے ہوتے۔ کوئی یہاں چار ہفتوں سے پھنسا ہوا ہے، کوئی دو اور کوئی تین۔ اور تم آج رات ہی آئے ہو، یہاں کے بارے میں پتہ کچھ نہیں اور......"

"تم کیوں نہیں نکل سکے یہاں سے؟" میں نے تجسس سے پوچھا۔

"جس جگہ ہم ہیں، یہ ایک جزیرہ ہے۔ اس کے چاروں طرف سمندر ہے۔ یہاں آنے اور یہاں سے جانے کا راستہ صرف ایک ہے اور وہ وہی ہے جس طرح ہمیں یہاں لایا گیا ہے۔ اس جزیرے پر گھنا جنگل ہے۔ جس میں ہر طرح کا خون خوار جانور موجود ہے۔ یہاں سے لے کر ساحل تک اگر ان جانوروں سے کوئی بچ بھی جائے تو ان وحشیوں سے کوئی نہیں بچ سکتا جو یہاں رہتے ہیں۔ ان ہی وحشیوں کے ہاتھوں تمہاری طرح کا ایک سرپھرا ہلاک ہو چکا ہے۔ وہ اسے کھا گئے ہیں۔ اگر تم بھی ان کا نوالہ بننا چاہتے ہو تو جاؤ۔"

"اور اگر بچ گئے تو؟ اگر ہم سے ہمارے بارے میں پوچھ لیا تو ہم تمہیں اپنا تعارف کروا دیں گے۔" اس عورت نے ہاتھ اٹھاتے ہوئے کہا۔ میں نے ان سب کی طرف دیکھا اور اٹھ کھڑا ہوا۔ وہ مجھے یوں دیکھنے لگے جیسے میں پاگل ہوں یا دنیا کا احمق ترین انسان ہوں۔

"ٹھہرو میں بھی تمہارے ساتھ چلتا ہوں۔" وہی پنجابی نوجوان اٹھ گیا۔

"واہ، اچھا لگا مجھے۔ کیا نام ہے تمہارا؟" میں نے خوش ہوتے ہوئے پوچھا۔

"مجھے سندیپ گروال کہتے ہیں، تم مجھے سندو بھی کہہ سکتے ہو۔" اس نے مسکراتے ہوئے کہا اور میری جانب قدم بڑھا دیئے۔ ہم نے سب پر نگاہ ڈالی اور باہر کی جانب چل دیئے۔

(باقی ان شاء اللہ آئندہ ماہ)



سنگدل

خلیل جبار

پسند کی شادی آج کل فیشن بن کر رہ گئی ہے۔ مختلف نجی چینلوں اور انڈین ٹی وی ڈراموں کی طرح پھیلائی گئی زہریلی مثل اور خصوصاً لوئر مڈل کلاس کی لڑکیوں کو اچھے برے کی تمیز سے بیگانہ کر دیا ہے۔ انہیں ماں باپ کی ڈانٹ بھی ظالم سماج کا ظلم محسوس ہونے لگتا ہے۔ ایک احمق حسینہ کی روداد' وہ پیتل کو سونا سمجھ بیٹھی تھی۔

وہ سول کورٹ کے احاطے میں کھڑی ہوئی تھی' ملازموں جیسے گندے میلے کپڑے پہنے ہوئے تھی' چہرے پر بلا کا کرب تھا' اس نے اپنے سر کو دوپٹے سے ڈھانپ رکھا تھا مگر پھر اس پر نظر پڑتے ہی صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ اس کے سر کے بالوں کو استرے سے صاف کر دیا گیا ہے' میں ابھی اس سے بات چیت کرنے کے بارے میں سوچ ہی رہا تھا کہ ایک چپڑاسی میرے نزدیک آیا۔

"یہ بڑی اچھی خبر ہے۔" اس نے کہا۔

"اچھا' کیا ہوا ہے اس کے ساتھ؟" میں نے پوچھا۔

"اس کے شوہر نے اس پر بری طرح تشدد کیا ہے اور اس کے سر کے بال کاٹ کر گنجا کر دیا۔"

"یہ سب کرنے کی کوئی خاص وجہ؟" میں چونکا۔

اس نے اشارے سے ایک خاتون کو اپنے نزدیک بلایا' اس کی صورت اس عورت سے خاصی مل رہی تھی۔ چپڑاسی کے نزدیک آنے پر وہ بولا۔

"یہ اخباری رپورٹر ہے' ان کا کام کورٹ میں آنے والے مختلف کیسوں کے بارے میں رپورٹنگ کرنا ہے' تم انہیں بتاؤ کہ تمہاری بہن کے ساتھ کیا ظلم ہوا ہے۔" اس نے کہا۔

"بھائی تم میرے بہنوئی کے ظلم و ستم کو اچھی طرح سے چھاپنا کرنا تاکہ کوئی اور بھولی بھالی لڑکی ایسے ظالم لوگوں کے چکر میں نہ پھنس سکے۔" وہ بولی۔

"اپنا مختصر سا تعارف کرائیں اور بتائیں کہ یہ واقعہ کیوں اور کیسے ہوا؟"

"میرا نام سلمٰی ہے اور یہ میری بہن بانو ہے' میری بہن نے پسند کی شادی کی تھی اس کے شوہر اسلم نے بانو کو سسرال میں سکون کا سانس نہیں لینے دیا' اس نے بانو پر ظلم و ستم کے پہاڑ توڑ رکھے تھے' ہمیں بانو کے محلے کی دادی حلیمہ نے ٹیلی فون کر کے بتایا کہ اسلم نے تمہاری بہن کو طلاق دے کر اس پر بدترین تشدد کر کے اسے گنجا کر دیا ہے' جب ہم دادی حلیمہ کے گھر پہنچے تو دیکھا واقعی اس پر تشدد ہوا ہے' پھر ہم نے تھانے میں رپورٹ درج کرائی اور آج پولیس میرے بہنوئی اسلم کو گرفتار کر کے کورٹ لے کر آئی ہے۔"

"یہ تمہارے بہنوئی ہیں۔" میں نے ایک آدمی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔

پولیس نے ایک آدمی کو ہتھکڑیاں پہنائی ہوئی تھیں' وہ شکل سے بدمعاش لگ رہا تھا' چہرے پر بڑی بڑی مونچھیں اس کے چہرے کو اور خوفناک بنائے دے رہی تھیں۔

"ہاں یہی میرا بہنوئی ہے۔" سلمٰی نے کہا۔ میں اس کی جانب بڑھا۔

"اسلم میاں میں اس مقدمے کے حوالے سے کچھ گفتگو کرنا چاہتا ہوں' میرا تعلق اخبار سے ہے' کیا یہ بتانا پسند کریں گے کہ تم نے اپنی بیوی کے ساتھ ایسا سلوک کیوں کیا؟" میں نے پوچھا۔

"کون بیوی...... کس کی بیوی' میں اسے کئی بار طلاق دے چکا ہوں لیکن میرے گھر سے جانے کا نام ہی نہیں لیتی۔ دو روز قبل بھی تیسری بار طلاق دے کر اسے اپنے گھر جانے کو کہا مگر یہ ڈھیٹ بنی رہی' جس پر مجھے غصہ آ گیا۔ وہ

بار پہلے بھی طلاق دی تھی مگر یہ نہیں گئی تیسری بار بھی ضد کر رہی تھی کہ میں یہیں رہوں گی۔ میں نے کوئی غریب یتیموں کو گھر میں رکھنے کا ٹھیکہ نہیں لے رکھا۔ مجھے غصہ آنے پر پہلے اس کی پٹائی کی یہ پھر بھی گھر سے نہیں گئی تو مجھے شدید غصہ آ گیا اور میں نے اسے تنہا کر دیا۔ یہ واحیات پھر بھی گھر سے جانے کا نام نہیں لے رہی تھی۔ تم ہی بتاؤ میاں! بیوی کا رشتہ اس وقت ہی ہوتا ہے نا کہ وہ بیوی کو طلاق نہ دے جب طلاق دے دی پھر عورت کا سابق شوہر کے گھر میں کیا کام۔" اسلم غصے سے بولا۔

"کیا واقعی تم تین بار طلاق دے چکے ہو؟" میں چونکا۔

"ہاں بھئی میری بات کا یقین نہیں آ رہا ہے تو وہ سامنے کھڑی ہے اس سے پوچھ لو۔" اسلم نے بانو کی طرف اشارہ کیا۔ میں بانو کی طرف بڑھا۔

"کیا اسلم نے..." میں نے کہنا چاہا۔

"ہاں وہ سچ کہہ رہا ہے اسلم مجھے کئی بار طلاق دے چکا ہے اور میں اپنی حیثیت بھول کر اس کے گھر میں پڑی رہتی۔"

"کیا تمہیں معلوم ہے طلاق کے باوجود بیوی شوہر کے پاس رہے تو پھر ان کے تعلق کس نوعیت کے ہوتے ہیں۔"

"مجھے معلوم ہے۔" بانو نے نظریں نیچے کرتے ہوئے کہا۔

"پھر بھی..."

"میں مجبور تھی جب تمہیں پتا چلے گا تم بھی یہی کہو گے کہ میں نے درست کیا۔"

"کیا.....؟" مجھے حیرت کا زبردست جھٹکا لگا اور کیوں نہ لگتا بانو نے بات ہی اس نوعیت کی کر دی تھی طلاق دینے پر بھی بیوی شوہر کے پاس رہے وہ زنا کی مرتکب ہوتی ہے یہ بات جانتے ہوئے بھی بانو شوہر کے پاس رہی تھی اس بات کے پیچھے بھی کوئی کہانی ضرور تھی۔

"کیا تم بتانا پسند کرو گی کہ ایسی کیا مجبوری تھی۔"

"یہ پوچھ کر کیا کریں گے جو ہونا تھا وہ ہو چکا۔" بانو نے آنکھوں میں آئے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔

"ہو سکتا ہے کہ تمہاری دکھ بھری کہانی سن کر کسی اور کو سبق حاصل ہو جائے اور وہ تمہارے جیسی زندگی گزارنے سے بچ جائے۔" میں نے کہا۔

"میں بڑے نازوں میں پلی تھی اس لیے بہت خود سر ہو گئی تھی۔ ابا جان شجاعت علی میری ہر خواہش پوری کرتے تھے میرے بڑے بھائی بہنوں کو اس طرح میری فرمائشیں پوری ہوتا دیکھ کر بہت تکلیف ہوتی تھی کیونکہ میری پیدائش سے قبل میرے والد کے کاروباری حالات ایسے نہ تھے کہ وہ اپنی اولاد کی بے جا فرمائش پوری کر سکیں۔ میری پیدائش کے بعد اچانک میرے والد کا کاروبار چمک اٹھا تھا اور وہ پیسوں میں کھیلنے لگے تھے لیے میری بڑی بڑی خواہشات بھی ان کے نزدیک معمولی ہوا کرتی تھیں۔ اس لیے میری زبان سے فرمائش نکلی ادھر وہ پوری ہوئی۔ امی ابو مجھے سمجھاتے بھی رہتے تھے کہ اس طرح ضد نہ کیا کرو جب پرائے گھر جاؤ گی اور وہ تمہاری اس طرح ضد پوری نہ کریں گے تو تمہیں بہت دکھ اور تکلیف ہو گی اس لیے ایسی عادت نہ اپناؤ جو بعد میں تکلیف کا باعث بنے۔ میں ان کی بات ایک کان سے سنتی اور دوسرے کان سے نکال دیتی اور یہ سوچتی کہ جب میرے والد اتنے امیر ہیں تو میرا رشتہ بھی دولت مند گھرانے میں ہی کریں گے۔ انسان خوشی میں مگن رہتا ہے اور پتا نہیں چلتا کہ اس کے ساتھ مستقبل میں کیا ہونے والا ہے۔ میں جس دکان سے کتاب کاپیاں خریدتی تھی وہ اسلم کے والد نواب علی کی دکان تھی۔ ان دنوں وہ دکان بہت چلتی تھی دکان کے چلنے کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ ان کا اسکولوں میں کاروبار تھا۔ چھوٹے دکانداروں کو وہ ہول سیل ریٹ پر مال بھی دیا کرتے تھے جس کے سبب ان کی روزانہ کی سیل بہت اچھی تھی دوپہر کے اوقات میں وہ گھنٹے کے لیے وہ آرام کرنے گھر چلے جاتے تھے۔ اس دوران کاؤنٹر پر اسلم بیٹھا کرتا تھا۔ میں کتاب کاپیاں لینے دوپہر کے وقت ہی جاتی تھی ان دنوں میں انٹر کے آخری سال میں تھی۔ میں اسلم کی آنکھوں میں پسندیدگی کے جذبات کو محسوس کر رہی تھی۔ اسلم بہانے بہانے سے مجھ سے باتیں کرنے لگا تھا میں بھی غیر محسوس طور پر اس کے نزدیک ہوتی جا رہی تھی۔ میں جو کتابیں خریدتی تھی اس سے اسلم کو میرے ذوق کا اندازہ ہو گیا تھا

اور وہ ان ہی موضوعات پر زیادہ بات کرتا تھا میری ان موضوعات پر دلچسپی ہونے کے سبب اب ہماری ملاقاتیں آدھے آدھے گھنٹے سے بھی زیادہ بڑھنے لگی تھیں ان ہوں نے ہمیں ایک دوسرے کا دوست بنا دیا تھا جب بھی ہم ایک دوسرے سے جدا ہوتے محسوس ہوتا کہ تشنگی رہ گئی۔

ایک دن ملازم کسی کام سے دکان سے باہر تھے اس لیے وہ دکان میں اکیلا ہی بیٹھا تھا گاہک بھی نہیں تھے اس نے موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے کہا۔

"بانو تم باتیں بہت دلچسپ کرتی ہو دل کرتا ہے کہ سنتا ہی رہوں۔"

"یہی میری کیفیت ہوتی ہے مجھے تمہاری باتیں بہت دلچسپ لگتی ہیں۔" میں نے کہا۔

"کیا ایسا نہیں ہوسکتا کہ ہم فرصت میں موبائل پر بات کرلیا کریں اگر تمہیں کسی قسم کا اعتراض نہ ہو تو یہ بات میں اسی لیے کررہا ہوں کہ دکان پر گاہکوں کا رش بہت زیادہ ہے ہم کسی بھی موضوع پر تفصیل سے بات نہیں کرپاتے ہیں۔" اسلم نے کہا۔

"ہاں دکان پر واقعی گاہکوں کا رش ہوتا ہے اور ہمارے موضوعات اس قسم کے ہوتے ہیں کہ ان پر تفصیل سے بات ہی نہیں ہوپاتی۔ موبائل پر واقعی ہماری تفصیلی گفتگو ہوسکتی ہے۔" میں نے اس کی تائید کی۔

ہمارا پھر موبائل پر گفتگو کا سلسلہ چل نکلا اسلم کو باتیں کرنے کا فن آتا تھا زیادہ تر وہی بولتا رہتا تھا اور میں سنتی رہتی تھی دراصل اسلم دکان پر بیٹھنے سے پبلک ڈیلنگ کا عادی ہوگیا تھا اسے پتا تھا کہ کس سے کس موضوع پر بات کی جائے وہ میری نفسیات سے بخوبی آگاہ تھا اس لیے اسلم نے مجھے اپنی چھے دار گفتگو میں پھنسالیا تھا جس دن میری اس سے ملاقات یا بات چیت نہ ہو سکون نہیں ملتا تھا۔ میں اکثر اپنی کسی سہیلی سے ملاقات کا بہانہ بنا کر اسلم سے ریستوران میں بھی ملاقات کرنے لگی تھی وہ شکل و صورت کا اتنا اچھا نہیں تھا مگر گفتگو ایسی کرتا تھا کہ انسان کا دل دوبارہ اس سے ملاقات کی خواہش کرتا تھا۔ میں روز ملاقات ہونے پر بھی دوسرے دن ملاقات کی تمنا رکھتی تھی اس لیے ہم ایک دوسرے کو چاہنے لگے تھے اور شادی کے عہد و پیماں ہونے لگے۔

میرے والد شجاعت علی کی بڑی خواہش تھی کہ وہ میری شادی اپنی بہن یاسمین کے لڑکے نیاز سے کردیں پھوپی یاسمین کا گھرانہ بہت اچھا تھا گھر میں پیسے کی فراوانی تھی ابو کا خیال تھا کہ میں بہت خوش رہوں گی۔ بچپن سے میں یہ باتیں سنتی آرہی تھی کہ میری شادی نیاز سے ہوگی جب سے میری زندگی میں اسلم آیا تھا میں نیاز کو جیسے بھول ہی گئی تھی جب اسلم کے والدین میرے رشتے کے لیے ہمارے گھر آئے میرے ابو نے انہیں صاف انکار کردیا کہ میری شادی وہ اپنی بہن کے لڑکی سے کریں گے۔ وہ مایوس ہوکر چلے گئے جاتے جاتے وہ کہہ گئے تھے کہ میں اور اسلم ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں اور ان کی خواہش پر ہی یہ رشتہ لے کر آئے ہیں۔ میرے ابو نے جب مجھ سے اس بارے میں استفسار کیا میں نے انہیں صاف صاف بتادیا کہ ہم دونوں ایک دوسرے کے ساتھ شادی کرنا چاہتے ہیں جس پر ابو نے صرف اتنا کہا۔

"میری بچی میں تمہاری ہر خواہش پوری کرسکتا ہوں لیکن یہ خواہش پوری نہیں کرسکتا اسلم کے والد نواب علی کی شہرت اچھی نہیں جیسا باپ ہوتا ہے بیٹا بھی اس کے نقش قدم پر ہی چلتا ہے۔"

"ابو کیا یہ ضروری ہے کہ باپ خراب ہو تو بیٹا بھی ایسا ہی نکلے۔" میں نے کہا۔

"تم نے زمانہ نہیں دیکھا ورنہ تم کبھی یہ بات نہ کرتی بہرحال تم اپنے دل سے یہ بات نکال دو کہ تمہاری اسلم سے شادی ہوسکتی ہے۔" ابا جان نے سختی سے کہا۔

مجھے امی جان کی زبانی بعد میں معلوم ہوا کہ اسلم کے والد نواب علی کی جوانی کی شہرت اچھی نہیں تھی وہ ایک نمبر کا عیاش تھا۔ اسلم کے بارے میں بھی مشہور تھا کہ اس کی لڑکیوں سے بھی بہت دوستیاں ہیں میں نے جب اسلم سے ملاقات پر اس بات کا ذکر کیا وہ مسکرا دیا۔

"میرے والد کی دولت و عزت سے لوگ جلتے ہیں اس لیے ایسی باتیں مشہور کی ہوئی ہیں جہاں تک میرے بارے میں یہ بات مشہور ہے کہ میری لڑکیوں سے دوستیاں ہیں یہ بات درست ہے۔ ہمارا کام ہی ایسا ہے

دکان چلانے کے لیے آنے والے گاہک چاہے وہ مرد ہوں یا لڑکیاں سب سے اچھے انداز میں بات کرنی پڑتی ہے۔ گاہکوں سے دوستانہ ماحول ہونے پر ہی ہماری دکان کی سیل اچھی ہے اگر آنے والے گاہکوں سے برا منہ بنا کر بات کریں تو پھر کون ہماری دکان پہ آئے گا۔" اسلم کی بات میں وزن تھا۔

میں نے یہ بات نوٹ کی تھی دوسرے دکانداروں کی نسبت ان کی دکان پر گاہکوں سے بہت اچھے انداز میں بات کی جاتی تھی اس لیے ایک بار جو گاہک وہاں آ جاتا تھا وہ دوبارہ بھی اس دکان پر آنے کو ترجیح دیتا تھا۔ اس کی باتیں ہی تھیں جو میں اس کی دیوانی ہو گئی تھی ورنہ اسلم کی صورت کوئی خاص نہ تھی۔ میرے گھر سے نکلنے پر پابندی لگ گئی تھی میرے ابو نہیں چاہتے تھے جو بات اسلم کے والدین نے میرے حوالے سے کہی ہیں وہ کوئی اور بھی کہے۔ اسلم سے بات چیت کرنے کا ایک واحد سہارا موبائل تھا وہ بھی مجھ سے چھین لیا گیا کالج بھی امی جان چھوڑ کر آتیں اور ساتھ لے کر آتی تھیں۔ اس پابندی نے مجھے بغاوت پر اکسایا میں نے محبت ہی محبت میں کبھی اس طرح کی سختیاں سہنے کی مجھے بچپن سے عادت ہی نہیں تھی۔ اس لیے میرا باغی ہونا فطری تھا میں کالج میں اپنی سہیلیوں کے موبائل سے اسلم سے باتیں کرنے لگی تھی اگر ملاقات کرنا ہوتی تو امی جان کے کالج چھوڑ کے جانے کے تھوڑی دیر بعد گیٹ سے باہر آتی اور باہر اسلم کو اپنا منتظر پاتی۔ وہ مجھے ریستوران لے جاتا کالج کی چھٹی ہونے سے آدھا گھنٹہ پہلے کالج چھوڑ جاتا۔ چھٹی ہونے پر امی کے آ جانے پر ان کے ساتھ گھر چلی آتی یہ سلسلہ کئی ماہ چلتا رہا پھر ایک دن میں نے اسلم سے کہہ ہی دیا۔

"اسلم ہم اس طرح کب تک ملتے رہیں گے؟"

"پھر تم کیا چاہتی ہو؟" اسلم نے پوچھا۔

"مجھے خطرہ ہے کہ کہیں ہمارا یہ راز کھل نہ جائے ایسی صورت میں میرا گھر سے نکلنا مشکل ہو جائے گا۔"

"اس کا ایک ہی حل ہے ہم کورٹ میرج کر لیں اس طرح ہمارے درمیان حائل ہر رکاوٹ دور ہو جائے گی۔" اسلم نے کہا۔

"کیا ہمارے والدین اس اقدام سے راضی ہوں گے۔" میں نے پوچھا۔

"نہیں ابتدا میں کسی کے بھی والدین اس طرح کے اقدام کو پسند نہیں کرتے لیکن پھر بچوں کی محبت کے سبب کچھ عرصہ ناراضگی رکھ کر خود بخود ناراضگی کو ختم کر دیتے ہیں۔ ہمارے ساتھ بھی ایسا ہی ہوگا ہم ان کا خون ہیں وہ ہمیں کس طرح سے اپنے سے دور رکھیں گے۔" اسلم نے مسکراتے ہوئے میری طرف دیکھا۔

اس کی بات مجھے پسند آئی تھی مجھے اتنا یقین تھا کہ جتنا مجھے ابو چاہتے ہیں وہ مجھے میرے اس اقدام پر معاف کر دیں گے۔ اس بات نے میرے اس جذبے کو تقویت دی کہ ہم جتنی جلدی ہو سکے کورٹ میرج کر لیں پھر ایسا ہی ہوا۔ ایک دن ہم نے کورٹ میرج کر لی گھر پر میں ایک کاغذ پہ پیغام چھوڑ آئی تھی تاکہ گھر والے ہمیں تلاش کرنے کے لیے پریشان نہ ہوں۔ اسلم نے وقتی طور پر ایک کرایہ کا چھوٹا سا مکان لے لیا تھا جس میں ہم دونوں رہنے لگے تھے۔

میرے ابو کو میرا یہ اقدام پسند نہیں آیا اور وہ بیمار پڑ گئے اور انہوں نے سختی سے کہہ دیا تھا کہ گھر میں سے کوئی بھی بانو سے رابطہ نہیں رکھے گا اگر کسی نے اس سے رابطہ کیا پھر اس کے لیے اس گھر میں کوئی جگہ نہیں ہوگی وہ کوئی اور گھر دیکھ لے۔ ابو کے یہ بات کہنے پر کسی کی کوئی مجال نہیں ہوئی کہ وہ مجھ سے رابطہ کر لے۔ اسلم کی والدہ جہاں آرا بیگم کو بھی اسلم کے کورٹ میرج کرنے کا بہت دکھ تھا وہ لالچی قسم کی خاتون تھیں۔ وہ اسلم سے میری شادی کی بات کرنے بھی اس لیے ہمارے گھر گئی تھیں کہ ڈھیر سارا جہیز ملے گا۔ کورٹ میرج کرنے سے ان کے ارمانوں پر پانی پھر گیا تھا۔ نواب علی نے غصے میں آ کر اسلم کو اپنی جائیداد سے عاق کر دیا تھا اسلم کو ایک پرائیوٹ ادارے میں نوکری مل گئی تھی اس لیے گھر کا خرچ چل رہا تھا۔ چند سال زندگی بہت اچھی گزری اس دوران میرے دو بیٹے کاشف اور ارسلان پیدا ہوئے میں بہت خوش تھی لیکن میری خوشی عارضی ثابت ہوئی اسلم اپنی اصل خصلت پر اتر آیا۔ گھر میں شراب پی کر آنا میرے سامنے لڑکیوں سے موبائل پر باتیں کرنا اس کا

معمول بن گیا۔ میرے سمجھانے پر وہ تشدد پر اتر آتا میری سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کروں۔

ایک دن اسلم نے مجھے بتایا کہ اس کی ابو سے ملاقات ہوئی ہے۔ مجھے حیرت کا جھٹکا لگا۔

"کیا کہہ رہے تھے؟"

"وہ کہہ رہے تھے کہ اگر میں بانو سے نجات پا لوں تو وہ ابو سے سفارش کر کے جائیداد سے عاق نامہ کینسل کرا دیں گے۔"

"پھر تم نے کیا کہا؟"

"میں نے فی الحال کوئی جواب نہیں دیا اور ان سے یہ کہہ کر بات ختم کر دی کہ سوچ کر جواب دوں گا۔" اسلم نے معنی خیز مسکراہٹ سے کہا۔

"تمہارا کیا ارادہ ہے؟" میں نے گھورتے ہوئے کہا۔

"آفر اچھی ہے فائدہ بہت ہے۔"

"کیا......؟" میں غصے سے دھاڑی۔ "تم مجھے چھوڑ دو گے؟"

"جب تمہارا باپ تمہیں اپنی جائیداد میں سے کچھ بھی حصہ نہیں دے رہا ہے ایسے میں میری ماں کی طرف سے یہ آفر بہت اچھی ہے۔"

"میرا باپ تمہیں کیوں اپنی جائیداد میں سے حصہ دے گا اگر کچھ لینا ہے تو اپنے باپ سے لو۔" مجھے بھی غصہ آ گیا تھا۔

"میں تمہارے باپ کا داماد ہوں اس ناتے انہیں جہیز نہیں تو کم از کم کچھ رقم دینی چاہیے تاکہ میں اپنا ذاتی کاروبار شروع کر سکوں۔"

"میرے ابو نے مجھ سے تعلق ختم کر دیا ہے اس لیے ان سے کسی بھی قسم کی توقع رکھنا بیکار ہے۔"

"پھر تم مجھ سے کوئی توقع مت رکھنا مجھے نہیں معلوم تھا کہ تم سے شادی کر کے میرے مقدر پھوٹ جائیں گے۔" اسلم نے کہا۔

"تمہارے کیا مقدر پھوٹیں گے مقدر میرا پھوٹا ہے نا جانے وہ کون سی منحوس گھڑی تھی جو میں تمہارے چکر میں آ گئی۔" میرا اتنا کہنا تھا کہ اس نے مجھ پر ہاتھ اٹھاتے ہوئے تشدد شروع کر دیا۔ جب مارتے مارتے وہ تھک گیا تو مجھے چھوڑ کر چلا گیا تشدد سے میرا جوڑ جوڑ درد کر رہا تھا میں بے حس و حرکت زمین پر پڑی تھی میرے بچے رو رو کر مجھ سے آ کر لپٹ گئے۔

اس دن کے بعد اب اکثر اسلم بہانے بہانے سے مجھے پیٹنے لگا تھا ہر دفعہ مار پیٹ کرنے سے پہلے اس کا مطالبہ ہوتا تھا کہ وہ مجھ سے شادی کر کے گردش میں آ گیا ہے لہٰذا اس گردش سے نکلنے کے لیے میں اپنے والد سے جائیداد سے حصہ مانگوں مگر میں کس منہ سے جا کر ان سے جائیداد سے حصہ مانگتی اسلم نے مجھے اس قابل چھوڑا ہی کہاں تھا۔

ایک روز میں بازار سودا سلف لینے گئی تھی اچانک میری نظر امی جان اور ابو پر پڑی امی جان کا مجھے دیکھ کر دل بھر آیا۔ ابو کی نگاہ جونہی مجھ پر پڑی وہ امی جان کا ہاتھ پکڑ کر گھسیٹتے ہوئے لے گئے اور میں انہیں دیکھتی ہی رہ گئی۔ گھر آ کر میرا دل بے اختیار رونے کو چاہنے لگا چاہنے کے باوجود میں ضبط نہ کر سکی زور زور سے رونے لگی ایسے میں اسلم گھر آ گیا جب میں نے بازار کا واقعہ سنایا وہ پھٹ پڑا۔

"میں اس لیے کہتا ہوں کہ ایسے سنگدل باپ سے جائیداد میں حصہ لے لو ایک روپیہ بھی انہیں معاف نہیں کرنا۔"

"مجھ سے کہتے ہو کہ میں اپنے باپ سے جائیداد میں سے حصہ مانگ لوں تم اپنے سنگدل باپ سے حصہ کیوں نہیں مانگ لیتے۔" میں نے غصے سے کہا۔

میری بات پر اسلم سخت اشتعال میں آ گیا اور مارنا پیٹنا شروع کر دیا اور غصے میں آ کر تین دفعہ لفظ طلاق ادا کر کے باہر چلا گیا۔ کتنی آسانی سے مجھے وہ طلاق دے کر چلا گیا تھا میں بہت دیر تک روتی رہی لیکن کب تک روتی صبر کر کے خاموش ہو گئی۔ ماں باپ کے سوا اس دنیا میں میرا کوئی ایسا عزیز نہ تھا جو مجھے رکھ لیتا جس معاشرے میں بھیڑیوں کی تعداد زیادہ ہو وہاں عورت بے بس ہو جاتی ہے۔ گھر چھوڑ کر کہیں نکلتی بھی تو میرا ٹکراؤ یقیناً کسی بھیڑیے سے ہی ہونا تھا پھر میں نے فیصلہ کر لیا جب تک حالات میرے موافق نہیں آ جاتے میں یہاں سے کہیں نہیں جاؤں گی مجھے ان حالات سے دوچار کرنے والا اسلم ہی تھا اور میں اس کے

بچوں کو کہاں لے کر جاؤں گی کم از کم انہیں تحفظ کا احساس تو رہے گا۔ رات گئے جب اسلم شراب پی کر آیا مجھے گھر میں دیکھ کر حیرت زدہ رہ گیا۔

"تو اپنا منحوس چہرہ لے کر یہاں سے دفعہ نہیں ہوئی۔"

"تم نے مجھے اس قابل چھوڑا ہے جو میں کہیں چلی جاؤں۔" میں نے غصے سے کہا۔

"تیری مرضی جہاں چاہے پڑی رہ میں نے تیرا فیصلہ سنا دیا ہے۔" یہ کہتے ہوئے وہ چارپائی پر پڑ گیا۔

میں بھی اپنے نصیبوں کو کوستی ہوئی سو گئی۔

میں ایک دن بازار سے پکانے کا سامان لے کر آ رہی تھی کہ اسلم کی والدہ کی پڑوسن مل گئی باتیں کرتی ہوئی گھر تک آ گئی۔ اخلاقاً میں نے بیٹھنے کو کہا وہ گھر میں داخل ہوئی اس کی باتوں سے اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ مجھ سے کچھ باتیں کرنا چاہ رہی ہے۔ کچھ دیر بعد میرا اندازہ درست ثابت ہوا شکورن خالہ رازداری سے میرے کان کے پاس منہ کر کے بولی۔

"تمہارا میاں بہت چکر چلا رہا ہے کہ کسی طرح اس کا باپ معاف کر کے اپنے پاس بلا لے۔"

"اسلم بتا رہا ہے کہ اس کی ماں چاہ رہی ہے کہ وہ واپس آ جائے۔" میں نے کہا۔

"جھوٹ... صاف جھوٹ بول رہا ہے بلکہ یہ چکر لگا رہا ہے۔ مجھے خود اسلم کی ماں نے بتایا کہ اسلم اس پر زور دے رہا ہے کہ ابا سے کہو کہ وہ مجھے معاف کر دے اور وہ بانو کو طلاق دے کر جہاں وہ چاہیں گے شادی کر لے گا۔"

"کیا ابا معاف کر دے گا؟"

"توبہ کرو جی نواب علی شروع سے غصے کا تیز ہے پھر اس پر جو انکشاف ہوا ہے اس کے بعد وہ کبھی بھی اسے معاف نہیں کرے گا۔" شکورن خالہ کانوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے بولی۔

"انکشاف... کیسا انکشاف...؟"

"صاحبزادے کا بھی وہی حال ہے جو نواب علی کا جوانی میں تھا شراب پینا آوارہ عورتوں کے ساتھ دوستیاں رکھنا۔ اس لیے دکان کو اسلم نے بہت نقصان پہنچایا دکان میں جتنا مال نہیں اس سے زیادہ کا نواب علی کو قرض دار بنا دیا ہے۔ نواب علی کی عقل کام نہیں کر رہی ہے کہ وہ کس طرح اس قرضے سے نجات حاصل کرے گا۔ نواب علی نے اسلم سے چھوٹے بیٹے قاسم کو دکان پر بٹھا دیا مگر اس پر وہ بھرپور نظر رکھتا ہے۔ ایک ایک روپے کا حساب لیتا ہے وہ نہیں چاہتا تھا کہ قاسم بھی اسلم کی طرح بگڑ جائے۔" شکورن خالہ نے کہا۔

"اچھا تبھی وہ کہتا ہے کہ میں اپنے ابا سے جائیداد میں سے حصہ مانگ لوں۔" میں نے کہا۔

"بیٹی ایسی غلطی بھول کر بھی نہیں کرنا تمہارا چھوٹے بچوں کا ساتھ ہے اسلم وہ رقم بھی جوئے اور شراب نوشی میں اڑا دے گا۔"

"جوئے اور شراب نوشی میں؟" میں چونکی۔

"ہاں بیٹی انسان جیسا کماتا ہے ویسا ہی چلا جاتا ہے اسلم کا ان دنوں چور اچکوں کے ساتھ یارانہ ہے نوکری کہیں کرتا نہیں ہے چوری چکاری سے کام چلا رہا ہے۔"

"شکورن خالہ! تمہیں یہ باتیں کیسے پتا چلیں؟" میں نے تجسس سے پوچھا۔

"ندیم کالا ہمارے محلے میں ہی رہتا ہے وہ بھی اسلم کا دوست ہے ایک دن دونوں میں جھگڑا ہو رہا تھا لوگوں نے بیچ بچاؤ کر کے جب پوچھ گچھ کی تو پتا چلا کہ وہ کسی جگہ چوری کر کے آئے تھے اور چوری کا سامان اس نے اسلم کے پاس رکھوا دیا تھا اسلم نے چوری کے سامان کی ساری رقم جوئے کی نذر کر دی اس کے پاس رقم ہوتی تو دیتا۔ وہ ندیم کالے کو سمجھا رہا تھا کہ آئندہ واردات میں تمہارا حساب برابر کر دوں گا مگر ندیم کالا بضد تھا کہ اسے رقم آج ہی چاہیے کسی سے رقم دینے کا وعدہ کیا ہوا ہے۔" شکورن خالہ نے کہا۔

وہ اسلم کے بارے میں انکشاف کر کے چلی گئی تھیں میری سمجھ میں سب باتیں آ گئی تھیں کہ اسلم مجھ پر تشدد کیوں کر رہا تھا۔ اس کا مقصد رقم کا حصول تھا اور رقم نہ ملنے پر اس نے مجھے غصے میں آ کر طلاق دے دی تھی مگر اب ان باتوں کو سوچنے کا کوئی فائدہ نہیں تھا مجھے اچھے وقت کا انتظار تھا پھر اس ماحول سے نکل جاتا تھا۔ شکورن خالہ کو گئے دو دن ہی ہوئے تھے کہ اسلم نے مجھ سے رقم کا مطالبہ کیا۔

"کس ناتے سے رقم مانگ رہے ہو؟" میں نے غصے سے کہا۔

"تم میری بیوی ہو اس لیے کہہ رہا تھا کہ جائیداد میں سے حصہ مانگ لو۔"

"تم مجھے طلاق دے چکے ہو۔"

"وہ میں نے غصے میں دی تھی۔" اسلم نے کہا۔

"پیار میں کون طلاق دیتا ہے، سبھی غصے میں طلاق دیتے ہیں۔" میں نے کہا۔

"زیادہ بکواس نہیں کرو تمہارے پاس طلاق کا ثبوت ہے؟"

"طلاق دے کر بھی ثبوت مانگ رہے ہو۔"

"ہاں جس طرح نکاح کے لیے دو گواہوں کی گواہی لی جاتی ہے اسی طرح طلاق ثابت کرنے کے لیے ان گواہوں کی ضرورت ہوتی ہے جن کے سامنے طلاق دی گئی ہوتی ہے۔ اس لیے سمجھداری کا تقاضا ہے کہ جیسا میں کہوں ویسا ہی کرو اسی میں تمہاری بھلائی ہے سوچو تمہیں کون قبول کرے گا میکے جانے پر تمہیں دھکے پڑ جائیں گے رشتہ داروں میں کس منہ سے جاؤ گی۔ میں تمہارے بھلے کے لیے کہہ رہا ہوں میں صرف تمہاری وجہ سے اس گھر میں پڑا ہوں ورنہ میں کب کا چلا جاتا۔ ابھی کل ہی امی جان ملی تھیں اور کہہ رہی تھیں کہ بیٹا بانو کو چھوڑ کر آ جاؤ تمہارے ابو تمہیں معاف کرنے کو تیار ہیں۔" اسلم نے مسکراتے ہوئے میری طرف دیکھا۔

"جھوٹ جھوٹ بولتے کیا تمہیں شرم نہیں آتا ہے تم نے جوا سے باپ کو کاروبار میں نقصان پہنچا کر لوگوں کا مقروض کیا ہے اس کے بعد وہ کسی صورت تمہیں اپنے ساتھ رکھنے کو تیار نہیں ہیں۔"

"یہ باتیں تمہیں کس نے بتائی ہیں؟" وہ سانپ کی طرح پھنکارا۔

"مجھے تو یہ بھی معلوم ہے کہ تم کسی دفتر میں نوکری نہیں کرتے بلکہ چوری چکاری کی وارداتوں میں ملوث ہو اور اس لیے تمہاری ناجائز کمائی جوئے اور شراب نوشی میں ضائع ہوتی ہے۔" میں نے کہا۔

میری بات پر وہ بھڑک اٹھا اور مار پیٹ شروع کر دی جب وہ مار پیٹ کرتے تھک گیا تو ایک بار پھر تین دفعہ طلاق کا لفظ ادا کر کے چلا گیا۔

وہ مجھے پہلے ہی طلاق دے چکا تھا اس لیے میری صحت پر کوئی اثر نہیں پڑا۔ دن پھر یوں ہی گزرنے لگے تھے اپنا راز کھل جانے پر اسلم نے خاموشی اختیار کر لی تھی کئی دن گزر جانے پر ایک روز وہ غصے میں بھرا ہوا گھر میں داخل ہوا۔

"بانو مجھے کچھ رقم چاہیے۔"

"کیوں؟" میں نے پوچھا۔

"میرا ندیم کالے سے جھگڑا ہو گیا ہے وہ مجھ سے ادھار کی رقم مانگ رہا ہے اگر میں نے رقم نہ دی تو وہ مجھے پولیس کے حوالے کر دے گا اس کے بہت لمبے ہاتھ ہیں۔" اسلم نے کہا۔

"میں کہاں سے رقم لاؤں؟"

"تم کیسی بیوی ہو بیویاں روزانہ کے خرچ سے رقم بچا بچا کر مشکل وقت میں اپنے شوہروں کو دے دیتی ہیں۔"

"مجھے تم دیتے کیا ہو جو میں تمہیں بچا کر دوں۔" میں نے کہا۔

"دیکھو بانو! میرے پاس بحث کرنے کے لیے اتنا وقت نہیں ہے تم مجھے شرافت سے دس ہزار روپے دے دو۔" اسلم غصے سے بولا۔

"میرے پاس پھوٹی کوڑی نہیں ہے کہاں سے اتنی رقم تمہیں لا کر دوں۔" میں نے زور سے کہا۔

"زیادہ شور مت مچا جیسا میں کہہ رہا ہوں ویسا کر ورنہ میں تیرا حشر نشر کر کے رکھ دوں گا۔"

"کر دے حشر نشر میں تجھے ایک پھوٹی کوڑی بھی نہیں دوں گی۔" مجھے بھی غصہ آ گیا تھا۔

میرے مسلسل انکار پر وہ شور شرابہ کرنے لگا شور اونچا ہونے پر محلے والے بھی جمع ہو گئے تھے اس نے مجھ پر ہاتھ اٹھایا محلے کی عورتیں اندر آ گئیں اور انہوں نے مجھے پٹنے سے بچا لیا۔ جب اسلم کا بس نہیں چلا تو وہ ایک بار پھر مجھے طلاق دیتا ہوا چلتا بنا۔ وہ سخت غصے میں تھا اس لیے اس سے بہت بڑی غلطی ہو گئی تھی اس بار محلے کے لوگوں کے سامنے طلاق دی تھی اس لیے وہاں موجود سب لوگ

گواہ بن گئے تھے۔ دادی حلیمہ اس محلے کی بزرگ خاتون تھیں وہ مجھے کمرے کے اندر لے گئیں اور وہاں جمع ہونے والی خواتین اور مردوں کو وہاں سے چلے جانے کو کہہ دیا۔ دادی حلیمہ کے جب ہمدردی کے دو بول میں نے سنے تو میں جیسے پھٹ پڑی اور الف سے ی تک مجھ پر گزرنے والے تمام واقعات سنا دیے۔

"بیٹی تم فکر نہ کرو میں تمہارے والدین سے ملاقات کروں گی اور انہیں قائل کروں گی کہ نادان بچی سے کوئی غلطی سرزد ہو جائے تو اسے یوں معاشرے کے رحم و کرم پر نہیں چھوڑا جاتا۔"

دادی حلیمہ مجھے دلاسہ دے کر چلی گئیں۔ اسلم گھر سے زیادہ دور نہیں گیا تھا' لوگوں کے منتشر ہو جانے پر وہ غصے سے بھرا واپس گھر آ گیا اس کے ساتھ اس کا دوست نذیر بھی تھا۔ نذیر نے مجھے پکڑ لیا اور اسلم نے استرے سے میرے سر کے بال کاٹنا شروع کر دیے' میں نے زور زور سے شور مچانا شروع کر دیا۔ بال کاٹ کر اس کا ارادہ میری ناک بھی کاٹنے کا تھا مگر شور پر اہل محلہ آ گئے۔ لوگوں کی بڑی تعداد دیکھ کر نذیر اور اسلم کے ہاتھ پاؤں پھول گئے اور وہ بھاگ گئے۔ دادی حلیمہ کو بھی اس واقعے کی اطلاع مل گئی تھی وہ مجھے اور میرے بچوں کو گھر لے آئیں۔ دادی حلیمہ نے موبائل پر میرے گھر رابطہ کیا اور ساری صورت حال سے امی جان کو آگاہ کیا' ابو کاروبار کے سلسلے میں اسلام آباد گئے ہوئے تھے امی جان نے جب انہیں ساری تفصیل بتائی وہ رو پڑے اور بولے۔

"یہ سب ہماری بے پروائی کا نتیجہ ہے' ہماری بچی نے پسند کی شادی کر لی تھی لیکن یہ ہمارا فرض بنتا ہے کہ آس پڑوس والوں سے اس کے بارے میں معلومات رکھتے۔ اس پر اسلم نے جو ظلم کے پہاڑ توڑے ہیں وہ نہ ٹوٹتے' تم لوگ فوری طور پر جاؤ اور بانو کو گھر لے آؤ' میں اسلام آباد سے آ کر اسلم سے میری پھول جیسی بچی پر جو اس نے ظلم و ستم کیے ہیں' ان کا ایک ایک کر کے اس سے حساب لوں گا۔"

ابو کے کہنے پر میرے بھائی رستم اور سلمیٰ آئے اور مجھے سینے سے لگا کر تسلی دی' اسلم کے ظلم و ستم کے خلاف تھانے میں رپورٹ بھی درج کرائی' پولیس نے اسلم کو پکڑ کر سول کورٹ میں پیش کر دیا ہے۔"

"خلیل جبار! تم یہاں ہو ہم تمہیں مختلف کورٹوں میں دیکھتے پھر رہے ہیں۔" نعیم قریشی نے اپنی کیپ درست کرتے ہوئے کہا۔ ان کے ساتھ سینئر رپورٹر ایس ایم رضوی بھی موجود تھے وہ مجھے ایسے دیکھ رہے تھے کہ جیسے میری چوری پکڑی گئی ہو۔

"تمہارے پاس بہت خبریں ہیں' مجھے پتا چل گیا ہے۔" ایس ایم رضوی نے کہا۔

"فی الحال میرے پاس بھی ایک خبر ہے اور تمہارے شام کے اخبار کے لیے بڑی زبردست خبر ہے۔" میں نے کہا۔

"تم کہہ رہے ہو تو مجھے ماننا پڑے گا۔" ایس ایم رضوی نے خوش ہوتے ہوئے کہا۔

"میرا خیال ہے اب کچھ بتانے کی ضرورت نہیں' تمہارا سارا موقف میں نے سن لیا ہے' یقیناً عدالت میں بیان قلم بند کرا کے اپنے والدین کے گھر ہی جاؤ گی۔"

"جی ہاں۔" بانو نے کہا۔

"تمہاری خبر سے پسند کی شادی کرنے والی لڑکیوں کو ایک سبق ملے گا کہ خودسری اور ضد کی کتنی بڑی سزا بعد میں بھگتنا پڑتی ہے۔" میں نے نوٹ بک بند کرتے ہوئے کہا۔

ایس ایم رضوی کے چہرے پر مسکراہٹ بتا رہی تھی کہ یہ خبر مل جانے پر وہ بہت خوش ہے۔



پرچھائیں

وقار الرحمن

انسان چاہے اپنے آپ سے جتنا بھی لڑے، خود کو کتنا بھی تبدیل کرلے لیکن وہ اللہ تعالیٰ کی ودیعت کردہ فطرت اور فطری تقاضوں کو نہ تبدیل کرسکتا ہے نہ جھٹلا سکتا ہے، محبت میں شکست خوردہ ایک مصور کا احوال

آٹھویں جماعت میں ہی اس کے ہاتھوں کی بنائی ہوئی تصویریں اسکول کے اسٹاف روم کی زینت بن گئی تھیں یہ تصاویر پنسل ورک کا شاہکار تھیں۔ جن پر وہ انعام کا حق دار بھی ٹھہرا تھا۔ لیکن جب وہ نویں جماعت میں پہنچا اور اس نے اختیاری مضمون میں عربی کا انتخاب کیا تو ڈرائنگ کے استاد نے اس کو اپنے کمرے میں بلا لیا اور پوچھا کہ یہ کیا طفلانہ حرکت ہے؟ ایک خوب صورت تصویریں بنانے والے طالب علم نے عربی کا مضمون کیسے منتخب کرلیا جبکہ اس کا ذہن ڈرائنگ کی طرف مائل تھا۔

کمال نے جب اپنی صفائی پیش کرتے ہوئے انہیں بتایا کہ یہ رائے میرے بڑے بھائی صاحب کی ہے تو وہ یہ بات سن کر بہت برہم ہوئے۔ پھر غصیلے لہجے میں ہی مخاطب ہو کر صرف اتنا کہا۔

"تم لوگ ترقی نہیں کرسکتے۔"

یہ جملہ سن کر وہ ندامت سے سر جھکائے ان کے سامنے دیر تک کھڑا رہا تھا۔ بڑے بھائی کے نزدیک ایک ہی بات تھی کہ اس کا چھوٹا بھائی یہ شعبہ اپنائے گا اور اسلامی تعلیمات کے پیش نظر انہیں یہ بات بالکل بھی پسند نہیں تھی۔ اس لیے حتماً وہ اپنی پسند کا مضمون منتخب نہ کرسکا تھا۔ یوں اس کی مصورانہ صلاحیتیں پابند سلاسل ہوگئیں۔

میٹرک پاس کرنے کے بعد اس نے کالج میں داخلہ تو لے لیا تھا لیکن اس کا ذہن ہر وقت آرٹ کی دنیا میں کھویا رہتا۔ وہ خیالوں میں آڑھی ترچھی لکیریں کھینچتا رہتا اور ان ہی میں مگن رہتا۔ کالج کے دنوں میں اس کے ایک پاسٹ دوست نے اس کا ہاتھ دیکھ کر حیرت سے کہا تھا۔

"یار، تمہارے اندر تو ایک بہت بڑا آرٹسٹ چھپا ہوا ہے تم ایک نظر کسی کو دیکھ لینے کے بعد آنکھیں بند کرکے اس کی تصویر بنا سکتے ہو۔" یہ بات وہ خود بھی جانتا تھا کہ یہ صلاحیت اس کے اندر تاحال موجود ہے۔

مگر اب وہ سوچتا کہ وہ خوب صورت رنگوں سے نہیں کھیل سکے گا۔ جو اس کے گرد بکھرے ہوئے ہیں۔ وہ کبھی کوئی شاہکار تخلیق نہیں کر پائے گا پھر وہ اداس کیفیت میں ان رنگوں کو فضا میں تحلیل ہوتے ہوئے دیکھتا۔

لیکن جب کبھی یہ خواہش اس کے نہاں خانے سے سر اٹھاتی وہ اپنے گھر کے در و دیوار، مدہم رنگوں کے امتزاج سے سجا کر تسکین حاصل کرلیا کرتا۔

تعلیم سے اس کا دل اچاٹ ہوتا جا رہا تھا۔ وہ خوب صورت چہروں کا متلاشی رہنے لگا۔ اب وہ ہمہ وقت اپنے ذہن کے کینوس پر کسی نہ کسی چہرے کو اتارتا رہتا۔ پھر ایک روز اس کی نظر اس کی

فرسٹ کزن پر جا ٹھہری۔ روحی کو اس نے پہلی ہی نظر میں پسند کرلیا تھا۔ اس کے چہرے کے خطوط اس کے دل میں اتر گئے تھے۔ وہ اس کے بارے میں سوچنے لگا۔ حالانکہ ابھی اس کی تعلیم بھی ادھوری تھی۔ وہ اس وقت سال دوئم میں تھا اور روحی سال اول میں۔

لیکن وہ سوچا کرتا اگر شادی کروں گا تو صرف روحی سے۔ ورنہ نہیں اس کے سوا میری زندگی میں کوئی اور آنے والا نہیں۔

وہ کیا کرتا اس کی چاہت دبے پاؤں اس کی زندگی میں داخل ہو چکی تھی۔ ایک روز ڈرتے ڈرتے اس نے اپنی والدہ سے اپنی پسند کا ذکر کر دیا۔ والدہ نے خاموشی سے اس کی بات سنی پھر قدرے توقف سے بولیں۔

"دیکھو کمال، روحی مجھے بھی پسند ہے مگر کیا کروں نہ تمہارا کوئی کاروبار نہ تمہاری کوئی تعلیم۔ میں روحی کو تمہارے لیے کیسے مانگ لوں؟ پہلے تو اپنی تعلیم مکمل کرو پھر روحی کے بارے میں سوچنا۔" انہوں نے شفقت سے سمجھاتے ہوئے کہا۔ لیکن اس کا دل اچاٹ ہو چکا تھا تعلیم کی طرف راغب نہ ہو سکا۔

بڑے بھائی کو جب اس صورت حال کا علم ہوا انہوں نے اسے اپنے پاس بلا لیا۔ اس طرح وہ ان کے ساتھ کاروبار میں مصروف ہو گیا۔ روحی نے اپنی تعلیم جاری رکھی اس نے گریجویشن کرلی تھی۔ یوں تعلیم میں وہ کمال سے سبقت لے گئی تھی۔

والدہ کی زبانی جب بھابی کو اس کی خاموش محبت کا علم ہوا تو وہ بہت حیران ہوئیں ایک دن انہوں نے کمال سے کہا کہ "تم جس کے دیوانے بنے پھرتے ہو اسے تو تمہاری چاہت کی خبر بھی نہیں پھر یہ کیسی محبت ہے؟" بھابی کے سوال پر اس نے چپ سادھ لی تھی۔

وہ روحی سے اپنی چاہت کا اظہار نہیں کر پایا تھا۔ کمال کی کاروبار میں بڑھتی ہوئی دلچسپی پر اس کے گھر والے بہت خوش تھے۔ پھر ایک دن کمال کی خواہش کے پیش نظر اس کے والدین، بھائی اور بھابی بڑے اہتمام سے روحی کے ہاں پہنچ گئے۔ لیکن روحی کے والدین نے بغیر کسی تمہید کے صاف انکار کر دیا کہ لڑکے کی تعلیم بہت کم ہے جبکہ ہماری بیٹی گریجویٹ ہے اور وہ ابھی اور تعلیم حاصل کرے گی۔ ہمیں یہ بے جوڑ رشتہ پسند نہیں۔

یوں کمال کو چاہت میں ناکامی کا سامنا کرنا پڑا۔ اس انکار پر کمال ہی نہیں تمام گھر والے بھی بہت افسردہ تھے۔

اس موقع پر والدہ اسے تسلی دیتے ہوئے کہنے لگیں۔

"بیٹا کمال، کوئی فکر نہ کرو میں تمہارے لیے اس سے بھی کہیں خوب صورت لڑکی بیاہ کر لاؤں گی جسے دیکھ کر تم روحی کو بھول جاؤ گے۔" لیکن اس روز کمال نے اپنی والدہ سے صاف الفاظ میں کہہ دیا تھا کہ میں اب شادی نہیں کروں گا۔ والدہ وقت کی نزاکت کو سمجھتے ہوئے اس کی بات پر خاموش ہو گئیں تھیں کہ انہیں اس وقت ایسا ہی کرنا چاہیے تھا۔ جب سے اسے محبت میں ناکامی کا سامنا ہوا تھا وہ بجھا بجھا سا رہنے لگا تھا۔ کسی کام میں اس کا دل نہیں لگتا تھا۔ ہر وقت لیے دیے رہتا۔

کوئی اس سے بات کرتا تو وہ اسے خاطر میں نہ لاتا۔ اس کا جی یہی چاہتا کہ کوئی اس سے بات نہ کرے اس کو اس کے حال پر چھوڑ دے۔ بڑے بھائی چھوٹے بھائی کی پریشانی کو سمجھ رہے تھے۔ وہ کس کرب سے گزر رہا ہے انہوں نے اس کی ذہنی

کیفیت کو جان لیا تھا وہ اس کیفیت سے ناآشنا نہیں تھے۔ وہ سوچ رہے تھے کہ چھوٹے بھائی کو اس بھنور سے کیسے نکالے کہ کسی طور پر سنبھل جائے۔ انہوں نے فیصلہ کیا کہ وہ اسے کسی دوسرے شہر بھجوا دیتے ہیں۔ چنانچہ انہوں نے اپنے کاروبار کو وسعت دیتے ہوئے ایک برانچ رحیم یار خان میں کھول دی اور اسے اس کا انچارج بنا دیا۔

کمال کو یہ چھوٹا سا صاف ستھرا شہر آرٹسٹک نظر سے بہت پسند آیا پھر اس کو یہاں قیام کے اوائل دنوں ہی میں چند مخلص دوست ایسے مل گئے جن سے مل کر اس نے محسوس کیا کہ یہ پردیس نہیں اپنوں کا دیس ہے۔

اس شہر کی خوب صورت فضا نے بھی اس کا ساتھ دیا وہ دل لگا کر محنت کرنے لگا۔ کاروبار میں کامیابی ملنے سے اس کے مزاج میں خوش گوار تبدیلی آئی پھر مخلص احباب کا ساتھ بھی تسکین کا باعث بنا۔

بڑے بھائی خوش تھے کہ چھوٹے بھائی نے احسن طریقے سے کاروبار سنبھال لیا ہے ایک روز بڑے بھائی کا فون آیا۔ خیریت دریافت کرنے کے بعد انہوں نے اسے شادی کا مژدہ سنایا کہ والدہ نے تمہارے لیے ایک لڑکی پسند کرلی ہے اب ہم تمہاری بہت جلد شادی کردیں گے لیکن وہ روحی کو ابھی تک بھلا نہیں پایا تھا اس لیے اس نے بڑے بھائی کا شکریہ ادا کرتے ہوئے وہی جملہ دہرایا۔

"میں شادی نہیں کروں گا میرا شادی کرنے کا کوئی ارادہ نہیں۔ میرے لیے کوئی لڑکی پسند نہ کریں۔"

بڑے بھائی کمال کے انکار پر ناراض تو ہوئے مگر خاموش رہے کہ وہ اس کے سامنے ناراضی کا اظہار نہیں کرنا چاہتے تھے۔

ترکی بہ ترکی

جاحظ نے اپنی سوانح حیات میں لکھا ہے۔

"میں ایک بار بصرہ کی ایک مشہور شاہراہ سے گزر رہا تھا۔ میں نے جوتوں کی ایک شاندار دوکان دیکھی۔ میں اس کے اندر چلا گیا اور ایک خوبصورت مخملی جوتا پسند کیا اور صاحب دوکان سے اس کی قیمت دریافت کی۔ جواب ملا "دس درہم" یہ بہت زیادہ تھے۔ اس لیے مجھے غصہ آگیا میں نے کہا "اگر یہ بنی اسرائیل نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے کہنے پر جو گائے قربان کی تھی اس کی کھال کا بھی بنا ہوا ہوتا تب بھی میں اس کے لیے ایک درہم سے زیادہ ادا نہ کرتا۔" دوکان دار نے یہ سنا اور جیسے کچھ سوچتے سوچتے چونک اٹھا میری طرف نظریں اٹھائیں اور کہا "اگر تمہارے پاس اصحاب کہف والے درہم ہوتے تب بھی میں تمہیں یہ جوتا ایک درہم میں نہ دیتا۔"

(مرسلہ: حق نواز ..... کہا)

کاروباری امور نمٹانے کے لیے وہ ان سے رابطے میں رہتا۔ دوسرے تیسرے دن ان سے فون پر بات ہو جاتی تھی۔ اب انہوں نے بھی اس کی شادی کے مسئلے پر خاموشی اختیار کرلی تھی۔ پھر بھی وہ کبھی کبھار ڈھکے چھپے انداز میں اس کی رائے معلوم کرلیا کرتے تھے۔ گھر والوں سے ملاقات کے لیے چار چھ ماہ بعد اس کا لاہور جانا رہتا تھا۔ گیارہ گھنٹے کی طویل مسافت اسے تھکا دیتی لیکن والدین اور بہن بھائیوں سے مل کر اس کی تھکن جاتی رہتی۔

ایک بار کاروباری مصروفیت کی وجہ سے لاہور جانے میں تاخیر ہوئی تو والدہ کا فون آیا کہنے لگیں۔

"دیکھو بیٹا میں تمہیں شادی پر مجبور نہیں کرتی لیکن ملنے میں اتنے فاصلے نہ بڑھاؤ تم نہیں جانتے میں تمہارے بغیر کیسے جی رہی ہوں۔ میری ممتا کا ہی کچھ خیال کرو۔"

اس بار جب وہ لاہور گیا تو والدہ کے سامنے اس کا جی چاہا کہ وہ اس حصار کو توڑ دے اسے کرچی کرچی کر دے جو اس نے خود کے گرد کھینچ رکھا تھا۔ لیکن وہ دوسرے لمحے سوچتا کہ اگر اس نے ایسا کیا تو روحی کیا کہے گی۔ وہ کہے گی۔

''دیکھو نی تمہاری محبت، تم تو کہا کرتے تھے کہ میں تمہارے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔ کہاں گئے وہ تمہارے وعدے کہاں گئیں وہ تمہاری قسمیں؟''

لیکن وہ سوچتا کہ اس نے تو ان رٹی جملوں میں سے ایک لفظ بھی اس سے نہیں کہا تھا۔ پھر بھلا وہ یہ شکوہ کیسے کرے گی۔ جبکہ بہت پہلے اس کی والدہ نے اسے بتا دیا تھا کہ روحی کی شادی اس کے رحیم یار خان جانے کے دو برس بعد ہی ہو گئی تھی۔ پھر یہ باتیں اس کے ذہن میں کیسے اتر رہی تھیں۔ اس کا جواب اس کے پاس نہ تھا۔ اس کے اندر تنہائی کا جنگل پھیلنے لگتا۔ وہ اس میں بھٹکنے لگتا۔

وقت کا دھارا بہتا رہا۔ دن مہینوں، اور مہینے برسوں میں ڈھلتے رہے یوں بارہ برس بیت گئے۔ اب اس کے بالوں میں چاندی اتر آئی تھی۔ لیکن اس کے دل سے روحی کی محبت کم نہ ہو پائی تھی۔

اس کی رہائش اس کے دفتر کے قریب ہی تھی جو دو کمروں پر مشتمل تھی۔ جس میں وہ عرصہ بارہ سال سے مقیم تھا۔

کام سے فراغت کے بعد جب وہ اپنے گھر کا رخ اختیار کرتا شام ہونے کو ہوتی۔ گھر کے قریب ہونے پر پڑوس کے بچے جو اس سے بہت مانوس ہو چکے تھے اس کے گرد جمع ہو جاتے انہیں یہ بات معلوم تھی کہ انکل کمال کی جیب میں ٹافی یا چاکلیٹ ضرور ہوتی ہیں اس لیے انکل ٹافی، انکل چاکلیٹ کی آوازیں آنے لگتیں۔ وہ ان سے خوش دلی سے ملتا، پیار کرتا پھر ان کی ہتھیلی پر ٹافی یا چاکلیٹ رکھ دیتا۔ بچے انکل تھینک یو کہتے ہوئے اپنے اپنے گھروں کو چل دیتے اور وہ اپنے فلیٹ کی طرف بڑھ جاتا۔

آج نہ جانے اسے کیا ہوا تھا اس کی آنکھوں کے کنارے بھیگنے لگے تھے۔ آج اس نے ایک ایسی آواز سنی تھی جو وہ اس سے پہلے کبھی نہ سن پایا تھا۔ اس کے کانوں میں ان معصوم بچوں کی آوازیں رچی بسی تھیں لیکن آج وہ یہ آواز سن کر اپنے گرد حیرت سے دیکھنے لگا۔ دائیں، بائیں، سامنے پھر پلٹ کر دیکھا لیکن وہاں کوئی نہ تھا۔

''بابا، میری چاکلیٹ۔''

جب اس نے اس آواز کو دوسری بار سنا تو ٹھٹک گیا۔ وہ اپنے وجود کا بوجھ نہ سہار سکا۔ ایک دیوار کا سہارا لے کر آہستگی سے نیچے بیٹھ گیا۔ اسے اسکول کا زمانہ یاد آنے لگا جب وہ بچوں کی تصاویر بنایا کرتا تھا۔ ہنستے مسکراتے بچوں کی تصاویر وہ ایک ایک کر کے اس کے سامنے آنے لگیں۔ معاً ان میں سے ایک تصویر متحرک ہوئی جو اسے بہت پسند تھی۔

ایک خوب صورت بچہ مسکراتے ہوئے ایک شخص کی طرف ہاتھ بڑھا کر ملتجی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہہ رہا تھا

''بابا، میری چاکلیٹ۔'' اس لمحے اس بچے کی معصوم مسکان اس کی روح میں اتر گئی تھی۔

عشق کی پرچھائیں اس کے سر سے سرکنے لگی۔ اس کے اندر ''بابا'' کہلانے کی فطری خواہش موجزن ہوئی۔

وہ اپنی بے ثمر زندگی میں ''بابا'' کہلانے کا فیصلہ کر چکا تھا۔

ٹٹ

اندھی عقیدتیں

محمد حنیف قادری

حضرت داتا گنج بخش ہجویریؒ فرماتے ہیں اللہ کا ولی وہ ہوتا ہے جسے دیکھتے ہی بے ساختہ اللہ تعالیٰ یاد آجائے' مگر آج ہم اسلامی تعلیمات سے دوری کے باعث پیر ساعد ہوش شیطان کو اس کی ظاہری حالت دیکھ کر اندھی عقیدت کا شکار ہو جاتے ہیں اور پھر اس کے ہاتھوں کٹھ پتلی بن کر اپنے ایمان سے بھی محروم ہو جاتے ہیں۔

ایک نوجوان کو پیش آنے والے پراسرار واقعات کی روداد

سطر سطر تجسس' لفظ لفظ ہنگامہ لیے ایک دلچسپ کہانی۔

سیلابی ریلا مجھے دھکیلے جا رہا تھا۔ پانی میں گرتے ہی میں نے اپنی بچی کھچی طاقت استعمال کرتے ہوئے تیرنا شروع کر دیا مگر پانی کا ریلا اتنا منہ زور تھا کہ مجھے اندر سے ہلائے دے رہا تھا۔ یہ بات نہیں تھی کہ مجھے تیرنا نہیں آتا تھا۔ مجھے تیرنے کا وسیع تجربہ تھا مگر آج جن حالات میں مجھے پانی میں چھلانگ لگانا پڑی تھی ایسے حالات میں میں نے پہلے کبھی تیراکی نہیں کی تھی۔ پہلے دریا بھی پرسکون ہوتا تھا اور میں بھی آج کی طرح تھکا ہوا نہیں ہوتا تھا۔ پہلے کی نسبت آج حالات قطعی مختلف تھے۔ آج مجھے تیرنا نہیں زندگی کی جنگ لڑنا تھی کیونکہ میرے یقین کے مطابق میری تمام سعی لاحاصل تھی اور میں آج جو بھی جتن کر لیتا موت میرا مقدر تھی مگر کبھی کبھی اللہ معجزے بھی کر دیتا ہے اور شاید آج بھی کوئی معجزہ رونما ہو جائے اور میں بچ جاؤں۔ بس اسی آس پر میں تیرے جا رہا تھا ورنہ میرا بچنا ناممکن تھا۔ بہرحال بنا لڑے میں یہ جنگ قطعاً ہارنا نہیں چاہتا تھا۔ پانی کے تھپیڑے میرے وجود کو زیروزبر کیے دے رہے تھے اور میں کئی دفعہ پانی میں ڈبکیاں بھی کھا چکا تھا مگر ابھی تک میرے حوصلے جوان تھے اور میں پانی میں کم از کم آدھ گھنٹا تک اور تیر سکتا تھا۔ اس کے بعد کیا ہوگا؟ مجھے نہیں معلوم میں نے اپنے آپ کو پانی کی بے رحم لہروں کے حوالے کر دیا تھا۔ میں فقط اتنی کوشش کر رہا تھا کہ ڈوبنے نہ پاؤں اور کسی نہ کسی طریقے سے پانی کے اوپر رہ کر سانس کا رابطہ زیادہ سے زیادہ دیر تک بحال رکھ سکوں۔ سانس پر یہ کنٹرول بھی میری مسلسل یوگا کی مشقوں کی عادت کی وجہ ہی سے ممکن ہو سکا تھا' ورنہ عام آدمی تو شاید ایسی حالت میں پانی میں گرتے ہی گھبراہٹ کا شکار ہو کر کب کا پانی کو اپنے پھیپھڑوں میں بھر کر اس جہان فانی سے کوچ کر چکا ہوتا۔

پانی میں ڈبکیاں کھاتے' کبھی پانی کے اوپر اور کبھی پانی کے نیچے جاتے اور بپھرے ہوئے پانی کے تھپیڑے کھاتے مجھے ابھی پندرہ بیس منٹ ہی ہوئے ہوں گے کہ مجھے زندگی بچانے کی ایک موہوم سی کرن نظر آئی۔ ہوا یوں کہ جب میں اس دریا کے بپھرے ہوئے پانی میں گرنے پر مجبور ہوا تھا تو بادلوں کی گھن گرج کے ساتھ انتہائی تیز بارش ہو رہی تھی اور بجلی بھی چمک رہی تھی۔ اچانک بجلی چمکی تو مجھے اپنے دائیں طرف کچھ جھاڑ جھنکاڑ اور خشکی سی نظر آئی۔ شاید یہ دریا کے نزدیک کوئی اونچی جگہ تھی یا پھر دریا کے درمیان میں ہی کوئی ٹیلہ نما جگہ تھی۔ ڈوبتے کو تنکے کا سہارا کے مصداق میں نے اس طرف تیرنا شروع کیا۔ شاید یہ دریا کے درمیان ہی کوئی ٹیلہ نما جگہ تھی۔ بجلی دوبارہ چمکی تو میں نے ذرا غور

نے اس ٹیلے کی جانب دیکھا۔ اس کے دونوں اطراف تاحد نگاہ پانی ہی پانی تھا۔ بہرحال یہ جو بھی تھا میرے لیے زندگی بچانے کا بہترین وسیلہ تھا۔ میں اس طرف بڑھنے کی سرتوڑ کوشش کررہا تھا۔ اندھیرے میں یہ ٹیلہ مجھے ایک بہت بڑے ہیولے کی مانند نظر آرہا تھا۔

اچانک ہی میری نظر اس جانب اٹھی جہاں کچھ ہی دور ایک درخت کی لمبی شاخیں پانی میں جھول رہی تھیں مگر پانی جس رفتار سے مجھے کھینچے جارہا تھا مجھے امید نہیں تھی کہ میں جلد اس تک پہنچ پاؤں گا۔ اچانک ہی بجلی ایک بار پھر سے چمکی اور مجھے واضح طور پر سب کچھ دکھائی دے گیا مگر پانی کے ایک زبردست تھپیڑے نے مجھے پانی میں نیچے کہیں دھکیل دیا۔ میرے دل میں مایوسیاں سی اترتی چلی گئیں مگر پانی کے دوسرے تھپیڑے نے مجھے نہال کرکے رکھ دیا۔ نیچے ہی نیچے پانی کا زبردست ریلا شاید اس اونچی جگہ کی سرحد سے ٹکرایا اور پھر پانی میں ایک بھونچال سا پیدا ہوگیا اور اسی بھونچال نے مجھے عین اس درخت کی شاخوں سے ٹکرادیا۔ میں نے نیچے لٹکی ہوئی ایک مضبوط شاخ کو دونوں ہاتھوں سے پوری طاقت سے تھام لیا۔ جونہی میں نے اس شاخ کو تھاما تو سکون کی ایک لہر میرے سارے وجود میں پھیلتی چلی گئی مگر دوسرے ہی لمحے جب میں نے اس شاخ پر بوجھ ڈالتے ہوئے درخت کے اوپر چڑھنا چاہا تو میں شاخ سمیت پھر سے دریا میں آرہا۔ پھر کچھ دیر تو مجھے یاد ہی نہیں رہا کہ میرے ساتھ ہوا کیا ہے۔ جلد ہی بے دھیانی میں میرے پھیپھڑوں میں بے اختیاری سے پانی کے کچھ قطرے گرے۔ مجھے ایک زبردست اچھو لگا مگر اس سے پہلے کہ اچھو کے ذریعے وافر مقدار میں پانی میرے پھیپھڑوں میں داخل ہوجاتا پانی کی گہرائیوں میں جاتے ہوئے میرے وجود کو ایک زبردست جھٹکا لگا اور مجھے نہیں پتہ کہ میں کب زمین کے کنارے پیوست ایک سرکنڈے کے اوپر جاگرا۔ یوں کہ جیسے پانی نے مجھے اچھال دیا ہو۔ پانی میرے وجود کو سرکنڈے کی طرف اچھالتے ہوئے اپنی منزل کی جانب روانہ ہوگیا اور سچ تو یہ ہے کہ یہ کسی معجزے سے کم نہیں تھا۔

* * *

کچھ دیر تو مجھے اپنے زندہ سلامت بچ جانے پر یقین ہی نہیں آیا مگر کچھ ہی دیر میں جب میری پھولی ہوئی سانسیں ہموار ہوگئیں اور اچھو کی کڑواہٹ اور زبردست جھٹکوں سے مجھے نجات ملی تو میں نے اپنے اردگرد تسلی سے دیکھا۔ جانے یہ کون سی جگہ تھی جہاں میرے وجود کو سیلاب کی بے رحم موجوں کے ریلے نے لا پھینکا تھا۔ میں اس علاقے سے قطعاً واقف نہیں تھا کیونکہ میں گزشتہ شب ہی پولیس اور دشمنوں سے چھپتا چھپاتا اس گاؤں تک پہنچا تھا جہاں سے مجھے پولیس والوں نے کھدیڑ کر دریا میں لا پھینکا تھا۔ جب پولیس میرے پیچھے لگی تھی تو میں کار میں سوار لاہور اپنے ایک دوست کے پاس جارہا تھا مگر راستے میں جانے کس نے مخبری کی کہ پولیس میرے پیچھے لگ گئی۔ پولیس سے بچنے کے لیے میں نے ایک ذیلی سڑک پر کار کو موڑا مگر بدقسمتی سے پولیس نے بھی میری کار کو مڑتے ہوئے دیکھ لیا۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ یہ کون سا علاقہ تھا اور یہاں کن حالات سے مجھے واسطہ پڑنے والا تھا۔ پولیس کے ساتھ ایک طویل آنکھ مچولی کے بعد اپنی دانست میں میں پولیس والوں کو ڈاج دینے میں کامیاب ہوگیا اور شام کے وقت میں نے ایک گاؤں سے باہر ایک ڈیرے میں کار روکی اور کار سے نیچے اتر کر ڈیرے تک پہنچا۔ درمیانی عمر کے ایک باریش بندے کو میں نے ایک جھوٹی سچی کہانی سنا کر رات رہنے کے لیے اس سے پناہ مانگی۔ تھوڑی سی پس وپیش کے بعد مجھے ڈیرے پر رہنے کی اجازت دے دی گئی۔ رات کے جانے کس پہر عجیب سی بے چینی اور گھبراہٹ سے میری آنکھ کھلی تو مجھے اپنے چار سو ایک بے نام سے خطرے کا احساس ہوا اور یہ احساس عین

وقت پر ہول۔ میں اس وقت ڈیرے کے برآمدے میں لیٹا ہوا تھا۔ میں آہستگی سے اٹھا اور حویلی کے گیٹ سے باہر نکلا۔ حویلی کے باہر اس وقت کتوں کے بھونکنے کا شور جاری تھا۔ غیر ارادی طور پر میرا رخ اس طرف ہو گیا جہاں میں نے شام کو آتے وقت اپنا اسلحہ چھپایا تھا تاکہ ڈیرے والے میرے بارے میں شکوک و شبہات کا شکار نہ ہوں۔ ڈیرے سے باہر یہ ایک سوکھی لکڑیوں کا ڈھیر تھا جہاں میں نے اپنی رائفل، پسٹل اور دس کے فالتو میگزین رکھے ہوئے تھے مگر جونہی میں وہاں پہنچا تو وہاں کچھ بھی نہیں تھا۔ میرا ماتھا ٹھنکا۔ یہ کس کا کام ہو سکتا ہے جب میں نے یہ اسلحہ چھپایا تھا تو ارد گرد کوئی بھی ذی روح موجود نہ تھا۔ میں نے حویلی کے گیٹ کے سامنے کھڑی اپنی کار کی طرف نظر دوڑائی تو مجھے وہاں ہیولہ سا کھڑا نظر آیا۔ ایک لمحے میں ساری باتیں مجھ پر عیاں ہو گئیں۔ یہ کام ڈیرے والوں کا تھا مگر کیوں؟

بارعش بزرگ نے میری من گھڑت کہانی پر یقین ہی نہیں کیا تھا اور شاید اس نے خود ہی پولیس کو اطلاع کر دی ہوگی۔ اتنے میں مجھے دور کہیں جیپ کے انجن کی گھر گھراہٹ سنائی دی۔ پنجاب پولیس کو میرا سراغ مل گیا تھا۔ بارعش بزرگ نے انہیں میرا حلیہ اور کار کا نمبر بھی لازمی بتا دیا ہوگا۔ میں آہستگی سے حویلی کی طرف بڑھا مگر ڈیرے کا مالک شاید مجھے دیکھ رہا تھا۔ اس نے مجھے چھت پہ کھڑے ہو کے للکارا اور پولیس کے آنے تک رکنے کے لیے کہا اور تعاون نہ کرنے کی صورت میں خطرناک نتائج کی دھمکی دی۔

"میں شام کو ہی سمجھ گیا تھا کہ تم وہ نہیں ہو جو ظاہر کر رہے ہو۔ اب بہتر یہی ہوگا کہ پولیس کو گرفتاری دے دو ورنہ میں تمہارے ساتھ کچھ بھی کر سکتا ہوں۔"

"بزرگو! میری آپ سے کوئی دشمنی نہیں بہتر یہی ہوگا کہ میرا اسلحہ واپس کر دو اور مجھے یہاں سے......" مگر ابھی الفاظ میری زبان پر ہی تھے کہ رات کے سناٹے میں فائر کی آواز گونجی اور سنسناتی آواز کے ساتھ گولی میرے سر کے بالوں کو چھوتے ہوئے گزر گئی۔ میں یکلخت نیچے گرا۔ میں نے فائر کی سمت کی طرف دیکھا تو مجھے رات کے اندھیرے میں ڈیرے کے گیٹ کے ساتھ کچھ ہیولے سے کھڑے نظر آئے لیکن کچھ ہی لمحوں میں مجھے یوں لگا کہ جیسے میرے ساتھ کوئی کھیل کھیلا جا رہا تھا۔ موت کے ہرکارے میری تاک میں لگے ہوئے تھے۔ پولیس کی جیپیں بھی حویلی کے قریب پہنچ چکی تھیں۔ اسلحے کے نام پر میرے پاس کچھ بھی نہیں تھا۔ ایسے میں وہاں سے بھاگ کر جان بچانے ہی میں میں نے عافیت جانی اور بنا کچھ سوچے سمجھے وہاں سے بھاگ نکلا مگر کچھ ہی دیر میں تیز سرچ لائٹ کی روشنی میں مجھے دیکھ لیا گیا۔ تڑتڑ کرتی گولیاں میرے آس پاس سے گزر گئیں اور اسی دوران کچھ ہی دیر میں آسمان بادلوں سے ڈھک گیا اور تیز موسلا دھار بارش کا آغاز ہو گیا۔ میرے پیچھے بھاگنے والے آسمان سے برسنے والی تیز بارش کی وجہ سے کچھ دیر کے لیے کشمکش کا شکار ہوئے۔ اتنے میں مجھے اس جھاڑ جھنکار اور سرکنڈے کے پودوں تک پہنچنے کا موقع مل گیا جنہیں میں سرچ لائٹ کی تیز روشنی میں دیکھ چکا تھا۔

......❀❀❀......

جانے یہ کون سی جگہ تھی جہاں مجھے سیلابی ریلا دھکیل کر لے آیا تھا۔ اندھیری رات، برسات کا موسم اور ہر سو پھنکارتے ہوئے پانی کے درمیان دریا میں زمین کا پراسرار ٹکڑا۔ جیسے سمندر میں کوئی ویران جزیرہ۔ کیا میں سٹھیا گیا ہوں یا پے در پے پڑنے والی مشکلات نے میرے دماغ پر برا اثر ڈالا ہے۔ میں آہستگی سے تھکن سے چور چور وجود کے ساتھ اٹھا اور زمین کے اس پراسرار ٹکڑے کی طرف بڑھا۔ آسمان پر ابھی بادل چھائے ہوئے تھے اور بلکی پھلکی رم جھم جا ری تھی۔ کبھی کبھی ہونے والی گرج چمک کا تسلسل بھی

برقرار تھا۔ ایسے میں یکبارگی بجلی چمکی تو میں نے ایک خوفناک اور سمجھ میں نہ آنے والی جگہ پر اپنے آپ کو پایا۔ یہ ایک بہت بڑا قبرستان تھا اور میں ایک مزار کے سامنے کھڑا تھا۔ مزار کا تابوت بالکل میرے سامنے تھا اور وہاں پر ایک دیا بھی روشن تھا۔ اف خدایا یہ سب کیا ہے؟ چاروں طرف خطرناک دریا اور اس کے بیچ میں قبرستان اور یہ مزار! سچ تو یہ ہے کہ میری سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا۔ دریا کے بیچوں بیچ قبرستان بنانے کی کسے سوجھی۔ اتنا تو کوئی بھی اندھا نہیں ہوسکتا کہ وہ اپنے پیاروں کی قبر بیچ دریا کے بنا دے۔ یہاں کے لوگ پاگل ہیں یا پھر انہیں اپنے مرنے والوں سے پیار نہیں یا پھر ہوسکتا ہے کہ پہلے یہاں دریا نہ ہو اور بعد میں کسی سیلاب کے دوران یہ زمینیں دریا میں آگئی ہوں اور پھر یہ بھی تو ہوسکتا ہے کہ لوگ صاحب مزار کی عقیدت میں یہیں اپنے مردوں کو دفنانا باعث ثواب سمجھتے ہوں کیونکہ میں نے کئی جگہ پر دیکھا ہے کہ لوگ اپنے پیاروں کو کسی ولی یا درویش کے ہمسائے میں دفنانا اپنے مرنے والے کے لیے باعث رحمت سمجھتے ہیں۔ یا پھر شاید میں غلط سوچ رہا تھا۔ ابھی میں نے زمین کا یہ ٹکڑا اصل طور پر دیکھا ہی کہاں تھا۔ شاید زمین کا یہ ٹکڑا دریا کے بیچوں بیچ نہ ہو، کنارے پر ہو مگر میں نے بجلی کی گرج چمک کے دوران اچھی طرح دیکھا تھا اس ٹکڑے کے دونوں اطراف میں دور دور تک پانی انتہائی تیزی سے بہہ رہا تھا۔ ہوسکتا ہے یہ پانی اسی طرف کا ہو جو دوسری سمت دور تک پھیل گیا ہو، میں نے سوچا۔ پھر میں نے سبھی خیالات کو اپنے ذہن سے جھٹکا اور سوچا اگر مزار پر دیا روشن ہے تو کوئی نہ کوئی بندہ بھی یہاں ضرور ہوگا۔ یہی سوچ کر میں مزار کے اندر داخل ہوگیا۔ میں نے عقیدت سے فاتحہ خوانی کے لیے ہاتھ اٹھا دیے۔ یہ سب کرتے ہی میرے وجود کو ایک ناقابل بیان سکون ملا۔ تھوڑی دیر میں نے پائیں مزار ٹیک لگائی اور دل ہی دل میں ایک ورد کیا اور اپنے رب سے دعا مانگی۔

تجسس سے مجبور ہو کر میں مزار سے اٹھا اور اندھیرے میں دور دور تک دیکھنے کی کوشش کی۔ مزار سے کچھ ہی دور مجھے کچی مٹی اور گارے کا بنا ہوا ایک گھر نظر آیا۔ شاید یہاں پر متولی رہتا ہوگا اور اسی نے دیا جلایا ہوگا۔ ایک بار تو میرے جی میں آئی کہ اسے اٹھاؤں اور اپنے لیے خشک کپڑوں کا ایک جوڑا مانگوں مگر رات کے اس پہر وہ جانے میرے بارے میں کیا سوچے۔ یہی سوچتے ہوئے میں ایک بار پھر مزار میں داخل ہوگیا۔ مزار میں ایک طرف اگربتیاں جلانے کے لیے ماچس رکھی ہوئی تھی۔ میں نے وہ اٹھائی اور قبرستان میں داخل ہوگیا۔ جلد ہی مجھے کچھ خشک لکڑیاں مل گئیں۔ میں نے وہ اٹھائیں اور ایک بار پھر سے مزار کی طرف بڑھا۔ مزار کے احاطے میں ہی ایک جگہ برآمدے کے نیچے چولہا بنا ہوا تھا۔ میں نے لکڑیاں وہاں ڈالیں اور ماچس کی مدد سے آگ جلائی۔ تھوڑی ہی دیر میں آگ بھڑک اٹھی۔ میں نے آگ تاپتے ہوئے اپنی قمیص اتاری جو کہ اب کئی جگہوں سے پھٹ چکی تھی۔ قمیص اتار کر میں نے اس میں سے پانی نچوڑا اور آگ پر سکھانے لگا اتنی ہی دیر میں میری شلوار بھی کچھ سوکھ چکی تھی۔ اچانک مجھے یاد آیا کہ میرے پاس تو موبائل بھی تھا وہ کہاں چلا گیا؟ شلوار اور قمیص کی جیبیں دیکھنے کے بعد جب مجھے موبائل نہ ملا تو میں نے سوچا کہ شاید کہیں گر گیا ہوگا۔ چلو کوئی بات نہیں۔ اللہ پاک نے جان بچا دی یہی بڑی بات ہے زندہ رہے تو موبائل تو اور بھی مل جائیں گے۔

الغرض شلوار قمیص سکھانے اور آگ تاپنے کے بعد میں ہر خطرے کو بالائے طاق رکھتے ہوئے وہیں پڑ کر سو گیا۔ مجھے یہ بھی یاد نہ رہا کہ میرے پیچھے پولیس لگی ہوئی تھی اور میں اس وقت انتہائی خطرے میں تھا۔



دوپہر کے قریب میری آنکھ کھلی۔ آنکھیں ملتا ہوا میں اٹھا۔ مزار سے کچھ ہی دور کچے سے گھڑونڈے کے سامنے نلکا لگا ہوا تھا۔ میں نے سکون سے منہ ہاتھ دھویا اور دن کی روشنی میں اس جگہ کا جائزہ لینے لگا۔ سب سے پہلے میں نے اس کچے گھر کا جائزہ لیا۔ یہاں دو کمرے بنے ہوئے تھے اور کچی چار دیواری بھی موجود تھی۔ لکڑی کے مضبوط دروازے کو بند کر کے تالا لگا دیا گیا تھا۔ شاید پانی کے آنے سے پہلے یہاں مکین موجود تھے جو کہ سیلابی ریلے کے آنے کے بعد یہاں سے نکل گئے تھے۔ ایک جگہ سے دیوار پھاند کر میں گھر میں داخل ہو گیا گو کہ کسی کے گھر میں بلا اجازت داخل ہونا اچھا نہیں تھا۔ مگر اس وقت مجھے زوروں کی بھوک لگ رہی تھی اور میں یہاں کسی کھانے پینے کی چیز کی تلاش میں داخل ہوا تھا۔ ایک کمرے کو باہر سے مضبوط تالا لگا ہوا تھا اور دوسرا کمرہ بالکل خالی تھا البتہ اس میں کچھ ٹوٹی پھوٹی صفیں موجود تھیں۔ یہاں کے مکین جاتے ہوئے شاید یہاں سے سبھی کچھ لے گئے تھے۔ میں نے دوسرے کمرے کے تالے کو دیکھا مگر وہ انتہائی مضبوط تھا اور اسے کھولنے کے لیے مجھے کسی سخت چیز کی ضرورت تھی مگر گھر میں تلاش بسیار کے باوجود مجھے کوئی بھی ایسی چیز نہ ملی جس سے تالا کھولا یا توڑا جا سکے۔ ہر طرف سے مایوس ہو کر میں کچھ ہی دیر میں گھر سے اسی طرح دیوار پھاند کر باہر نکلا اور اس جگہ کا مکمل طور پر جائزہ لینے کے لیے باہر پھیلے ہوئے قبرستان کی طرف بڑھا۔ یہاں پر قبروں کے درمیان خود رو پودے، جھاڑ جھنکار اور پہاڑی کیکر کی بہتات تھی۔ چلتے چلتے میں اس طرف بڑھا جس طرف رات میں نے بجلی کی کڑک چمک کے دوران دریا دیکھا تھا۔ جلد ہی میرے اس اندیشے کی تصدیق ہو گئی۔ کچھ ہی دیر میں جب میں دوسرے کنارے تک پہنچا تو وہاں بھی تا حد نظر ٹھاٹھیں مارتا اور کالے ناگوں کی مانند پھنکارتا پانی ہی پانی نظر آیا۔ ایک دفعہ تو میں بے حد خوش ہوا کہ شکر ہے اس علاقے میں پولیس کا تو کوئی خطرہ نہیں مگر دوسرے ہی لمحے مجھے اپنی بھوک کا خیال آیا۔ یہاں پر کھانے پینے کو کچھ نہیں تھا۔

شاید یہاں سے کوئی راستہ خشکی کی طرف جاتا ہو۔ آخر یہاں پر قبرستان ہے ایک مزار ہے اور ایک کچا سا گھر بھی ہے جہاں پہ یقیناً انسان ہی رہتے تھے۔ یہی چیک کرنے کے لیے میں نے اس سارے علاقے کو دیکھنے کا فیصلہ کیا۔ ارد گرد پھیلے ہوئے وسیع قبرستان اور اس سے ملحقہ علاقے کا مکمل جائزہ لینے کے بعد میرے خطرناک اندازوں کی تصدیق ہو گئی۔ یہاں چاروں طرف پانی ہی پانی تھا ایک جگہ سے دور کہیں پانیوں سے آگے فصلیں سی نظر آ رہی تھیں مگر وہاں مجھے کوئی ذی روح نظر نہیں آیا مگر جس طرف سے پانی اس اونچی ٹیلہ نما جگہ سے ٹکرا کر گزر رہا تھا وہاں پہ بھاری تعداد میں پتھر رکھے ہوئے تھے۔ یقیناً یہ مزار اور قبرستان کو سیلاب سے محفوظ رکھنے کے لیے یہاں کے لوگوں نے ہی سب کچھ کیا ہوگا۔

مطلع بالکل صاف تھا اور ہر سو دھوپ پھیلی ہوئی تھی۔ اتنا چلنے کی وجہ سے گرمی نے میرا برا حال کر دیا۔ ایک جھاڑی کے نیچے کچھ دیر ستانے کے بعد میں تھکا ہارا ایک بار پھر سے مزار کی طرف بڑھا۔ مزار میں بالکل سکون تھا۔ نلکے پر میں نے وضو کیا اور مزار کے احاطے میں بنی چھوٹی سی مسجد میں نماز پڑھی اور خدا کے حضور سجدہ ریز ہو کر اپنے کردہ اور ناکردہ گناہوں کی معافی مانگی۔ بڑے دنوں کے بعد آج مجھے خدا کے حضور اتنی تسلی اور بے فکری سے نماز پڑھنے کا موقع ملا تھا۔ میری آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ مجھے یوں لگا کہ جیسے میرا رب مجھ سے انتہائی قریب ہے اور میری آواز سن رہا ہے۔ تو تو جانتا ہے میرے مولا کہ میں نے کبھی کسی راہ چلتی چیونٹی کو بھی دانستہ طور پر اپنے پیروں تلے نہیں روندا تو پھر میں کسی کا قتل کیسے کر سکتا ہوں۔ میرے مولا کوئی جانے یا نہ جانے

تو تو جانتا ہے کہ نہ تو میں دہشت گرد ہوں اور نہ ہی ان کا ساتھی تو پھر مجھ پر دہشت گردی کا یہ بے بنیاد مقدمہ کیوں؟ میرے مولا مجھ سے جانے انجانے میں کچھ غلطیاں یقیناً ہوئی ہیں اور میں تو ویسے بھی خطا کار ہوں مگر تو تو عطا ہے رب کریم۔ مجھے معاف کر دے مولا اور پھر جانے کب تک میری آنکھوں سے اس کی یاد میں آنسو بہتے رہے۔ من ہلکا ہوا تو میں نے نلکے پر جا کر ٹھنڈا پانی پیا اور پرسکون سا ہو کر ایک بار پھر سے مزار کے احاطے میں لیٹ گیا۔

•••

عصر کے وقت تک میرا بھوک سے برا حال ہو گیا اور میں ایک بار پھر سے پیٹ کی آگ بجھانے کی خاطر کسی شے کی تلاش میں نکلا۔ میرا رخ ایک دفعہ پھر سے اسی کچے گھروندے کی طرف ہو گیا۔ مجھے امید تھی کہ وہیں سے مجھے کھانے کو کچھ نہ کچھ مل سکتا ہے۔ بند کمرے کے تالے کو توڑنے کے لیے میں نے نلکے کے قریب پڑے ہوئے تین چار پتھر بھی اٹھا لیے۔ دیوار پھاند کر میں گھر میں اترا ایک بار پھر سے باریک بینی اور تسلی سے وہاں کی تلاشی کا عمل شروع کیا۔ مگر پہلے کی طرح مجھے مایوسی ہوئی۔ آخر کار میں نے تالا توڑنے کا فیصلہ کیا۔ پتھر کی مدد سے میں نے بہت کوشش کی مگر تالا انتہائی مضبوط ہونے کی وجہ سے نہ ٹوٹ سکا۔ تنگ بار کر میں ایک دفعہ پھر سے مایوسی کا شکار ہو کر دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ بیٹھتے ہی اچانک میری نظر مٹی سے بنے ہوئے بھڑولے پر پڑی۔ پنجاب کے گاؤں دیہات میں رہنے والے لوگ کہیں کہیں اب بھی اس کا استعمال کرتے ہیں۔ گو کہ اب تو لوگ گندم کو اسٹور کرنے کے لیے لوہے کے بنے ہوئے بہترین اور خوبصورت قسم کے بھڑولے استعمال کرنے لگے ہیں لور مٹی کی بنی ہوئی اس پنجاب کی ثقافت کو لوگ بھولتے جا رہے ہیں مگر غریب لوگ اب بھی اس کا استعمال کرتے ہیں۔ بہرحال مٹی سے بنی اس پنجاب کی ثقافت سے مجھے پاپی پیٹ کی آگ بجھانے کا سامان مل گیا۔ اس میں گندم کم ہی تھی مگر میرے لیے یہ بھی غنیمت تھا۔ میں نے اپنی ضرورت کے تحت وہاں سے گندم کے دانے نکالے اور اسی گھر سے گھڑے کا ٹوٹا ہوا ٹھیکرا اٹھایا اور گھر سے نکل گیا۔ باہر جا کر میں نے مزار کے احاطے میں بنے ہوئے چولہے پر یہ دانے بھون لیے۔ میں نے زندگی میں بہت سے مزے دار کھانے کھائے تھے مگر اپنے ہاتھوں سے بھونے ہوئے کچے پکے گندم کے ان دانوں کا مزہ میں آج تک نہیں بھولا۔ میں نے نلکے کا ٹھنڈا پانی پیا اور خدا کا شکر ادا کیا۔ کھانے پینے سے میرے جسم میں کچھ جان سی آئی اور میں نڈھال سا ہو کر مزار میں بنے سائبان تلے لیٹ گیا۔

•••

شام ہوئی تو میں نے مسجد میں نماز مغرب ادا کی اور مزار کی طرف بڑھا۔ مزار پر جاتے ہی میری حیرت کی انتہا نہ رہی۔ مزار پر چراغ جل رہا تھا اور پھر مجھے یاد آیا کہ چراغ تو کل رات جب میں یہاں آیا تھا تب بھی جل رہا تھا۔ تو کیا یہ چراغ کل ہی کا جلا ہوا تھا؟ یا پھر آج کسی نے سر شام جلا دیا تھا۔ مگر مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ میں دوپہر کو جب اٹھ کر اس سارے قطعہ زمین کا جائزہ لے رہا تھا تو میں مزار میں بھی داخل ہوا تھا۔ تب تو یہ چراغ نہیں جل رہا تھا تو پھر اب یہ کس نے جلا دیا جبکہ یہاں دور دور تک کوئی انسان موجود نہیں تھا۔ دن میں مجھے خیال ہی نہیں رہا کہ رات جو چراغ جل رہا تھا وہ کس نے بجھایا ہوگا اور اب سر شام ہی کوئی چراغ جلا کر چلا گیا اور مجھے خبر بھی نہیں ہوئی۔ یہ کون تھا آخر تو کیا یہ صاحب مزار کی کرامت تھی؟ یا پھر کوئی اور چکر تھا۔ ایک عجب سی سنسنی کی لہر میرے وجود میں سرایت کرتی چلی گئی اور میں جلدی مزار سے نکل آیا۔ مزار سے باہر نکل کے میں نے ارد گرد دیکھا مگر مجھے کہیں کوئی بندہ نظر نہیں آیا۔ میں نے اونچی آواز سے پکارا۔

"کوئی ہے......؟"

اور پھر میں نے کئی بار یہ آواز لگائی مگر دریا کے پانی اور ویرانے میں شام کو جاگنے والے حشرات الارض کی مختلف النوع قسم کی پرہول آوازوں کے علاوہ کچھ سنائی نہ دیا اور نہ ہی کسی نے میری آواز کا جواب دیا۔ یہ سب کیا تھا؟ مجھے کچھ بھی سمجھ نہیں آرہا تھا۔ سنا تھا کہ اولیاء اور درویشوں کے دیے ہمیشہ جلتے رہتے ہیں مگر شاید آج اس کا عملی مظاہرہ دیکھا تو مجھے یقین نہیں آرہا تھا اور ویسے بھی اولیاء اور درویشوں سے کبھی مل بیٹھنے کا مجھے زیادہ تجربہ بھی نہیں تھا۔ سچ تو یہ ہے کہ اس حوالے سے میرا دماغ اور بھی الجھ سا گیا اور مجھے اس سارے ماحول سے ہی خوف سا آنے لگا۔ میں جو زندگی میں کبھی اتنا خوف زدہ نہیں ہوا تھا آج واقعی خوف اور ڈر نہ صرف محسوس کررہا تھا بلکہ میرا دل بھی گھبرانے سا لگا۔ میرے دل میں ایک خیال جڑ پکڑ گیا کہ جب اس پورے علاقے میں میرے علاوہ کوئی بندہ موجود نہیں تو پھر یہ چراغ کس نے جلایا تھا؟ ہونہ ہو یہ کسی ہوائی یا مافوق الفطرت مخلوق کی کارروائی تھی۔ اب یہ کوئی جن تھا کہ پری یا پھر کوئی روح جو کہ عالم ارواح سے یہاں آکے دیا جلا گئی اور مجھے پتہ بھی نہیں چلا جبکہ میں شام سے یہیں موجود تھا۔ میں مزار سے اٹھا تو میں نے قبرستان کی طرف نظر ڈالی۔ یہاں بھی خطرہ ہی خطرہ تھا۔ قبرستان سے تو لوگ دن میں خوف محسوس کرتے ہیں جبکہ میں یہاں پر اس ویرانے میں اکیلا رہنے پر مجبور تھا۔ کچھ بھی ہو میں یہاں سے تو کسی صورت نکل بھی نہیں سکتا تھا کیونکہ میرے چار سو دریا میں پانی ہی پانی تھا۔ میں تو پہلے ہی بڑی مشکل سے سیلابی ریلے سے بچا تھا اب میں دوبارہ اپنی موت کو دعوت نہیں دینا چاہتا تھا مگر یہاں اس صورت حال میں رہنا بھی میرے لیے انتہائی مشکل ہورہا تھا۔ مزار سے باہر ایک درخت کے نیچے کھڑا میں یہ سوچ ہی رہا تھا کہ درخت کے اوپر سے کوئی سفید سی چیز نیچے گری اور کسی پرندے نے پھڑ پھڑانے کی آواز سنائی دی اور ساتھ ہی درخت کے اوپر سے کوئی سیال سی چیز نیچے گری۔ میں نے اندھیرے میں غور سے دیکھا۔ سیاہی مائل یہ سیال کیا بلا تھی نیچے زمین پر بیٹھ کر میں نے آنکھیں پھاڑ کر دیکھا تو مجھے یہ خون سا معلوم ہوا۔ انتہائی گھبراہٹ کے عالم میں میں نے اوپر درخت کی جانب دیکھا۔ اندھیرے میں چمکتی ہوئی دو خوفناک سی آنکھیں مجھے گھور رہی تھیں۔ اف میرے خدا۔ میں نے زندگی میں کبھی ایسا خوفناک منظر نہیں دیکھا تھا۔ اندھیری رات، قبرستان کا پراسرار سائیں سائیں کرتا دل کو دہلاتا ماحول اور ایسے میں درخت کے اوپر سے خون کا گرنا اور دو خوفناک اور خون آلود سی مجھے گھورتی ہوئی آنکھیں۔ بے اختیار میری چیخ سی نکلی مگر انتہائی خوف کی وجہ سے میرے اندر ہی کہیں دم توڑ گئی۔ میں نے بھاگنا چاہا مگر مجھے یوں لگا کہ جیسے میرے پاؤں کسی نے منوں وزنی زنجیر سے باندھ دیے ہوں۔ میری یہ کیفیت کچھ دیر جاری رہی اور پھر مجھے نہیں معلوم کہ مجھے کیا ہوا۔ میں وہاں سے اٹھا اور انتہائی خوف اور ڈر سے بھاگتا ہوا کچے گھر کی دیوار پھلانگ کر اس میں داخل ہوگیا اور جو کمرہ کھلا تھا میں نے اسی میں جا کر پناہ لی۔

کچھ ہی دیر میں جانے کیسے میری زبان اور دل میں آیۃ الکرسی کا ورد جاری ہوا اور مجھے کچھ ہوش آنے لگا اور مجھے معاملے کی سنگینی کا احساس ہوا۔ اس کمرے کے کونے میں صفیں موجود تھیں۔ میں آہستگی سے اٹھا اور اندھیرے میں اندازے سے اس کونے کی جانب بڑھا جہاں صفیں موجود تھیں۔ جلد ہی مجھے صفیں مل گئیں تو میں نے ایک صف کھولی اور نیچے بچھا کر اس پر آڑا ہو کر اپنے آپ میں سمٹتے ہوئے کمرے کی دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا اور یونہی پر بیٹھے بیٹھے اونگھتے اور مختلف خوفناک خیالات کے پیچھے بھاگتے ہوئے جانے کب میری آنکھ لگ گئی۔

☆☆☆......

رات کے جانے کس پہر عجیب سے شور سے میری آنکھ کھلی۔ میں ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ کمرے میں اندھیرا ہونے کی وجہ سے مجھے کچھ نظر تو نہ آیا البتہ کمرے سے باہر وہ عجیب سا شور ہنوز جاری تھا۔ تھوڑی دیر تو ایک بار پھر سے میں انتہائی خوف زدہ ہو گیا اور اس شور کو دل ہی دل میں کسی نئی آفت سے منسوب کرنے لگا مگر جلد ہی مجھے احساس ہوا کہ یہ سب میرا وہم ہے۔ باہر شاید بدستور آندھی جاری تھی اور اسی کا شور مجھے کمرے میں سنائی دے رہا تھا۔ میں دل ہی دل میں پھر سے ورد کرنے لگا اور اپنے آپ میں کچھ اور بھی سمٹ گیا۔ ابھی تھوڑی ہی دیر ہوئی تھی کہ مجھے آندھی کے شور میں عجیب سی نہ سمجھ میں آنے والی آواز سنائی دی۔ اف میرے خدا۔ انتہائی سنسنی کی ایک تیز لہر میرے سارے وجود میں سرایت کرتی چلی گئی اور اس وقت مجھے سو فیصد یقین ہو گیا کہ اس قبرستان میں کوئی مافوق الفطرت مخلوق نہ صرف آباد تھی بلکہ دندناتی پھر رہی تھی۔ انتہائی خوف اور ڈر کی وجہ سے میرا گلا خشک ہو گیا اور کوئی چیز میرے گلے میں پھنسنے لگی۔ ابھی میں یہ سوچ ہی رہا تھا کہ میرے کمرے کا دروازہ کسی نے تیزی سے کھٹکھٹانا شروع کر دیا۔

خوف اور ڈر کی وجہ سے مجھے یوں لگا کہ جیسے میرا دل اچھل کر سینے سے باہر آ جائے گا اور میں اس اندھیری رات میں ایک اجنبی علاقے کے نامعلوم قبرستان کے متولی کے کمرے میں ڈر اور خوف کی وجہ سے مر جاؤں گا اور میں جو دریا کے سیلابی ریلے سے بچ جانے پر خوش بھی کا شکار ہو گیا تھا، بے موت مارا جاؤں گا۔

وقفے وقفے سے دروازہ مسلسل کھٹکھٹایا جا رہا تھا۔ کچھ ہی دیر بعد مجھے احساس ہوا کہ دروازہ میرے کمرے کا نہیں بلکہ ساتھ والے کمرے کا کھٹکھٹایا جا رہا ہے جس پر میں نے تالا لگا ہوا دیکھا تھا اور یہ تالا اتنا مضبوط تھا کہ پتھر کی زوردار ضربوں اور میری لاکھ کوششوں کے باوجود نہیں ٹوٹا تھا۔ اف میرے اللہ! یہ سب کیا ہے؟ جس کمرے کو باہر سے تالا لگا ہوا ہے بھلا اسے کوئی کیوں کھٹکھٹا رہا ہے۔ کیا وہ پاگل ہے؟ اسے نہیں معلوم کہ اس کمرے کو باہر سے تالا لگا ہوا ہے۔ آندھی کے بے پناہ شور کی وجہ سے مجھے سمجھ نہیں آ رہی تھی۔ مگر تھوڑی دیر انتہائی غور سے میں نے دیوار سے کان لگا کر سنا تو مجھے محسوس ہوا کہ دوسرے کمرے کو اندر سے کھٹکھٹایا جا رہا ہے۔ یہ سب کیسے ممکن ہے؟ کیا اندر کوئی بندہ ہے؟ جو دروازے کو اندر سے کھٹکھٹا رہا ہے؟ یا پھر کوئی اور بات ہے؟ جہاں تک اندر کسی بندے کی موجودگی کا سوال ہے تو یہ ممکن ہی نہیں ہے۔ میں نے دن کی روشنی میں عصر کے وقت اس دروازے کے تالے کو کھولنے کی غرض سے پتھر کی زوردار ضربیں لگائی تھیں اور اگر کوئی اندر موجود تھا تو وہ اس وقت کیوں نہیں بولا؟ اور رات کے اس پہر اس نے دروازے کو اندر سے کیسے کھٹکھٹانا شروع کر دیا ہے؟ میں نے سارا دن اس پورے علاقے کو چھان مارا تھا مگر مجھے تو یہاں کوئی بھی نظر نہیں آیا اور پھر میں نے شام کے دھندلکے میں کئی آوازیں بھی دی تھیں مگر تب تو کوئی نہیں بولا تھا۔ اب یہ بندہ کہاں سے وارد ہو گیا اور وہ بھی تالا لگے ہوئے کمرے کے اندر؟ یہ کوئی مافوق الفطرت مخلوق ہی ہے جو کہ مجھے اس بہانے سے کمرے سے باہر نکالنا چاہتی ہے اور شاید میرا خون پینا چاہتی ہے اور اس سوچ کے بعد تو میرا ذہن نہ جانے کیا کیا سوچتا چلا گیا مگر ساتھ والے کمرے کا دروازہ مسلسل بج رہا تھا۔

باہر تیز طوفان جاری تھا جس کی وجہ سے ہوا کے درختوں اور جھاڑ جھنکار سے ٹکرانے کی مہیب اور خوفناک آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ اس علاقے میں پھیلے ہوئے چار سو دریا کے پرشور پانی ہی کا خوف کم نہیں تھا کہ اوپر سے آندھی اور اندھیری رات میں اس پراسرار اور سمجھ میں نہ آنے والے چکر نے مجھے کچھ اور بھی دہلا دیا اور پھر اچانک نہ جانے کیسے ساتھ والے کمرے میں بالکل خا

موشی چھا گئی۔ اندر لرزی اور چمگادڑوں نے بھی برا حال کر رکھا تھا مگر سچ تو یہ ہے کہ میں اتنا ڈرا ہوا تھا کہ مجھے اس کا احساس بھی نہیں ہوا۔ یہ رات مجھ پر بہت بھاری تھی۔ ابھی میں ساتھ والے کمرے سے دروازے کو کھٹکھٹائے جانے والی آوازوں کے طلسم سے نکل بھی نہ پایا تھا کہ ایک نئی مصیبت نازل ہوگئی۔ کوئی چیز سرسراتی ہوئی میرے پاؤں سے ٹکرائی۔ مجھے یوں لگا کہ جیسے یہ کوئی سانپ ہو۔ ڈر کے مارے میری چیخ نکل گئی میں نے کمرے کا دروازہ کھولا اور باہر کی جانب بھاگا۔ باہر انتہائی تیز طوفان جاری تھا مگر میں ابھی گھر کی دیوار پہ چڑھنے ہی والا تھا کہ تالا لگے ہوئے کمرے میں سے کوئی تیزی سے چلایا اور اس نے کچھ کہا بھی مگر تیز آندھی کی وجہ سے میں سن نہیں پایا۔ مجھے یوں لگا کہ جیسے کئی بلائیں میرے پیچھے لگ گئی ہوں اور میرے خون کی پیاسی ہوں۔ میں نے جلدی سے چھلانگ لگائی اور دیوار چھلانگ کر باہر کود گیا۔

میرا رخ جانے کس جانب تھا مجھے نہیں معلوم پر اتنا مجھے احساس تھا کہ میں قبرستان میں قبروں کے بیچ بھاگتے ہوئے بھاگتا جا رہا ہوں اور پھر وہ ہوا جس کا میں نے زندگی میں شاید کبھی سوچا بھی نہ ہوگا۔ میرا پاؤں ایک سنگ مرمر لگی قبر کے سرہانے سے ٹکرایا اور میں دوسری جانب یعنی قبر کے عین اوپر جا گرا۔ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ میں قبر کے اوپر گرتا مگر جانے کیسے قبر میرے وہاں گرنے سے پہلے ہی شق ہوئی اور میں اس کے اندر کہیں گہرائیوں میں گرتا چلا گیا۔



جب مجھے ہوش آیا تو مجھے یوں لگا کہ جیسے میں اندھا ہو گیا ہوں مگر تھوڑی دیر بعد جب میرے حواس ذرا بحال ہوئے تو مجھے احساس ہوا کہ ایسا نہیں ہے اور اس کے ساتھ ہی مجھے یاد آیا کہ میرے ساتھ کیا ہوا تھا۔ یہ سوچ کر ہی مجھے ٹھنڈے پسینے آنے لگے کہ میں اس وقت قبر میں پڑا ہوں اور میرے اردگرد مہیب اندھیروں کا راج ہے۔ سچ پوچھیں تو اس وقت مجھے اس ذات مہربان کی شدت سے یاد آئی اور میرے دل کی گہرائیوں سے یہاں سے صحیح سلامت بچ نکلنے کی دعا نکلی۔ یہ بات الگ کہ یہاں نہ ختم ہونے والے اندھیرے چار سو پھیلے ہوئے تھے مگر قبر کے اندر ہونے کا احساس یقینی طور پر جان لیوا تھا۔ کسی کا مردہ وجود کے ساتھ قبر میں ہونا اور بات ہے مگر زندہ در گور ہونا قطعی طور پر مختلف ہے۔ اب تو مجھے صد فیصد یقین ہو گیا کہ یہ پورا علاقہ ہی آسیب زدہ اور پراسرار ہے۔ یقینی طور پر یہاں کچھ مافوق الفطرت عناصر نے ڈیرہ جما رکھا تھا اور انہیں یقینی طور پر میرا یہاں آنا اچھا نہیں لگا اور اسی لیے وہ مخلوق مجھ سے بھیانک کھیل کھیل رہی تھی۔ اب وہ جانے میرے ساتھ کیا سلوک کرنے والی تھی۔ میں نے اوپر اس خلا کی جانب دیکھا جہاں سے میں نیچے گرا تھا۔ اب وہاں کوئی خلا نہیں تھا اور قبر بند ہو چکی تھی۔ یا الٰہی یہ سب کیا ہے؟!

اس وقت میرے سر میں شدید درد ہو رہا تھا۔ میں نے سر پہ ہاتھ پھیرا تو مجھے سر میں ایک گومڑ کا احساس ہوا۔ شاید اوپر سے جب میں قبر کے اندر گرا تھا تو میرا سر کسی سخت چیز سے ٹکرا گیا تھا اور اسی وجہ ہی سے میرے سر میں درد کی لہریں اٹھ رہی تھیں۔ سر میں جس جگہ گومڑ بنے ہونے کا مجھے احساس ہو رہا تھا اس جگہ پر میں نے ہاتھ لگایا تو مجھے چپچپاہٹ سی محسوس ہوئی۔ لگتا تھا کہ زبردست چوٹ لگی ہے اور خون بھی نکل رہا ہے۔ میں نے اندھیرے میں ادھر ادھر ہاتھ پھیلایا اور دیکھنے کی کوشش کی کہ وہ کون سی چیز تھی جس سے میرا سر ٹکرایا تھا۔ اچانک ہی میرے ہاتھ سے کوئی چیز ٹکرائی۔ مگر جونہی میں نے اس چیز پہ ہاتھ پھیرا تو ایک خطرناک خیال سے میرا دل لرز کر رہ گیا' یہ ایک انسانی کھوپڑی معلوم ہو رہی تھی۔ اف میرے خدایا' میرے دل کی دھڑکن جو کہ پہلے ہی خطرناک حدوں کو کراس کر رہی تھی

دب کچھ اور بھی تیز ہو گئی اور پھر کچھ ہی لمحوں میں یہ رفتار اچانک گھٹنے لگی اور مجھے یوں لگا کہ جیسے مجھے الٹی آ رہی ہو۔ قبر میں ایک عجب نامانوس سی بو بھی حواس کو مختل کیے دے رہی تھی۔ مجھے یوں لگا کہ جیسے میرے وجود میں قید کوئی چیز باہر نکلنے کے لیے انتہائی بے چین و بے قرار ہو اور اسی لمحے مجھے زبردست قے آتے آتے رہ گئی۔ کڑواہٹ کی وجہ سے میری آنکھوں سے پانی نکل آیا۔ میری زندگی میں کئی خطرناک اور دل کو لرزا دینے والے واقعات پیش آئے تھے مگر میں نے کبھی کا خندہ پیشانی اور بے خوفی سے مقابلہ کیا مگر جو اس اندھیری رات میں میرے ساتھ وقوع پذیر ہو رہا تھا اس نے سچ میں مجھے اندر سے دہلا کر رکھ دیا۔

ابھی میں انہی سوچوں میں غلطاں یہاں سے نکلنے کے بارے میں سوچ ہی رہا تھا کہ مجھے اندھیری قبر میں ہلکی سی روشنی ہوتی نظر آئی۔ قبر کے مہیب اندھیروں میں یہ روشنی؟ پہلے ہی میرا ذہن پاگل پن کا شکار ہوا جا رہا تھا اور اب یہ روشنی..... میں اس وقت قبر کے اندھیرے میں اوندھا لیٹا ہوا تھا اور نیچے زمین کی طرف نگران میری آنکھوں کو یہ پراسرار اور ہوتی سی روشنی انتہائی عجیب اور خوفناک سی لگ رہی تھی۔ میرے وجود میں مقید میری روح بھی اس خوفناک خیال سے لرز رہی تھی کہ اب جانے میرے ساتھ کیا ہونے والا ہے۔ اس وقت صحیح معنوں میں یہ عجیب پراسرار سا ماحول مجھ پر سحر طاری کیے ہوئے تھا۔ میں نے انتہائی ڈر اور خوف کے عالم میں سوچا شاید قبر میں منکر نکیر سوال جواب کرنے آ چکے تھے مگر میں ابھی مرا کہاں تھا۔ انہیں تو میرے مرنے کے بعد آنا تھا مگر یہ میرے مرنے سے پہلے ہی قبر میں آ چکے تھے۔ بڑی مشکل سے سیدھا ہوتے ہوئے میں نے آہستگی سے روشنی کے ماخذ کی طرف نگاہ دوڑائی تو ایک اور دل کو دہلا دینے والا منظر میری نگاہوں کے سامنے تھا۔ یہ سب کچھ دیکھ کر میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے اور بے انتہا سنسنی اور حیرت نے میری قوت گویائی سلب کر لی۔ حیرت سے میرے منہ سے نکلتی ہوئی چیخیں میرے اندر ہی کہیں دم توڑ گئیں۔

میرے سامنے اس وقت ایک خوبصورت دلفریب اور ملکوتی حسن لیے کوئی حور کھڑی مجھے حیرانی سے تک رہی تھی۔ اس کے ہاتھ میں جادوئی سی روشنی دیتی ایک موم بتی قبر کے اندھیروں کو جھکے سے اجالے میں تبدیل کرنے کی ناکام سی کوشش کر رہی تھی۔ اس کے دوسرے ہاتھ میں خون آلود چھری بھی نظر آ رہی تھی۔ مگر اس کے چہرے پہ چھائے حیرت کے قدرتی اور معصومیت سے تاثرات دیکھ کر میرے لیے اس کے بارے میں کوئی بھی اندازہ لگانا مشکل ہو رہا تھا۔ وہ تھوڑی دیر مجھے گھورتے ہوئے حیرت سے تکتی رہی اور پھر ان الٹے گلاب جیسے ہونٹوں کی پنکھڑیاں ہوا ہوئیں اور قبر کے اس طلسماتی سے ماحول میں اس کی دلفریب اور مدھری آواز سے گویا جلترنگ سے بج اٹھے۔

"آپ کون ہیں؟ اور یہاں کیسے پہنچ گئے؟"

میں نے اس کی بات کے جواب میں کچھ بولنا چاہا مگر انتہائی حیرت تجسس اور خوف کی وجہ سے میری آواز میرے اندر ہی گھٹ کر رہ گئی۔ اس نے غور سے میری جانب دیکھا اور ایک ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے موم بتی قبر میں ایک جگہ پہ رکھ دی اور مجھ سے کچھ دوری پہ بیٹھ گئی۔ یہ ایک اور ہی عجیب و غریب ہنسنا تھا۔

جب میں پچھلی رات سیلاب کے ریلے میں پانیوں کے تھپیڑے کھاتا ہوا اس جگہ تک پہنچا تھا تو جان بچ جانے پہ خدا کا شکر ادا کرتے ہوئے پھولا نہ سما رہا تھا مگر آج شام سے ہونے والے پے در پے واقعات نے مجھے گھما کر رکھ دیا۔ یا الٰہی یہ سب کیا ہے اور میں کہاں آ گیا ہوں؟ اب تو مجھے شک سا ہو رہا تھا کہ جیسے میں مر چکا ہوں اور یہ سب واقعات بعد مرنے کے وقوع پذیر ہو رہے ہیں اور اگر ایسا ہی تھا تو پھر حور نما یہ لڑکی کون ہے جو

اس وقت موم بتی روشن کیے قبر کے اندھیروں میں چلی آئی ہے؟ اگر یہ کوئی مافوق الفطرت مخلوق ہے تو پھر وہ مجھے یہاں دیکھ کر حیران کیوں ہو رہی ہے؟ اور اگر وہ حیران ہو رہی ہے تو اس کا مطلب ہے کہ وہ واقعی کوئی معصوم لڑکی ہے مگر وہ یہاں جہاں پر چاروں طرف خطرناک دریا پھیلا ہوا ہے اور اس دریا کے درمیان ایک خشکی کا ٹکڑا اور اس ٹکڑے پر جھاڑ جھنکار خود رو پودوں اور قدیم درختوں کی بہتات کے درمیان ایک آسیبی قبرستان کی اس قبر میں وہ رات کے اس وقت کیا کر رہی ہے؟ نہیں یہ ہو ہی نہیں سکتا۔ یہ کوئی اور ہی چکر ہے؟ اور پھر وہ قبر میں رات کے اس وقت کہاں سے اور کیسے داخل ہوئی؟ جبکہ اس قبر میں داخلے کا واحد راستہ وہی تھا جہاں سے میں بیٹھا ہوا تھا اور مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ یہ لڑکی اوپر سے نہیں بلکہ کہیں قبر سے ہی آئی تھی۔ اب مجھے سو فی صد یقین ہو گیا کہ یہ لڑکی واقعی کوئی مافوق الفطرت مخلوق ہے اور مجھ سے کوئی بھیانک اور خطرناک کھیل کھیلنے والی ہے اور اس کے ہاتھ میں خون آلود چھری کی موجودگی نے میرے اس یقین کو پختہ اور بھی پختہ کر دیا۔ یہی سوچتے ہوئے میں نے اس سے کچھ دور ہونا چاہا تو میرے کانوں میں اس لڑکی کے سسکنے کی آواز سنائی دی۔ میں نے دیکھا وہ حسن کی دیوی میرے سامنے گھٹنوں میں سر دیے رو رہی تھی۔ اب تو میں کچھ اور بھی خوف زدہ ہو گیا۔ ہو نہ ہو اب یہ میرے ساتھ کوئی خوفناک کھیل کھیلنا چاہتی ہے۔ میں نے دل ہی دل میں ایک فیصلہ کیا اور وہاں سے نکلنے کے لیے غیر محسوس انداز میں پیچھے کی طرف ہٹنا شروع کیا۔ مگر میری حرکت کو شاید اس خوبصورت بلا نے دیکھ لیا۔ وہ چلاتے ہوئے میری طرف بڑھی اور اس نے مجھے اپنی مضبوط باہوں میں دبوچ لیا اور مجھے تھپڑ لگانا شروع کر دیے۔

"اب بھاگ کے کہاں جائے گا حرامزادے! تو نے میری زندگی نرک بنا ڈالی ہے تو کیا سمجھتا ہے کہ میں تمہیں اتنی آسانی سے یہاں سے نکلنے دوں گی۔ میں تیرا خون پی جاؤں گی کمینے تو سمجھتا کیا ہے اپنے آپ کو؟"

میں جو کہ پہلے ہی پے در پے ہونے والے واقعات سے نڈھال ہو چکا تھا اور مجھ میں قوت مدافعت نہ ہونے کے برابر رہ گئی تھی۔ میں نے سوچا کہ موت تو برحق ہے اور ایک روز سبھی کو آنی ہے اور جب مرنا ناگزیر ٹھہرا تو پھر یوں ڈر کے بزدلی سے کیوں مروں؟ کیوں نہ میں اس خوبصورت بلا کا دلیری اور بہادری سے مقابلہ کروں اور جان جان آفریں کے سپرد کر دوں۔ مرنا تو ہے ہی مگر حالات کا مقابلہ تو کرنا چاہیے مجھے۔ کیا ہوا کہ یہ مافوق الفطرت مخلوق ہے اور اس کی اور میری طاقت میں زمین و آسمان کا فرق ہے مگر میں بھی تو اشرف المخلوق ہوں اور خدا نے مجھے ان سب مخلوقات پر فوقیت دی ہے اور افضل قرار دیا ہے تو پھر میں کیوں حوصلے ہار رہا ہوں؟ میری اس سوچ نے میرے اندر ایک نئی طاقت بھر دی اور میں نے ایک نئے عزم اور ولولے سے اس خوبصورت مافوق الفطرت حور نما مخلوق کو دونوں ہاتھوں سے مضبوطی سے پکڑ لیا۔ کچھ دیر تو اس نے میرے ہاتھوں کے شکنجے سے نکلنے کی کوشش کی مگر جلد ہی اس کا غصہ جھاگ کی طرح بیٹھ گیا اور اس نے ایک بار پھر سے رونا شروع کر دیا۔ تھوڑی دیر اس کی یہ کیفیت جاری رہی اور کچھ ہی دیر بعد جب وہ نارمل ہوئی تو میں نے اس سے پوچھا۔

"آپ کون ہیں اور میرے پیچھے کیوں پڑی ہوئی ہیں جبکہ میری آپ سے کوئی دشمنی بھی نہیں تو پھر آپ میرے ساتھ ایسا کیوں کر رہی ہیں؟" یہ کہتے ہوئے میں نے دیکھا کہ کافی دیر سے الفاظ جو کہ میرے گلے میں پھنسے ہوئے تھے بڑی روانی سے زبان تک پہنچے اور میری آواز پھر سے ویسے ہی ہو گئی جیسا کہ پہلے تھی۔

"اچھا تو تم کیا سمجھتے ہو کہ تمہارے ایسا کرنے سے میں تمہیں چھوڑ دوں گی۔ تم بھی ان میں سے شاد کے ساتھی ہو۔ تبھی تو تم یہاں اس راستے سے داخل ہوئے

ہو جیسے صرف اور صرف سائیں دینے شاہ استعمال کیا کرتا تھا۔" اس نے انتہائی نفرت اور حقارت سے مجھے دیکھتے ہوئے کہا۔

"کون سائیں دینے شاہ اور کون سا راستہ؟" میں نے انتہائی حیرت سے اس خوبصورت حسینہ کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"دیکھو! اتنے معصوم نہ بنو۔ میں پہلے ہی اس کے یہاں موجود ساتھی نازو ملنگ کو قتل کر چکی ہوں جس کا مجھے از حد افسوس ہے اور میں اب دوسرا قتل نہیں کرنا چاہتی۔ بہتر ہوگا کہ تم مجھے یہاں سے نکلنے کا راستہ بتا دو۔ ورنہ میں اسی چھری سے تمہارا قتل بھی کر دوں گی جس سے میں نے ابھی تھوڑی دیر پہلے نازو ملنگ کو قتل کیا ہے۔" یہ کہتے ہی اس نے اپنے ہاتھ میں موجود خون آلود چھری کو بلند کرتے ہوئے قہر کے فضا میں لہرایا یوں کہ جیسے وہ مجھے دھمکانا چاہتی ہو۔

"دیکھیں! آپ پہلے میری بات سن لیں۔ اس کے بعد اگر آپ مجھے قتل بھی کرنا چاہیں تو بے شک کر دیں۔ مجھے کوئی اعتراض نہ ہوگا۔ آپ یقین کریں کہ جن باتوں کا آپ ذکر کر رہی ہیں ان کا مجھے قطعاً کوئی علم نہیں۔" اور پھر میں نے مختصراً اسے اپنے حالات اور یہاں تک آمد کے بارے میں بتا دیا۔ شکر ہے کہ اس نے میری ساری رام کہانی بڑی شرافت سے سن لی۔ میرے حالات اور یہاں آمد کے بارے میں سن کر اس نے دکھ بھری نظر سے مجھے دیکھا اور بازو سے تھامتے ہوئے کہا۔

"شکر ہے۔ میں نے بے اختیاری میں تمہیں قتل نہیں کر دیا اگر مجھ سے یہ گناہ ہو جاتا تو میں زندگی بھر اپنے آپ کو بھی معاف نہ کر پاتی۔" یہ کہتے ہوئے اس کی آنکھوں میں ایک مرتبہ پھر سے آنسو بھر آئے اور وہ رونے لگی۔ میں نے دیکھا موم بتی کافی بڑی تھی اور ابھی تک جل رہی تھی اور اس موم بتی کی روشنی میں وہ حور بھی موم کی گڑیا کی طرح ہی محسوس ہو رہی تھی۔ کچھ ہی دیر بعد اس نے آنسو پونچھے اور مجھے انتہائی خوبصورت اور پیار بھرے انداز میں دیکھتے ہوئے کہا۔

"اقبال! بھول جاؤ! تھوڑی دیر پہلے ہونے والی باتوں کو اور ایک بار اپنے حالات کو بھی اور خدا کے لیے یقین کرو کہ میں نہ تو کوئی حور پری ہوں اور نہ ہی کوئی مافوق الفطرت مخلوق۔ میں بھی تمہاری طرح ایک انسان ہی ہوں اور لاہور شہر سے تعلق رکھتی ہوں اور جہاں تک میرے یہاں اس جگہ پر موجود ہونے کا تعلق ہے تو یہ ایک لمبی کہانی ہے مگر مختصراً بتائے دیتی ہوں۔

"میرا نام صائمہ ہے اور میں اپنے والدین کی اکلوتی اولاد ہوں۔ میرے والد اس ملک کے بہت بڑے بزنس مین تھے۔ بچپن ہی سے مجھے روپے پیسے کی کمی نہ تھی جو میں نے چاہا، میں نے والدین سے مانگا وہ انہوں نے مجھے لے کر دیا اور میری ہر جائز و ناجائز خواہش پوری کی اور اسی چیز نے مجھے انتہائی ضدی اور خود سر بنا دیا۔ بی اے کرنے کے بعد میں یونیورسٹی پہنچی تو مجھے ناصر نامی ایک لڑکے سے پیار ہو گیا اور اس کے پیار میں اتنی شدت تھی کہ اس نے مجھے پاگل بنا کے رکھ دیا مگر وہ مجھ سے شادی پر رضامند نہ ہوا۔ اگر تو وہ کسی غریب کا بیٹا ہوتا تو میں شاید اسے گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کر دیتی مگر وہ ایک بااثر سیاسی خاندان سے تعلق رکھنے کی بنا پر اپنے ہم پلہ دوسرے سیاسی خاندان کی لڑکی سے شادی کا خواہاں تھا اور یہ صرف اسی کی نہیں اس کے بڑوں کی مرضی بھی تھی۔ میں نے بڑے جتن کیے مگر اسے راضی نہ کر سکی۔ پھر میں نے جیسے تیسے کر کے اپنے والدین کو بھی راضی کر کے اس کے گھر بھیجا مگر بجائے اس کے کہ میرا مسئلہ حل ہوتا اور بھی بگڑ گیا۔ ناصر کے والدین نے میرے ماں باپ کی خوب بے عزتی کی۔ جب والدین کی زبانی مجھے حالات کا علم ہوا تو بجائے اس کے کہ میں ناصر کو بھول جاتی۔ میں نے اس بات کو اپنی انا کا مسئلہ بنا لیا۔ خود سر اور ضدی تو میں پہلے ہی تھی اور اب تو گویا میرے

لیے ناصر اور اس کے گھر والوں کو سبق سکھانا ضروری ہو گیا تھا۔

اسی سلسلے میں میرا دھیان اخبار میں چھپنے والے جعلی عاملوں اور پیروں کے اشتہاروں کی طرف ہو گیا۔ میں نے ان جعلی عاملوں اور پیروں سے اپنے من کی مراد پانے کے لیے پیسہ پانی کی طرح بہایا مگر میرے مطلوبہ مقاصد پورے نہ ہو سکے۔ اسی دوران سائیں بابا دینے شاہ کا اشتہار میری نظر سے گزرا۔ اشتہار کچھ اتنا پرتاثیر تھا کہ میں نے فوری طور پر اخبار میں دیا ہوا ان کا نمبر ملایا۔ فوراً ہی میری کال ریسیو کر لی گئی مکمل طور پر میرے حالات سننے کے بعد فون پر بات کرنے والے نے مجھے یادگار چوک پہنچنے کو کہا۔ میں جونہی یادگار پہنچی تو میں نے فون پہ انہیں اپنی لوکیشن کے بارے میں بتایا۔ تھوڑی ہی دیر میں ایک بنے ٹھنے مسٹنڈے نے میری گاڑی کا شیشہ کھٹکھٹایا اور اسی وقت میرے موبائل پر بات کرنے والے نے کال کر کے کہا کہ میں اسے اپنی گاڑی میں بٹھا لوں اور وہ مجھے اس تک پہنچا دے گا۔ میں پہلے بھی ایسے لوگوں کے طریقہ کار سے واقف تھی۔ میں نے گاڑی کا شیشہ کھولا اور اسے اپنے ساتھ بٹھا لیا۔ وہ مجھے لاہور میں ایک گھر میں لے گیا اور وہاں پہلے ہی سے کچھ لوگ موجود تھے۔ میں نے سوچا کہ شاید یہ لوگ بھی میری طرح کوئی غرض مند تھے۔ وہاں پہنچتے ہی انہوں نے مجھے نیاز کے نام پر شربت پیش کیا جسے پیتے ہی میں بے ہوش ہو گئی اور پھر مجھے یہاں پہنچا دیا گیا۔ پچھلے دو ماہ سے میں یہاں موجود ہوں۔ میرے گھر والوں سے یہ لوگ کروڑوں روپیہ تاوان بھی وصول کر چکے ہیں مگر انہوں نے مجھے چھوڑا نہیں۔ یہ ایک تہہ خانہ ہے جو کہ اس قبر سے متصل ہے اور اس کا ایک دروازہ باہر موجود ایک کمرے میں کھلتا ہے مگر کمرے کا دروازہ باہر سے لاک ہے۔ مجھے یہاں نیچے تہہ خانے میں بنے ایک کمرے میں قید کیا گیا ہے۔ جانے آج کیسے ہارو ملنگ مجھ پر

لوڈشیڈنگ کے فوائد

+ بجلی کے بل میں کمی واقع ہو جاتی ہے اگر لوڈشیڈنگ نہ ہو تو بل یقیناً آپ کو چیخیں مارنے پر مجبور کر سکتا ہے۔
+ ٹی وی بند ہو جاتا ہے جس سے پورے گھرانے کا اخلاق بہتر ہو جاتا ہے تربیت کا اس سے بہتر اور سستا ذریعہ اور کوئی نہیں ہو سکتا۔
+ بچوں کی مشکوک سرگرمیاں رک جاتی ہیں کیونکہ اس طرح انہیں زیادہ بیٹری چارج کرنے کا موقع نہیں ملتا اور موبائل بند رہتے ہیں۔
+ قرب الٰہی حاصل ہوتا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ ہر حال میں صبر کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔
+ بندہ شکر گزار بن جاتا ہے کیونکہ جب بھی تین چار گھنٹوں بعد لائٹ آتی ہے سب یک زبان ہو کر کہتے ہیں یا اللہ تیرا شکر ہے۔
+ ملک میں بے روزگاری کی شرح میں کمی آتی ہے جنریٹر، یو پی ایس، ٹارچ، لالٹین، لیمپ، چراغ اور موم بتیاں بیچنے والوں کا کاروبار خوب چلتا ہے۔ مرمت (آپ کی نہیں مذکورہ اشیاء کی) کرنے والوں کی آمدنی میں اضافہ ہو جاتا ہے۔
+ مذکورہ فوائد کی بنا پر سال کے 365 دن، ہر گھنٹے لوڈشیڈنگ ہمارا قومی مطالبہ ہونا چاہیے وزارت بجلی اس نعرے کو اپنا موٹو بھی بنا سکتی ہے۔

مدیحہ کنول سرور.... چشتیاں

مہربان ہو گیا اور اس نے میرے لیے یہ دروازہ کھول دیا۔ بتاتی چلوں کہ ہارو ایک نیم پاگل شخص ہے جو انہی لوگوں کے ساتھ رہتا ہے۔ کبھی کبھی تو وہ یوں بات کرتا ہے کہ جیسے دنیا میں اس سا کوئی عقل مند ہی نہیں اور کبھی کبھار وہ بالکل ہی پاگلوں اور بے وقوفوں جیسی باتیں کرنے لگتا ہے۔ وہ پہلے بھی کئی بار یہاں بابا دینے شاہ کے ساتھ آتا رہتا تھا مگر آج وہ اکیلا آیا تھا اس نے مجھے بتایا کہ باہر سخت طوفان ہے اور وہ اوپر سے قبر والے راستے سے اندر آیا ہے اور یہ کہ وہ مجھے آزاد کر سکتا ہے اگر میں

اس کی بات مان لوں تو..... ظاہر بات ہے وہ مجھے دعوت گناہ دے رہا تھا اس کی یہ بات سن کر تو جیسے میرے تن بدن میں آگ سی لگ گئی اور میں نے اس کے منہ پر طمانچہ جڑ دیا۔ نازو ملنگ نے غصے میں آ کر مجھے پیٹنا شروع کر دیا اور پھر جانے کیسے اور کہاں سے زمین پر پڑی ہوئی تیز دھار چھری میرے ہاتھ میں آ گئی اور ایک مناسب موقعے پر میں نے وہ چھری اس کے سینے میں گھونپ دی اور تھوڑی ہی دیر میں وہ حرام زادہ جہنم واصل ہو گیا۔ کچھ ہی دیر بعد جب میں اپنے حواس میں آئی تو مجھے احساس ہوا کہ میں نے کیا کر دیا ہے۔ بہرحال مجھے اس حرام زادے کے مرنے کا رہ بھر بھی دکھ نہیں ہوا تھا۔

میں نے دیکھا کہ میں اس وقت تہہ خانے کے ہی میں موجود تھی۔ جس کمرے میں ان لوگوں نے مجھے قید کیا ہوا تھا یہ اس کے ساتھ والا ہی کمرا تھا۔ میں اس سے بچتے بچتے ہی زمین پر گھسٹتی ہوئی یہاں تک پہنچی تھی اور یہیں پر شاید چھری نیچے پڑی ہوئی تھی جو مجھے ملی اور میں نے اسے نازو ملنگ کے سینے میں گھونپ دیا اور وہ اسی وقت مر گیا۔ بے انتہا حیرت کے تاثرات اس کے چہرے پر ثبت ہو کر رہ گئے تھے۔ شاید اسے یقین ہی نہیں ہو پا رہا تھا کہ میں اس کے ساتھ ایسا بھی کر سکتی ہوں۔ جب مجھے یقین ہو گیا کہ نازو ملنگ مر چکا ہے تو میں اوپر والے کمرے تک جا پہنچی۔ وہاں جا کر مجھے معلوم ہوا کہ باہر تو سخت طوفان آیا ہوا ہے مگر میں جلد از جلد اس دلدل سے نکل جانا چاہتی تھی۔ اسی لیے میں نے باہر والا دروازہ کھولنے کی کوشش کی مگر یہ دروازہ شاید باہر سے بند تھا۔ مجھے کچھ اور نہ سوجھا تو میں نے زور زور سے دروازہ کھٹکھٹانا شروع کر دیا۔ مجھے یہ تو معلوم نہیں تھا کہ رات کے اس وقت کون دروازہ کھولنے آئے گا مگر جو بھی آتا میں اسے دھکا دیتے ہوئے یہاں سے بھاگ جانے کی کوشش کرنا چاہتی تھی۔ مگر یہ تو مجھے اس وقت معلوم ہی نہیں تھا کہ اس علاقے میں زبردست سیلاب کی وجہ سے وہ سب لوگ یہاں سے نکل گئے ہیں۔ آخرکار تھک ہار کر میں دروازے سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی اور یہ سوچنے لگی کہ ابھی تک کیا نے بھی دروازہ کھٹکھٹائے جانے کی آواز کیوں نہیں سنی تھی؟ اور وہ لوگ آخر کہاں چلے گئے تھے؟ تب ہی کچھ دیر بعد ساتھ والا دروازہ کھلنے کی آواز سنائی دی۔ مجھے خوشی ہوئی کہ میری مراد آخرکار بر آئی۔ میں نے ایک بار پھر سے دروازہ زور زور سے بھڑ بھڑایا اور چلاتے ہوئے کئی آوازیں بھی دیں مگر اس کے بعد وہاں طوفانی شور کے علاوہ کوئی بھی آواز نہ سنائی دی اور شاید یہی وہ وقت تھا جب تم دوسرے کمرے سے سانپ سے ڈر کر بھاگ نکلے تھے اور پھر جب میں اس راستے سے مایوس ہوئی تو میں نے اس قبر والے راستے کو چیک کرنا چاہا کیونکہ میں نے سرنگ میں داخل ہونے کے لیے مدھم سی روشنی کی کرنیں تہہ خانے سے اس قبر تک کا راستہ ایک چھوٹی سی سرنگ سے ہو کر آتا ہے۔ تاکہ چلوں کہ باقی تہہ خانے میں آکسیجن کا بہترین سسٹم موجود ہے۔ اس کے لیے انہوں نے اوپر بنے ہوئے کچے گھر کی چھت پر سولر سسٹم کی پلیٹیں لگا رکھی ہیں جس کی بجلی سے اندر تہہ خانے کا سارا انتظام چل رہا ہے۔ بہرحال جب میں یہاں پہنچی تو میں نے تمہیں دیکھا تو میں تمہیں بھی انہی کا کوئی ساتھی سمجھی اور مخبوط الحواسی میں تم پر حملہ کر بیٹھی۔ جس کے لیے میں تم سے معذرت خواہ ہوں۔"

بابا دینے شاہ یہاں اس جگہ کا ایک پہنچا ہوا ولی مانا جاتا ہے۔ باہر جو مزار ہے اس کا اس مزار سے کوئی تعلق نہیں مگر وہ اپنے آپ کو اس کی نسل سے بتاتا ہے۔ مجھے نہیں معلوم کہ وہ کب سے یہاں مقیم ہے اور سادہ لوح لوگوں کو لوٹ رہا ہے۔ اب وہ چاہتا ہے کہ میں اس سے شادی کر لوں اور اس کے ساتھ رہوں مگر میں اس پر راضی نہیں ہو رہی اور وہ کہتا ہے کہ اسے بھی کوئی جلدی نہیں۔ ایک نہ ایک دن میں اس سے شادی کرنے پر راضی ہو ہی جاؤں گی۔ اصل میں یہ ایک ڈاکوؤں اور لٹیروں کا گروہ ہے جو اس مزار کی آڑ میں چھپ کر یہ ساری کارروائیاں

کر رہا ہے۔ شہر سے دور دراز اس گاؤں میں کون اتنا خیال کرتا ہے اور پھر ایک ولی کی درگاہ کے متولی کے بارے میں تو ایسا ویسا سوچنا بھی یہاں گناہ اور پاپ کے زمرے میں آتا ہے۔

☆☆☆......

صائمہ کی مختصر بیانی ختم ہو چکی تھی۔ اوپر شاید آندھی اب بھی زوروں پر تھی۔ ایک بات کی مجھے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ وہ قبر جس سے میں نیچے اس تہہ خانے میں گرا تھا تو اس میں اچھا بھلا خلا تھا جو کہ اب کہیں نظر نہیں آ رہا تھا۔ یہ خلا شاید اسی وقت کسی میکنزم سے بند ہو گیا تھا جب میں اس قبر کی تہہ میں گرا تھا۔ صائمہ کی معیت میں موم بتی کی روشنی میں میں نے اوپر کا جائزہ لیا۔ واقعی قبر بند ہو چکی تھی اور اب اگر کوئی نیچے سے دیکھتا بھی تو اسے پہلی نظر میں یہ معلوم ہی نہ ہو پاتا کہ وہاں سے اوپر قبر کے ذریعے جایا جا سکتا ہے۔ البتہ اوپر لوہے کے سریے کا ایک جال سا بچھا ہوا تھا۔ جس کے اوپر سنگ مرمر کی پلیٹ نظر آ رہی تھی۔

اس تہہ خانے میں ایک کچن اور دو کمرے بنے ہوئے تھے۔ جانے یہ کیسے ان لوگوں نے تعمیر کروایا تھا؟ اور اسے کن لوگوں نے تعمیر کیا ہوگا؟ لازمی بات ہے اس کے لیے انہوں نے باہر ہی سے کسی کو بلایا ہوگا اور تہہ خانے کی تعمیر کے بعد جانے اس کے ساتھ کیا کیا ہوگا۔ اسے زندہ چھوڑا یا مار ڈالا۔ ایسے لوگوں سے کچھ بھی بعید نہ تھا۔ بہر حال ابھی تو یہ سب سوچنا فضول تھا۔ اس وقت یہاں سے نکلنا ہمارے لیے بہت ضروری تھا۔ بابا دینے شاہ اور اس کے حواری شاید یہاں سے صرف اور صرف سیلابی ریلے کے ڈر کی وجہ ہی سے نکلے ہوں گے اور انہوں نے یہاں ایک فضول اور بے کار سے پاگل ملنگ کو صائمہ کی ڈیوٹی پر لگا دیا ہوگا۔ یہ دونوں لوگ ان کے لیے بیکار اور فضول ہی تھے۔ اسی لیے وہ انہیں یہاں مرنے کے لیے چھوڑ کر چلے گئے۔

باہر جو ولی کے مزار پہ دیا جل رہا تھا وہ بھی شاید اسی پاگل ملنگ ہی کا کارنامہ ہوگا مگر سوچنے کی بات یہ تھی کہ میں جب سے یہاں آیا تھا میں اسے کیوں نہیں دیکھ پایا۔ یا پھر اس ملنگ نے مجھے کیوں نہیں دیکھا؟ اور اگر اس نے مجھے دیکھا تھا تو پھر کچھ کہا کیوں نہیں؟ شاید وہ پاگل شخص اپنی ہی دھن میں مگن رہنے والا شخص تھا اور اس نے مجھے دیکھا تو میرے بارے میں کچھ غلط سوچا ہی نہیں۔ میں نے دربار اور مزاروں پہ کئی ایسے مجذوب الحواس لوگوں کو دیکھا ہے جنہیں لوگ اکثر کوئی پہنچا ہوا ولی یا بزرگ سمجھتے ہیں مگر درحقیقت ان میں سے زیادہ تر تعداد ایسے لوگوں کی ہوتی ہے جو کہ کسی نہ کسی دماغی عارضے میں مبتلا ہوتے ہیں اور ان لوگوں کو ماننے والے اتنے باشعور نہیں ہوتے کہ انہیں یا ان کی حقیقت کو پا سکیں اور اگر کوئی ان کی حقیقت کے بارے میں جانتا بھی ہے تو وہ صاحب مزار کی اندھی عقیدت میں خاموش رہتا ہے اور لوگوں کو کچھ نہیں بتاتا اور بالفرض اگر کوئی یہ جرأت کر بھی بیٹھے تو ماننے والے عقیدت مند ان کی بات سننے کی بجائے ایسا کہنے والے ہی کو کافر قرار دے دیتے ہیں۔ بہر حال یہ تو ہمارے معاشرے کا المیہ ہے۔ ایسے لوگوں کے بارے میں دعا ہی کی جا سکتی ہے کہ اللہ پاک ایسے لوگوں کو ہدایت نصیب فرمائے۔

قبر سے نکلنے کا راستہ بند ہو چکا تھا۔ یقیناً یہ کوئی میکنزم ہی تھا جس کے ذریعے قبر کے اوپر لگی سنگ مرمر کی پلیٹ ایک طرف ہٹ جاتی ہوگی اور بندہ قبر کے اندر داخل ہو جاتا ہوگا اور قبر میں داخل ہونے کے بعد یہ کسی طریقے سے بند بھی ہوتا ہوگا۔ جس کی فی الوقت مجھے سمجھ نہیں آ رہی تھی۔ میں نے بہت کوشش کی مگر قبر کے اوپر موجود سلیٹ اپنی جگہ سے نہیں ہلی۔ اس سلیٹ کو توڑا بھی جا سکتا تھا مگر اس سلیٹ کے کچھ ہی نیچے لوہے کے موٹے سریے کا جال بچھا ہوا تھا جسے کسی بھی صورت اپنی جگہ سے ہلایا نہیں جا سکتا تھا۔ حقیقت میں اسی جال ہی

سے کوئی میکنزم منسلک تھا جو کہ اس سلیٹ کو اوپر نیچے کرنے کا کام کر رہا تھا مگر فی الحال مجھے اس کی کوئی سمجھ نہیں آ رہی تھی۔ اس تہہ خانے میں ایک اور بات جو میری سمجھ سے باہر تھی کہ یہاں تازہ ہوا کی کوئی کمی نہ تھی۔ آخر اس کا منفذ کہاں تھا؟ یہ بھی سوچنے والی بات تھی کہ وہاں سے مجھی نکالا جا سکتا تھا۔ اوپر کمرے والے راستے کو چیک کیا تو پتا چلا کہ وہ بھی مضبوط اور پائیدار تھا۔

تہہ خانے میں داخل ہوتے ہی سب سے پہلے میں نے ہڈ ولمنگ کی لاش کو گھسیٹ کر قبر کی طرف جانے والی سرنگ میں دھکیل دیا اور اس کے بعد تسلی سے یہاں سے نکلنے کے بارے میں سوچنے لگا۔ تہہ خانے میں ہر جگہ پر انرجی سیور لگے ہوئے تھے جن سے پورا تہہ خانہ روشن ہو رہا تھا۔ البتہ اوپر موجود کمرے میں کوئی بلب سرے سے لگانے کی زحمت ہی نہیں کی گئی تھی۔ بہر حال یہاں سے نکلنے کے بارے میں سوچا جا سکتا تھا مگر اس میں کافی دیر لگنے کے امکانات تھے۔ پکی دیواریں توڑ کر یا پھر چھت پھاڑ کر یہاں سے نکلنے کی کوشش کی جا سکتی تھی مگر اس وقت مجھے بھوک بہت لگی ہوئی تھی اور میں دیکھ چکا تھا کہ تہہ خانے میں کھانے پینے کا وافر سامان موجود ہے۔ صائمہ کی مدد سے مجھے یہ معلوم تہہ خانے سے منسلک باہر والے کمرے تک لانا پڑا۔ وہاں سوکھی لکڑیاں اور چولہا موجود تھا۔ وہاں پہ میں نے گزارے لائق کھانا پکایا اور صائمہ اور میں نے ڈٹ کر کھایا۔ پیٹ میں مناسب غذا پہنچی تو مجھ پر کچھ غنودگی سی طاری ہونے لگی اور مجھے دیر کے لیے میری آنکھ سی لگ گئی۔ جانے کب صائمہ نے مجھے جھنجھوڑ کر جگایا۔ آنکھ کھلی تو میں نے دروازے کی درزوں سے باہر دیکھا۔ سورج نکل آیا تھا اور اس کی مدھم سی روشنی لکڑی کے موٹے دروازے کی درزوں سے چھن چھن کر اندر آ رہی تھی۔ باہر درختوں پر مختلف قسم کے پرندوں کے چہچہانے کی آوازیں بھی سنائی دے رہی تھیں۔ گویا دنیا میں اک نئے دن کا آغاز ہو چکا تھا۔

ایک طویل انگڑائی لینے کے بعد میں بیدار ہوا تو صائمہ نے مجھے خشک دودھ سے بنی چائے پیش کی۔ چائے پی کر میری رہی سہی سستی بھی جاتی رہی۔ گزشتہ رات مجھ پر بہت بھاری گزری تھی اور میں کم از کم آج کی رات یہاں نہیں گزارنا چاہتا تھا۔ جیسے بھی ہو مجھے ہر حال میں آج یہاں سے نکلنا تھا اور پھر اب تو مجھ پر ایک اور بھی ذمہ داری آن پڑی تھی اور مجھے یہ ذمہ داری بھی نبھانا تھی۔

ہم دونوں ایک دفعہ پھر سے تہہ خانے میں جا پہنچے۔ سولر انرجی سے چلنے والی بیٹریاں کام کر رہی تھیں۔ میں نے تہہ خانے میں موجود کئی انرجی سیورز آن کر دیے اور ان کی روشنی میں اپنی مطلوبہ چیزوں کی تلاش کا عمل جاری کیا مگر تلاش بسیار کے باوجود مجھے اپنے مقصد میں کامیابی نہ ہو سکی۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ یہ چیزیں یہاں نہ ہوں۔ یہ ایک بہت بڑا قبرستان ہے اور یہاں کسی کدال، بیلچہ اور کلہاڑی نہ ہو؟ یا پھر سیلاب کے آنے سے پہلے یہ لوگ جب یہاں سے نکل رہے تھے تو ایسی ساری چیزیں ساتھ لے گئے ہوں؟ عجیب بات ہے کہ وہ دو زندہ انسانوں کو یہاں مرنے کے لیے چھوڑ گئے اور ایسی چیزیں ساتھ لے گئے جو کہ دنیا کے بازار سے روپے پیسے سے آسانی سے مل جاتی ہیں۔ کتنا سستا ہوتا جا رہا ہے انسان اور کتنی مہنگی ہوتی جا رہی ہیں انسانی ضروریات۔

بہر حال اسی تلاش اور تگ و دو کے دوران اک اور عجیب انکشاف ہوا۔ جب میں ہر طرف سے مایوس ہو گیا تو صرف ایک ہی جگہ بچی تھی اور وہ تھی ایک کمرے میں موجود لوہے کی الماری جسے چابی کا مضبوط تالا لگا ہوا تھا۔ اسے چابی کے بغیر کھولنا آسان نہیں تھا مگر اسے کھولے بنا بھی چارہ نہیں تھا کیونکہ اب یہی میری آخری امید رہ گئی تھی۔ تہہ خانے میں ایک جگہ سے مجھے لوہے کے سریے کا ایک مضبوط ٹکڑا ملا تھا۔ میں نے اسی کو تالے

پہ مارنا شروع کیا مگر کافی کوشش کے بعد بھی تالا نہیں ٹوٹا۔ اس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ میں اس سے درست انداز میں تالے کو ہٹ ہی نہیں کر پا رہا تھا دوسرے تالے کو جونہی چوٹ لگتی وہ ادھر ادھر ہو جاتا۔ بہرحال مجھے تالے کا کچھ نہ کچھ کرنا تو تھا ہی۔ اچانک مجھے ایک خیال آیا اور میں چونک پڑا۔ جتنی محنت میں نے تالے پر کی تھی اس سے کہیں کم محنت میں اس الماری کی اس کنڈی کے قبضوں کو اکھیڑا جا سکتا تھا جس کنڈی پر تالا لگا ہوا تھا۔ تالے پر چوٹ پڑنے کی وجہ سے پہلے ہی یہ کچھ ڈھیلے ہو چکے تھے۔ اب میں نے اس پر تھوڑی سی اور محنت کی تو کنڈی تالے سمیت زمین پہ آرہی۔

صائمہ۔ جو کہ اس وقت میری ساری کارروائی دیکھ رہی تھی۔ وہ بھی میری اس کامیابی سے خوش ہوئی مگر جونہی میں نے الماری کا تالا کھولا تو میری امیدوں پہ پانی پھر گیا۔ اس الماری میں کچھ زنانہ اور کچھ مردانہ سوٹ لٹکے ہوئے تھے۔ یہاں کوئی بھی ایسی چیز نہ تھی جو کہ ہمیں اس تہہ خانے سے باہر نکلنے میں مدد دے سکتی۔ مایوسی کی شدت سے میں نے غصے میں آکر الماری کو لات ماری۔ چوٹ سے میرا پاؤں جھنجھنا اٹھا مگر اس سے جو ہوا اسے دیکھ کر صائمہ اور میں حیرت سے مبہوت رہ گئے۔

ابھی تک ہم نے اس پر تو غور ہی نہیں کیا تھا کہ یہ الماری دیوار میں فکس تھی۔ جونہی میں نے غصے میں الماری کو لات رسید کی تو الماری عقب کی طرف سے کھل گئی اور ہمیں دیوار کے دوسری طرف بھی ایک کمرہ نظر آیا۔ یہ سب کچھ دیکھ کر تو میں پاؤں کی چوٹ بھی بھول گیا اور جلدی سے اس کمرے میں داخل ہوا۔ میرے پیچھے صائمہ نے بھی میری تقلید کی۔ جونہی ہم کمرے میں داخل ہوئے ہمارے سر پہ تو جیسے حیرتوں کے پہاڑ ٹوٹ پڑے۔

اس کمرے میں ایک لیپ ٹاپ کے ساتھ عجب سا الیکٹرانک سسٹم جڑا ہوا دکھائی دے رہا تھا۔ جس کے ہاتھوں مجبور ہو کر میں نے لیپ ٹاپ آن کر دیا۔ کمپیوٹر کے بارے میں میرا علم تو واجبی سا تھا مگر صائمہ اس کے بارے میں کچھ نہیں بلکہ بہت کچھ جانتی تھی۔ اس نے لیپ ٹاپ سے چھیڑ خانی شروع کی تو اس نے پاس ورڈ مانگا۔ گویا پاس ورڈ کے بغیر اس سے کسی قسم کی معلومات کا حصول ناممکن تھا۔ میں نے حیرت کی نظر سے صائمہ کی طرف دیکھا تو اس نے مجھے آنکھوں ہی آنکھوں میں باہر نکلنے کا اشارہ کیا۔ باہر نکلتے ہی اس نے الماری کو بند کر دیا اور مجھے بازو سے پکڑ کر دوسرے کمرے میں لے جا کر بولی۔

"اقبال! ابھی تو یہی تھی کہ یہ لوگ اغوا کار، ڈاکو اور لٹیرے ہیں مگر یہاں اس تہہ خانے میں ہائی فائی لیپ ٹاپ اور اس سے جڑا سسٹم دیکھ کر تو مجھے کچھ اور ہی محسوس ہو رہا ہے۔ میں اسی لیے تمہیں وہاں سے خاموشی سے یہاں لے آئی ہوں کیونکہ مجھے شک سا محسوس ہو رہا ہے کہ اس کمرے میں اگر اتنا کچھ ہے تو پھر کوئی خفیہ کیمرہ بھی یقینا موجود ہوگا۔ جس سے یقینا یہاں کی مانیٹرنگ کی جا رہی ہوگی اور وہاں ہونے والی آوازیں بھی کہیں سنی جا رہی ہوں گی ویسے تو ہو سکتا ہے انہوں نے سارے تہہ خانے کے کمروں کو مانیٹر کرنے کا کوئی نہ کوئی انتظام کر رکھا ہو مگر جہاں تک میری معلومات کا تعلق ہے تو میرے خیال میں یہ صرف اور صرف لیپ ٹاپ والے کمرے میں ہی ہے اور مجھے شک نہیں سو فیصد یقین ہے کہ کمپیوٹر والے کمرے کا استعمال صرف اور صرف ایک ہی بندہ کرتا ہے اور اس کے بارے میں اس کے ساتھیوں کو بھی معلوم نہیں ہے اور یہ صرف اور صرف بابا دینے شاہ ہو سکتا ہے اس کے علاوہ کوئی نہیں۔"

"صائمہ! تمہارے خیال کے مطابق یہ دینے شاہ کون ہو سکتا ہے؟" میں نے حیرت سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"اصل بات کا پتہ تو لیپ ٹاپ آن ہونے کے بعد

ہی چل سکتا ہے مگر اس کے لیے اس کا پاس ورڈ توڑنا پڑے گا اور میں یہ کر تو سکتی ہوں مگر اس میں کچھ وقت لگے گا مگر اس سے بھی پہلے اگر ہم کر سکیں تو ہمیں ایک کام کرنا ہے۔ خفیہ کیمرے اگر کہیں لگے ہوئے ہیں تو ہمیں سب سے پہلے ان کا کوئی نہ کوئی حل کرنا ہے گو کہ اس جگہ کے چاروں طرف سیلاب نے تباہی پھیلا رکھی ہے مگر میرے یقین کے مطابق وہ لوگ یہاں سے زیادہ دور نہیں ہوں گے اور اگر انہیں پتہ چل گیا تو وہ ہمیں یہاں سے کسی بھی صورت نکلنے نہیں دیں گے اور میں جلد از جلد اس دوزخ سے نکل جانا چاہتی ہوں۔" صائمہ نے مجھے سمجھاتے ہوئے کہا۔

"دیکھو صائمہ! میں وعدہ کرتا ہوں کہ تمہیں یہاں سے ہر حال میں نکال کر کسی ایسی جگہ تک ضرور پہنچا دوں گا جہاں سے تم آسانی سے اپنے گھر تک پہنچ جاؤ مگر کیا اس طرح سے تمہارے لیے خطرات اور نہیں بڑھ جائیں گے!! اور ان لوگوں کے لیے تم سب سے بڑا خطرہ ہو اور یہ لوگ تمہارے زندہ رہنے کا خطرہ کبھی مول نہیں لیں گے۔ ہمیں اس پورے گروہ کا خاتمہ کرنا ہے تاکہ تم آزادی سے اپنی دنیا میں جا کر جی سکو۔" میں نے صائمہ کو سمجھاتے ہوئے کہا۔

اس کے بعد میں اور صائمہ ایک بار پھر سے کمپیوٹر روم میں داخل ہوئے۔ میں نے صائمہ کے ساتھ مل کر آخر کار کیمرہ تلاش کر ہی لیا۔ کیمرے کے لینس پر میں نے موٹی تہہ والا کاغذ چسپاں کر دیا جو کہ ٹیپ اسی کمرے سے مل گیا تھا۔ اب خاموشی سے ہم نے اپنا کام شروع کیا۔ لیپ ٹاپ اسٹارٹ کر کے صائمہ اس کا پاس ورڈ توڑنے میں مصروف ہو گئی مگر اس سے پہلے کہ وہ اس میں کامیاب ہو پاتی مجھے تہہ خانے کے اوپر سے کچھ عجیب سی آوازیں سنائی دیں۔ مجھے یوں محسوس ہوا کہ جیسے کہیں دور سے کسی گاڑی کے انجن کے گھڑ گھڑانے کی آواز سنائی دے رہی ہو۔ میں نے صائمہ کو اپنے کام

میں مصروف رہنے کا اشارہ کیا اور خود تہہ خانے کی سیڑھیاں چڑھ کر اوپر والے کمرے میں چلا گیا۔ یہاں پر یہ آواز بہت ہی صاف سنائی دے رہی تھی۔ اس قبرستان میں تو کوئی گاڑی نہیں تھی تو پھر یہ آواز کیسی ہے؟ اور پھر یہ آواز بھی انتہائی قریب کی تھی اچانک میرے دل میں خیال آیا کہ ہو نہ ہو یہ کسی بوٹ کی آواز تھی مگر اس دریا میں بوٹ کا کیا کام؟ اور یہ کون لوگ تھے جو کسی بوٹ پہ سوار اس سیلاب زدہ علاقے میں پھر رہے تھے۔ یہ سوچتے ہی میرا خیال آپون آپ پاک فوج کی جانب چلا گیا۔ ہو سکتا ہے پاک فوج ہی اس علاقے کا دورہ کر رہی ہوں مگر یہ آواز آہستہ آہستہ دور ہوتی جا رہی تھی اور پھر کچھ ہی دیر میں یہ آواز بالکل ہی معدوم ہو گئی۔ شاید وہ لوگ آگے کہیں نکل گئے تھے۔

میں دوبارہ سے تہہ خانے میں ابھی پہنچا ہی تھا کہ صائمہ نے میری طرف انتہائی خوشی سے دیکھا اور وکٹری کا نشان بنایا۔ لگتا تھا اس نے پاس ورڈ توڑ لیا تھا۔ یہ بہت خوشی کی بات تھی۔ اب کم از کم ان لوگوں کی حقیقت کے بارے میں کچھ نہ کچھ پتہ چل سکتا تھا۔ صائمہ کئی قسم کی فائلیں چیک کر رہی تھی۔ ان میں اندار وشمار کے علاوہ بھی کئی فائلیں موجود تھی۔ اچانک صائمہ نے ایک فولڈر کو ڈبل کلک کر کے کھولنا چاہا تو اس نے پاس ورڈ مانگا۔ تھوڑی دیر سر کھپانے کے بعد آخر کار صائمہ نے یہ معرکہ بھی سر کر ہی لیا۔ یہ سب دیکھ کر مجھے یقین ہو گیا کہ صائمہ واقعی کمپیوٹر ایکسپرٹ تھی۔

اس فولڈر کے کھلنے سے کئی فائلیں کمپیوٹر اسکرین پر ظاہر ہوئیں۔ میں انتہائی محویت کے عالم میں کمپیوٹر کی طرف دیکھ ہی رہا تھا کہ باہر ایک دفعہ پھر سے وہی کسی موٹر بوٹ کے انجن کا شور سنائی دیا۔ میں نے صائمہ کو کندھوں سے دبایا اور اسے اپنا کام جاری رکھنے کا کہہ کر ایک بار پھر سے اوپر والے کمرے میں چلا گیا۔ ایک دفعہ پھر سے وہی شور سنائی دیا اور پھر کچھ ہی دیر بعد یہ شور

پہلے کی طرح معدوم ہوتا چلا گیا۔ مجھے یقین ہو گیا کہ یہ واقعی پاک فوج کے جوان تھے جو کہ اس علاقے کا دورہ کر رہے تھے۔ میں نے سر جھٹکا اور ایک بار پھر تہہ خانے کے کمپیوٹر روم میں جا پہنچا۔ صائمہ نے مجھے دیکھتے ہی لیپ ٹاپ بند کر دیا اور مجھے کمرے سے باہر نکلنے کا اشارہ کیا۔

دوسرے کمرے میں پہنچ کر صائمہ نے جو انکشافات کیے انہیں سن کر تو جیسے آسمان پورے بوجھ کے ساتھ میرے سر پر آن گرا۔

"اقبال! میں کچھ زیادہ تو نہیں جان سکی کیونکہ ہر فائل ہی کسی نہ کسی پاس ورڈ کے تالے میں بند ہے اور وقت انتہائی کم ہے۔ لیپ ٹاپ میں موجود تمام ڈیٹا کو جاننے کے لیے کسی آئی ٹی ماہر کی ضرورت ہے جو کہ میں نہیں ہوں مگر اتنا میں یقین سے کہہ سکتی ہوں کہ اس لیپ ٹاپ میں جو ڈیٹا ہے وہ کسی محب وطن پاکستانی کا نہیں۔ مجھے شک نہیں بلکہ پختہ یقین ہے کہ یہ کسی انڈین جاسوس کے زیر استعمال ہے۔" صائمہ نے انتہائی پراسرار انداز سے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"صائمہ! اگر یہ سچ ہے تو پھر ہم اس وقت انتہائی خطرے میں ہیں۔ جیسے بھی ہو ہمیں جلد از جلد یہاں سے نکل کر پاکستانی آرمی کو ان کی اطلاع کرنا چاہیے۔" میں نے صائمہ کو درپیش خطرے سے آگاہ کرتے ہوئے کہا۔

"تو پھر جلدی یہاں سے نکلنے کی کوئی سبیل کرو۔" صائمہ نے خوف زدگی سے کہا۔

"صائمہ! یہاں سے نکلنے کے دو ہی راستے ہیں اور وہ بند ہیں۔ قبر کی طرف سے نکلنے کے بارے میں سوچنا ہی فضول ہے کیونکہ وہاں میں اپنی تسلی کر چکا ہوں۔ اس راستے سے شاید اوپر سے نیچے تو آیا جا سکتا ہے مگر نیچے سے اوپر نہیں جایا جا سکتا۔ آ جا کے ایک ہی راستہ بچتا ہے اور وہ ہے اوپر کمرے والا راستہ مگر کمرے کا دروازہ باہر سے تالا لگا کر بند کر دیا گیا ہے۔ باہر نکلنے کی اب ایک ہی صورت رہ جاتی ہے کہ کسی نہ کسی طریقے سے باہر موجود کمرے کی کچی دیوار کو توڑ دیا جائے اور یہ کسی ہتھیار ہی سے ممکن ہے جو کہ فی الحال یہاں سے نہیں مل رہا۔ ہاں البتہ لوہے کے سریے کی مدد سے میں اسے توڑنے کی کوشش کرتا ہوں۔" میں نے صائمہ سے کہا۔

یہ کہہ کر میں وہاں سے اٹھا تو صائمہ نے مجھ سے کہا۔

"تم اوپر چلو۔ میں بند رستے لیپ ٹاپ اور اپنے اور تمہارے باپ کے کچھ سوٹ اٹھا لوں۔" یہ کہہ کر وہ کمپیوٹر روم کی طرف بڑھی۔

میں نے لوہے کے موٹے سریے کا ٹکڑا اٹھایا اور اوپر کمرے کی طرف بڑھا۔ ابھی میں سیڑھیوں پر ہی تھا کہ اندر تہہ خانے والے کمرے سے انتہائی تیز الارم نما آواز گونجی۔ میں گھبراتے ہوئے کمرے کی طرف بھاگا۔ جانے یہاں کیا ہو گیا تھا! میں جونہی وہاں پہنچا تو میں نے دیکھا صائمہ حیرانی کے عالم میں کمپیوٹر روم کی طرف تکے جا رہی تھی اور کمپیوٹر روم میں اس وقت سرخ رنگ کی تیز روشنی پھیلی ہوئی تھی اور اسی کمرے میں ایک جگہ سے الارم نما تیز آواز سنائی دے رہی تھی۔

"کیا ہوا صائمہ؟ یہ سب کیا ہے؟ یہ تیز ہارن کی آواز اور لال رنگ کی تیز روشنی؟" میں نے گھبراتے ہوئے صائمہ سے چلا کر پوچھنے کی کوشش کی۔

"اقبال! میں ابھی وہاں سے لیپ ٹاپ اٹھا کر نکلنے ہی والی تھی کہ کمپیوٹر روم میں موجود سرخ رنگ کا بلب جلنے لگا اور اس کے ساتھ ہی یہ تیز الارم بھی بجنے لگا ہے۔" صائمہ نے بھی چلاتے ہوئے کہنے کی کوشش کی کیونکہ تیز ہارن کی آواز کی وجہ سے کچھ بھی سنائی نہیں دے رہا تھا۔

اچانک ہی میرا ماتھا ٹھنکا اور میں نے صائمہ کا ہاتھ مضبوطی سے پکڑا اور تہہ خانے کی سیڑھیوں کی طرف بھاگا۔ اوپر کمرے میں پہنچتے ہی میں نے چلاتے ہوئے پکارا۔

کوئی ہے؟ پلیز ہماری مدد کرو کوئی ہے...... کوئی ہے..... کوئی ہے؟" اس کے ساتھ ہی زور زور سے میں نے دروازہ کھٹکھٹایا۔

اس دوران صائمہ بھی شاید آنے والے خطرے سے آگاہ ہو چکی تھی اور وہ بھی میرے ساتھ چلانے میں برابر کی شریک تھی۔

الارم کی آواز تہہ خانے میں مسلسل گونج رہی تھی۔ چار سو پھیلے ویران قبرستان کے جنگل میں، جس کے چاروں طرف سیلابی ریلے نے تباہی مچا رکھی تھی۔ ہر سو دور دور تک پانی ہی پانی دکھائی دیتا تھا اور دور تک کسی بھی آدم زاد کے ہونے کا خیال بھی محال تھا۔ ایسے میں کون ہماری مدد کو آنے والا تھا۔ مدد کے لیے چلاتے ہوئے دو مجبور انسان شاید کچھ ہی لمحوں میں ہلاک ہونے والے تھے۔ سرخ رنگ کی روشنی اور تیز الارم کی آواز نے واضح کر دیا تھا کہ چند ہی لمحوں میں یہ جگہ دھماکوں سے اڑنے والی تھی۔ شاید نہیں یقیناً لیپ ٹاپ کے نیچے کوئی بٹن تھا جو کہ لیپ ٹاپ اٹھانے سے پریس ہو گیا تھا۔ صاف ظاہر ہے اس کا انتظام انہی لوگوں نے کیا ہوگا جو جانتے تھے کہ کمپیوٹر روم میں کوئی داخل ہوا اور اگر کوئی یہاں داخل ہو جائے اور لیپ ٹاپ اٹھا کر یہاں سے نکلنا چاہے تو زندہ بچ کر باہر نکل نہ پائے تا کہ ان کا راز راز ہی رہے۔ میں نے دیکھا وہ لیپ ٹاپ اب بھی صائمہ کے ہاتھوں میں تھا اور پھر اچانک ہی کان پھاڑ دینے والا پہلا دھماکہ سنائی دیا۔ در و دیوار لرز اٹھے اور اسی لمحے میں نے دروازے کو ہلتے ہوئے دیکھا۔ صائمہ ڈر کے مارے مجھ سے یوں لپٹی کہ جیسے مجھ میں سما جانا چاہتی ہو۔ دیواریں ہلیں اور مجھے یوں لگا کہ جیسے چھت ہم پر گرنے والی ہو اور اس کے ساتھ ہی دروازے کے سامنے والی دیوار دھڑام سے گری اور چھت نیچے کی طرف جھکی مگر اس وقت ہم چونکہ دروازے کی سمت موجود تھے اور وہ دیوار ابھی تک نہیں گری تھی۔ اس لیے ہم محفوظ رہے۔ دوسری سمت چھت کے گرنے کی وجہ سے ایک خلا نمودار ہو گیا تھا۔ کوئی لمحہ جاتا تھا کہ ہماری طرف والی دیوار بھی گر جاتی اور ہم بھی ملبے تلے دب جاتے۔ اسی لمحے میں نے ایک خطرناک فیصلہ کیا اور جس طرف چھت گری تھی اس سمت سر نیچے کیے بڑھا۔ صائمہ نے مجھے مضبوطی سے تھام رکھا تھا۔ میں نے سرکنڈوں سے بنی سرکی جو کہ ایک جگہ سے زبردست دھکا لگنے کی وجہ سے ٹوٹ چکی تھی اسے انتہائی تیزی سے ایک طرف کو ہٹایا اور باہر چھلانگ لگا لی۔ صائمہ نے بھی میری تقلید کی۔ دوسرے ہی لمحے ہم چھت گرنے کی وجہ سے نمودار ہونے والے خلا سے باہر تھے اور اسی لمحے زوردار دھماکہ ہوا اور دونوں کمروں کی چھت نیچے آن گری۔ مجھے اور صائمہ کو ایک زبردست جھٹکا لگا اور ہم دونوں چھت کے ملبے سے دور جا گرے۔ گرتے ہی میں نے ہوش و حواس قائم رکھتے ہوئے صائمہ کو مضبوطی سے پکڑا اور اٹھ کر مزار کی سمت بھاگا۔ پھر تو جیسے وہاں قیامت سی برپا ہو گئی۔ پے در پے دھماکے ہونے لگے۔ مزار کے قریب پہنچتے ہی ہم زمین پر لیٹ گئے۔

⁂

اف خدا کی پناہ۔ یہاں بہت بڑی تباہی ہوئی تھی۔ اس تہہ خانے کے اوپر ایک جگہ پہ بہت سی پہاڑی کیکر کی خشک لکڑیاں پڑی ہوئی تھیں اور دھماکوں کی وجہ سے ان میں بھی آگ لگ گئی تھی جسے میں نے بڑی مشکل سے صائمہ کے ساتھ مل کر آگے بڑھنے سے روکا تھا ورنہ آگ اتنی بھڑک چکی تھی کہ یہ پورے قبرستان کی جھاڑ جھنکار کو اپنی لپیٹ میں لے سکتی تھی۔ وہ تو شکر ہے کہ پانی کا نالا قریب ہی تھا اور وہاں ایک پلاسٹک کی بالٹی بھی پڑی ہوئی تھی جس سے ہم نے بالٹیاں بھر بھر کے آگ کے ارد گرد پانی چھڑکا اور آگ کو آگے بڑھنے سے روکا۔ جس جگہ یہ بکی مٹی اور گارے کا گھر بنا ہوا تھا وہ جگہ کافی نیچے

تک گہرائی میں دھنس چکی تھی۔ پورا تہہ خانہ اور پھر اس وقت ملبے کے ڈھیر میں تبدیل ہو چکا تھا۔ ابھی ہم آگ پر بمشکل کنٹرول کر ہی پائے تھے کہ ایک بار پھر کہیں دور سے موٹر بوٹ کے انجن کی گھڑگھڑاہٹ سنائی دی۔ شاید یہ وہی بوٹ تھی جو پہلے بھی یہاں سے گزر کے گئی تھی۔

اس وقت پہاڑی کیکر کی خشک لکڑیاں جل کر سرخ انگاروں میں تبدیل ہو رہی تھیں۔ اس قبرستان کے درختوں پر رہائش پذیر پرندے جن میں زیادہ تر تعداد کوؤں کی تھی۔ وہ کائیں کائیں کا شور بلند کرتے ہوئے فضا میں چکر کاٹ رہے تھے۔ اس طرف آنے والی موٹر بوٹ کا شور لحہ بہ لحہ بڑھتا جا رہا تھا۔ میں اس وقت عجیب سی کشمکش کا شکار ہو رہا تھا۔ میرے لیے یہاں سے بھاگ جانا بھی ناممکن تھا اور اگر میں وہاں رک جاتا اور آنے والی موٹر بوٹ پر پنجاب پولیس کے لوگ ہوتے تو وہ مجھے دیکھتے ہی شوٹ کرنے کو ہی ترجیح دیتے۔ البتہ اگر یہ پاکستان آرمی ہوتی تو وقتی طور پر میرے لیے کوئی خطرہ نہیں تھا کیونکہ یہ لوگ علاقے میں سیلاب زدگان کی مدد کے لیے آئے ہوئے تھے اور علاقے کے اشتہاریوں اور پولیس کے مفروروں کو نہیں جانتے تھے۔ یہی سب سوچتے ہوئے میں نے صائمہ کو کچھ باتیں جلدی جلدی سمجھائیں اور خود مزار کے قریبی شیشم کے بڑے درخت پر چڑھ گیا۔ درخت کے اوپر چڑھتے ہی چاروں طرف دور دور تک کی لوکیشن میری نظروں میں آ گئی۔ میں نے موٹر بوٹ کے شور والے علاقے کی طرف دیکھا تو مجھے قبرستان سے کچھ ہی دوری پر ایک موٹر بوٹ آتی دکھائی دی جو کہ آہستہ آہستہ قبرستان سے قریب ہوتی جا رہی تھی۔ میں نے دیکھا اس میں پاک آرمی کے جوان سوار تھے۔ میرے سینے سے سکون کی ایک لمبی سانس خارج ہوئی۔ پاک آرمی کے جوانوں سے فی الحال مجھے کوئی خطرہ نہیں تھا۔

میں نے اوپر سے ہی صائمہ کو اشارہ کیا اور جلدی سے نیچے اتر آیا۔ اتنے میں پاک آرمی کے جوان بھی موٹر بوٹ بند کر کے کسی جھاڑی سے باندھنے کی کوشش کرتے ہوئے نظر آئے۔ میں انتہائی خود اعتمادی سے ان کی طرف بڑھا۔ پاک فوج کے جوانوں نے جونہی مجھے دیکھا تو وہ بہت حیران ہوئے۔ ان میں سے ایک جوان جو کہ شاید ان کا کمانڈر تھا اس نے مجھ سے پوچھا۔

"ہیلو ینگ مین! تم یہاں پر کیسے موجود ہو جبکہ ہم نے تو ایک ہفتہ پہلے یہاں سے سبھی کو محفوظ مقام کی طرف روانہ کر دیا تھا۔ تم یہاں پر کیسے رہ گئے اور کیا تمہیں نہیں معلوم تھا کہ سیلابی ریلا آنے والا ہے اور یہ جگہ قطعاً محفوظ نہیں۔"

میں نے اسے ادب سے سلام کیا اور مختصراً ایک جھوٹی من گھڑت کہانی سنائی۔ جس پر شاید انہوں نے یقین کیا یا نہیں اور مجھے ان کے یقین کرنے یا نہ کرنے سے کوئی غرض بھی نہیں تھی اور شاید ان لوگوں کے پاس بھی اتنا وقت نہیں تھا کہ وہ میری کہانی کی تصدیق کرنے بیٹھ جاتے۔ جلدی میں فوجی جوانوں کے ساتھ مزار تک پہنچ گیا۔ وہاں پر جونہی انہوں نے صائمہ کو دیکھا تو وہ اور بھی حیران ہوئے مگر جب انہوں نے مزار سے کچھ ہی دور بنی حویلی اور اس کے گرد و نواح کی حالت دیکھی تو ان کی حیرانی کی انتہا نہ رہی۔

مختصراً میں نے صائمہ کے ساتھ مل کر ان کو اصل حقائق سے آگاہ کیا۔ جونہی فوجی آفیسر کو حالات کی سنگینی کا احساس ہوا تو اس نے ہیڈ کوارٹر اپنے بڑوں سے رابطہ کیا اور انہیں یہاں کی سنگین صورت حال کے بارے میں بتایا۔ ہیڈ کوارٹر کال کرنے کے بعد اس نے مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔

"شکر ہے کہ ہم ظہر کی نماز کی ادائیگی کے لیے یہاں رکے اور اس بات کا ہمیں بروقت پتہ چل گیا ورنہ جانے تمہارا کیا حال ہوتا۔"

یہ کہنے کے بعد وہ کہیں اور رابطہ کرنے لگا اور اس نے

کسی کو ذری طور پر سیلاب ریلیف کیمپ میں کچھ بندوں کو گرفتار کرنے کا حکم دیا۔
تقریباً ایک گھنٹے میں وہاں ایک فوجی ہیلی کاپٹر لینڈ ہوا۔ جس میں کچھ سینئر اعلیٰ فوجی افسران سوار تھے۔ ان کے یہاں اترتے ہی ہیلی کاپٹر پھر سے کہیں روانہ ہو گیا۔ فوجی افسران نے نئے سرے سے مجھ سے اور صائمہ سے بات چیت کی۔ کافی دیر یہ گفتگو جاری رہی۔ اسی دوران موٹر بوٹ والے فوجی جوانوں نے بتایا کہ ان کے ساتھیوں کا ریڈ کامیاب رہا ہے اور بابا دیپے شاہ اپنے کچھ ساتھیوں کے ہمراہ سیلاب زدگان کے کیمپ سے فرار ہوتے ہوئے پکڑا گیا ہے۔
لیپ ٹاپ جس میں انڈین انٹیلی جنس کے حوالے سے کئی راز قید تھے۔ وہ صائمہ سے دھماکوں کے دوران کہیں گر گیا تھا جو کہ بعد میں فوجی جوانوں کے آنے کے بعد ہم نے ملبے سے تلاش کیا تھا۔ خدا کے کرم سے اس میں موجود تمام ڈیٹا محفوظ تھا اور اب یہ پاکستانی فوج کے کام آنے والا تھا۔ کچھ ہی دیر بعد وہاں ہیلی کاپٹر دوبارہ آ گیا مگر جاتے وقت سینئر افسران نے ہمیں بھی ساتھ لے لیا۔ ہیڈکوارٹر پہنچ کر ایک بار پھر سے ہمیں کچھ لوگوں کے سامنے پیش کیا گیا۔ میری جھوٹی اور من گھڑت کہانی زیادہ دیر نہ چل سکی اور مجھے اپنے بارے میں انہیں حقیقت سے آگاہ کرنا پڑا۔ البتہ اسی رات صائمہ کو اس کے باپ کے ہمراہ اس کے گھر بھیج دیا گیا البتہ ان لوگوں نے مجھے پولیس کے حوالے کر دیا لیکن اب یہ پولیس میرے ساتھ وہ سب کچھ نہیں کر سکتی تھی جو کہ وہ کرنے کا ارادہ رکھتی تھی۔ وہ بہت تلملائے مگر آخر کار انہیں کرنل قدیر صاحب کی ماننا پڑی اور مجھ پر وہی کیس بنایا گیا جو کہ حقیقت تھا اور یہ کچھ بھی نہیں تھا۔ جس کی عدالت نے مجھے چھ ماہ کی قید سنائی اور چھ ماہ جیل میں گزار کر میں گھر میں آ گیا۔
بابا دیپے شاہ واقعی بدنام زمانہ انڈین تنظیم را کا ایجنٹ نکلا۔ جس کا اصل نام گنگا رام تھا اور وہ پچھلے دو سالوں سے یہاں مقیم تھا۔ بنیادی طور پر را والے اس جگہ کو ہیڈ کوارٹر کے طور پہ استعمال کر رہے تھے اور گنگا رام ان سب کا سینٹر تھا۔ یہ ایک الگ تھلگ اور انتہائی محفوظ ٹھکانہ تھا۔ اس دن دھماکوں کے بعد جو سوکھی لکڑیوں کو آگ لگی جس کے بارے میں بعد میں انکشاف ہوا کہ یہی وہ جگہ تھی جہاں سے تازہ آکسیجن تہہ خانے میں جا رہی تھی۔ انہوں نے یہاں پہ لوہے کے موٹے سریے لگا کر اس کے نیچے ایک پنکھا لگا رکھا تھا جو کہ تہہ خانے میں تازہ ہوا کی آمدورفت کا ذریعہ تھا اور لوہے کے سریے کے اس جال کو انہوں نے پہاڑی کیکر کی لکڑیوں میں چھپا دیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ جو نہی تہہ خانے میں موجود بم بلاسٹ ہوئے تو ان کے اثرات ان سوکھی لکڑیوں تک بھی پہنچے اور ان میں آگ لگ گئی۔
اور اس رات درخت پہ میں نے جو وہ خوفناک آنکھیں دیکھی تھیں وہ ایک بلی کی آنکھیں تھیں جو کہ اس وقت ایک پرندے کے گوشت سے اپنے پیٹ کی آگ بجھا رہی تھی۔ اوپر سے پرندے کے پر اور خون کا گرنا بھی اسی وجہ سے ہوا تھا۔
اب بھی کبھی کبھی میں سوچتا ہوں تو یہ سب مجھے خواب سا لگتا ہے۔ جانے ہمارے ملک کے اندھے عقیدت مندوں کو کب ہوش آئے گا اور جانے کب تک ہمارے دشمن ہماری ان اندھی عقیدتوں سے اپنے مفادات حاصل کرتے رہیں گے۔ جانے کب تک؟



آخری خواہش

ساحل دعا بخاری

محبت اور نفرت دو ایسے جذبے ہیں جو آپس میں لازم و ملزوم ہیں' ان دونوں جذبوں کی معراج دیوانگی اور بس دیوانگی ہے جو زندگی لے بھی لیتی ہے اور دے بھی سکتی ہے، جان لینے والا بھی محبت کا شکار ہوتا ہے مقتول بھی نفرت کی سب سے بلند منزل پر براجمان ہوتا ہے۔

ایک نوجوان کا المیہ' وہ محبت اور نفرت کے جذبوں کی جنگ میں پس گیا تھا۔

دل کے تاروں کو چھوتی ایک مختصر مگر خوب صورت تحریر حساس دلوں کے لیے بطور خاص

ڈوبتے سورج کی لہو رنگ کرنیں درختوں کے سروں پر رقص کناں تھیں۔ ان کا جنونی رقص نکتہ عروج پر پہنچ چکا تھا اس مقام پر اب اگر وہ چاہتیں بھی تو رقص روک نہ سکتی تھیں۔ بعض اوقات کسی کام کو شروع کرنا بے شک ہمارے بس میں ہوتا ہے مگر اس کا اختتام ہمارے دائرہ اختیار سے باہر ہو جاتا ہے۔ ہم چاہیں بھی تو اسے اپنی مرضی کے مطابق ڈھال نہیں سکتے۔ کیونکہ ہم خود بھی کٹھ پتلی کی طرح تقدیر کے ہاتھ میں ڈھل چکے ہوتے ہیں۔ سورج کی لہو میں لتھڑی ہوئی کرنوں نے بھی بے شک رقص اپنی مرضی سے شروع کیا تھا مگر اب وہ رک نہ سکتی تھیں۔ ان کی رگوں میں اضطراب کا لاوا بہتا تھا اور بے قراری ان کی ہر ہر جنبش سے عیاں تھی پھر ناچتے ناچتے ان کی ٹانگیں شل ہو گئیں تلووں سے خون رسنے لگا اور بالآخر وہ زمین بوس ہو گئیں اور زمین بوس ہونے سے قبل ہی وہ دم توڑ چکی تھیں اور اب سرمئی شام زمین پر اتر آئی تھی اور ان کی موت پر سسک رہی تھی، چلا رہی تھی بین کر رہی تھی۔ وہ ہاتھ میں پسٹل تھامے صحن میں بے چینی سے ٹہل رہا تھا اسے رات کا' سیاہ رات کا انتظار کرنا تھا ایک سیاہ رات اس کی خوشیوں کو اس کی محبت کو اس کی زندگی کو کھا گئی تھی اور ایک سیاہ رات کسی اور کی خوشیوں کی، زندگی کو کھانے والی تھی۔ "قاتل" کو کھانے والی تھی ایک ہفتہ قبل ہاں ٹھیک ایک ہفتہ قبل اس گھر میں زندگی اپنی تمام تر رعنائیوں اور دلربائیوں کے ساتھ مسکراتی تھی اور اب اب یہ گھر اجاڑ، ویران تھا۔ کرب در و دیوار سے لپٹا اذیت سے بلک رہا تھا۔ خاموشی دم سادھے خاموش بیٹھی تھی اور تنہائی تنہائی سے اکتا کر سارے میں بولائی بولائی سی پھرتی تھی۔ شہروز نے آنکھوں میں در آئی نمی ہتھیلی کی پشت سے صاف کی اور آنکھوں کو وحشت سے رگڑ ڈالا۔ اس کی براؤن آنکھوں میں نفرت بھری وحشت کا دریا ٹھاٹھیں مارنے لگا سسکتی شام بھی نم آنکھیں لیے رخصت ہو گئی اور اب......

اب اندھی رات نے ڈرتے ڈرتے دھرتی پر قدم دھرے تھے شہروز نے پسٹل شرٹ کے نیچے نراؤزر میں اڑسا اور ایک آخری نگاہ اپنے گھر پر خالی گھر پر ڈال کر آگے بڑھ گیا۔ اندھیرے نے اس کے لیے اپنی آغوش وا کر دی تھی۔ وہ آگے

بڑھا اور اندھیرے کا حصہ بن گیا اور گھر اپنی مالکن شہلا کو یاد کر کے آبدیدہ ہو گیا۔ شہروز، شہلا کا خالہ زاد تھا وہ لوگ سندھ کے رہنے والے تھے۔ ان کی شادی کی تیاریاں جاری تھیں۔ شہلا کے ماں باپ اور بہنیں اس کے جہیز کے لیے چیزیں جمع کر رہے تھے۔ خود شہروز کے گھر والے بھی شادی کی تیاریاں زور و شور سے کر رہے تھے۔ شہروز کے والد کا انتقال ہو چکا تھا اور گھر میں اس کی ماں کے علاوہ صرف چھوٹا بھائی ہی تھا لیکن ایک رات.....

ایک رات سیلاب آیا اور سب کچھ بہا لے گیا۔ پوری بستی میں سے محض چند لوگ ہی بچے تھے۔ ان میں شہروز اور شہلا بھی تھے پھنکاریں مارتا پانی بستی کو..... ان کے گھر کو..... ان کے گھر والوں کو کھا گیا تھا۔ چند دن کیمپ میں رہنے کے بعد شہروز شہلا اور اس کی خالہ صنوبر کو لیے پنجاب چلا آیا۔ اس میں اپنے گھر کا ملبہ دیکھنے کی سکت نہ تھی۔ ہاں وہاں تو شاید ملبہ بھی نہ رہا ہو پنجاب کے ایک گاؤں میں گھر انہیں آسانی سے مل گیا گاؤں کا چوہدری ملک احسان شہروز کو کچھ اچھا نہ لگا تھا مگر اس نے پھر بھی شکر ادا کیا کہ سر چھپانے کو ٹھکانہ میسر آ جائے گا۔ کام بھی اسے ملک احسان کی زمینوں پر مل گیا تھا۔ صنوبر خالہ نے اصرار کیا کہ اب ان کا نکاح ہو جانا چاہیے۔ مگر شہروز چاہتا تھا کہ اس کے پاس اتنے پیسے تو ہونے ہی چاہئیں کہ وہ چار لوگوں کو کھانا کھلا سکے ورنہ شہلا کا معصوم حسن اسے بھی بے چین کرتا تھا۔ بہرحال وقت بلی کی سی چال چلتا ہوا گزرتا رہا اور اس رات اس..... اس رات شہروز نے رات کو فصل کو پانی لگا رکھا تھا۔ وہ گھر پہنچا تو تجر کا پیڑ چھل رہا تھا۔

دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا تو ایک نقاب پوش ڈیوڑھی سے نکل رہا تھا

''کون ہو تم؟'' وہ نقاب پوش سے بھڑ گیا۔ اسی لمحے اس کی کنپٹی پر ایک بھرپور ضرب لگی اور وہ لہرا کر زمین پر گر گیا۔ اس کی آنکھ کھلی تو وہ پولیس کی حراست میں تھا اور گھر میں گویا کہرام مچا تھا۔

''کیا ہوا ہے؟'' اس نے بوکھلا کر پوچھا۔

''کیا ہوا ہے؟ ذلیل..... قتل کر کے معصوم بنتا ہے اوئے صنوبر بی بی نے تیرا کیا بگاڑا تھا جو تو نے اسے مار ڈالا!'' کانسٹیبل نے اس پر گھونسوں کی بارش کر دی جبکہ اس کا ذہن تو جھکڑوں کی زد میں تھا۔

''یہ..... یہ..... آپ کیا کہہ رہے ہیں؟''

''انجان نہ بن۔'' کانسٹیبل کا بھاری ہاتھ اس کا جبڑا سہلا گیا اور پھر اسے جیل میں ڈال دیا گیا۔ اس کے پڑوسی رحمت خان اور اس کی بیوی شہلا نے اس کے خلاف گواہی دی تھی کہ انہوں نے خود دیکھا ہے کہ شہروز نے کسی بات پر مشتعل ہو کر صنوبر کی گردن دبا کر اسے قتل کیا ہے۔

''تھانیدار صاحب مجھے پھنسایا جا رہا ہے آپ شہلا سے پوچھ لیں میں تو ساری رات گھر میں نہیں آیا اور.....!'' اس نے نقاب پوش کی بابت بتا دیا۔ اس سے اگلے دن شہلا اس سے ملنے آئی وہ اسے دیکھ کر اس کی جانب لپکا مگر راہ میں سلاخیں رکاوٹ تھیں وہ سلاخوں کو تھام کر بولا۔

''شہلا تم جانتی ہو نا کہ صنوبر خالہ کو میں نے نہیں مارا۔''

''خالہ نے تمہارا کیا بگاڑا تھا شہروز؟'' شہلا کا سرد لہجہ اسے برفیلے غار میں دھکیل گیا۔
''تم انسان نہیں درندے ہو میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ تم اتنا گر سکتے ہو۔'' وہ سناٹے میں رہ گیا۔ یہ شہلا کہہ رہی تھی اس کی شہلا؟ جس کا دعویٰ تھا کہ وہ اسے خود سے زیادہ جانتی ہے وہ مزید بھی کچھ کہہ رہی تھی مگر شہروز کے کانوں میں سائیں سائیں ہو رہی تھی۔ بپھری ہوائیں پاگل بد روحوں کی طرح بین کر رہی تھیں۔ وہ بے دم سا ہو کر سلاخوں کو جکڑے فرش پر گر گیا۔ شہلا ایک آخری نگاہ اس پر ڈال کر چلی گئی۔

...... ❁ ...... ❁ ......

آگے کے مراحل بے حد آسان تھے اتنے ہی آسان، جتنا کہ موت کے بعد کسی میت کو ''دفنانا'' ہوتا ہے وہ بھی اندر سے مر چکا تھا مگر یہ الگ بات کہ ابھی دفن نہیں ہوا تھا۔ اس نے اقبال جرم کر لیا کہ اب زندہ رہ کر کرنا بھی کیا تھا لیکن اگلے ہی روز اس کی ضمانت ہو گئی اس کی ضمانت کروانے والا ملک احسان تھا گھر آ کر اسے علم ہوا کہ شہلا نے ملک احسان سے نکاح کر لیا ہے اس کے خون میں آتش فشاں کا لاوا ابلنے لگا۔ اسے ملک احسان کا پیغام ملا تھا کہ اگر وہ اپنی زندگی چاہتا ہے تو یہاں سے چلا جائے اور اس نے ایک رات کی مہلت مانگ لی تھی کہ وہ کل چلا جائے گا وہ کل واقعی چلا جاتا مگر کہیں اور نہیں بلکہ واپس جیل میں۔

اسے پتا چل گیا تھا کہ یہ سازش ملک احسان کی ہی تھی اسے قتل کے جھوٹے الزام میں پھنسوا کر اس نے شہلا کو اس کے خلاف کر دیا تھا اور اب خود اس سے شادی رچالی تھی مگر اسے یہ سمجھ میں نہیں آیا کہ اس کی ضمانت کیوں کرائی گئی ہے اور شہلا کیا وہ نہیں جانتی تھی کہ شہروز کیسا ہے؟ وہ بھلا خالہ کو کیوں قتل کرے گا؟ پھر اس نے کیوں اس کے بجائے لوگوں کا اعتبار کیا تھا حالانکہ وہ بخوبی جانتی تھی کہ وہ ساری رات گھر نہیں آیا تھا۔ اس کی محبت اور اس کی خوشیوں کے قاتل ملک احسان اور شہلا دونوں تھے اور اسے انتقام لینا تھا شہلا سے بھی اور ملک احسان سے بھی۔

...... ❁ ...... ❁ ......

آسمان پر بادلوں کا بسیرا تھا سیاہ بادلوں نے ستاروں تک کو چھپا لیا تھا ملک احسان کی حویلی کی بالائی سمت دو گارڈ متعین تھے۔ ملک احسان کی

شروعات

ایک شخص نے اپنے پڑوسی سے کہا کہ ''بھائی صاحب! کل تمام دن آپ کا کتا بھونکتا رہا جس کی وجہ سے میری بیوی گانے کی پریکٹس نہ کر سکی۔ عجیب کتا ہے آپ کا؟''
''دیکھئے بھائی صاحب!'' پڑوسی نے جواب دیا۔ ''شروعات آپ کی بیوی ہی کرتی ہے۔''

منیبہ ناز..... جمبر شریف

حسن اور ذوق

فن کا منبع، فن کی روح ہے جب روٹی اور فن مل جاتے ہیں تو انسان تاج محل تعمیر کرتا ہے، اہرام مصر بناتا ہے، الحمرا کے طلسماتی عمارت کی بنیاد رکھتا ہے۔ کالی داس ''شکنتلا'' ملٹن ''گمشدہ جنت'' اور اقبال ''جاوید نامہ'' لکھتا ہے لیکن جب فن سے روٹی چھن جاتی ہے تو شکنتلا مر جاتی ہے اور جاوید نامہ ردی میں بکنے لگتا ہے پھر حسن مر جاتا ہے، مذہب مر جاتا ہے، بھوک سب کا گلا گھونٹ دیتی ہے۔

کمال بھلی..... چکوال

وہشت پورے علاقے میں تھی سو کسی کی ہمت نہ تھی کہ بلا اجازت اندر داخل ہو سکے اور جو کوئی ایسا کرتا تھا تو وہ زندہ واپس نہ جاتا تھا اس لیے اب کسی کی مجال نہ تھی کہ کوئی اندر جائے کہ اپنی جان کسے پیاری نہیں ہوتی بھلا؟ مگر شہروز حویلی کی عقبی دیوار پھلانگ چکا تھا کیونکہ اسے اپنی زندگی پیاری نہیں تھی۔ وہ پھولوں کی کیاریوں میں گرا تھا۔ قبل اس کے کہ کوئی حرکت کرتا کسی کی آواز آئی اور وہ وہیں دبک گیا۔ باتوں کی آواز اور قدموں سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ قریب آرہے ہیں۔

''ملک صاحب آپ نے میرا جسم تو حاصل کرلیا مگر میرے دل میں ہمیشہ شہروز ہی رہے گا۔'' شہلا کی آواز ابھری۔

''مگر میں نے تمہاری خواہش پر اسے رہا تو کروادیا ہے اور اب وہ آزاد ہے کیا یہ معمولی بات ہے؟'' احسان کی آواز میں بے بسی کی جھلک تھی۔

''یہ آپ نے کوئی احسان نہیں کیا ہے آپ جانتے ہیں کہ اگر آپ اسے رہا نہ کرواتے تو میں کبھی آپ سے شادی نہ کرتی۔ میں ایک مشرقی لڑکی ہوں آپ سے کبھی بے وفائی نہیں کروں گی۔ کبھی شہروز سے نہیں ملوں گی اور اگر اس نے کبھی ایسی کوئی کوشش کی تو میں سختی سے اسے جھڑک دوں گی مگر اس کے باوجود وہ میرے دل میں ہمیشہ رہے گا۔ خدا کرے کہ وہ یہاں سے کہیں دور چلا جائے......زندہ رہے اور......خوش رہے۔ کاش وہ مجھے مل جائے تو میں اس کے قدموں میں گر کر التجا کروں کہ وہ کہیں دور چلا جائے لیکن اگر وہ مل بھی گیا تو وہ مجھے دھتکار دے گا کیا بعید کہ مجھے قتل ہی کرڈالے لیکن کاش میری یہ خواہش میری یہ آخری خواہش پوری ہوجائے تو میں......'' ہچکیوں نے اسے بات مکمل نہ کرنے دی تھی۔

''تم نے کہا تھا کہ تمہاری آخری خواہش یہ ہے کہ وہ آزاد ہوجائے۔'' ملک احسان کا لہجہ مدھم تھا۔

''ہاں آپ نے میری آخری خواہش پوری کردی تھی جس کے لیے میں آپ کی شکر گزار رہوں گی لیکن...... شہروز کے حوالے سے میری آخری خواہش یہی ہے۔'' آواز مدھم ہوتے ہوتے معدوم ہوگئی اور قدموں کی چاپ بھی۔ شہروز سناٹے میں گھرا اپنی جگہ جم چکا تھا۔ دفعتاً بادل گڑگڑائے تو آسمان کا سینہ شق ہوا ایک کوندا سا لپک کر آسمان پر لڑھکتا چلا گیا۔ رات مزید سہم گئی۔ شہروز اٹھا اور اسی خاموشی سے باہر نکل گیا جس خاموشی سے اندر آیا تھا۔ اگر ملک احسان شہلا کی خواہش پوری کرسکتا تھا تو اس کا بھی حق تھا بلکہ فرض تھا کہ وہ شہلا کی آخری خواہش پوری کرتا۔ وہ سر جھکائے کسی نامعلوم مقام کی جانب رواں تھا اور اس کی بدنصیبی پر آنسو بہاتا بوڑھا آسمان بوند بوند لہو ٹپکا رہا تھا اس کی بوندوں میں شہروز کے آنسو بھی مدغم ہو رہے تھے اور اندھی رات کی بے نور آنکھیں بھی لہو رو رہی تھیں۔

پھقلا

جاوید احمد صدیقی

زندگی کی بوقلمونیوں کا احوال' ان حسین سپنوں کا افسانہ جو جاگتی آنکھوں سے دیکھے جاتے ہیں لیکن ان کی تعبیر پلکوں تک تو آتی ہے مگر آنسو بن کر رخساروں پر ہی خشک ہوجاتی ہے۔
حساس دلوں کے لیے بطور خاص ایک ذہین لڑکی کی روداد

وہ حساس تو تھی ہی مگر بڑے حوصلے اور حقائق کو جانچ کر چلنے والی تھی' بڑے ہونے کے ناتے ماں باپ کی ہر تکلیف اور غربت کی ہر آندھی میں چٹان بن کر کھڑا رہنا اس کی عادت سی ہوگئی تھی مگر بچپن سے جوانی تک اس نے غربت کو آہستہ آہستہ مٹتے دیکھا۔ دو بھائیوں کی یہ دو بہنیں تھیں' یہ سب سے بڑی' دنیا اور زمانے میں انسانوں کے کئی رویوں سے ہمکنار ہوچکی تھی اور پھر وہ اس کو سمجھنے سے قاصر تھی کہ طبقاتی فرق ہم انسان خود ہی بڑھا چڑھا کر رکھ دیتے ہیں ورنہ یہ کم تر امیر اور درمیانہ طبقہ میں اتنی بڑی تعداد میں یہ معصوم جوانیاں محض درمیانہ طبقہ کی ہونے کی وجہ سے اندر سے گھٹ گھٹ کر نہ مر جائیں اور سسک کر جینے کو اپنا مقدر جان کر صبر کا کڑوا گھونٹ لے کر معاشرے کے اس جہنم میں جلتی رہیں اور پھر یعنی زندگی تمام ہوئی؟ واقعی......

اور باپ بھی دن رات محنت کرتے ہوئے آہستہ آہستہ اس خاندان کی غربت کی سطح کو کم سے کم تر کرتے ہوئے انتہائی محنتی انسان ثابت ہوا تھا اور اس حالت میں یہ ماں کے ساتھ ساتھ ہر قسم کے حوادث کا مقابلہ کرتے کرتے اتنی ہی حساس بھی ہوگئی تھی۔

دونوں بھائی پڑھائی میں مصروف رہتے اور یہ ان کو ہر قسم کی مدد پہنچاتی۔ اتفاق سے دونوں ہی میٹرک میں تھے' بہن اب میٹرک کرکے کالج جانے کی تیاری کررہی تھی اور یہ خود ایم بی اے کرچکی تھی اور اچھی جاب کی تلاش میں تھی تو اس طرح یہ پرسکون گھرانا' اندرونی طوفان کو دبائے سرتوڑ کوشش کرکے نہ صرف اچھے کھاتے پیتے گھرانوں میں شامل ہونا چاہتا تھا بلکہ اگلی نسلوں کو بھی ایسی جیسی زندگی سے چھٹکارا دلانا چاہتا تھا۔

اور آج تو مہرو بے حد خوش تھی کہ اتنی تگ و دو بھی اس کے لیے خوش خبری لائی' اسے مشہور اور ترقی پذیر بڑے ادارے میں ایچ آر میں اسسٹنٹ منیجر کی پوسٹ مل گئی تھی۔ یہ ادویات کے بین الاقوامی ادارے کی پاکستان برانچ تھی اور کراچی' لاہور میں ادویات کی مینوفیکچرنگ کے ہیوی اور بڑے کارخانے موجود تھے۔ ایک ہفتہ کے بعد مہرو نے آفس میں رپورٹ کی اور اسی دن سے ڈیوٹی بھی شروع ہوگئی تھی۔ ڈیوٹی سے گھر واپسی پر مہرو دونوں بھائیوں اور بہن روشنی کے لیے خوب اچھی اچھی چیزیں لائی اور سب سے وعدہ کیا کہ تنخواہ ملنے پر سب کو گفٹ بھی ملیں گے اور کالج میں دونوں بھائیوں کو داخلے کے بعد موٹر

بائیک بھی ضرور لے گی۔ ماں باپ کے ساتھ ان تینوں کا خوشی سے کوئی ٹھکانہ نہ تھا۔ ماں باپ نے تو ہزاروں دعائیں دے ڈالیں اور مہرو روشنی کو بہترین پڑھائی کی طرف راغب کرتی رہتی تھی۔

مہرو نے تو ابھی کمانے کی شروعات ہی کی تھی حالات بھی نہایت سست روی سے بہتری کی طرف رواں دواں تھے۔ انہی دنوں ایچ آر میں ایک اسسٹنٹ بھرتی ہوا' وہ خاصا معقول شخص تھا مگر پوزیشن تو محض ایک سینئر کلرک کے برابر تھی مگر انتہائی ایماندار تھا۔ ایک دو ماہ میں ہی محسوس ہوگیا کہ ترقی کے لیے یہ کوئی ناجائز طریقہ نہ استعمال کرے گا۔ چند ہفتہ میں مہرو سے خاصی دوستی ہوگئی' معلوم ہوا کہ پورے گھر کی ذمہ داری اسی پر ہے' بوڑھے ماں باپ' چھوٹے بہن بھائی ہیں ان سب کی اپنی اپنی ضرورتیں ہیں اور یہ سب مجھے ہی پوری کرنی ہوتی ہیں۔

وہ محسوس کرنے لگا کہ مہرو اس سے اچھا سلوک کرتی ہے وہ بڑی خاموشی اور نہایت انہماک سے بیٹھی اپنے چیمبر میں کام کررہی ہوتی ہے۔ مہرو کے پاس کئی دفعہ کام کے سلسلے میں وہ چیمبر میں آتا تھا' مہرو محسوس کرنے لگی کہ یہ (جس کا نام رضوان تھا) ذرا کھل مل کر بات کرنے کی خواہش رکھتا ہے۔ رضوان سمجھنے لگا کہ یہ اگر میرے طبقے سے نہ سہی مگر اسی طبقے سے آگے بڑھ رہی ہے۔ چند ملاقاتوں میں رضوان سمجھنے لگا کہ میری باتوں کو پذیرائی ملنی شروع ہوگئی ہے۔ چند دنوں کے اندر رضوان کام کو وضاحت کرنے کے بہانے مہرو کے پاس جاتا تو وہ اس سے تھوڑی سی گپ شپ لگالیتی ہے اور ان ہی دنوں رضوان کو باتوں باتوں میں معلوم ہوا کہ مہرو کی ایک بہن ہے جو بی اے کررہی ہے اور دو بھائی پڑھائی کرتے ہیں۔ اس دن بھی رضوان کچھ کاغذات' مہرو کے چیمبر میں دینے گیا اور تفصیل بتا رہا تھا کہ مہرو کو محسوس ہوا کہ رضوان کوئی بات کرنا چاہتا ہے مگر لبوں تک لا نہیں رہا۔ اسی دوران مہرو نے چائے منگوالی' رضوان نے تھوڑی سی ہمت کرکے مہرو سے کچھ کہنے کے لیے اجازت مانگی اب مہرو کو خیال آیا کہ یہ افسر ہے فوراً سنجیدہ ہوگئی اور رضوان بھی ہوا سمجھ کر کاغذات کو سمیٹتے ہوئے سر جھکائے باہر آگیا۔

مہرو اس دن بازار کچھ شاپنگ کے لیے نکلی تھی' کچھ دیر کے بعد پیچھے سے کسی کی آواز آئی۔ مہرو نے دیکھا تو رضوان ذرا گھبرایا ہوا کھڑا تھا۔ شاید وہ جھجک گیا' صرف یہ پوچھا۔

"آپ یہاں کیسے؟"

مہرو نے کہا "جیسے آپ.....؟" مہرو کی مخصوص مسکراہٹ ان سب کا جواب تھی' رضوان دل میں یہ خیال کر بیٹھا کہ میری فرمائش ضرور مہرو پوری کرے گی اور رضوان خوشی سے جھوم اٹھا کہ ہم دونوں مل کر بہتر زندگی گزار سکیں گے۔ رضوان یہ تو سمجھتا تھا کہ مہرو خود تو بڑی اچھی پوسٹ پر ہے اور ایک سال کے اندر اندر اس کمپنی میں اچھی جگہ لے لے گی۔

ایک روز دفتر پہنچنے کے بعد میں مہرو کے چیمبر میں سلام کرنے چلا گیا' وہ جواب دے کر ذرا مسکرانے لگی مگر فوراً ہی سنجیدہ ہوکر کام میں لگ گئی۔ چند روز تک بات چیت بھی نہ ہوسکی آفس کا ماحول ایسا نہ تھا کہ اس طرح فری ہوا جاسکے۔

ایک روز لنچ ٹائم میں جب سب لوگ چلے گئے تو میں بات کرنا چاہ رہا تھا۔ اچانک مہرو بولی۔

"کام میں اتنا بھی نہ مصروف رہیں کہ کھانے کا خیال بھی نہ رہے۔"

"نہیں، ایسی کوئی بات نہیں۔" رضوان کاغذات سمیٹتے ہوئے بولا۔

"ایک بات کہوں آپ اگر بُرا نہ منائیں تو؟" مہرو اسے سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگی۔ "کسی روز آپ میرے ساتھ چائے پینے چلیں گے؟"

"کس سلسلے میں۔" بڑی روکھی آواز تھی رضوان بولا۔

"نہیں کوئی خاص بات نہیں' ویسے ہی۔" اور تیزی سے باہر نکل گیا' رضوان نے سمجھا کہ مہرو ناراض ہوگئی ہے' کھانا کھا کر واپس آیا تو میری طرف دیکھ مہرو مسکرائی تھی مطلب یہ کہ دوستی جاری ہے۔

دن مہینوں میں ڈھلتے رہے اور مہرو کی چھوٹی بہن روشنی بھی اب فرسٹ کلاس فرسٹ پوسٹ گریجویٹ ہوکر لیکچرار کی پوسٹ پر آ گئی تھی اور مہرو نے کچھ سکھ کا سانس لیا اور اسی طرح رضوان بھی اپنی خواہش کو دبا کر وقت کے ساتھ ساتھ زندگی کی ڈور کو کھینچتا چلا گیا۔

اس دن رضوان نے کڑا دل کر کے مہرو سے اپنی خواہش اس کے سامنے رکھنے کا موقع ڈھونڈ نکالا۔ اگلے روز رضوان خاموشی سے کام کرتا رہا' لنچ ٹائم میں بھی سب لوگوں کے ساتھ باہر چلا گیا۔

اسی شام رضوان کو حیرانی کا جھٹکا لگا جب مہرو بس اسٹاپ پر اس کے قریب آئی۔ رضوان نے گھبرا کر اِدھر اُدھر دیکھا' آفس کے کچھ اور لوگ بھی

کھڑے تھے اور بس کا انتظار ہو رہا تھا۔ مہر بولی۔
"آج آپ اپنی بس کو مس کر دیں اور ہم کہیں چل کر چائے پیتے ہیں۔" رضوان حیرانگی سے یہ سب کچھ دیکھتا رہا۔ اس نے سر کے اشارے سے ہاں کہہ دی۔
تھوڑی دیر کے بعد ہم ایک ریسٹورنٹ میں بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ رضوان نے دل میں خیال کیا کہ چلیں اچھا ہوا جس بات کے کرنے میں موقع ڈھونڈ رہا تھا مہرو نے آج خود ہی وہ موقع دے دیا ہے۔ رضوان نے لمبی چوڑی تمہید باندھی اور آخر میں پوچھنے لگا۔
"آپ کی بہن روشنی بھی اب برسر روزگار ہے اور آپ کی بھی ترقی ہو گئی ہے میں اپنے آپ کو اس جگہ پر آپ کے قابل تو نہیں سمجھتا مگر روشنی سے آپ کی مرضی سے شادی کا بندھن باندھنا چاہتا ہوں۔" تمام بات سننے کے بعد مہرو کے چہرے پر مسکراہٹ چھا گئی اور مسکراتی رہی۔ کچھ دیر کے بعد بولی۔
"میں جانتی تھی کہ ہمارے معاشرے میں مرد اور عورت کی دوستی صحت مند بنیادوں پر قائم نہیں رہ سکتی۔ یہ ہمارے معاشرے کی ہمیشہ سے ڈگر رہی ہے کہ مرد جب چاہے جہاں چاہے عورت کو استعمال کرلے اور مرد یہ سمجھتا ہے کہ یہ اس کا حق ہے۔ اب تو بے تحاشہ تبدیلی آگئی ہے اور یہی حق عورت بھی اپنا سمجھتی ہے کہ اسے ہزاروں سال سے جو بھیڑ بکری کی طرح ہانکا جا رہا ہے اس کو ختم کیا جائے اور عورت کا صحیح مقام تعین کیا جائے۔ رضوان آپ دوسرے مردوں سے مجھے ذرا مختلف لگے مگر چند روز کے آپ کے برتاؤ سے میں سمجھ گئی تھی کہ معاملہ کچھ اور ہی ہے۔
مجھے رضوان صاحب! آپ کے احساسات اور جذبات کا احساس ہے لیکن میری سوچ آپ سے مختلف ہے میں اور میری بہن روشنی اپنی ماں کی طرح سسک سسک کر زندگی گزارنا نہیں چاہتے اور نہ میں روشنی کے لیے ایسی غربت والی جگہ کو پسند کروں گی۔ آپ سے اس کی شادی کرنے کا مطلب یہ ہے کہ تمام عمر چھوٹی چھوٹی خواہشوں کو پورا کرنے کے لیے ترستی رہے گی اور اپنی نوکری کے باوجود بھی سکھ کا سانس نصیب نہ ہوگا اور اس کے صبح و شام بسوں میں اسی طرح دھکے کھاتے اور گھر میں کولہو کے بیل کی طرح چکی پیستے گزریں اور زندگی بھی پچھلے لوگوں کی طرح جذبات کو مار مار کر گزرتی رہے۔ نہیں رضوان نہیں جب میں خود اس طرح کی گھٹتی زندگی اپنے لیے پسند نہیں کرتی تو پھر وہ تو میری چھوٹی لاڈلی بہن ہے یہ نا ممکن ہے۔ امید ہے آپ برا نہ منائیں گے آپ کی عزت اب بھی میرے دل میں ہے اور ہم ہمیشہ اچھے دوستوں اور آفس کولیگز کی طرح رہیں اور...... اور بس......"

بند گلی

علی اختر

ہر شہر ہر علاقہ میں کوئی نہ کوئی بند گلی ضرور ہوتی ہے جس میں داخلے کا راستہ تو ہوتا ہے لیکن اس سے باہر نکلنے کا کوئی راستہ نہیں ہوتا۔ جرم کی دنیا بھی ایک بند گلی کی مانند ہے۔ جس میں داخل ہونے والا لاکھ کوشش کے باوجود نکل نہیں پاتا۔

ایک انسپکٹر اور دو ملزمان کی روداد' وہ تینوں ایک بند گلی میں آگئے تھے۔

گفتگو کی بھنبھناہٹ میں' لوگوں کے اژدحام میں ایک کمزور سی آواز ابھری تھی۔

"اس سے پستول چھین لو...... یہ مجھے مار ڈالے گا......"

مگر اس شور میں یہ آواز دب کر رہ گئی اور ایک ہلکی سی آواز آئی۔ گولی کی آواز...... اس آواز کو سنتے ہی وہاں موجود لوگوں میں افراتفری پھیل گئی اور بھاگ دوڑ شروع ہو گئی۔ گولی چلانے والا باہر کے گیٹ کی جانب بھاگا' جسے گیٹ پر موجود گن مین نے پکڑ لیا اور کمال مہارت سے اس کے ہاتھ میں موجود پستول بھی چھین لیا گیا۔

زخمی کو دو آدمیوں نے سہارا دے کر اٹھایا' اور تقریباً گھسیٹتے ہوئے اسے باہر لے جانے لگے۔ جس کا خون بہہ رہا تھا' چند لمحوں پہلے جہاں شور مچا تھا' اب پھر معمول کا کام شروع ہو گیا تھا۔ یہ ساری کارروائی مشہور بینک کی مین برانچ میں ہوئی تھی۔ برانچ منیجر پریشانی کے عالم میں اپنے کیبن سے نکل کر واردات کی جگہ پہنچا تھا۔ یہ ایک بڑی برانچ کا وسیع و عریض ہال تھا۔ کیش کاؤنٹر کے قریب ہی بچھے ہوئے صوفے پر لین دین کے لیے آنے والے لوگ بیٹھے تھے۔ وہیں یہ تمام کارروائی ہوئی تھی' گولی چلانے اور زخمی ہونے والے دونوں بینک کے ملازم تھے اور آپس میں بھائی بھی تھے۔

برانچ منیجر عرفان بیگ نے فوری طور پر مقامی پولیس اسٹیشن میں اس کی اطلاع دی' کچھ ہی دیر میں پولیس کے چند سپاہی اور آفیسر سجاد احمد تفتیش کے لیے برانچ میں آ گئے۔ پولیس انسپکٹر سجاد احمد نوجوان اور محنتی لگ رہا تھا' اس کی آنکھوں کی چمک بتا رہی تھی کہ وہ ایسے معاملات میں خصوصی دلچسپی لے کر انہیں تیزی سے حل کرنے میں مہارت رکھتا ہے۔

اس نے آتے ہی اس مخصوص جگہ کا معائنہ کیا' جہاں کچھ دیر پہلے زخمی رشید وابلہ اور حمید وابلہ میں جھگڑا ہوا تھا۔ اس کے ساتھ آئے ہوئے ایک سپاہی نے جائے واردات کا نقشہ بنایا اور پھر کچھ عینی شاہدین کو منیجر کے کمرے میں بلا کر ان کے بیانات لیے کہا یہ جاتا تھا کہ دونوں بھائیوں کے درمیان جائیداد کا تنازعہ عرصے سے چل رہا تھا۔ جس کے بارے میں کچھ کچھ خبریں ان کے ساتھی ملازمین تک بھی پہنچتی رہی تھیں اور آج اس کا نتیجہ اس جھگڑے کی صورت میں ہوا' زخمی رشید وابلہ بینک کی مقامی یونین کا آفس سیکریٹری تھا اور اس کے تمام بڑے افسران سے ذاتی تعلقات اس لیے بھی قائم تھے کہ وہ نہ صرف مقامی ٹریڈ یونین کا عہدیدار تھا بلکہ اسے تعلقات بنانے کا فن بھی خوب آتا تھا۔ اس لئے بھی افسران اس سے خاصا دبتے تھے۔ حمید وابلہ اس کا سگا بھائی تھا اور عمر میں اس سے چھوٹا تھا۔

والد کے مرنے کے بعد سے لے کر اب تک ان دونوں میں جائیداد کے بٹوارے کا جھگڑا چل رہا تھا اور رشید واہلہ اپنی متکبرانہ طبیعت کے باعث اس بٹوارے کی راہ میں رکاوٹ بنا ہوا تھا۔ ایسے بھی رشید واہلہ اپنے مکارانہ رویے کے باعث پورے بینک میں بدنام تھا۔ اونچا لمبا قد' اس پر بڑی بڑی اور بے ہنگم مونچھیں' ہر وقت نشے میں دھت' رشید واہلہ جب کسی کام کی غرض سے بینک کے اعلیٰ عہدیداروں کے کمروں میں جاتا تو اپنے بوٹ کی نوک سے دروازہ کھولتا اور بغیر اجازت کمرے میں چلا جاتا اور پھر باہر کھڑے دوسرے لوگ اس کے چلانے سے اندازہ لگا لیتے تھے کہ وہ کس انداز میں اپنے سینیئرز کے ساتھ گفتگو کرتا اور انہیں قائل کرتا تھا۔

ان کے علاوہ بھی اس کے ساتھیوں میں اس کی ایک عادت بڑی مشہور تھی کہ وہ ہر وقت نشے میں رہنے کے سبب اول فول بکنے اور فحش لہجہ گفتگو کا ماہر سمجھا جاتا تھا۔ اس کے ساتھیوں میں مشہور تھا کہ جہاں رشید واہلہ اپنا کام بگڑتا دیکھتا ہے وہاں وہ ان کی بے عزتی کرنے سے بھی گریز نہیں کرتا۔ اسے کام لینے کے لیے افسران کو ہر طرح خریدنے کا فن بھی آتا تھا۔ اس کے جاننے والے جانتے تھے کہ اس کام میں وہ خوبصورت کال گرلز اور کاروباری لڑکیوں کو بھی افسران بالا تک پہنچاتا تھا۔

بینک اور خصوصاً اس برانچ میں لڑکیاں بھی ملازمت کرتی تھیں جن سے اس کے تعلقات بڑے اچھے طریقے سے قائم تھے۔ گھریلو جھگڑے کی بازگشت اب اس کے ساتھی ملازمین تک پہنچ چکی تھی۔ رشید واہلہ یونین میں ہونے کی وجہ سے ہر وقت اپنی حفاظت کے لیے پستول ساتھ رکھتا تھا' چونکہ ملازمین کی جامہ تلاشی نہیں کی جاتی تھی اس لیے حمید واہلہ بھی اسلحہ بینک میں بغیر کسی روک ٹوک کے لے آتا تھا اور یہی سبب آج بنا' رشید واہلہ کو پستول نکالنے میں سستی ہوئی تھی اس لیے حمید واہلہ نے اپنا کام دکھا دیا۔

سجاد احمد نے ابتدائی اطلاعات ایک کاغذ پر لیا اور یہ کہتا ہوا چلا گیا کہ وہ اس کیس کے باقاعدہ اندراج کے بعد کارروائی کا آغاز کرے گا۔ اگلے ہی دن بینک میں اسپتال سے اطلاع ملی کہ رشید واہلہ زخموں کی تاب نہ لاتے ہوئے ہلاک ہو گیا ہے۔ اب قتل کی باقاعدہ تفتیش مرحوم کی نوجوان بیوی پریسہ کے اندراج پرچہ کی مدعیت میں ہونے لگی تھی۔ اسی روز ہتھکڑیوں میں جکڑے ہوئے حمید واہلہ کو ایک بار پھر تفتیش کے لیے بینک کی برانچ میں لایا گیا اور اس سے باقاعدہ تفتیش کا سلسلہ شروع کیا گیا۔ اس وقت برانچ میں بینک کے اعلیٰ عہدیدار بھی موجود تھے۔ حمید واہلہ کی آنکھوں میں خوف ضرور جھلک رہا تھا مگر اس کی باڈی لینگویج سے ظاہر ہو رہا تھا جیسے اسے اپنے اقدام پر قطعاً کوئی شرمندگی نہیں۔

"آپ جانتے ہیں کہ قتل ایک بہت بڑا جرم ہے اس سلسلے میں آپ کے بینک کے کچھ دیگر ملازمین کو بیانات کے سلسلے میں اگر پولیس اسٹیشن بلایا جائے تو آپ کو یا افسران بالا کو کسی قسم کا اعتراض تو نہ ہوگا......" سجاد احمد نے دوران چائے نوشی آہستہ آہستہ گفتگو کرتے ہوئے افسران اعلیٰ سے پوچھا۔

"ہمیں اس سلسلے میں کوئی اعتراض نہیں لیکن ناجائز دباؤ اور کسی قسم کی ان کے ساتھ تشدد آمیز کارروائی سے گریز کیا جائے۔" انہوں نے کہا۔

"یقیناً...... اصل میں قتل کی تہہ تک پہنچنا قانونی ضرورت ہے' اگرچہ اصل قاتل ہماری حراست میں ہے لیکن پھر بھی یہ سب ضروری ہوتا ہے' آپ تو سمجھتے ہی ہیں۔" سجاد احمد نے چائے کا آخری گھونٹ لے کر اپنے ساتھی سپاہی کی طرف دیکھا جس نے اپنی بیلٹ کے ساتھ بندھی ہوئی ہتھکڑی کو سنبھالتے ہوئے حمید واہلہ کو اٹھایا اور ساتھ لے کر باہر نکل گئے۔



پوسٹ مارٹم رپورٹ کے مطابق گولی مقتول کے بالکل جسم کے ساتھ پستول لگا کر چلائی گئی تھی' جس کی وجہ سے گولی کا زہر پورے جسم میں انتہائی سرعت کے ساتھ پھیل گیا تھا اور زیادہ خون بہہ جانے کی وجہ سے دوران آپریشن مقتول مر گیا تھا۔" مقتول کے نزاعی بیان میں بھی اس نے اپنے گھریلو جھگڑے کا ذکر کیا تھا۔ اس سلسلہ میں بینک کے اعلیٰ افسران کا دباؤ اس حد تک تھا' چونکہ بینک ایک اعلیٰ اور شاندار روایات کا حامل ہے لہٰذا اس کی شہرت کو نقصان پہنچائے بغیر اگر اس قتل کی انکوائری کرلی جائے تو اسے کوئی اعتراض نہیں۔ سجاد احمد بھی اس بات سے پوری طرح متفق تھا لیکن بات یہیں نہیں ختم ہو جاتی تھی' اخباری نمائندگان اور میڈیا کی شہر میں موجودگی ہیں ہر وقت ادھر ادھر دندناتی پھرتی ہیں۔ اس لحاظ سے سجاد احمد دہرے دباؤ کا شکار رہتا اور پھر جب وہ مرحوم کے گھر اس کی بیوہ سے بیان لینے پہنچا تو اخبارات کے مقامی نمائندے پہلے سے وہاں موجود تھے۔

"کیا آپ کے نزدیک یہ صرف جائیداد کا شاخسانہ ہے یا اس کے عوامل اور بھی ہیں۔" ایک تیز طرار اخباری نمائندے نے سجاد احمد کو وہاں پا کر سوال کیا۔

"ہو سکتا ہے بلکہ ممکن بھی ہے لیکن جب تک تفتیش نہیں مکمل ہو جاتی' کچھ کہا نہیں جا سکتا۔" سجاد احمد نے اطمینان سے جواب دیا۔

"میرے خیال میں جب سے آپ کی تعیناتی اس اسٹیشن میں ہوئی ہے یہ آپ کا پہلا کیس ہے اور سنا ہے آپ ایسے اندھے کیسوں کو حل کرنے میں خاصے ماہر اور شہرت رکھتے ہیں۔" ایک اور نمائندے نے پوچھا۔

"یہ سب اوپر والے کا کرم ہے' میں ہر قتل کو کسی مجرم یا بے گناہ کا قتل نہیں سمجھتا' بلکہ انسانیت کا قتل سمجھتا ہوں۔ جو کہ میرے نزدیک ایک گھناؤنا جرم ہے۔ ابھی تو اس کیس کی ابتدا ہے' دیکھیں اسے کہاں تک جا کر حل کیا جا سکے گا۔" سجاد احمد نے جان چھڑائی۔

رشید واہلہ کے گھر میں تعزیت کرنے والوں کا ہجوم تھا۔ سجاد احمد نے مقتول کی بیوہ پریسہ تک رسائی حاصل کرتے ہوئے اسے الگ لے جا کر بیان دینے کے لیے کہا۔

گھر کی بیٹھک کا دروازہ کھول دیا گیا اور سجاد احمد کو ادھر بلا لیا گیا۔ ایک اونچے لمبے قد کی سرخ و سپید رنگت اور تیکھے نین نقوش والی آئیڈیل جسمانی خطوط کی حامل بڑی بڑی گہری نیلی آنکھوں والی نوجوان خاتون بیٹھک میں داخل ہوئی۔ تو سجاد احمد نے اٹھ کر اس کا استقبال کیا۔

اس کی گہری نیلی آنکھیں مسلسل رونے کی وجہ سے سوجی ہوئی تھیں' چہرے پر غم کی پرچھائی موجود تھی۔ وہ خاموشی کے ساتھ سجاد احمد کے قریب ایک کرسی پر بیٹھ گئی۔ تو سجاد احمد نے گفتگو شروع کی۔

"مجھے آپ کے خاوند کے قتل کا افسوس ہے کیا میں اس سلسلہ کی تہہ میں جا سکتا ہوں۔ آخر وہ کیا معاملہ تھا جس کا سبب اس کے قتل تک آ پہنچا۔" سجاد احمد نے رکتے رکتے اپنے آنے کا سبب بتایا۔

"میں جانتا ہوں کہ اگرچہ آپ اس وقت گہرے رنج سے گزر رہی ہیں' لیکن کچھ سوالات پوچھنا بھی ضروری تھے۔ اس لیے میں آپ کے پاس آیا ہوں۔" سجاد احمد نے مزید توجیح دی۔

"جی پوچھیے۔" اس نے آہستگی سے جواب دیا۔

"کیا حمید کی فیملی بھی آپ کے ساتھ ہی رہتی ہے۔"

"جی۔" مختصر جواب دیا گیا۔

"وہ کدھر...... میرا مطلب ہے' ان کا پورشن الگ سے ہے؟" سجاد احمد نے پوچھا۔

"وہ حویلی کی دوسری جانب جو کمرے آپ کو نظر آ رہے ہیں' انہی کے ہیں لیکن چونکہ ہمارا مشترکہ خاندانی نظام ہے لہٰذا چولہا چکی ایک ہی ہے۔ پریسہ

نے بتایا۔
"لگتا ہے آپ پڑھی لکھی ہیں۔ کہاں تک ....."
سجاد احمد نے بات بدلی۔
"گریجویشن کیا ہے۔" اس نے جواب دیا۔
"ہوں.... تو کیا بتا رہی تھیں آپ ....." سجاد احمد نے دوبارہ پوچھا۔
"ہم مشترکہ خاندانی سسٹم کے تحت رہ رہے ہیں۔ حمید دولہا کی بیوی ہمیشہ اسے یہاں سے الگ کرنے کے بارے میں اکساتی رہتی تھی اور جب سے میرے سسر فوت ہوئے ہیں یہ جھگڑے بڑھتے ہی چلے جا رہے ہیں۔"
"کیا وہ لوگ پرسے کے لیے ادھر آئے ہیں۔" سجاد احمد نے سوال کیا۔
"نہ جی..... جب سے انہوں نے اس بارے میں سنا ہے وہ تو..... خود حمید کی بیوی بھی ادھر سے غائب ہے سنا ہے گھر کو تالے ڈال کر کہیں اور جا چھپے ہیں۔" پریسہ نے رکتے ہوئے جواب دیا۔
"آپ کے اپنے شوہر کے ساتھ کیسے تعلقات تھے۔ کیسے شوہر تھے؟" سجاد احمد نے سوال کرتے ہوئے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔
"جیسے ایک شوہر کے اپنی بیوی کے ساتھ ہوتے ہیں۔" اس نے مختصر جواب دیا۔
"ذرا میری طرف دیکھ کر جواب دیں۔" سجاد احمد بولا۔
اس نے اپنی ڈبڈبائی ہوئی آنکھیں اوپر اٹھائیں اور بولی۔
"کیا پوچھنا چاہتے ہیں آپ؟"
"میں نے سنا ہے وہ نشہ کرتا تھا..... اور بازاری عورتوں سے بھی اس کے تعلقات تھے۔" سجاد احمد نے آہستہ آہستہ اپنا مقصد واضح کیا۔
"ہوں گے۔ کون سے مرد کے ایسے تعلقات نہیں ہوتے۔ ہر بندہ چاہے گھر میں پری ڈال رکھے لیکن باہر جھک ضرور مارتا ہے اور اگر رشید کے تعلقات باہر ہوں گے تو مجھے اس سے غرض نہیں تھی۔ میری تمام ضروریات کا وہ بے حد خیال رکھتا تھا۔" اس نے تفصیل سے جواب دیا۔
"وہ ابھی سوال جواب کر رہے تھے کہ ایک ہلکی سی دستک کے ساتھ ایک خوبصورت نوجوان داخل ہوا۔ جس کے بڑے بڑے بال اس کے کندھے پر گر رہے تھے اس نے پتلون اور قمیص پہن رکھی تھی۔ نفاست لباس اور اس کی بولتی آنکھیں بتا رہی تھیں جیسے وہ وقت گزرنے کے ساتھ بہت پریشان ہو رہا ہو اور اسی لیے وہ جلدی اور پھرتی سے ادھر بیٹھک میں آیا ہو جہاں سجاد احمد اور پریسہ بیٹھے تھے۔
تیزی سے اندر داخل ہو کر اس نے متجسس نظروں سے سجاد احمد کی طرف دیکھا اور پریشانی میں اپنا ہاتھ مصافحہ کے لیے بڑھا دیا۔
"واجد اقبال۔"
"انسپکٹر سجاد احمد۔" اس نے بھی اپنا ہاتھ آگے کرتے ہوئے جواب دیا۔ "دراصل میں اس قتل کی تفتیش کر رہا ہوں اور اسی سلسلے میں یہاں بیٹھا ہوں۔" سجاد نے اپنا تعارف کرایا۔
"اوہ.... دخل اندازی کی معذرت..... دراصل باہر کچھ خواتین ان سے افسوس کرنے آئی تھیں اور ڈھونڈ رہی تھیں۔ اس لیے ..... اس نے بات ادھوری چھوڑتے ہوئے واپس پلٹنا چاہا۔
"کوئی بات نہیں۔ چاہیں تو آپ ادھر بیٹھی رہیں۔" سجاد احمد نے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔ تو ایک متوحش سی جھلک اس کی آنکھوں سے جھانکتی ہوئی نظر آئی۔
سجاد احمد نے اپنی پیشہ ورانہ ذہانت کے سبب اسے نوٹ کرتے ہوئے پریسہ کی طرف دیکھا۔
اس کی خوبصورت اور نیلی آنکھوں میں بھی اسے کچھ ایسا ہی ارتعاش نظر آیا۔ لگتا تھا جیسے اسے یہاں

بے سبب آنے کی وجہ سے خلجان سا ہونے لگا تھا۔

"یہ میرے کزن ہیں۔" پریسہ نے اپنی پریشانی پر کنٹرول کرتے ہوئے کہا۔

"میں چلتا ہوں۔" وہاج افضل نے کہا اور جاتے ہوئے دروازہ بند کر دیا۔

"دیکھیے! کیس ابھی شروع ہوا ہے ممکن ہے اس سلسلے میں مجھے کئی بار ادھر آنا پڑے آپ کو ناگوار تو نہیں گزرے گا۔" سجاد احمد نے اٹھتے ہوئے کہا۔

"دراصل مجھے یہ کام اپنے پولیس اسٹیشن میں بیٹھ کر کرنا چاہیے لیکن چونکہ آپ کا تعلق ایک شریف اور معزز فیملی سے ہے اس لیے میں آپ کو ادھر نہیں بلانا چاہتا۔ اس لیے......"

"نہیں... نہیں ایسی بات نہیں...... آپ جب چاہیں... جس وقت آنا ہو مجھے فون کر دیں یہ میرا سیل نمبر ہے۔" اس نے ایک چھوٹی سی چٹ پر نمبر لکھ دیا اور خود بھی اٹھ گئی۔

سجاد احمد کی پیشہ ورانہ تربیت اسے بتا رہی تھی کہ اس قتل کے محرکات میں ایک سبب تو جائیداد کی تقسیم ہو سکتا ہے مگر اس کے پیچھے اور بھی خدشات سر ابھار رہے ہیں کیونکہ جب وہاج افضل بیٹھک میں داخل ہوا تھا اسی وقت مقتول کی بیوہ کی آنکھوں میں بے کلی سی اتر آئی تھی اور یہی حیرانی وہاج کی آنکھوں سے جھانک رہی تھی۔ سجاد احمد کو اسی وقت ایک شک سا ہوا تھا کہ ممکن ہے اس قتل کا محرک کچھ اور بھی ہو مگر یہ سوچ اس وقت دم توڑ جاتی تھی جب اس کا قاتل خود پولیس کی تحویل میں تھا۔ یہی سوچتے ہوئے وہ واپس تھانے آ گیا...... تھانے آ کر اس نے ابتدائی رپورٹ کے مطابق حمید ولبلہ کے خلاف پرچہ کاٹا...... اور اگلے دن اسے عدالت میں پیش کر کے ریمانڈ لے لیا۔



روزنامہ "فٹ پاتھ" اپنی زرد صحافت کی وجہ سے شہر بھر میں بدنام تھا جو وقتاً فوقتاً اپنی مطلب براری کے لیے کسی نہ کسی سرکاری، نیم سرکاری اور پرائیویٹ اداروں کے خلاف کالم لکھنے خبریں لگانے میں ثانی نہیں رکھتا تھا اور اس سے بچنے کے لیے ان اداروں کے لوگ اسے اپنی بدنامی کے خوف سے منہ مانگی رقوم دے دیتے تھے۔ گویا وہ ایک ایسا اقدام اور جہاد کرنے کا دعویٰ کر رہے تھے جس سے وہ معاشرے کی کالی بھیڑوں کو بے نقاب کر کے اور ان کے جرائم کو عام کر کے معاشرے کی خدمت سرانجام دے رہے تھے۔ اس کے نمائندے شہر میں دندناتے پھرتے تھے اور وہ جس بھی کام کے پیچھے لگ جاتے تھے جب تک ان کے مقاصد حاصل نہ کر لیتے اطمینان سے نہ بیٹھتے تھے۔ اس کیس میں بھی یہی ہوا...... جس ادارے میں یہ قتل ہوا تھا اس کو بدنام کرنے کی سکت تو شاید اس روزنامے کے بس کی بات نہ تھی لیکن پولیس کو اپنے مقصد کے لیے استعمال کرنے میں انہوں نے پورا زور لگا رکھا تھا۔ چنانچہ اس کے نمائندے روز کسی نہ کسی بہانے پولیس اسٹیشن میں آ کر نہ صرف رعب جھاڑتے بلکہ اس کے دائرہ اختیار میں آنے والے ہر جرم کی تہہ تک پہنچنا اپنا فرض اولین جانتے تھے۔

حمید ولبلہ کے ریمانڈ کی خبر ان تک بھی پہنچ چکی تھی لہٰذا اس روز جب سجاد احمد اپنی ڈیوٹی پر آ کر بیٹھا تو ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔

سجاد احمد نے ٹیلی فون اٹھایا تو دوسری طرف سے آواز آئی۔

"روزنامہ فٹ پاتھ کا کرائم رپورٹر امانت علی بول رہا ہوں۔ کہیے کیسے ہیں۔" اس کی آواز میں بڑی کھنک تھی۔

سنا ہے دوسرے پولیس والوں کی طرح آپ اس کیس میں بہت لیت و لعل سے کام لے رہے ہیں اور اپنی کوششوں سے اسے بگاڑنے پر تلے ہوئے ہیں۔

اس کی بات سن کر سجاد احمد غصے سے باہر آ گیا۔

"کون سے کیس کی بات کر رہے ہو تم اور تمہیں کم

از کم تصدیق سے پہلے الزام لگانے کا حق کس نے دیا ہے۔"

دوسری طرف سے ہنسنے کی آواز آئی۔ اور ساتھ ہی وہ بولا۔

"ارے صاحب... ناراض ہو گئے۔ آپ تو ہمیشہ اپنے ہاتھوں کو دھو کر صاف رکھنے میں مشہور ہیں اور ماشاءاللہ پیچھے کوئی نشان بھی نہیں چھوڑتے۔ کہا تو بے امانت بول رہا ہوں روزنامہ فٹ پاتھ کا کرائم رپورٹر۔ میں دراصل رشید والہ کیس کی بات کر رہا ہوں۔ اس لیے پوچھا کرتا ہوں۔"

"اس کی تفتیش جاری ہے۔ پھر اصل مجرم ہمارے پاس ہے اور صاف بات ہے کہ قتل اسی نے کیا ہے؟" سجاد احمد نے اطمینان سے جواب دیا۔

"تھانیدار جی... سکے کے ہمیشہ دو رخ ہوتے ہیں۔ ایک ہی رخ کو نہیں دیکھتے رہنا چاہیے۔" امانت نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

"خود کیوں نہیں تفتیش کر لیتے..." سجاد احمد نے بھی اسی لہجے میں جواب دیا۔

"جس کا کام اسی کو ساجھے۔ ہم تو صرف دھیان رکھتے ہیں۔ کہیں کوئی گھپلا نہ ہو جائے۔ آپ تو ناراض ہو گئے۔ ہم وقتاً فوقتاً آپ کو تکلیف دیتے رہیں گے اگر آپ غصہ کر گئے تو ہمارا کام کیسے چلے گا۔ اللہ حافظ۔" یہ کہہ کر اس کا فون بند ہوا تو سجاد احمد غصے سے بڑبڑایا۔

"حرامزادہ... صبح ہی صبح موڈ بگاڑ دیا۔"

پھر اس نے اطلاعی گھنٹی بجائی تو ایک سنتری اندر آ گیا۔

"جی صاحب..."

"اشرف کو بلاؤ اور اسے کہو... حمید والہ کو لے کر آئے اور جب تک وہ میرے کمرے میں رہے کسی اور کو اندر آنے نہ دینا۔" سجاد احمد نے کہا۔

"جی اچھا۔" کہہ کر وہ دروازہ بند کر کے چلا گیا اور کچھ دیر بعد اشرف حمید والہ کو لے کر آ گیا اور اسے میرے سامنے کھڑا کر دیا۔

رات بھر کے جھگڑاتے اور مسلسل تواضع سے اس کا حلیہ بدلا ہوا تھا۔ اور اس سے کھڑا ہونا بھی مشکل تھا۔

"ہوں... کیا بنا..." سجاد نے اشرف سے پوچھا۔

"یہ مان نہیں رہا۔" اشرف نے کہا۔

"کیوں بے... جھگڑا تمہارا ہوا... پستول تم سے برآمد ہوا آلہ قتل پولیس کے پاس موجود ہے پھر بھی تم انکاری ہو۔" سجاد احمد نے رک رک کر جرح کی۔

"یہ ٹھیک ہے صاحب... پستول میرے ہاتھ سے پکڑا گیا یہ بھی درست ہے کہ ہمارا جھگڑا بھی ہوا تھا لیکن صاحب کوئی ایسا بے درد ہو سکتا ہے کہ اپنے سگے بڑے بھائی کو جان سے مار دے۔" اس نے ٹوٹے پھوٹے الفاظ میں جواب دیا۔

"دیکھو... تمام شہادتیں اور گواہوں کے بیانات تیرے خلاف ہیں۔ ان کے بارے میں تم کیا کہو گے... کیوں اپنی جان کے پیچھے پڑے ہو۔ صاف صاف قبول لو جائیداد کے پیچھے تو روزانہ ہزاروں قتل ہوتے ہیں۔" سجاد احمد نے دوبارہ پوچھا۔

"صاحب جی... آپ جس قسم کی چاہیں صفائی لے لیں مگر میں یہی کہوں گا کہ میں نے قتل نہیں کیا۔" اس نے ٹوٹے پھوٹے لہجے میں کہا۔

"تمہارا جائیداد کے علاوہ بھی کوئی جھگڑا تھا اور پھر ایسے جھگڑے تو گھر بیٹھ کر کسی بڑے کی یا پنچایت کے ذریعے حل ہو سکتے ہیں اس پر کسی کی ناحق جان لینے سے کیا یہ مسئلہ حل ہو جاتا ہے۔ لعنت ہے تم پر۔" سجاد احمد نے جرح کرتے ہوئے کہا۔

"صاحب جی... میں اپنی پوری جذباتی تو ہوں نہیں سچ کہہ رہا ہوں کہ یہ قتل میں نے نہیں کیا بلکہ الٹا مجھے اس کی طرف سے یہ ڈر لگا رہتا تھا کہ وہ مجھ

جھوٹ اور مکار طبیعت کا مالک ہے کہیں اشتعال میں آکر مجھے ہی نہ مار ڈالے۔ اس لیے میں یہ پستول ہمیشہ اپنے ساتھ رکھتا تھا اور المیہ یہ تھا کہ ہم دونوں ایک ہی ادارے میں کام کرتے تھے جہاں دن میں ہزاروں بار ایک دوسرے کے سامنے آتے تھے بلکہ صاحب! میں نے تو یہاں سے اپنے تبادلے کی درخواست بھی دے رکھی تھی۔ جس کا ابھی فیصلہ نہیں ہوا تھا۔ ہم تقریباً روزانہ رات کو جائیداد پر جھگڑتے تھے مگر اس کا کوئی حل بھی رشید بھائی کو قبول نہ تھا۔ الٹا وہ مجھے اور میری گھر والی کو بڑی گندی گالیاں دیتا تھا۔

اور کہتا تھا کہ میری بیوی کے ناجائز تعلقات کسی کے ساتھ قائم ہیں جس کی وجہ سے وہ مجھے اس سے الگ رہنے کا مشورہ دے رہی ہے' حالانکہ خود اس کی بیوی۔ مگر چھوڑیں صاحب جی۔ میں اپنے بارے میں کہتا ہوں کہ جس طرح کا مرضی اندازہ کر لیں میں نے یہ کوشش کیا اس روز بھی جھگڑے کے دوران اور مجھ سے تگڑا ہونے کے باوجود نہ جانے کس طرح پیچھے کر گیا۔ میرے ہاتھ میں پستول تھا جو میں نے اس کے کردوں کے قریب لگا رکھا تھا اور وہ چیخ رہا تھا اس کے پاس پستول ہے اس سے چھین لو یہ مجھے گولی مار دے گا۔ اس کی آواز سن کر کچھ لوگوں نے مجھے پکڑنے کی کوشش بھی کی مگر میرا گریبان اس کے ہاتھ میں تھا اسی چھینا جھپٹی میں ایک گولی چلی۔

اس اچانک آواز سے میں ڈر گیا تھا شاید یہ میرے پستول ہی کی گولی ہو میں نے یہ سوچ کر باہر کی جانب بھاگنا چاہا تو چوکیدار نے مجھے پکڑ لیا اور مجھ سے پستول بھی چھین لیا۔

وہ چپ ہوا تو سجاد احمد طنزیہ لہجے میں بولا۔

"لگتا ہے ڈرائنگ روم کی سیر نے ابھی تمہیں سچ بولنے پر نہیں اکسایا۔ ابھی کوئی کسر باقی ہے سوچ لو بہار تو آکر پھر بھی بولنے لگتے ہیں۔ تو تو..... پھر

نیکی کی ہدایت

کسی دوسرے شخص کو کسی نیک کام پر آمادہ کرنا بھی بہت ثواب کا کام ہے۔ اگر ایک شخص کی کوشش سے کوئی دوسرا شخص کسی نیک کام پر تیار ہو جائے تو اس نیک کام کا جتنا ثواب کرنے والے کو ملے گا اتنا ہی ثواب اس شخص کو بھی ملے گا جس نے اس نیک کام میں اس کی رہنمائی کی ہے۔

لہٰذا جب کسی شخص کو کوئی اچھی بات بتانے یا کسی نیکی کا مشورہ دینے کا موقع ملے تو اس سے گریز نہیں کرنا چاہیے۔ البتہ اس بات کا خیال رکھنا ضروری ہے کہ اس کام کے لیے ایسا طریقہ اختیار کیا جائے جس سے سننے والے کی رسوائی یا دل آزاری نہ ہو۔ مجمع میں روک ٹوک نہ کی جائے اور انداز متکبرانہ اور حقارت آمیز نہ ہو بلکہ تنہائی میں ایسے نرم لہجے کے ساتھ بات کی جائے جس میں دل سوزی و دردمندی اور خیر خواہی نمایاں ہو۔ اس کے لیے ایسے وقت کا انتخاب کیا جائے جس میں سننے والے کا ذہن مشوش نہ ہو۔ غرض حکمت اور خیر خواہی کا لحاظ رکھنا انتہائی ضروری ہے۔

(مرسلہ: محمد حذیفہ ۔ پاپوش نگر، کراچی)

ہوا ہے۔"

جاوید اشرف سمجھا ات۔ اور لے جائے..... ابھی ریمانڈ ختم ہونے میں دس روز باقی ہیں۔ دس دن کا مہمان ہے یہ..... کوشش کر دیکھو۔ اگر نہ مانا تو سجاد احمد کی سبکی ہوگی۔ ساری شہرت داغ دار ہو جائے گی۔"

وہ نکل کر گئے کہ ایک بار پھر فون کی تیز گھنٹی بجنے لگی۔

سجاد احمد نے فوراً ریسیور اٹھایا۔ دوسری طرف سے تحکمانہ آواز آئی۔

"ملک قیصر بول رہا ہوں۔ تمہارے علاقے کا ایم این اے۔"

"جی سر... جی سر... کیسے ہیں آپ جی میں سن رہا ہوں' سجاد احمد نے روایتی جملوں سے استقبال کرتے ہوئے کہا۔

"یہ میرے نہایت عزیز اور بھائی وہاب افضل بیٹھے ہیں۔ ادھر تمہارے قریبی بینک کی ایک شاخ میں قتل ہو گیا ہے۔ سنا ہے قاتل بھی تمہاری گرفت میں ہے' ہاں سنا ہے جائیداد وغیرہ کا کوئی جھگڑا چل رہا تھا۔ یار اسے جلد از جلد فارغ کردو اور ذرا مضبوط کیس بنا کر عدالت کے حوالے کردو۔ رعایت نہیں برتی۔ سنا تم نے۔" اس رعب دار آواز میں کہا گیا۔

"مگر سر... ملزم تو انکاری ہے کہ قتل اس نے نہیں کیا۔" سجاد احمد نے آہستگی سے جواب دیا۔

"واٹ... و... ا... ٹ" اس نے رک رک کر تیز لہجے میں کہا۔ "یعنی آلہ قتل کے برآمد اور رنگے ہاتھوں گرفتار ہونے پر بھی وہ قتل سے انکار کرسکتا ہے۔ دیکھو... ذرا دھیان سے اس کیس کو ہینڈل کرو... اور تمہیں ماندگان کے ساتھ پوری طرح انصاف ہونا چاہیے۔"

ادھر سے پھر وہی آواز آئی۔

"میں دلچسپی کے ساتھ کیس کو ڈیل کررہا ہوں' سر۔" سجاد احمد نے بتایا۔

"اوکے... کہیں کوئی سفارش اور رخنہ اندازی ہو تو مجھے بتانا۔ یا آپ کے پاس اس بارے میں آتے رہیں گے۔" یہ کہہ کر ایم این اے کا ٹیلی فون بند تو ہو گیا' مگر سجاد احمد کے لیے ایک نئی کھڑکی کھول گیا۔ ایک نئی راہ۔

ہوسکتا ہے... مگر پکی گواہیاں' آلہ قتل کی موجودگی... لیکن قاتل کا انکار... یہ سب کیا تھا جو اسے آہستہ آہستہ اپنی زنجیر میں جکڑنے لگا تھا۔ اگلے روز وہ پھر بینک کے ڈرائنگ روم میں بیٹھا تھا۔

❁......❁......❁

ادارے سرکاری ہوں یا پرائیویٹ۔ ان کے اپنے اپنے اصول وضوابط ہوتے ہیں۔ سر...... پھر ہم تو ملازم لوگ ہیں۔ سارا سارا دن ہاتھ میں اسکینر پکڑے آتے جاتے لوگوں کے جسموں پر پھیرتے رہتے ہیں ہماری ذمہ داری تو آنے والے لوگوں سے کوئی ناجائز چیز پکڑنا ہوتی ہے' کوئی اسلحہ یا کوئی بھی مشکوک چیز تحویل میں لینا' یا اس کی نشاندہی ہوتی ہے۔ مگر صاحب ادارے کے ملازموں کی تلاشی لینا تو ہماری ذمہ داری نہیں ہے۔ اگر بڑے افسران ہمیں کہتا تو ایسا بھی کرسکتے ہیں' مگر آج تک کبھی کسی افسر نے ہم سے نہیں کہا۔"

بینک کے اس روز ڈیوٹی پر موجود گن مین زیارت خان نے بیان دیتے ہوئے کہا۔

"تو کیا ہر ملازم بھی اسلحہ لے کر بینک اوقات میں اندر باہر آجا سکتا ہے۔" سجاد احمد نے جرح کرتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں جی اور پھر رشید وابلہ تو بہت تجربہ قسم کا بندہ تھا جی... اللہ معاف کرے' فوراً ماں بہن ایک کردیتا تھا... بڑے افسروں کی مونچھ کا بال تھا...... اس کی بیلٹ میں ہر وقت جدید اور اعلیٰ نسل کا پستول لٹکا ہوتا تھا اور وہ دن میں کئی کئی مرتبہ برانچ میں آتا جاتا رہتا تھا۔"

زیارت خان ہر بات بڑی تفصیل سے بتا رہا تھا۔

"زیارت خان پھر تو تمہارا یہ اسکینر پکڑ کر ہر وقت کھڑے رہنا تو بے کار ہوا ناں...... " سجاد احمد نے پوچھا۔

"یہی سمجھ لیں جی...... ہمیں کہیں گے تو ہم اس پر عمل کریں گے۔"

"اس روز کیا ہوا تھا۔" سجاد احمد نے اس سے پوچھا۔

"پتہ نہیں جی' ہم تو ادھر گیٹ کے پاس کھڑا تھا' اندر برانچ میں شور مچا' میں بھی دروازے سے اندر آیا'

تو پتہ چلا کہ کچھ جھگڑا ہو گیا ہے اور پھر کسی نے بڑی تیزی سے کہا۔

"گیٹ بند کرو بھاگنے نہ پائے..... میں نے فوراً گیٹ بند کر دیا' چٹخنی لگا دی تو یہ اپنا..... نہیں نہیں اللہ معاف کرے' اپنا نہیں ...... یہ حمید وہلہ بھاگتا ہوا آیا' اس کے ہاتھ میں پستول تھا۔ میں نے اس سے چھیننا چاہا' پہلے تو اس نے مجھے دھکا دے کر گرانے کی کوشش کی مگر میں نے اسے پچھاڑ دیا اور اس سے پستول چھین لیا۔

اس کے بعد کچھ لوگ اس کے بھائی رشید وہلہ کو سہارا دے کر لائے' بینک کی جیپ میں اسے ڈالا' اس وقت اس کے جسم سے بے حد خون بہہ رہا تھا۔ اس کے جاتے ہی کچھ اور لوگ اسے اسپتال دیکھنے دوڑ گئے۔ اسٹاف کا معاملہ تھانہ جی' میں نے حمید وہلہ کو منیجر کے کمرے میں بٹھا دیا۔ پھر پولیس آ کر اسے لے گئی' اور پستول بھی میں نے ایک پولیس والے کو پکڑا دیا تھا۔

"مجھے نہیں پتہ ان کے درمیان جھگڑا کس بات کا تھا' یا کیا ہوا تھا' بہرحال برا ہوا' کیا زمانہ آ گیا ہے جی' بھائی بھائی کے خون کا پیاسا ہو گیا ہے۔"

یارت خان کو اس سے بڑھ کر اور کچھ معلوم نہ تھا' اس لیے تفصیل کے ساتھ اس کا بیان قلم بند کرنے کے بعد اسے پولیس اسٹیشن لے جانے کی اجازت دے دی گئی۔

بے پناہ تشدد اور ہر حربہ استعمال کرنے کے باوجود حمید وہلہ کا یہی بیان تھا کہ اس نے گولی نہیں چلائی البتہ اس کا جرم اتنا ضرور تھا کہ اس نے اپنا پستول صرف ڈرانے کے لیے رشید وہلہ کے جسم کے ساتھ لگایا تھا لیکن اس نے تو اپنی انگلی بھی ٹریگر سے باہر رکھی ہوئی تھی۔ مبادا جذبات میں آ کر اس سے گولی نہ چل جائے۔ اس کے اس بیان نے پولیس کو قصے میں ڈال دیا تھا۔ سوال یہ پیدا ہوتا تھا کہ اگر اس نے گولی نہیں چلائی تو پھر گولی کس نے چلائی تھی۔ پوسٹ مارٹم کی رپورٹ کے مطابق گولی بالکل نزدیک سے چلائی گئی تھی اور حمید وہلہ کے مطابق جہاں اس نے پستول لگا رکھا تھا اس جگہ گولی کا نشان مقتول کے جسم پر واضح ہو رہا تھا۔

یہی سوچ کر اگلے دن سجاد احمد نے پریسہ کو تھانے بلایا تھا۔

کیس کو الجھتا دیکھ کر سجاد احمد نے نئے رخ سے اس کی تفتیش کرنا شروع کر دی تھی۔ محض اس خیال سے کہ شاید کوئی اور نشان کوئی اور کڑی مل جائے جس سے کیس درست سمت اختیار کر جائے' کیونکہ قاتل حمید وہلہ کا یہی بیان تھا کہ اس نے قتل نہیں کیا۔

پریسہ اس روز بن ٹھن کر پولیس اسٹیشن آئی تھی۔ ایسے لگ رہا تھا جیسے پہلی بار اس کے جوبن پر بہار آئی ہو۔ گو جس طرح کا سیاہ لباس اس نے پہن رکھا تھا' اس کی سوگواریت پر دلالت کرتا تھا۔ مگر پہلی نظر میں دیکھنے والا کسی طرح بھی یہ اندازہ نہیں کر سکتا تھا کہ یہ حال ہی میں قتل ہونے والے رشید وہلہ کی بیوہ ہے۔

سجاد احمد نے اسے کمرے میں آتے دیکھ کر چپڑاسی کو دروازہ بند کرنے کا کہا' وہ مسکراتے ہوئے آ کر اس کے سامنے کھڑی ہوئی تھی اور پھر بڑے والہانہ انداز میں پوچھنے لگی۔

"کیا آپ آنے والوں کو بیٹھنے کا نہیں کہتے۔"

"اوہ شاید میں بھول گیا ہوں۔ معذرت خواہ ہوں' آپ بیٹھیں۔" سجاد احمد نے اسے ہاتھ سے اشارہ کر کے کہا۔

"شکریہ....." اسے لگا جیسے قیامت بیٹھ گئی ہو۔

"اتنے سارے شواہد کے ہوتے ہوئے اور قاتل کے ہاتھ سے آلۂ قتل برآمد ہونے کے باوجود آپ کو لگتا ہے کہ میرے شوہر کا قتل کسی اور نے کیا ہے؟" اس نے شکوے کے انداز میں کہا۔

"جی اب تو کچھ کچھ مجھے بھی یقین سا ہونے لگا ہے کہ واقعتاً یہ قتل کسی اور نے کیا ہے' حمید وہلہ تو

صرف استعمال ہوا ہے۔ سجاد احمد نے اس کی نیلی گہری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بتایا۔

"کیا..... کیا آپ کو مکمل یقین ہے۔" اس نے حیرانگی سے پوچھا۔

"دیکھیے مسز رشید..... اہم نے اپنا ہر حربہ اس پر استعمال کر کے دیکھ لیا' تھرڈ ڈگری اندازِ تفتیش بھی اس پر کارگر نہیں ہوا۔ اس کا صرف ایک ہی بیان ہے کہ قتل اس نے نہیں کیا اور وہ اس سلسلے میں بے قصور ہے۔"

"کمال ہے اس کا یہ مطلب ہوا کہ آپ کی تفتیش ناکامی کا منہ دیکھنے جا رہی ہے۔" اس نے مسکراتے ہوئے چوٹ کی۔

"آپ جیسے ذہین' خوبصورت اور محنتی آفیسر کا یہ احساسِ شکست کچھ اچھا نہیں لگا۔" اس نے طنز کے سہارے تیر برسانا شروع کر دیے۔ تب اچانک سجاد احمد نے بھی پینترا بدلا۔

"کبھی کبھی خوبصورتی کے آگے ہتھیار بھی کند ہو جاتے ہیں۔ میرا مطلب ہے کہ میرے تمام تر ہتھیار اور حربے اس نے ایک ہی بات کی ڈھال پر سہہ ڈالے کہ یہ قتل اس نے نہیں کیا۔" سجاد احمد نے کہتے ہوئے اس کی آنکھوں میں جھانکا تو ایک ہلکی سی خوفزدہ سوچ وہاں تیرتے ہوئے نظر آئی۔ ٹھیک اسی لمحے سجاد احمد نے چوٹ کی۔

"اگر آپ برا نہ مانیں تو میں وہاج افضل کے بارے میں آپ سے کچھ پوچھ سکتا ہوں۔ دیکھیے یہ بھی ہماری تفتیش کا ایک حصہ ہے۔ آپ کا خاوند قتل ہوا ہے اور قاتل لاک اپ میں موجود ہے جو اس سے انکاری ہے پھر تیسرا شخص کون ہے؟ اسے میری طرح آپ کو بھی تلاش ہے' لیکن مجھے افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ اس قدر آپ کو اپنے خاوند کے قتل کا افسوس نہیں ہے جس قدر رشید وہاج کو سزا دلوانے میں آپ اور وہاج دلچسپی لے رہے ہیں۔ کہیں نہ کہیں کوئی کمزور پہلو ضرور ہے جو شک کی بنیادوں کو یقین کی دیواریں بنا رہا ہے۔" سجاد احمد نے دھیرے دھیرے کہا۔

تو پریسا اپنی کرسی سے اچھل پڑی۔

"انسپکٹر صاحب' آپ کو ایک شریف عورت پر شک کرنے کی اجازت کس نے دی ہے۔"

"دیکھیے محترمہ! آپ نے بتایا کہ آپ کے اور مقتول رشید کے گھریلو تعلقات ٹھیک چل رہے تھے' مگر میرے اندازے کچھ اور کہہ رہے ہیں۔" بات کرتے کرتے سجاد احمد رک گیا۔

"آپ کا کیا اندازہ ہے' میں نے جھوٹ کہا ہے۔" پریسا خوفزدہ ہو کر بولی۔

"جی ہاں..... یہی کہ آپ کے گھریلو تعلقات ٹھیک نہیں تھے' چونکہ آپ کا خاوند نہ صرف شراب کا عادی تھا' اس کے بازاری اور آوارہ عورتوں سے تعلقات بھی تھے اور پھر سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ اپنے مقصد..... یعنی حصول کی خاطر بڑے بڑے آفیسرز کو ان کی من پسند لڑکیاں بھی سپلائی کرتا تھا۔ کیا میں جھوٹ کہہ رہا ہوں۔" سجاد احمد تھوڑی دیر کو رکا..... پھر اس کی طرف غور سے دیکھنے لگا' تو اسے ایسا لگا' جیسے پریسا اندر سے کہیں ٹوٹ گئی ہو۔ اس کی خوبصورت آنکھیں چھلک پڑیں۔

"آپ کا اندازہ درست ہے آفیسر..... رشید وہاج مجھے شروع سے ہی پسند نہ تھا' لیکن چونکہ ہماری شادی ایک خاندانی معاملہ تھا' اس لیے بڑوں کے فیصلوں کی سولیوں پر ہم جیسی لڑکیوں کو چپ چاپ چڑھنا پڑ جاتا ہے۔ اس کی بجائے مجھے وہاج افضل پسند تھا۔ ہم ایک دوسرے سے محبت بھی کرتے تھے لیکن اسے آپ اور میں صرف تقدیر کہہ سکتے ہیں۔ میں رشید کی بیوی بن گئی یہاں آ کر جب میں نے رشید کا رویہ اور اس کی اڑتی ہوئی شہرت سنی تو اس نے مجھے اس سے متنفر کرا دیا اور میرا جھکاؤ ایک بار پھر وہاج افضل کی طرف ہو گیا۔ اسی اثنا میں دونوں بھائیوں کے درمیان

جائیداد کا جھگڑا اٹھ کھڑا ہوا۔ رشید اپنی حرکتوں کے سبب گھر میں بھی اکثر دیر سے آتا اور کئی کئی بار تو وہ کسی بہانے گھر سے بھی کئی کئی روز غائب رہتا تھا' اس کی مذموم حرکات کا اکثر و بیشتر مجھے علم ہو جاتا تھا۔

وہاج افضل نے کئی بار مجھے اس سے خلع لینے کا مشورہ دیا' مگر میں ٹال گئی' یقین آپ جس طرح مرضی اطمینان کرنا چاہیں تو ہم حاضر ہیں' کہ اس کے قتل میں ہمارا کوئی عمل دخل نہیں ہے۔" پریسہ نے روتے ہوئے ہولے ہولے بتایا۔

"دیکھو محترمہ! مجھے آپ کے ذاتی معاملات سے کوئی غرض نہیں' میں نے تو اس قتل کا مسئلہ حل کرنا ہے جو میرے نزدیک کسی بڑے بندے کا نہیں' ایک جیتے جاگتے انسان کا قتل ہے اور میں اس معاملے میں بہت دور اور کہیں تک بھی جا سکتا ہوں۔ بہر حال اب آپ تو جا سکتی ہیں' آخر میں میں یہ پوچھنا چاہوں گا کہ آپ کے اور وہاج افضل کے تعلقات کا کس کس کو علم ہے۔"

"میرے اندازے میں ابھی تک کسی کو نہیں۔" اس نے روتے ہوئے بتایا۔

"ٹھیک ہے' اب آپ گھر جائیں اور کسی بھی وقت قانونی ضرورت کے تحت آپ کو دوبارہ بلایا جا سکتا ہے۔" سجاد احمد نے بتایا۔

"میں حاضر ہوں۔" پریسہ نے اپنے پرس سے ٹشو نکال کر اپنی بھیگی آنکھیں صاف کیں اور اٹھ کر باہر نکل گئی۔



ایگزامن رپورٹ پولیس اسٹیشن میں اس کی میز پر پڑی تھی۔ جس میں واضح طور پر لکھا ہوا تھا' کہ پستول کے میگزین میں موجود گولیوں سے مقتول کو لگنے والی گولی میچ نہیں کرتی' اگرچہ میگزین میں ایک گولی کم تھی مگر رشید الہٰہ کے جسم سے برآمد ہونے والی گولی ان سے میچ نہیں کرتی تھی' جس کا مطلب یہ تھا کہ حمید الہٰہ کا بیان سچ تھا کہ اس کے بھائی کے جسم سے نکال جانے والی گولی اس کے پستول کی نہ تھی' پھر یہ گولی کس نے چلائی تھی' کسی کو اس کے ساتھ کیا دشمنی ہو سکتی تھی۔

حمید الہٰہ دوبارہ ریمانڈ پر پولیس اسٹیشن پر موجود تھا اور آج اس کا یہاں آخری دن تھا۔

تب سجاد احمد نے ایک بار پھر اسے بلا کر پوچھا۔

"دیکھو...... اگر تم قاتل نہیں ہو تو پھر اسے کس نے قتل کیا ہے۔ تمہیں کوئی شک شبہ۔"

"یقین کریں صاحب جی...... میں بالکل نہیں جانتا...... کہ اسے کس نے قتل کیا ہے۔ وہ زانی تھا۔ شرابی تھا اور وہ بڑے لوگوں کو لڑکیاں بھی سپلائی کرتا تھا' یہاں تک کہ اسٹاف میں بھرتی ہونے والی لڑکیاں بھی اس کی پہنچ سے دور نہ تھیں۔ آپ تو جانتے ہیں' کہ اپنی ترقی کی خاطر یہ بیچاریاں کیا کچھ نہیں کر گزرتیں۔ دوا گر جب سیدھے ہاتھ سے گھی نہ نکلتا دیکھتا تو بڑے مذموم ہتھکنڈے استعمال کرنے لگتا تھا اور جب تک وہ اپنے مقصد کو حاصل نہ کر لیتا تھا' وہ ان کے ارد گرد کا دائرہ تنگ کرتا جاتا تھا۔ ہاں یاد آیا' وہ پچھلے کچھ دنوں سے زونیلہ جو کہ نئی نئی عارضی آفیسر بن کر اس برانچ میں آئی تھی' اس پر ڈورے ڈال رہا تھا' جس کی وجہ سے وہ بے حد پریشان رہتی تھی۔

ایک روز اس نے بھائی رشید کی شکایت مجھ سے بھی کی تھی۔ تب میں نے اسے تسلی دے دی تھی کہ میں اس کے لیے کچھ کروں گا مگر اسے میری بزدلی جانئیے کہ میں رشید بھائی سے کچھ نہ کہہ سکا۔ زونیلہ دبلی پتلی اور انتہائی خوبصورت لڑکی تھی' وہ اکثر مجھ سے ہنستے ہوئے کہتی تھی۔

"حمید بھائی...... یہ حسن بھی بڑی زحمت ہے' یہ جس کو مل جائے اس کے لیے عذاب بن جاتا ہے' اب دیکھو اس ادارے میں مجھے جاب ملی تو میں خوش تھی کہ ایک معتبر ادارے میں ملازمت مل گئی ہے۔ اب میری عزت اور میری آبرو محفوظ رہے گی' مگر یہاں بھی میر

ے اور گر رہو کے گدھ منڈلانے لگے ہیں۔ سوچ رہی ہوں کہ میں استعفیٰ دے دوں' ایک عزت ہی تو ہوتی ہے غریب عورت کے پاس..... وہ بھی نہ رہے تو جینا کس کام کا۔

میں نے اسے بے حد روکا' مگر میرا اپنا بھائی اس کی عزت کے درپے ہو رہا تھا' اس روز بھی اس نے روتے ہوئے مجھے بتایا تھا کہ اب تو اس کا جینا دوبھر ہو چکا ہے' دو ہی راستے ہیں اس کے پاس' یا تو خودکشی اور یا پھر دوبارہ سے بے روزگاری۔

"تمہارے بھائی نے کل مجھے وارننگ دی تھی کہ اگر اس کی بات نہ مانی تو مجھے اغوا کرلیا جائے گا' کیونکہ اسے اپنا ایک ضروری کام نکلوانے کے لیے اس کی ضرورت ہے۔"

حمید نے آہستہ آہستہ اسے بتایا' تو اس کی سوچوں میں ایک دھماکا سا ہوا۔ وہ بولا۔

"ٹھیک ہے' لے جاؤ اسے اور صبح اسے عدالت میں پیش کردینا۔ دوبارہ ریمانڈ لینے کی ضرورت نہیں ہے' اب ایک نیا راستہ زوئیلہ کی صورت اس کو دکھائی دینے لگا تھا۔ اس نے اگلے روز پولیس اسٹیشن آتے ہی سب سے پہلا کام یہ کیا کہ بینک کی شاخ کے منیجر سے بات کی۔

"میں انسپکٹر سجاد احمد بول رہا ہوں۔" اس کی آواز سن کر دوسری طرف سے کچھ پوچھا گیا۔ تب وہ دوبارہ بولا۔

"مجھے تمہاری برانچ کی پروبیشنری آفیسر زوئیلہ سے اس قتل کی بابت کچھ انکوائری کرنا ہے' آپ اسے کچھ دیر کے لیے پولیس اسٹیشن بھجوا سکتے ہیں' نہیں تو میں اس سلسلے میں لیڈی پولیس کو بھجوا دوں۔"

"ہاں..... ہاں بھجوا دیں' لیکن احتیاط رہے کہ وہ سادہ کپڑوں میں ہو۔ پولیس کی وردی میں ہوگی تو ہماری بدنامی کے ساتھ ساتھ زوئیلہ بھی گھبرائے گی۔ وہ ایک بہت شریف اور گھریلو قسم کی لڑکی ہے۔ اس کی ہر طرح کی ضمانت خود میں دینے کو بھی تیار ہوں۔ اس کے ساتھ کسی قسم کی زیادتی نہیں ہونی چاہیے۔"

"میں آپ کی توقعات پر پورا اترنے کی کوشش کروں گا۔" اس نے یقین دہانی کرائی اور ایک لیڈی کانسٹیبل بینک بھجوادی۔

کچھ دیر بعد زوئیلہ اس کے ساتھ پولیس اسٹیشن پر موجود تھی۔ وہ خاصی خوفزدہ اور گھبرائی گھبرائی لگ رہی تھی۔ اس کی بڑی بڑی آنکھوں سے خوف چھلک رہا تھا۔ جیسے اللہ تعالیٰ نے بڑی فرصت کے ساتھ اسے بنایا ہو۔ مگر اب اس کا سرخ و سفید رنگ ہلدی کی طرح زرد ہو رہا تھا۔ سجاد نہیں چاہتا تھا کہ اس سلسلے میں اس کی اپنی شہرت پر کچھ آنچ آئے' اور پھر اسے اس کی بدنامی پر بھی ترس آ رہا تھا۔

"دیکھیے انہیں پانی پلائیے اور ادھر قریب ہی بیٹھ جائیں لیکن ایک بات کا دھیان رہے کہ یہاں جو بھی گفتگو ہو' اس کی بازگشت باہر سنائی نہ دے۔"

سجاد احمد نے اپنی ساتھی پولیس کانسٹیبل کو کہا تو وہ آہستہ سے بولی۔

"جی سر!" اس نے اٹھ کر پانی کا ایک گلاس زوئیلہ کے پاس رکھ دیا اور اسے پینے کو کہا مگر زوئیلہ نے انکار کردیا اور سہمے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

"مجھے یہاں کس سلسلے میں لایا گیا ہے؟"

"وہ دراصل آپ کی برانچ میں جو رشید وابلہ کا قتل ہوا تھا' اس کی انکوائری میں آپ سے کچھ پوچھنا تھا۔" سجاد نے مطمئن لہجے میں کہا۔

"میرا اس سے کیا تعلق۔" اس کے اندر مری ہوئی کوئل بولی۔

اس کی آواز میں بلا کی نغمگی تھی۔ سجاد احمد اس کی خوبصورتی کے ساتھ اس کی آواز کے لوچ سے بھی گھائل ہونے لگا تھا۔

"دیکھو بی بی! بعض تعلق ایسے ہوتے ہیں جو نہ چاہتے ہوئے بھی کسی نام کے ساتھ جڑ جاتے ہیں۔

اگر آپ میرے ساتھ تعاون کریں گی تو یہ آپ کے لیے بہتر ہوگا۔ ورنہ سچ بلوانے کے لیے ہمیں دوسرے حربے بھی استعمال کرنا آتے ہیں۔"

یہ سن کر زوئیلہ کا رنگ دھلے لٹھے کی طرح ہو گیا۔ اس کی خوبصورت آنکھوں سے آنسو چھلکنے لگے۔ اس نے رندھی ہوئی آواز میں کہا۔

"پوچھیے جو پوچھیں گے میں سچ سچ بتادوں گی۔ ویسے بھی یہ حسن میرے لیے وبال بن چکا ہے میں خود اپنی اس خوبصورتی سے تنگ آچکی ہوں، جس نے مجھے ہر طرف سے گھیر رکھا ہے اور مجھے بدنامی کی پاتال میں گرانا چاہتی ہے۔" وہ روتے ہوئے دھیرے دھیرے کہہ رہی تھی۔

"مجھے بس آپ کا اقبالی بیان چاہیے کہ یہ قتل آپ نے کیا ہے۔" سجاد احمد نے سیدھے الفاظ میں کہا تو وہ روتے ہوئے بولی۔

"دکھیں...!"

سجاد احمد نے لیڈی پولیس کانسٹیبل کو اشارہ کیا تو وہ کاغذ قلم لے کر بیٹھ گئی۔ اب دھیرے دھیرے زوئیلہ بولتی جارہی تھی اور وہ لکھ رہی تھی اس کے ساتھ ہی سجاد احمد نے ایک چھوٹا ٹیپ ریکارڈ بھی آن کر لیا تھا۔ زوئیلہ اپنا اقبالی بیان ریکارڈ کروانے لگی تھی۔

"میں زوئیلہ بنت عبداللہ بقائمی ہوش و حواس بیان دے رہی ہوں کہ میں رشید وابلہ کی قاتلہ ہوں۔ میں نے یہ قتل محض اپنی عزت بچانے کی خاطر کیا ہے۔

میرا تعلق ایک غریب گھرانے سے ہے میں نے اپنی اعلیٰ تعلیم بھی جیسے تیسے پوری کی اور پھر بینک میں مجھے ملازمت مل گئی۔

مگر میری خوبصورتی جو ہمیشہ سے میری گھات میں تھی یہاں بھی مجھے چین سے نہ رہنے دے رہی تھی۔ یہاں کے اعلیٰ افسران اب مجھے اپنے نشانے پر لینے کو تلے ہوئے تھے۔ ایسے ایسے بوڑھے...... جو عمر میں میرے والد کی عمر سے بھی زیادہ تھے، مجھے دیکھ کر ان کی رال ٹپکنے لگی تھی۔ اب تو ان کی طرف سے خفیہ طریقوں سے تعاون کرنے کی پیش کشیں ہونے لگی تھیں اور ان کے بدلے میں میرے درخشاں مستقبل کی نوید بھی سنائی دینے لگی تھی، جسے میں بڑی ہمت سے ٹھکراتی چلی آئی تھی۔

اس معاملے میں ایک بار میں نے اسٹاف یونین کے کرتا دھرتا لوگوں سے بات کی... تو انہوں نے بھی میری کوئی مدد نہ کی، بلکہ الٹا اس کے ایک رکن رشید وابلہ نے مجھ سے رابطہ بڑھا کر مجھے اس راستے پر چلنے کی پیش کش کی۔ جسے میں نے نہ صرف ٹھکرا دیا بلکہ اس کی اچھی خاصی گوشمالی بھی کروائی۔

لیکن اس کے باوجود وہ انتہائی ڈھٹائی سے وقتاً فوقتاً مجھے زچ کرنے لگا تھا، پھر ایک روز تو اس نے ڈھٹائی سے کہا۔

"زوئیلہ... کیا ہے اگر تمہارے حسن کی خیرات کسی اپنے بندے کی جھولی میں گر جائے، یقین کرو ایسا کرنے سے نہ صرف وہ بندہ تمہارا زندگی بھر کا غلام ہو جائے گا بلکہ ترقی کے تمام دروازے بھی تم پر کھل جائیں گے، میری مانو...... تو عیش کرو گی عیش...... یہ جو تمہارے اردگرد دوسری لڑکیاں یہاں ملازمت کررہی ہیں اور دن دگنی رات چوگنی ترقی کررہی ہیں، اس کا سبب بھی یہی ہے..... جو میں نے تمہیں بتایا ہے، سوچ لو سب اچھی طرح..... میں نے اس کو نہ صرف دھتکار دیا بلکہ اس کی بے حد بے عزتی بھی کی اور اس کی شکایت اس کے چھوٹے بھائی حمید وابلہ سے بھی کی لیکن وہ بھی اس معاملے میں بے بس لگا، مجھے سمجھ نہیں آرہی تھی کہ اس سے کس طرح چھٹکارہ حاصل کرسکتی ہوں۔

انہی دنوں میری منگنی اپنے رشتہ داروں میں ہو گئی، وجاہت نام کا ہی وجیہ نہ تھا بلکہ وہ دل کا بھی بے حد خوبصورت انسان تھا۔ وہ ایسا تھا جس کی ہمراہی کی خواہش ہر لڑکی کرتی ہے، میں نے اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا تھا کہ مجھے وجاہت ایسا ساتھی ملا۔ میں اب جلد ہی

ملازمت کو چھوڑنے والی تھی لیکن وجاہت کی چند مجبوریوں نے مجھے کام سے استعفیٰ دینے سے روکے رکھا۔ ان ہی دنوں رشید نے پھر سے اور کھردا اپنے مذموم ارادوں کا گھیرا اور تنگ کرنا شروع کر دیا۔ میں نے اس کا ذکر وجاہت سے بھی کیا اور اپنی حفاظت کے لیے اس سے کہہ کر پستول کا لائسنس بھی لے لیا' اس نے اپنے خرچ سے کچھ پیسے بچا کر مجھے ایک سیکنڈ ہینڈ پستول بھی لے دیا جو میں اب اپنے پاس رکھنے لگی تھی۔

اس روز رشید واہلہ نے مجھے صریحاً دھمکی دی تھی۔

آخری بار تمہیں کہہ رہا ہوں' میری بات مانو گی تو خوش رہو گی' ورنہ کل تک تم اغوا ہو جاؤ گی پھر دیکھوں گا تم کیسے نخرے کرتی ہو .... بہت دیکھ لیے تمہارے چوچلے۔

چونکہ اسٹاف کی تلاشی نہیں ہوتی' اس لیے میں پستول ہمیشہ اپنے دستی بیگ میں رکھتی تھی' اس روز رشید واہلہ اور اس کے بھائی حمید واہلہ کے درمیان جھگڑا ہوا نوبت ہاتھا پائی تک آ پہنچی تھی۔ یہ سب دیکھ رہی تھی پھر حمید واہلہ نے اسے صوفوں کے قریب گرا لیا اور اس کے جسم پر سوار ہو گیا' اس کے ہاتھ میں پستول دیکھ کر مجھے نہ جانے کیا سوجھا۔

میں نے دل میں دعا کی .... کہ اللہ کرے حمید اسے قتل کر دے' حمید نے جب پستول کی نال اس کی گردن پر لگائی تو رشید واہلہ ڈر کے مارے چیخ اٹھا۔

"بچاؤ .... اس کے ہاتھ میں پستول ہے یہ مجھے جان سے مار دے گا۔" کچھ لوگ اس کی طرف بھاگے تو میرے ذہن میں نہ جانے کہاں سے یہ بات آئی کہ رشید واہلہ جیسے گند کو ہمیشہ کے لیے ختم ہو جانا چاہیے۔ یہ سوچ کر میں نے اپنے ہینڈ بیگ سے اپنا پستول نکالا اور بڑی پھرتی کے ساتھ ادھر جا پہنچی نہ جانے کس نے حمید واہلہ کا ہاتھ پکڑ کر اونچا کر دیا تھا' اور اس سے اس کا پستول چھیننا چاہا میں نے فوراً اسی جگہ پر اپنا پستول رکھا اور اس کا فائر کر دیا .... ایک ہلکا سا شور ہوا اور رشید واہلہ کی آواز آئی۔

"اوہ اس نے مجھے مار ڈالا ...." حمید واہلہ ڈر کر بھاگا .... لوگ اس کے پیچھے بھاگے اور میں اپنی سیٹ پر دوبارہ آ کر بیٹھ گئی۔ حمید واہلہ کو گرفتار کر لیا گیا تھا اور رشید واہلہ قتل ہو چکا تھا۔

ایک برائی ہمیشہ کے لیے ختم ہو چکی تھی اور میں مطمئن تھی کہ میرا نام اس قتل میں کبھی نہیں آئے گا مگر میری سوچ غلط تھی' آج میں بتاتی ہوئی وجوہ اس بات کا اقرار کرتی ہوں کہ رشید واہلہ کی اصل قاتل میں ہوں' میں ہوں۔"

اتنا لکھوانے کے بعد وہ ایک بار پھر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی تھی۔ لیڈی کانسٹیبل نے اس کے بیان کے نیچے اس کے دستخط لیے اور اس کی باقاعدہ گرفتاری ڈال کر اسے حوالات میں بند کر دیا گیا۔

سجاد احمد نے اس کیس کی سوچ بچار کے بعد چالان مکمل کیا اور اس .... کی روشنی میں بہت ہی نرم شقیں لگا کر اس کا چالان کر کے اس کی گرفتاری ڈال دی۔ نیا اس نے ایسا خدا ترسی کی وجہ سے کیا تھا' اس کی خوبصورتی سے مرعوب ہو کر کیا تھا یا اس کی جوانی پر ترس آ گیا تھا۔ انتہائی نرم شقیں لگا کر مکمل ہونے والا یہ اس کا پہلا اور شاید آخری چالان تھا' اور گرفتاری بھی .... اس نے ایسا کس لیے کیا یہ وہ آج تک نہیں سمجھ سکا۔ اس سے جب بھی پوچھا .... تو اس نے یہی کہا کہ بند گلی میں تو اس کا اپنا سانس گھٹنے لگتا ہے' وہ اب قانون کی بند گلی میں زونیشہ کو ساری زندگی قید نہیں رکھنا چاہتا اس لیے اس نے یہ رعایت برتی ہے۔

فطری لغزش

شان شفیق

انسان خطا کا پتلا ہے۔ یہ انسانی فطرت کا خاصہ ہے۔ شاید اللہ تعالیٰ نے جس مٹی سے حضرت آدم علیہ السلام کو خلق کیا' اس مٹی کے کسی ذرے میں یہ فطرت شامل ہو' تبھی تخلیق آدم سے لے کر آج تک انسان زندگی کے کسی نہ کسی مرحلے پر کوئی نہ کوئی خطا ضرور کرتا ہے۔ معاف کرنا شان کریمی ہے جس کی وجہ سے رب تعالیٰ ہر ہر قدم پر ہماری خطاؤں سے درگزر کرتا ہے اور ہمیں اچھائی کے راستوں پر چلنے کا موقع فراہم کرتا ہے۔

ایک دوشیزہ کا افسانہ دل فریب' اس کی ایک لغزش نے اسے خود سے دور کر دیا تھا۔

جب میری آنکھ کھلی تو میں نے اپنے گرد سفید لبادوں میں خواتین کو دیکھا اور مجھے محسوس ہوا کہ میری دنیاوی زندگی ختم ہو چکی ہے اور میں دوسری دنیا میں آ گیا ہوں' لیکن سفید لبادوں میں ملبوس یہ کون تھیں کیا یہ حوریں ہیں اور کیا' اب مجھ سے سوال جواب ہوں گے۔ اسی دوران ایک دراز قامت مرد نظر آیا' جس نے سفید گاؤن پہنا ہوا تھا۔

"اب یہ خطرے سے باہر ہے۔" میرے کانوں میں اس کی آواز آئی اور پھر میں اسی دنیا میں آ گیا جہاں اب تک رہتا رہا تھا۔ مجھے سب کچھ یاد آ گیا' میرا ایکسیڈنٹ ہو گیا تھا اور اتنا شدید کہ فوراً ہی بے ہوش ہو گیا' اب میں اسپتال میں تھا۔ مجھے یہاں کون لایا تھا' میں اس بات سے واقف نہیں تھا' کچھ دیر ہی گزری تھی کہ ایک معمر شخص جس کے چہرے پر سفید داڑھی تھی اور خال خال سیاہ بال نظر آ رہے تھے' انہوں نے شیروانی پہنی ہوئی تھی سر پر جناح کیپ خاصے تندرست دراز قامت' تقریباً ساٹھ سال ان کی عمر رہی ہو گی' نمودار ہوئے۔

"کیسے ہو بیٹے؟" وہ مجھ سے بڑی نرمی سے مخاطب ہوئے۔ میں ان کا چہرہ دیکھنے لگا۔

"کمزوری بہت زیادہ ہے۔ بہت خون ضائع ہو گیا' انہیں آرام کرنے دیں۔" ڈاکٹر نے ان سے کہا۔

"بہرحال جس چیز کی ضرورت پیش آئے آپ مجھے اطلاع دے دیں۔" انہوں نے ڈاکٹر سے کہا پھر وہ چلے گئے۔ میں تقریباً دو ہفتے اسپتال میں پڑا رہا اور سوچتا رہا ایک بے یار و مددگار شخص جس کا اس دنیا میں خدا کے سوا کوئی نہیں تھا اور ملازمت کے لیے مارا مارا پھر رہا تھا' اس کی کیسی دیکھ بھال ہو رہی تھی۔ ایکسیڈنٹ کس گاڑی سے میرا ہوا تھا مجھے کچھ نہیں معلوم تھا۔ بہرحال بیس بائیس دن میں' میں ٹھیک ٹھاک ہو گیا' ایک دن ڈاکٹر نے مجھے بتایا کل مجھے فارغ کر دیا جائے گا' میں سوچنے لگا پھر وہی بیروزگاری کے دن ہوں گے پھر وہی احساس محرومی ہو گا' پھر وہی تنہائیاں ہوں گی' ساڑھے چار سال کی عمر میں میری والدہ گزر گئیں' اور تقریباً بارہ سال کی عمر میں میرے والد بھی اس دنیا سے رخصت ہو گئے' اب بڑے بھائی کے رحم و کرم پر ہم تین بہنیں اور ایک میں' جلد ہی بکھر گئے تھے' والد صاحب کے دور میں میں نے کچھ پڑھ لکھ لیا تھا' میں

نے بڑے بھائی کا گھر چھوڑ دیا تھا۔ کالے سر والیاں کہاں شوہر کے بہن بھائیوں کو برداشت کرتی ہیں۔ اور دوسرے شہر میں چلا آیا تھا۔ مصوری سے بے اندازہ لگاؤ تھا۔ ایسا کہ کسی بھی فرد کو سامنے بٹھا کر اس کی تصویر بنالیتا اور ریاضی بھی میرا پسندیدہ مضمون تھا۔ میں ابھی یہی سوچ رہا تھا کہ کہاں جاؤں گا؟ کہاں رہوں گا اور کیا کھاؤں گا؟ جانے قسمت کہاں لے جاتی ہے اسی دوران وہ معمر شخص میرے کمرے میں داخل ہوئے۔

"کل تمہاری چھٹی ہو جائے گی سیدھے میرے پاس چلے آنا۔ لو یہ میرا کارڈ اس میں میرا نام اور پتہ درج ہے فون نمبر بھی ہے۔" پھر کچھ سوچتے ہوئے انہوں نے جیب سے اپنا پرس نکالا اور سو روپے کا نوٹ میری طرف بڑھا دیا۔ یہ اچھی خاصی رقم تھی ایک روپے کا چار سیر (کلو سے کچھ کم) آٹا بک رہا تھا۔ میں ان کا چہرہ دیکھتا رہ گیا۔ خدا جب مہربان ہوتا ہے تو ایسے ہی ذرائع پیدا کر دیتا ہے۔ وہ فکر جو مجھے گھیرے ہوئے تھی ایک لمحہ بھی تو نہیں لگا اس کے ختم ہونے میں۔

دوسرے دن دس بجے کے قریب میری چھٹی ہو گئی باہر نکلا دیکھا یہ تو ایک پرائیویٹ ہسپتال تھا لیکن مجھ سے کچھ طلب نہیں کیا گیا۔ سیدھا شیخ مطلوب الٰہی کی رہائش گاہ پہنچ گیا۔ دو ہزار گز پر بنی ہوئی کوٹھی گیٹ پر گارڈ موجود۔ میں نے اس کو کارڈ دکھا کر کہا۔ "شیخ صاحب نے مجھے بلایا ہے انہیں میرے آنے کی اطلاع دیدیں۔" ایک منٹ بھی نہیں لگا مجھے اندر بلا لیا اور میں ایک آراستہ ہال میں داخل ہوا جہاں سبز ایرانی قالین بچھا ہوا تھا۔ وہ وہاں میرے منتظر تھے۔ میں نے سلام کیا۔

"بیٹھو بیٹا۔" انہوں نے کہا اور میں سر جھکا کر بیٹھ گیا۔

"دیکھو بیٹا پہلی بات تو میں تم پر واضح کر دوں تمہارا حادثہ میری گاڑی سے نہیں ہوا۔ میں ایک جگہ جا رہا تھا تو سڑک کے کنارے تمہیں پڑے دیکھا۔ گاڑی روک کر فوراً ڈرائیور سے اٹھوایا تم لہولہان تھے فوراً ایمرجنسی کا رخ کیا۔ زندگی تو اللہ کی دین ہے ہاں اگر تم کچھ دیر بے ہوشی کی حالت میں اور پڑے رہتے تو" اتنا کہہ کر وہ خاموش ہو گئے۔

"اب یہ بتاؤ کچھ پڑھا لکھا ہے کیا کام کر سکتے ہو۔" میں نے اپنے کوائف انہیں بتا دیے۔

"ٹھیک ہے کل سے اکاؤنٹنٹ کے ساتھ رہو تمہاری ریاضی اچھی ہے جلد ہی کام پر قابو پالو گے۔" اگرچہ کامرس اور ریاضی میں فرق ہے لیکن پھر بھی مناسبت ہے۔"

"جی بہتر ہے" میں نے جواب دیا۔

"کچھ اپنے بارے میں نہیں بتاؤ گے۔" یہ سن کر میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

"چلو چھوڑو۔ سرونٹ کوارٹرز کی ایک خالی پڑے ہیں ایک میں رہائش اختیار کر لو ضرورت کی تمام چیزیں مہیا کر دی جائیں گی کچھ سامان تمہارے پاس بھی ہے۔"

"ہاں سرائے میں پڑا ہے ایک بستر بند ایک اٹیچی۔"

"ٹھیک ہے وہ لے آنا کھانے کے لیے ایک ملازمہ ہے ناشتہ دوپہر کا کھانا جو ناشتہ دان میں آفس لے جانا پڑے گا اور رات کا کھانا کوارٹر میں ٹھیک مغرب کے بعد پہنچ جائے گا۔" میں سوچنے لگا کیا دنیا میں ایسے سرمایہ دار بھی ہیں ایسے مالکان بھی ہیں۔

"نام کیا ہے تمہارا؟"

"شباب۔"

"شہاب تم اس حالت میں مجھے دیکھ رہے ہو یہ نہ سمجھنا کہ میں بڑے باپ کا بیٹا رہا ہوں گا میرے والد تو ایک غریب انسان تھے بمشکل تمام گزر بسر ہوتی تھی لیکن قدرت نے میرا ہاتھ پکڑ لیا اور آج میرے پاس سب کچھ ہے۔" انہوں نے کہا کچھ دیر کے بعد میں رخصت ہو گیا اور اپنا سامان لا کر سرونٹ کوارٹر میں رکھ دیا۔ زندگی میں ایک ٹھہراؤ پیدا ہو گیا تھا۔ میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا وہ کچھ مجھے مل گیا تھا اکاؤنٹس پر جلدی ہی میں نے قابو پالیا چھ ماہ کا عرصہ اس طرح گزر گیا کہ پتہ ہی نہیں چلا' اسی دوران مجھے سن گن محسوس ہوئی کہ شیخ صاحب کی لڑکی کی شادی کی تیاریاں ہو رہی ہیں' لیکن میرا تعلق تو دفتر سے تھا اور شیخ صاحب کے خاندانی معاملات سے میرا کیا تعلق ہو سکتا تھا۔ میں نے تو کبھی ان کی صاحبزادی کو دیکھا بھی نہیں تھا' پھر سرونٹ کوارٹر کے بیرونی دروازے مخالف سمت کھلتے تھے ہاں ایک چھوٹا دروازہ احاطے کے اندر بھی تھا جہاں سے ملازمہ مجھے ڈرائیور حنیف اور گارڈ کو کھانا دے جاتی تھی' شیخ صاحب نے اپنے ملازمین کو کافی سہولتیں دے رکھی تھیں۔ ان کے ایک رشتے کے بہنوئی جوان سے ایک دو سال ہی بڑے ہوں گے' وہ فرصت کے اوقات میں اکثر میرے پاس آ جاتے اور ادھر ادھر کی باتیں ہونے لگتیں۔

شادی کی تیاریاں پورے زور و شور سے جاری تھیں اور آخر کار وہ دن بھی آ گیا جب بارات آنے والی تھی' میں اس وقت اپنے کوارٹر میں تھا اس لیے کہ اتوار کا دن تھا' کھانے پر تمام ملازمین کو مدعو کیا گیا تھا اور ابھی اس میں وقت تھا۔ اچانک گیارہ بجے کے قریب شیخ صاحب کے بہنوئی میرے کمرے میں آئے۔

"شہاب میاں جلدی سے تیار ہو جاؤ۔" انہوں نے عجیب سے لہجے میں کہا۔

"مشکور صاحب ابھی تو بہت وقت پڑا ہے' بارات آئے گی' نکاح ہو گا پھر کہیں جا کر کھانا کھلے گا۔" یہ سن کر وہ میرا چہرہ دیکھنے لگے۔

"مسئلہ بگڑ گیا ہے' صاحبزادے۔ بارات نہیں آ رہی۔"

"کیا کہہ رہے ہیں آپ' بارات نہیں آ رہی۔"

"ہاں ہمارے سالے صاحب بہت زیادہ پریشان ہیں۔"

"لیکن کیوں؟"

"پتہ میں بھی نہیں جانتا۔" انہوں نے کہا۔

"سمجھ میں نہیں آیا' میں جلدی سے کیوں تیار ہو جاؤں۔" یہ سن کر مشکور صاحب کے چہرے پر ایک ٹھہراؤ پیدا ہو گیا۔

"میری بات سنو شہاب میاں' ان کی یہ پریشانی دیکھ کر اچانک میرے ذہن میں تمہارا خیال آیا۔"

"میرا خیال آیا' میں سمجھا نہیں آپ کی بات۔" میں نے ان کی بات کاٹ کر کہا۔

"مراد یہ کہ تم ان کی بیٹی سے نکاح کرنے کے لیے تیار ہو جاؤ۔" یہ سن کر میرا دماغ گھوم کر رہ گیا۔

"کیا کہہ رہے ہیں آپ۔"

"میں جو کچھ کہہ رہا ہوں وہ تمہارے حق میں ہے۔"

"لیکن مشکور صاحب میں ان کا ایک ادنیٰ ملازم' میری حیثیت کیا۔"

"اس گھرانے کے فرد بن جاؤ گے۔" یہ سن کر میں سوچنے لگا۔

"کیا شیخ صاحب اس کے لیے تیار ہیں۔"

"انہوں نے منظوری دے دی ہے۔ تمہارے ساتھ ان کا رویہ کیسا رہا ہے' وہ ایک خدا ترس انسان

ہیں۔"

یہ سن کر مجھے شیخ صاحب کے احسانات یاد آ گئے حقیقت میں مجھ جیسے بے سہارا انسان کو انہوں نے سہارا دیا تھا اور اب جبکہ میں ان کے وقار اور عزت کو بچانے کے لیے کچھ کر سکتا ہوں تو مجھے کرنا چاہیے ان کی بیٹی کیسی تھی کیسا مزاج تھا بارات کیوں آتے آتے رک گئی تھی ان تمام باتوں کے سوچنے کا وقت نہیں تھا' کچھ مثبت پہلو ابھر کر سامنے آ گئے تھے اور اب جبکہ تقدیر نے اس مقام پر مجھے لا کھڑا کیا تھا تو مجھے تقدیر کے اس فیصلے کو تسلیم کر لینا چاہیے اور میں تیار ہو گیا۔



وہ پہلی رات' جسے سہاگ رات کہا جاتا ہے جب میرے کانوں نے راحیلہ کی زبان سے نکلتے ہوئے یہ الفاظ سنے۔ "خبردار مجھے ہاتھ نہ لگانا' یہ محض ایک اتفاقیہ اور حادثاتی شادی ہے۔" تو میں گم صم ہو کر رہ گیا' پہلی رات جو دلہن کا حیا اور شرم میں ڈوبا ہوا انداز ہوتا ہے ایسی کوئی بات نہیں تھی حاکمیہ انداز اور بے ساختگی اور بڑے پن کا احساس میں بالکل خاموش رہا' ایک نظر اس کے سراپا پر ڈالی وہ دراز قامت خوبصورت لڑکی تھی۔

"وہ سامنے صوفے کا بند وبست ہے جا کر سو جاؤ۔" کس قدر تلخ لہجہ تھا اس کا جیسے ملازموں کو مخاطب کیا جاتا ہے۔

"اور اس علیحدہ سرونٹ کوارٹر سے اپنا ٹوٹا پھوٹا سامان لانے کی بھی ضرورت نہیں۔" میں نے ان طنزیہ باتوں کا کوئی جواب نہیں دیا اور خاموشی سے صوفے پر دراز ہو گیا' انتظار تھا کہ صبح ہو مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میری کسی آزمائش کا وقت شروع ہو گیا تھا' راحیلہ کو جانا کہاں تھا کوئی سسرال تو اس کی تھی نہیں' شیخ صاحب کی دوسری کوٹھی جو چار سو گز پر بنا ہوا ایک بنگلہ تھا وہ ہمیں دے دیا گیا تھا جس کے در و دیوار مجھے کاٹنے کو دوڑنے لگے تھے۔ وہی راحیلہ کی سسرال تھی اور وہی میرا قید خانہ۔

وہ رات جو سہاگ رات تھی درحقیقت سوگ کی رات تھی' مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میں بک گیا ہوں اور یہ سودا مشکور صاحب نے کرایا تھا' انسان تو بکتا ہے جزوی طور پر اور یہ ملازمت کہلاتی ہے' لیکن بے خبری میں میں تو کلی طور پر بک چکا تھا۔ راحیلہ کی والدہ آسیہ بی اور میری نام نہاد ساس نے اندازہ لگا لیا کہ راحیلہ کا رویہ میرے ساتھ اچھا نہیں تھا' ایک روز اتفاق سے میں نے ماں بیٹی کی باتیں سن لیں۔

"راحیلہ تمہارا رویہ شہاب کے ساتھ مناسب نہیں۔"

"تو کیا میں بیری کی جولی کو سر پر چڑھا لوں۔"

"جولی کو تو میرا اس لیے چڑھایا گیا کہ تم نے حرکت ہی ایسی کی تھی جہاں تمہاری بات پکی ہوئی تھی وہ بارات نہیں لائے اور لفافے میں بند کر کے کچھ نازیبا حالت میں تمہاری تصویریں بھیج دیں اور ایک پرچے پر لکھ دیا' ہم بارات لانے سے قاصر ہیں۔" راحیلہ ماں کا چہرہ دیکھنے لگی۔

"تصویریں بھیج دیں۔" راحیلہ نے گردن جھکالی۔

"تمہارے ڈیڈی کی آنکھیں شرم سے جھک گئیں' اتنا گہرا صدمہ دل پر لیے بیٹھے ہیں کہ میں بیان نہیں کر سکتی۔" میں خاموشی سے یہ بات چیت سن کر پچھلے گیٹ سے باہر نکل گیا تاکہ انہیں یہ احساس نہ ہو کہ میں موجود تھا' مجھے شدید بھوک لگ رہی تھی اس لیے میں مون ویو ریسٹورنٹ چلا گیا جو قریب ہی تھا۔ میری ذات میں ایک فنکار' ایک آرٹسٹ پوشیدہ تھا اور یہ عطیہ خدا نے جہاں ہزار محرومیاں میری قسمت میں لکھ دی تھیں دیا تھا۔ میں حسن پرست تھا' یہ حسن خواہ فطرت

کا حسن ہو یا کسی شخصیت کا۔ راحیلہ مجھے پسند تھی اور دل کی گہرائیوں سے' لیکن ایک بات اس میں احساس کہاں ہوتا ہے' میں کسی بھی تصور کو کینوس پر منتقل کرسکتا تھا' موڈ میں ابھی آ کر بیٹھا ہی تھا کہ چودہ سولہ سال کا ایک لڑکا آیا اور اس نے کہا منظور صاحب آپ کو یہ لفافہ دے گئے ہیں۔ پھر وہ فوراً ہی چلا گیا' سفید رنگ کا یہ لفافہ خاصا بڑا تھا' کھولا ہی تھا کہ چند پوسٹ کارڈ سائز کی تصاویر پھسل کر سنگ مرمر کی میز پر گر گئیں اور ان کو دیکھ کر میرا دماغ گم صم ہوگیا' یہ نازیبا حالت میں راحیلہ کے پوز تھے۔

"منظور صاحب ہرگز یہ تصاویر نہیں بھجوا سکتے' یہ کوئی گہری سازش ہے۔ یہ کوئی اور ہی شخص ہے' اس کا کیا کردار ہوگا' وہ اس حرکت سے ظاہر ہے' میں نے سوچا' ایک ہی وقت میں ماں بیٹی کی بات چیت اور پھر اجنبی لڑکے کے ہاتھوں ان تصاویر کا ملنا' میں راحیلہ کی نفرت کے جواب میں اسے آئینہ دکھا سکتا تھا لیکن وہ میری چاہت تھی اور میری سوچ' اس نے اس شکستہ آئینے کو اور بھی میری نگاہوں میں عزیز تر بنا دیا تھا' ہاں اس کے بعد میں نے راحیلہ کے رویے میں کسی قدر تبدیلی محسوس کی' وہ اکثر کچھ کھوئی کھوئی محسوس ہوتی' کچھ الجھی الجھی اور میں خاموش تھا' شدت سے اس وقت کا منتظر' ایک ہفتہ ہی گزرا تھا کہ شیخ مطلوب الٰہی پر دل کا دورہ پڑا اور وہ اللہ کو محبوب ہوگئے' بھائیوں نے فوراً ہی کاروبار کو تقسیم کرنے کا ارادہ کیا' آسیہ بی بی مجسم سوگ بن گئی تھیں اور ان کی عدت بھی پوری نہیں ہوئی تھی کہ اس دنیا سے گزر گئیں' اب کیا رہ گیا تھا' بھائیوں نے جائیداد کا ایک مخصوص حصہ اور کچھ روپیہ پیسہ راحیلہ کے نام کر دیا' بہرحال پھر بھی بہن کا خیال کرلیا تھا۔ ایک ماہ ہی گزرا تھا کہ ایک روز راحیلہ میرے کمرے

حکمت

ایک دفعہ اکبر بادشاہ کو سرِراہ کوئی اس کا بچپن کا دوست مل گیا۔ جب اس کے دوست کو یہ معلوم ہوا کہ اس کا دوست اکبر بادشاہ ہوگیا ہے تو اس نے اکبر بادشاہ سے اپنی کسی ضرورت کا اظہار کیا تو اکبر بادشاہ نے کہا کہ تم میرے محل میں آجانا جب وہ غریب دوست اس کے محل میں پہنچا تو اس نے دیکھا کہ اس کا دوست اکبر بادشاہ آسمان کی طرف ہاتھ اٹھائے اللہ تعالیٰ سے کچھ طلب کررہا ہے۔ تو وہ الٹے پاؤں یہ کہتا ہوا واپس چلا گیا کہ عجب! اکبر بادشاہ ہو کر اس سے مانگ رہا ہے جس سے سب طلب کرتے ہیں تو ہم اللہ تعالیٰ سے کیوں نہ مانگیں۔ جو اللہ اس کو بادشاہ بنا سکتا ہے وہ مجھے بھی عطا کرسکتا ہے۔

(مرسلہ: سعید حسن آفریدی... کراچی)

میں آئی' یہ دیکھ کر مجھے حیرت ہوئی لیکن جلد ہی یہ حیرت دور ہوگئی۔

"شہاب' تم مجھے طلاق دے دو' میں اپنا مہر معاف کرلی ہوں۔"

"مجھے اس بات کی توقع تھی۔" میں نے کہا۔

"صرف یہی نہیں اگر کچھ پیسہ چاہیے تو وہ بھی دے دوں گی۔"

"میں اتنا بے غیرت نہیں' اور پھر عملاً ہم دونوں نکاح کے کاغذ میں شوہر و زن ہیں' طلاق دینا ایک رسمی بات ہوگی۔" "ہاں ایک بات میں یہ بتانا بھول گیا' ایک روز شیخ مطلوب الٰہی نے مجھے اپنے کیبن میں بلایا۔

"شہاب' میری موت کے بعد کیا حالات پیش آتے ہیں یہ خدا ہی جانتا ہے' ممکن ہے یہ بھائی راحیلہ کو اس کے حق سے محروم کر دیں یا واجبی سا حق دیں۔ میں بیس لاکھ روپے تمہیں دے رہا ہوں' یہ چیک اپنے حساب میں جمع کرا دینا' لیکن وعدہ کرو تم میری بچی کو خوش رکھو گے۔"

"یہ پیسے سراں ہی کے رہیں گے اور میں صرف ان کا امین رہوں گا۔" پھر میں نے اپنے دل میں سوچا میں کس کو خوش رکھوں گا' جو تمہارا میری شریک حیات بھی نہیں' میں جانتا ہوں اس کے دل و دماغ پر کوئی اور ہی سوار ہے اور وہ ٹھوکر کھائے گی۔

وقت جب بدلنے پر آتا ہے تو اپنی رفتار کچھ زیادہ ہی تیز کر دیتا ہے۔

"ہاں تو آپ مجھ سے چھٹکارہ حاصل کرنا چاہتی ہیں' سچ تو یہ ہے کہ صرف قانونی طور پر آپ بندھی ہوئی ہیں ورنہ آزاد ہی آزاد ہیں۔"

"ہاں' ایک مطالبہ میرا اور ہے۔" اس نے کہا۔

"میں سمجھ گیا' کہ اپنا بوریا بستر یہاں سے اٹھالوں' ٹھیک ہے جب آپ کہیں۔"

"کل مجھے طلاق دیدو اور ایک ہفتے کے بعد یہاں سے چلے جاؤ۔"

"ٹھیک ہے اور محترمہ مہر کے معاف کرنے کی ضرورت نہیں حالات کے تحت صرف پچاس ہزار مقرر کیا گیا تھا' وہ میں چیک آپ کو دے دوں گا۔" راحیلہ میرا منہ دیکھنے لگی' کبھی کبھی مجھے محسوس ہوتا جیسے وہ اپنی غلطی کو محسوس کر رہی ہو۔

وہ سب کچھ ہو گیا جو وہ چاہتی تھی' میں نے ایک فلیٹ کرائے پر لے لیا اور وہاں چلا گیا' میں نے محسوس کیا وہ مجھے جاتے ہوئے غور سے دیکھ رہی تھی اور پھر اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے اور شاید وہ مجبور تھی ابھی ابھی میں نے عرض کیا تھا کہ جب وقت بدلتا ہے اپنی رفتار بہت تیز کر دیتا ہے' میرے وجود میں میرا فنکار کلبلا رہا تھا' پھر میری تنہائیاں میرے لیے سوہان روح بن گئی تھیں' میں نے شباب آرٹس سینٹر کے نام سے اپنا کام شروع کر دیا۔ حالانکہ یہ وہ دور ہے جب سائنسی ایجادات نے فنون لطیفہ کو دھندلا کر رکھ دیا ہے' اب مصوری کی وہ قدر کہاں رہی' ہاں کچھ صاحب ذوق لوگوں کا ایک حلقہ ہے' جلد ہی میرا سینٹر مشہور ہو گیا' فرصت کے وقت میں' میں راحیلہ کی کوئی نہ کوئی تصویر بنانے بیٹھ جاتا' اس چہرے پر چھا جانے والے اثرات' وہ سہاگ رات' جو برائے نام سہاگ رات تھی' اس کا غرور میں ڈوبا ہوا چہرہ وہ بیگانگی جو اس نے مجھ سے روا رکھی' کتنے ہی موضوع' کتنے ہی رخ اس کے میرے سامنے تھے' جن کو تصویروں کے قالب میں' میں ڈھالتا چلا گیا' پھر اہل فن کا ایک ایشیائی مقابلہ ہوا اور مجھے دس لاکھ روپے کا پہلا انعام ملا' اب دولت کے ڈھیر تھے لیکن میری چاہت میرے قریب نہ تھی اور اگر وہ ہوتی تو اتنی شہرت میں کبھی نہ حاصل کر پاتا' سچا فنکار نہ اسے دولت کی ہوس ہوتی ہے' نہ شہرت کی' کبھی کبھی جب اپنے فلیٹ میں ہوتا' سوچتا' کاش راحیلہ میرے ساتھ ہوتی اور پھر اس کے خاموش در و دیوار مجھے غم کی اتھاہ وادیوں کی جانب دھکیلنے لگتے' کیا یہ غم انسان کے لیے اللہ کا کوئی تحفہ نہیں ہیں' ایک سال گزر گیا' راحیلہ مجھے نظر نہیں آئی اور اب شاید میں اپنے گھر کی تنہائیوں اور ویرانیوں کا عادی ہو چکا تھا۔

ایک روز میرے سینٹر میں ایک سیاہ برقع میں ملبوس ایک خاتون آئیں۔

"آپ مصور ہیں۔"

"شاید۔" میں نے مسکرا کر جواب دیا۔

"ہاتھ سے ہی بناتے ہیں۔"

"جی ہاتھ سے ہی۔"

"مجھے ایک تصویر آپ سے بنوانی ہے۔"

"تصویر! جب وہ تصویر ہے تو پھر کیا ضرورت پیش آ گئی۔" میں نے کہا اور وہ جز بز ہو کر رہ گئی۔

"میں نے یہ بھی سنا کہ آپ نے ایشیائی مقابلے میں پہلا انعام حاصل کیا۔"

"پرانی بات ہوگئی۔"

"میرا مقصد یہ ہے کہ میری ایک ساتھی ہے وہ آپ کے سامنے بیٹھ کر اپنی تصویر بنوانا چاہتی ہے' کیا آپ میرے ساتھ چلیں گے۔"

"میں جاتا نہیں ہوں اور یہاں وہ بیٹھیں تو وقت لگے گا' ان سے کہیں کہ فضول آرزو دل سے نکال دیں جدید دور ہے ذرا دیر میں ایک سے ایک ان کا فوٹو اتر جائے گا جیسا چاہیں گی' جتنا بڑا چاہیں گی' جس انداز میں اتروانے کی مرضی ہوگی' سب کچھ ہو جائے گا۔"

"میں نے بھی یہی سمجھایا مگر بضد ہیں۔"

"میں معذرت چاہوں گا' کسی دوسرے آرٹسٹ کو دیکھیں۔"

"آپ نے جو شاہکار اندر لگا رکھے ہیں میں انہیں دیکھ سکتی ہوں۔"

"دیکھ لیں۔" میں نے بیزار آتے ہوئے کہا' وہ اندر گئی میں نے لائٹ جلا دی' پھر چند منٹ تصویروں کو دیکھ کر واپس آ گئی۔

"معذرت چاہتی ہوں' میں نے آپ کا وقت ضائع کیا۔" میں کی اس بات کا میں نے کوئی جواب نہیں دیا اور وہ خاموشی سے چلی گئی' لوگ اسی طرح آ کر وقتاً فوقتاً مجھے پریشان کرتے تھے اور میں بیزار آ جاتا تھا۔

ایک ہفتہ گزر گیا' میں راحیلہ کی ایک اور تصویر بنانے میں منہمک ہو گیا' یہ وہ منظر تھا جب میں جا رہا تھا اور وہ مجھے آنسو بھری نگاہوں سے دیکھ رہی تھی' اس کی ہر یاد میرے ذہن کے پردے پر مرتسم ہو کر رہ گئی تھی' میں نے بہزاد کو اپنے سینٹر میں ملازم رکھ لیا تھا۔ اسے خود بھی فائن آرٹس سے گہرا لگاؤ تھا' بہرحال اس کا یہ فائدہ ہوا کہ وہ غیر ضروری قسم کے لوگوں کو باہر سے ہی ٹال دیتا تھا اور میں پریشانی سے بچ جاتا تھا۔ تھوڑے دن وہ پھر آ گئیں اس بار دو اور خواتین ان کے ساتھ تھیں۔

"سر بہت مصروف ہیں آپ پھر کسی اور وقت آ جائیں۔" بہزاد نے کہا۔

"ہمیں ان سے بہت ضروری ملنا ہے آپ انہیں جا کر بتا دیں۔"

"آپ میری شامت بلوانے پر تلی ہوئی ہیں۔ سر نے منع کیا ہے کہ کوئی بھی آئے میں ملنے سے روک دوں۔"

"ہمیں ان سے آج ہی اور اسی وقت ملنا ہے' آپ جا کر شہاب صاحب سے کہہ دیں کہ ہمیں لازماً ان سے ملنا ہے۔"

"دیکھیے محترمہ میں مجبور ہوں۔" بہزاد نے کہا۔

"ٹھیک ہے تم مجبور ہو نا۔" مخاطب کرنے والی خاتون نے کہا اور پھر یہ تینوں اندر داخل ہو گئیں اور بہزاد انہیں روک نہ سکا' میرے ہاتھ سے موقلم گر گیا اور کچھ دیر کے لیے میں کھڑا کا کھڑا رہ گیا۔

"آپ لوگ؟"

"ہاں ہم میں اس خاتون کو لے آئی ہوں جو اپنی تصویر آپ سے بنوانا چاہتی ہیں۔"

"بیٹھیں آپ لوگ۔" میں نے دھیمے لہجے میں کہا۔

"اپنا نقاب الٹ دو تصویر تم نے بنوانی ہے نا۔" اور اس نے اپنا نقاب الٹ دیا۔

"تم' تم' تم راحیلہ۔" میری عجیب کیفیت ہو گئی تھی' شاید شادیٔ مرگ کا شکار ہو جاتا' راحیلہ نے کوئی جواب نہیں دیا اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے تھے' میں نے آگے بڑھ کر ان آنسوؤں کو پونچھ ڈالا وہ عجیب لگ رہی تھی

سے مجھے دیکھنے لگی ایسی نگاہیں جن میں احساس شرمندگی رچا بسا تھا۔

"محبت روح سے کی جاتی ہے جسم سے نہیں اور میں۔" اتنا کہہ کر میرا دل بھر آیا۔

"ذرا اس دیوار پر آویزاں ان تصویروں پر نظر کس کے پوز ہیں راحیلہ یہ۔" لیکن راحیلہ خاموش تھی۔

"شہاب بھائی کیا ان شاہکاروں کی بنا پر آپ نے ایشیائی مقابلہ جیتا ہے۔" مہک نے جو پہلی بار مجھے ملی تھی کہا۔

"ہاں یہی پوز صداقت تھی ان میں۔" میں نے کہا۔

"شہاب بھائی راحیلہ آپ کو لینے آئی ہے۔"

"مجھے! کیا یہ ممکن ہے۔"

"ہاں بالکل ممکن ہے وہ جس نے راحیلہ کو بلیک میل کیا اور نکاح کا ڈھونگ رچا کر اس کی دولت اور جائیداد پر ہاتھ صاف کرنا چاہا وہ اب اس دنیا میں نہیں ہوائی حادثے کا شکار ہو گیا۔"

"آپ چلیں گے نہ اس کے ساتھ۔" مہک نے کہا۔

"کہاں؟"

"جہاں پہلی بار شاہکاروں کے شوٹ میں جلوہ گر ایک ساتھ گئے تھے۔"

"ہاں مجھے یاد آیا۔" میں خفیف سا مسکرا دیا۔

"آپ کی مسکراہٹ میں تلخی محسوس ہوئی ہے مجھے۔" مہک نے کہا اور میں راحیلہ کا چہرہ دیکھنے لگا۔

"یہ تیسری محترمہ کون ہیں ابھی تک خاموش ہیں۔"

"یہ صرف آپ کو دیکھنے کے لیے میرے ساتھ آئی ہیں۔"

"مجھے دیکھنے کے لیے۔ کیا خاص بات ہے مجھ میں۔"

"ایشیائی شہرت کے مالک ہیں آپ اور اتفاق سے یہ بھی فائن آرٹس کی دلدادہ ہیں لیکن ان کی زندگی ایک المیہ بن گئی ایک کاروباری شخص سے شادی ہوئی اور ان کی زندگی اتنا کہہ کر وہ خاموش ہو گئی۔

"طلاق ہو گئی؟"

"ہاں۔" مہک نے کہا۔

"ہمارا معاشرہ اور بے جوڑ شادیاں۔"

"راحیلہ چلوں آپ کے ساتھ۔" راحیلہ کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے میں ان آنسوؤں کی نوعیت سمجھ گیا ان میں ٹھہری چاہت تھی اور میں نے اپنی چاہت آخر حاصل کر ہی لی بہرحال ایک عورت کی لغزش اس کی پہلی اور آخری لغزش ہوتی ہے بس اس کا خیال رہے۔

ہر طرف زندگی کے انداز تھے۔ چہل پہل تھی، قہقہے تھے رونق۔ جو کبھی مجھے ویران سنسان اور ایک قید خانہ معلوم ہوتا تھا اب وہاں کا ہر کونہ مسکرا رہا تھا ہر پھول میں تازگی تھی اور ہر کلی میں مسکان کیا بدلا تھا کچھ بھی تو تبدیل نہیں ہوا تھا ہاں صرف احساس!

"سرکار چائے ٹھنڈی ہو رہی ہے آپ ناشتے کی میز پر تشریف لے آئیں۔" یہ راحیلہ کی آواز تھی وہی راحیلہ جس نے مجھے پہلی رات بڑی سخت نگاہوں سے دیکھا تھا بڑے سخت لہجے میں بات کی تھی میں صرف اتنا جانتا ہوں۔

"حقیقت خود کو منوا لیتی ہے مانی نہیں جاتی۔"

نجات دہانی

سویرا فلک

لڑکیاں معصوم اور نازک کلیوں کی مانند ہوتی ہیں' انہیں اللہ تعالیٰ نے والدین کے لیے رحمت قرار دیا ہے۔ یعنی وہ جس سے خوش ہوتا ہے انہیں بیٹی کی صورت میں رحمت سے نواز دیتا ہے۔ مگر ہم اس رحمت کے ساتھ کیا سلوک کرتے ہیں اس کا اندازہ آپ اس کہانی میں کرسکتے ہیں۔
ایک معصوم کلی کا فسانہ' معاشرہ کی کثیف فضا نے اس سے مسکراہٹ چھین لی تھی۔

یہ ان دنوں کی بات ہے جب میں اپنے شوہر نامدار کے ساتھ جون جولائی کی چھٹیاں گزارنے ہنزہ گئی تھی اہم لوگ عموماً کراچی کی گرمیوں سے بچنے کے لیے شمالی علاقہ جات کا رخ کرلیتے ہیں گو کہ اب وطن عزیز کے مخدوش ہوتے حالات کے باعث یہ سرگرمی تعطل کا شکار ہونے لگی ہے تاہم کیونکہ شوق کا کوئی مول نہیں تو میرے شوہر کوئی نہ کوئی پروگرام سیٹ کرہی لیتے ہیں خیر تو میں آپ کو ان دنوں کی بات بتارہی تھی۔ جب حالات خاصے سازگار رہتے تھے سیر و تفریح اور غیر ملکی سیاحوں کی بڑی تعداد ہنزہ کی خوب صورت وادی کو کھوجتے نکلے ہوئے تھے۔ ہوٹل پہنچ کر میں نے تھکے ہارے بچوں کو سلا دیا اور خود کافی لے کر کھڑکی کے سامنے آکر بیٹھ گئی۔ دل موہ لینے والے مناظر دل و دماغ کو تر و تازہ نقش رہے تھے تو زبان و دل قدرت کی صناعی پر ثناء پڑھ رہے تھے۔

میں اپنی پوری قوت صرف کرکے آلودگی سے پاک معطر اور خوشگوار فضاؤں کو اپنے اندر جذب کرنے کی کوشش کرنے لگی تو عاکف میرے شوہر میرے ساتھ آ کھڑے ہوئے اور میری حرکت پر مسکرانے لگے تو میں جھینپ گئی پھر کچھ لمحے ہم یونہی اس خوب صورت منظر کا حصہ بنے رہے۔ چند ساعتیں گزریں تو جانے کس خیال کے تحت عاکف نے مجھ سے کہا۔

"او یار وہ میرا دوست امجد کہیں نکل نہ جائے میں ذرا اس کے ساتھ جا کر ایک سرسری راؤنڈ لے کر دیکھ لوں کہ ہمیں کون کون سی جگہ وزٹ کرنی ہیں۔" یہ کہہ کر وہ موبائل اٹھا کر کمرے سے باہر نکل گئے عاکف کو پسند نہیں تھا کہ وہ مجھے اور بچوں کو لے کر بے مقصد سڑکیں ناپیں۔ اس لیے وہ مکمل معلومات حاصل کرکے چیدہ چیدہ اور منتخب مقامات پر ہی سیر کو نکلتے ہیں۔

میں بھی مطمئن رہتی تھی کیونکہ اس طرح بے وجہ کی تھکن نہیں ہوتی' عاکف نکلے تو عصر کی اذان ہوگئی اور میں جائے نماز بچھا کر رب کے سامنے حاضر ہوگئی۔ کوئی گھنٹہ بھر بعد عاکف واپس آئے تو ان کے ساتھ ایک بارہ تیرہ سالہ مقامی بچی بھی تھی۔ میں نے حیرانی سے اسے دیکھا اور عاکف سے پوچھا۔

"یہ کسے ساتھ لے آئے ہیں آپ؟"

"یار یہ بچی امجد کے بوڑھے ملازم کی بیٹی ہے امجد کہہ رہا تھا کہ یہ بچوں کو سنبھالنے میں ہماری مدد کرے گی۔" عاکف نے صوفے پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

"کیا ہوگیا ہے آپ کو یہ تو خود ابھی بچی ہے اور پھر مجھے ہمیشہ اپنے بچوں کو سنبھالنے میں کوئی مسئلہ نہیں آپ جانتے تو ہیں ہمیشہ میں نے خود ہی مینج کیا ہے سب اور میں نے کچھ کہا بھی نہیں آپ سے۔" میں نے اس بچی کی طرف دیکھا جو ایک جانب سہمی سہمائی نظریں نیچے کیے کھڑی تھی۔

"بیٹا تم یہاں بیٹھو بچے اٹھنے والے ہیں پھر تم ان کے ساتھ کھیلنا میں اور آنٹی ذرا باہر جا کر آتے ہیں۔ بس پانچ

دس منٹ لگیں گے مادیہ ذرا ادھر آنا۔" عاکف نے بچی کو بیڈ کے پاس بیٹھنے کا اشارہ کیا اور مجھے لے کر کمرے سے باہر آ گئے ادھر ادھر کوریڈور میں کوئی نہیں تھا' پھر انہوں نے مجھے بچی کے بارے میں مختصراً تفصیل بتائی۔

"ماریہ یہ لوگ بہت غریب ہیں بڑی مشکل سے گزارا کرتے ہیں' امجد کہہ رہا تھا کہ غریب ہونے کے باوجود ماں باپ بہت خوددار ہیں' بغیر محنت کے ایک پیسہ نہیں لیتے۔ اس کا باپ امجد کے پاس برسوں سے ملازم ہے' ماں مقامی گیسٹ ہاؤس میں صفائی ستھرائی کا کام کرتی ہے' بچی کو امجد اسی طرح جان پہچان والے سیاحوں کے پاس رکھوا دیتا ہے تو اس سیزن میں کچھ ایکسٹرا کمائی ہو جاتی ہے' یہ ان کی مدد کا ایک طریقہ ہے اور ہمارے تمہارے ثواب حاصل کرنے کا ذریعہ۔"

"مگر عاکف اس طرح تو یہ بچی چائلڈ لیبر کے زمرے میں آ جائے گی اور پھر لڑکی ذات ہے یوں امجد بھائی کیسے کسی کے ساتھ رکھوا دیتے ہیں۔" میں ابھی بھی مطمئن نہیں تھی۔

"یار کیا کریں غریب آدمی کا پورا کنبہ نہ کمائے تو گھر چلنا مشکل ہے اور امجد صرف بھروسے کے لائق خاندان والوں کے پاس ہی اس بچی کو رکھواتا ہے بلکہ امجد بتا رہا تھا کہ اس کے باپ نے خود امجد سے کہا کہ بچی کو کہیں رکھوا دے مگر لوگ اتنی چھوٹی بچی کو ملازم رکھنے کو تیار نہیں کیونکہ اس کے پیر میں ہلکا سا نقص ہے۔"

"حیرت ہے ورنہ لوگ تو کم عمر بچیوں کو ہی فوقیت دیتے ہیں مگر ظاہر ہے اس کی معمولی معذوری سے وہ برداشت نہیں کر سکتے کیونکہ کام کی رفتار میں فرق آ جائے گا حد ہے خود غرضی کی انتہا ہو گئی یہ تو۔" مجھے واقعی سخت افسوس ہو رہا تھا۔

"اسی لیے تو میں اور بھی اسے یہاں لے آیا یار! کیا برا ہے کہ اگر ہم کسی کی اس طرح مدد کر سکیں کہ اس کی خودداری اور انا کو ٹھیس بھی نہ لگے۔" عاکف نے کہا تو میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"ٹھیک کہہ رہے ہیں آپ' شاید اللہ نے ہی ہمیں یہ نیکی کرنے کا موقع دیا ہے تو ہمیں اسے ضائع نہیں کرنا چاہیے۔ اچھا چلیں اب کچھ سینڈوچز وغیرہ آرڈر کر دیں' بچے سو کر اٹھے ہیں بھوک لگ رہی ہو گی اور مجھے بھی چائے کی سخت طلب ہو رہی ہے۔"

میں نے روم کی طرف قدم بڑھائے تو عاکف بھی میرے ہمراہ اندر آ گئے' عاکف نے چائے وغیرہ آرڈر کی اور اخبار پڑھنے میں مگن ہو گئے اور میں بکھرا ہوا سامان سمیٹنے لگی۔ بچی جس کا نام عاکف نے مالا بتایا تھا' بچوں کے ساتھ کھیلنے میں مگن ہو گئی۔ میں کام کرتے کرتے اس بچی کو بھی دیکھتی جا رہی تھی۔

وہ یہاں کے مقامی لوگوں کی طرح ہی تھی' سرخ سفید رنگت' گہری سبز آنکھیں جن میں کاجل بھرا ہوا تھا' اپنے سر کے بالوں اور جسم کو اس نے چادر سے چھپا رکھا تھا۔ میرے مسلسل دیکھنے پر وہ میری طرف متوجہ ہوئی تو میں مسکرا دی مگر وہ چپ چاپ مجھے ہراساں نظروں سے تکنے لگی۔ مجھے محسوس ہوا کہ وہ خوفزدہ ہے جانے اس کی وجہ اس کی کم عمری تھی یا ہماری اجنبیت۔ میں نے اس کا دھیان بٹانے کی غرض سے اس سے بات چیت شروع کر دی۔

"ہاں بھئی مالا! آپ کیا کرتی ہو' مطلب آپ پڑھتی ہو؟" اس نے نفی میں سر ہلا دیا۔

"اچھا یہ بتاؤ مالا! آپ کی سہیلیاں وغیرہ تو ہوں گی' جن کے ساتھ آپ کھیلتی ہوں گی' باتیں کرتی ہوں گی' کیوں۔۔۔؟" میں نے اپنی بات کی تائید چاہی تو اس نے پھر نفی میں سر ہلا دیا' اتنے میں چائے اور سینڈوچز بھی آ گئے۔ میں بصد اصرار مالا کو بھی سینڈوچ دیا جسے اس نے تھوڑا تھوڑا کر کے آہستگی کے ساتھ ختم کر دیا پھر عاکف نے کہا کہ وہ کچھ ضروری سامان لینے قریبی بازار تک امجد بھائی کے ساتھ جا رہے ہیں' البتہ کل صبح جلد ہی سیر و تفریح کی غرض سے نکلیں گے۔

عاکف کے جانے کے بعد میرے دونوں بچے آٹھ سالہ فرحان اور دس سالہ حنا لڈو نکال کر بیٹھ گئے اور میں ایک میگزین کی ورق گردانی کرنے لگی۔ بچے گوٹ نکلنے اور چھا آنے پر خوشی سے شور مچاتے تو میری توجہ میگزین کے اوراق سے ان کی طرف ہو جاتی۔ میں نے محسوس کیا کہ مالا اس کھیل میں بچوں کے ساتھ بظاہر تو شریک تھی مگر اس کے چہرے سے خوشی اور دلچسپی کا اظہار نہیں ہو رہا تھا۔

"لگتا ہے مالا کو یہ کھیل پسند نہیں؟" میں نے اپنے خیال کی تصدیق کرنا چاہی تو مالا گھبرا کر ایک بار پھر نفی میں سر ہلانے لگی۔

"ایسی کوئی بات نہیں، مجھے بھی پسند ہے۔"

"اچھا مالا یہ بتاؤ آپ اپنی سہیلیوں کے ساتھ کیا کھیل کھیلتی ہو؟" میں اس کی گھبراہٹ اور ڈر دور کرنے کی غرض سے اس سے پھر باتیں کرنے لگی۔

"میں کھیل نہیں کھیلتی۔" اس نے کہا تو میں چونک گئی شاید اس کے پاس کھلونے ہی نہ ہوں۔ یا اللہ کیا غربت کی ایسی انتہا بھی ہو سکتی ہے میرے دل میں کسک اٹھی مگر میں مالا سے کھلونوں کی بابت نہ پوچھ سکی۔

"اچھا مگر جب میں چھوٹی تھی نا مالا تو مجھے بھی کھلونے اچھے ہی نہیں لگتے تھے میں تو اپنی سہیلیوں کے ساتھ چھپن چھپائی، گلی ڈنڈا، رسی کودنا اور گھوڑا جمال شاہی کھیلتی تھی۔"

"مما ہم روز لنچ بریک میں یہی کھیلتے ہیں اور ہمیشہ میں ہی جیتتی ہوں۔" میری بیٹی حنا جو بظاہر کھیل کی طرف متوجہ تھی میری بات سن کر فوراً بولی تو میں مسکرا دی۔

"اچھا مالا! آپ اپنی سہیلیوں کے نام بتاؤ۔ حنا کی تو بہت ساری دوستیں ہیں فروا، سارہ، ثمرہ، خلیفہ اور......" میں رکی تو حنا فوراً بولی۔ "اور سدرہ مما......!"

"او کے بس بیٹا مما بھول گئی تھیں تو حنا کی تو پانچ دوستیں ہیں اب تم بتاؤ مالا کی دوستیں کتنی ہیں؟" میں نے پھر اسے پکارا دراصل مالا کی معصومیت سے بھرپور ادا کی میرے حساس دل کو بہت زیادہ متاثر کر رہی تھی شاید کم عمری میں کمانے کے لیے نکل جانے والے بچوں کے چہرے یوں ہی یاسیت زدہ ہوا کرتے ہیں۔

میرے ذہن میں افسردگی سے بھری سوچ ابھر رہی تھی اور کیونکہ میں نے اور عاکف نے نیت کی تھی کہ ہم اپنی طرف سے چند اچھے لمحات اور خوشگوار یادیں مالا کے ساتھ ضرور شیئر کریں گے تو بس میں انہی کوششوں میں لگی تھی کہ شاید کسی طرح اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ ابھر سکے تو ہمارے انسان ہونے کا حق ادا ہو سکے کیونکہ صرف کسی لاچار و مسکین کی مالی مدد کرنا ہی نہیں اس کی دلجوئی کرنا بھی انسان کا اخلاقی فریضہ ہوتا ہے۔ مالا فقط تیرہ سال کی تھی ابھی تو اس کی عمر گڑیوں اور سہیلیوں کے ہمراہ کھیلنے کی تھی مگر حالات یا شاید اس کے اپنے نصیب کی کروٹوں نے اسے اس مقام پر لا کھڑا کیا تھا کہ وہ اپنا بچپن بھولتی جا رہی تھی اور میں اس کا دل خوش کرنے کے لیے اسے اس کے بچپن کی رنگینیوں سے واپس جوڑنا چاہ رہی تھی اور ایک ایک کر کے وہ تمام طریقے اپنا رہی تھی جس سے وہ ہم میں گھل مل جائے اور ہنسے بولے مگر مالا ہنوز خاموش تھی۔

"مالا! کیا آپ کو آنٹی اچھی نہیں لگیں؟" میں نے اپنی جانب اشارہ کر کے پوچھا تو وہ فوراً بولی۔

"نہیں نہیں آپ تو بہت اچھی ہیں، آنٹی بھی نہیں ہیں۔"

"مگر آپ تو آنٹی سے باتیں ہی نہیں کر رہیں، آپ نے تو ابھی تک آنٹی کو اپنی دوستوں کے نام بھی نہیں بتائے۔" اس بار میں نے تھوڑا سا منہ بسورا تو وہ میرے قدموں میں آ کر بیٹھ گئی۔

"آپ مجھ سے ناراض مت ہوں، میری تو کوئی سہیلی ہے نہیں میں کس کا نام بتاؤں آپ کو۔"

"ارے بیٹا میں ناراض نہیں ہوں، اچھا اٹھو تم یہاں بیٹھو۔ چلو یہ بتاؤ گھر میں کون کون ہے مطلب اور بہن بھائی۔" میں نے اسے اپنے برابر صوفے میں بٹھا دیا۔

"بہن نہیں ہے بس دو مجھ سے چھوٹے بھائی ہیں۔" اب کی بار اس نے کافی کھلی آواز میں جواب دیا میں خوش ہو گئی کہ اس کی جھجک اور ڈر ختم ہو رہا ہے۔

"پھر تو تم بہت بور ہو جاتی ہو گی مالا! نہ بہن نہ کوئی دوست اماں کے ساتھ کام کراتی ہو گی گھر میں؟" میں نے پوچھا تو وہ میری بات سن کر جواب دینے کے بجائے یکا یک رونا شروع ہو گئی تو میں گھبرا گئی شاید میرے سوالوں سے اسے اپنی بے چارگی کا زیادہ احساس ہونے لگا ہو مجھے پشیمانی ہونے لگی۔ میں نے جلدی سے پانی پلایا اور آنسو پونچھے۔

"مالا کیا ہو گیا تم رونے کیوں لگ گئیں بیٹا!" تو اس نے بمشکل تمام اپنی ہچکیاں کنٹرول کیں اور بولی۔

"میری بھی ایک سہیلی تھی وہ میری خالہ کی بیٹی بھی تھی۔ مجھ سے چار سال بڑی تھی ہم دونوں خوب کھیلتے تھے گڑیا گڈے کی شادی بھی کرتے تھے اور چھپن چھپائی کی مانی بھی کھیلتے تھے مگر پچھلے برس اس کے بڑے بھائی ہاشم نے شمو کو مار ڈالا۔ میری شمو میرے پاس نہیں رہی میں اکیلی رہ گئی اب میری کوئی دوست نہیں۔" اس کی رکی ہوئی سسکیاں پھر جان پکڑ گئیں۔

"کیا مطلب ہے مالا! کیوں مار دیا شمو کو اس کے بھائی نے؟" میں ابھی بھی ٹھیک سے پوری بات نہیں سمجھ پائی تھی۔

"میں اور شمو کھیتوں میں کھیلنے جاتے تھے تو شمو کا پھوپھی زاد بھائی اکبر اکثر راستے میں کھڑا ہوتا تھا۔ وہ شمو کا ہاتھ پکڑنے کی کوشش کرتا تھا اس سے کہتا تھا کہ تم یہاں میرے ساتھ بیٹھ کر باتیں کرو مگر شمو ہمیشہ اسے ڈانٹ دیتی تھی کہ وہ ایسے بے غیرتی والے کام نہیں کر سکتی۔ اس دن اکبر نے اسے زبردستی لے جانے کی کوشش کی تو شمو نے اس کے منہ پر تھپڑ مار دیا تب اکبر نے اسے دھمکی دی کہ تو مجھے بے غیرت کہتی ہے نا اب دیکھ میں تیری غیرت کے کیسے پرخچے اڑاتا ہوں۔ ہم اس دن کھیلنے کے بجائے گھر کی طرف واپس چل پڑے راستے میں ہی ہاشم خان آتا دکھائی دیا اور اس نے وہیں شمو کو لاتوں سے مارنا شروع کر دیا اور ساتھ ساتھ گالیاں بھی دیتا رہا کہ" بے غیرت بے شرم تو کیا سمجھی کہ تو کھیتوں میں رنگ رلیاں منائے گی اور مجھے پتا نہیں چلے گا۔ مجھے اکبر نے سب بتا دیا ہے۔" یہ کہہ کر اس نے دیکھتے ہی دیکھتے ریوالور نکال کر شمو کی کنپٹی پر رکھا اور گولی چلا دی اور مجھے یہ کہہ کر چلا گیا کہ" دیکھ لے اچھی طرح اور بتا دینا سب کو ایسی لڑکیوں کا یہی انجام ہوتا ہے اور میں اسے کہتی رہ گئی کہ" ہاشم بھائی تم غلط ہو اکبر نے چال چلی ہے "مگر کسی نے میری ایک نہ سنی اور تو اور میری اماں نے بھی میری پٹائی لگائی کسی نے بھی میری بات پر یقین نہیں کیا......" اب کی بار اس کے ساتھ ساتھ میری آنکھوں میں بھی آنسو آ گئے۔

"ہاں مالا! وہ غیرت والی تھی اس کا بھائی اور وہ سب لوگ بے غیرت تھے اور ہیں جو شمو پر یہ ظلم ہوتے دیکھتے رہے۔ جنہوں نے اس کا ناحق خون بہتا دیکھا جو غیرت کے نام پر معصوم جانوں کا تماشا دیکھتے رہے ظلم اٹھاتے رہے جنہوں نے سچ کا نہیں طاقت کا ساتھ دیا۔" میں اسے دلاسے دیتے دیتے خود بھی سسک اٹھی میری روح بھی بین کرنے لگی کہ ہم کیسے کہتے ہیں کہ ہم ترقی کر گئے ہیں آج بھی عورت بے اماں ہے آج بھی حوا کی بیٹی فرسودہ روایات اور رسموں کے شکنجے میں جکڑی ہوئی اپنی رہائی کی منتظر ہے۔ آج بھی لڑکی ہونا جرم ہے۔ کہتے ہیں کہ میڈیا بااثر اور بااختیار ذریعہ ہے تو آج میں اسی ذریعے سے آپ سے پوچھتی ہوں کہ غیرت کے نام پر غیرت کا جنازہ نکالنے والے ان لوگوں کو آپ کیا کہیں گے......؟

جال و صیاد

ریاض بٹ

جال اور صیاد

جس طرح ایک جھوٹ کو نبھانے کے لیے انسان سو جھوٹ بولنے پر مجبور ہو جاتا ہے اسی طرح ایک جرم کو چھپانے کے لیے جرم پر جرم کرتا چلا جاتا ہے لیکن جس طرح جھوٹ نہیں چھپتا اسی طرح جرم بھی کہیں نشان چھوڑ دیتا ہے۔ جس پر قدم رکھتے ہوئے پولیس اس تک پہنچ جاتی ہے۔

جرم و سزا پر مبنی ایک خوب صورت تحریر۔

یہ بات میں آپ کو اپنی کسی کہانی میں بتا چکا ہوں کہ بچوں کے اغوا کے معاملے میں میں بہت حساس واقع ہوا تھا۔ جب تک میں کیس کو حل نہیں کر لیتا تھا، چین سے نہ بیٹھتا تھا اور نہ دوسروں کو بیٹھنے دیتا تھا۔

اور اس سلسلے میں رات دن کی کوئی تمیز نہیں کرتا تھا۔

ایک دن ایک آٹھ سالہ بچے کی گمشدگی کی رپورٹ لکھوانے دو بندے تھانے آئے۔

دونوں کی شکلیں آپس میں ملتی تھیں۔

بعد میں تعارف ہونے پر دونوں بھائی ثابت ہوئے۔

ایک کا نام حفیظ اور دوسرے کا حنیف تھا۔

ان سے جو معلومات حاصل ہوئیں ان کا خلاصہ مختصراً پیش کر دیتا ہوں۔ بچے کا نام جاوید تھا اور جیدی کہلاتا تھا۔ وہ سخت گرمیوں کے دن تھے۔ بچہ شام کو گھر کے قریب ایک پارک میں کھیلنے جاتا تھا اور اندھیرا پھیلنے سے پہلے پہلے واپس آ جاتا تھا۔ محلے کے کچھ اور بچے بھی جاتے تھے۔

لیکن گزشتہ شام وہ واپس نہیں آیا۔

میرے ایک سوال کے جواب میں بڑے بھائی حفیظ نے بتایا کہ فکر والی کوئی بات نہیں تھی۔ پارک بالکل قریب ہی تھا۔ اس لیے جاوید کو بھیج دیتے تھے۔ جاوید اس کا بیٹا تھا۔

لیکن اب بات فکر بلکہ تشویش والی ہو گئی تھی، جو میرے دن کا چین اور رات کا سکون غارت کرنے کے لیے کافی تھی۔

ان کو رخصت کرنے سے پہلے میں نے ان کے گھر کا ایڈریس اور لوکیشن پوچھ لی تھی۔

جو بات آپ کے ذہن میں کھٹک رہی ہے اس کی وضاحت بھی کرتا چلوں۔

ان سے یہ بات پوچھنے کا کوئی فائدہ نہیں تھا کہ وہ شام یا رات کو رپورٹ درج کروانے کیوں نہیں آئے؟ انہوں نے یہی کہنا تھا کہ وہ اپنے طور پر بچے کو تلاش کرتے رہے تھے۔ ایسے کیسوں میں یہی ہوتا تھا اور اتنا وقت گزر جانے کے بعد ہمارے لیے مشکلات بڑھ جاتی تھیں۔

بہرحال...... ہمیں اپنا فرض ادا کرنا تھا۔

میں نے اے ایس آئی شاہد کو اپنے کمرے میں بلا لیا اور اس کے ذمے ایک ڈیوٹی لگا دی۔ تقریباً گیارہ بجے میں کانسٹیبل وزیر کو ساتھ لے کر مغوی بچے کے گھر پہنچ گیا۔

یہ گھر ایک درمیانے درجے کی کوٹھی پر مشتمل تھا۔ ہمیں ایک خوبصورت بیٹھک نما کمرے میں بٹھایا گیا۔ اس وقت بڑا بھائی حفیظ ہی گھر میں موجود تھا۔ اس نے اپنی بیگم کو بھی بلا لیا۔ وہ ایک سانولے رنگ کی دراز قد

خاتون تھیں۔ نین نقش تیکھے تھے اس وقت اس کے چہرے پر دنیا جہاں کے غم سمٹ آئے تھے۔ آنکھیں رو رو کر سوج گئی تھیں۔ اس کا نام نغمانہ معلوم ہوا۔
حفیظ بھی کم پریشان نہیں لگتا تھا۔ لیکن اس نے کمال ضبط سے اپنے آپ کو سنبھالا ہوا تھا۔
میں نے پہلے تو خاتون سے اظہار ہمدردی کیا پھر اپنے اصل مقصد کی طرف آگیا۔
"بی بی..... جب تک آپ لوگ تعاون نہیں کریں گے ہم کوئی راہ متعین نہیں کرسکیں گے۔" میں نے حفظ ماتقدم کے طور پر پہلے ہی سوال سے ان کا ذہن اپنے قبضے میں کرنے کی کوشش شروع کردی۔ ورنہ جو سانحہ ان کے ساتھ گزر چکا تھا وہ کافی دیر میرے سوالوں کے اطمینان بخش جوابات دینے کے قابل نہیں ہوسکتے تھے۔
"تھانیدار صاحب! ہم ہر قسم کے تعاون کے لیے تیار ہیں آپ حکم تو کریں۔"
دونوں ایک زبان ہوکر بولے۔
"آپ لوگوں کے خیال میں بچہ کہاں جاسکتا ہے؟"
"وہ نہ تو کبھی اس طرح گیا تھا اور نہ ہمارے خیال میں جاسکتا ہے۔"
خاتون کا جواب میری توقع کے عین مطابق تھا۔
"پھر تو ایک ہی بات رہ جاتی ہے۔" میں نے حفیظ کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔
"وہ کیا... تھانیدار صاحب؟" حفیظ نے بے ساختہ پوچھا۔
"بچے کو کسی نے اغوا کیا ہے۔"
"اغوا..... اغ..... وا" خاتون نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔
میں نے یہ بھی دیکھا کہ حفیظ کی آنکھوں میں حیرت اور غم ہلکورے لے رہا ہے اور اس کے ہونٹ کانپ رہے ہیں۔

"بالکل حالات و واقعات تو اس طرف اشارہ کررہے ہیں۔" میں نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ "اور ظاہر ہے یہ کام کسی دوست کا تو ہو نہیں سکتا۔"
"لیکن .... تھانیدار صاحب! ہمارا تو کوئی دشمن نہیں ہے۔ ہم صلح جو قبیلے ہیں۔ کبھی کسی کے ساتھ کوئی عداوت اور چپقلش نہیں رکھی۔"
"بہرحال! ہم اپنی پوری کوشش کریں گے کہ آپ کا بچہ بازیاب ہوجائے۔" میں نے اٹھتے ہوئے کہا۔
پھر ہم وہاں سے اٹھ کر تھانے میں آگئے۔
راستے بھر گرم ہوا کے جھونکے ہمارے چہروں کو جھلساتے رہے تھے۔ ہر موسم کا اپنا ہی انداز ہوتا ہے۔ ویسے ایک بات ہے کہ ہم خوش قسمت ہیں کہ چار موسم ہمارے پیارے ملک میں آتے ہیں۔ ورنہ ایسے ملک بھی ہیں جہاں انسان دھوپ کو ترستے ہیں۔ جس دن سورج اپنا چہرہ دکھاتا ہے وہ دن ان کے لیے خوشی اور تفریح کا دن ہوتا ہے۔
بات سے بات نکلتی ہے یہ اسی شام کی بات ہے کہ میں اور سپاہی بشارت اس پارک میں پہنچ گئے' جہاں سے جاوید عرف جیدی غائب ہوا تھا۔ ہم اپنے طور پر جائزہ لینا چاہتے تھے۔ اس لیے اس وقت ہم سادہ کپڑوں میں تھے۔
میں اور سپاہی ایک سنگی بنچ پر بیٹھ گئے۔
ہمارے اردگرد بچے کھیل رہے تھے۔ یہاں اس بات کی وضاحت کردوں کہ یہ ویسا پارک نہیں تھا جیسے عموماً ہوتے ہیں۔ اس میں جھولے وغیرہ نہیں تھے اور اس میں کچھ گھاس وغیرہ اگی ہوئی تھی۔
سپاہی نے کرکٹ کھیلتے ہوئے دو تین بچوں کو اپنے پاس بلالیا۔
اور جیب سے کچھ ٹافیاں نکال کر ان کو دیں۔ بچے ہمارے ساتھ گھل مل گئے۔
سپاہی نے ایک گول مٹول دس سالہ بچے سے

چمکارتے ہوئے پوچھا۔

"بیٹا! کل یہاں سے ایک بچہ گم ہوا ہے۔"

وہ گول مٹول سا بچہ جس کا نام بعد میں بہلو معلوم ہوا۔ بولا۔

"وہ جی..... جیدی ہمارے ساتھ کھیلتا تھا۔ ہمارا بڑا اچھا دوست تھا۔ ہم خود حیران ہیں وہ کہاں چلا گیا۔"

"وہ خود نہیں گیا..... بلکہ کوئی اسے لے گیا ہے۔" میں نے پہلی دفعہ گفتگو میں حصہ لیتے ہوئے کہا۔

"کون لے گیا ہے.....؟" بہلو نے میری طرف سوالیہ نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ "لیکن آپ کون ہیں اور....."

"بھئی تم اس بات کو چھوڑو کہ ہم کون ہیں۔ اگر تم چاہتے ہو کہ جیدی دوبارہ تم لوگوں کے ساتھ آ کر کھیلے تو ہمارے چند سوالوں کے جواب دے دو....." سپاہی نے بچوں کی نفسیات کے عین مطابق کہا۔

"پوچھیے" ایک اور گیارہ سالہ بچے نے نیچے گھاس پر آلتی پالتی مار کر بیٹھتے ہوئے کہا۔ "جیدی میرا گہرا دوست تھا۔ میں چاہتا ہوں کہ وہ دوبارہ ہم سے آ ملے۔"

"بہت خوب بیٹے۔" میں نے اس کا گال تھپتھپاتے ہوئے کہا۔

"تم نے پارک میں کبھی کوئی نیا آدمی یا عورت دیکھی ہے جس کے ساتھ جیدی باتیں کرتا ہو۔"

"باجی۔" اس نے اپنا سر کھجاتے ہوئے باقی بچوں کی طرف دیکھا۔

"ہاں..... ہاں..... شاباش یاد کرو۔" سپاہی نے کہا۔

"ایک عورت اکثر پارک میں آتی ہے۔ اس کے ساتھ تو سب بچے گھل مل جاتے ہیں۔ وہ سب بچوں سے پیار کرتی ہے اور..... بسکٹ ٹافیاں بھی بچوں کو دیتی ہے۔"

"اوہ..... میری آنکھیں چمک اٹھیں۔

"جس دن جیدی غائب ہوا تھا کیا وہ اس دن بھی آئی تھی۔"

"نہیں..... اس دن تو نہیں آئی تھی۔" بچے نے باقی بچوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

باقیوں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"اب آخری بات۔" میں نے سپاہی کو اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ وہ میرا اشارہ سمجھ گیا اور باقی ٹافیاں بھی بچوں میں تقسیم کر دیں۔

"جی..... پوچھیے۔" سب بچوں نے یک زبان ہو کر کہا۔

"کیا جیدی کے والدین نے بھی آپ بچوں سے کچھ پوچھا تھا؟"

"جی ہاں۔"

"پھر.....؟" میں نے اور سپاہی نے سنگی بینچ سے اٹھتے ہوئے کہا۔

"ہم نے انہیں بھی یہی باتیں بتائی تھیں جو آپ کو بتائی ہیں۔"

"ٹھیک ہے اب تم لوگ کھیلو۔" ہم نے پارک کے گیٹ کی طرف قدم بڑھاتے ہوئے کہا۔

"انکل....." بچوں نے ہماری طرف سوالیہ نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ہم رک گئے اور بچوں کی طرف دیکھنے لگے۔

"کیا جیدی ہم میں دوبارہ آ ملے گا؟"

میں نے سب بچوں کی طرف دیکھا۔ ان کی نگاہوں میں سوال سے زیادہ التجا تھی حسرت تھی اور نجانے کیا کیا تھا۔ جس کو لفظوں کی زبان دینا ممکن نہیں ہے۔

"انشاء اللہ۔" کہتے ہوئے ہم نے گیٹ کی طرف دوبارہ قدم بڑھا دیے۔

ان الفاظ کے علاوہ ہم اور کیا کہہ سکتے تھے۔ میں راستے بھر یہ سوچتا رہا کہ انسان کتنا بے حس اور خود غرض ہے۔ اپنی انا کی تسکین کے لیے معصوم بچوں کو مہرے

کے طور پر استعمال کرتا ہے۔ آپس کی چپقلش اور عداوت میں بچوں کو لے آتا ہے۔ ایک قول ہے کہ آپ اپنے بچوں کی خاطر دنیا کو ٹکڑے ٹکڑے کر سکتے ہیں۔

بہر حال اس کیس میں مجھے ایسے ہی عوامل نظر آرہے تھے۔ مجھے جیدی کے ماں باپ پر بھی غصہ تھا انہوں نے بہت سی باتیں چھپائی تھیں۔ تھانے میں واپس آکر میں نے سپاہی انور کو بھیج کر جاوید عرف جیدی کے ماں باپ کو بلالیا۔

وہ جب میرے سامنے آکر بیٹھ گیا تو میں نے اسے گھورنا شروع کر دیا۔

وہ سٹپٹا گیا۔ اور نظریں جھکا کر بولا۔

"تھانیدار صاحب آپ مجھے اس طرح کیوں دیکھ رہے ہیں۔"

"اس لیے کہ کیا تم لوگ پولیس کو بے وقوف سمجھتے ہو؟"

"نہیں جناب! آپ نے کیسے اندازہ لگایا۔" وہ حیران نگاہوں سے میری طرف دیکھتے ہوئے گویا ہوا۔

"وہ اس طرح جناب کہ آپ نے کچھ باتیں چھپائی ہیں۔ اس طرح تو ہم کبھی بھی جاوید عرف جیدی کو نہیں ڈھونڈ سکیں گے۔" میں نے خشک لہجے میں کہا۔

"کونسی باتیں..... تھانیدار صاحب ہم نے تو.."

"مثلاً اس عورت کی باتیں جو پارک میں بچوں میں گھل مل جاتی ہے اور انہیں چاکلیٹ اور بسکٹ وغیرہ بھی دیتی ہے۔" میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

"کیا اس عورت کا تعلق جیدی کی گمشدگی کے ساتھ ہوسکتا ہے۔" میرے سامنے بیٹھے ہوئے مغوی کے باپ نے سوالیہ نگاہوں سے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"تعلق ہو نہ ہو پولیس سے کوئی بات چھپانی نہیں چاہیے۔ چھوٹا سا نقطہ ذرا سی بات بعض اوقات ہمارے لیے مشعل راہ بن جاتی ہے۔"

"سوری تھانیدار صاحب! ہم سے غلطی ہوئی۔ اب میں کوئی بات نہیں چھپاؤں گا۔ اپنی زندگی کے ایک راز سے پردہ اٹھا دیتا ہوں۔ یہ آج سے تقریباً گیارہ سال پہلے کی بات ہے۔ مجھے کنول سے محبت ہوگئی تھی۔ وہ تھی بھی محبت کے قابل۔ دو سال ہم پاکیزہ محبت کرتے رہے۔ تنہائیوں میں بھی ہمارے قدم کبھی نہیں بہکے۔ پھر ایک دن وہ ہوگیا جس کے متعلق ہم نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا..... وہ سانس لینے کے لیے رکا پھر دور خلاؤں میں گھورتے ہوئے بولا۔

"اس واقعے کے ایک ماہ بعد کنول نے مجھے بتایا کہ وہ امید سے ہوگئی ہے۔ میرے ہاتھ پاؤں پھول گئے میرا رشتہ بچپن ہی میں میری خالہ زاد سے طے کر دیا گیا تھا۔ میں نے اپنی غلطی تسلیم کرنے کی بجائے الٹا اسے مورد الزام ٹھہرا دیا اور یہاں تک کہہ دیا کہ پتہ نہیں کس کا گناہ میرے سر تھوپنا چاہتی ہو۔" اس نے ایک لمحہ توقف کیا پھر بولنے لگا۔ "تھانیدار صاحب اس وقت مجھے نہ جانے کیا ہوگیا تھا شاید بدنامی کا خوف تھا۔ زمانے کا ڈر تھا ماں باپ کا خیال آگیا تھا یا بچپن میں کیا ہوا رشتہ یاد آگیا تھا۔ کچھ بھی تھا پھر وہ خاموش ہوگیا۔ اس کے بعد وہ کافی دیر چپ رہا۔ میں اس کے چہرے کا جائزہ لیتا رہا۔ وہ اپنے ہاتھوں کی مٹھیاں بنا کر کبھی کھولتا تھا اور کبھی بند کرتا تھا۔ اس کا اضطراب اور ندامت کا احساس اپنی آخری حدوں کو چھو رہا تھا۔ جبھی تو اس نے خود ہی اپنے راز سے پردہ اٹھا دیا تھا۔

بہر حال کافی دیر بعد اس نے کچھ اور باتیں بتائی تھیں جن کا ذکر مناسب موقع پر آئے گا۔

میرے ایک سوال کے جواب میں اس نے بتایا تھا کہ اس نے پارک میں آنے والی عورت کو کبھی نہیں دیکھا تھا۔

بچوں نے بھی اپنے گھروں میں کبھی ذکر نہیں کیا تھا۔ اس کی وجہ ہمیں بعد میں معلوم ہوئی تھی۔ عورت نے بچوں سے کہہ رکھا تھا کہ وہ اپنے گھروں

میں شہ دیتا تھیں ورنہ وہ کبھی بھی پارک میں نہیں آئے گی۔

بچے تو آخر بچے ہوتے ہیں۔

لیکن ہم تو بچے نہیں تھے۔ ہم بہت کچھ سمجھ گئے تھے۔

ٹھیک تو یہی تھا کہ بچے کو لے جانے والی عورت بھی ہو سکتی تھی۔ اس بات کو بالکل سچ سمجھنے میں صرف ایک بات مانع تھی کہ جس دن جیدی غائب ہوا تھا اس دن وہ عورت نہیں آئی تھی۔

اگلے دن اے ایس آئی شاہد نے مجھے رپورٹ دی۔ (جیسا کہ شروع میں ذکر آ چکا ہے کہ میں نے اس کے ذمے ایک ڈیوٹی لگائی تھی)

اس کی رپورٹ کا ذکر کرنے سے پہلے یہ بتا دینا مناسب سمجھتا ہوں کہ میں نے اس کے ذمے یہ ڈیوٹی لگائی تھی کہ حفیظ کے خاندان کے متعلق معلومات حاصل کرے۔ اس کی رپورٹ سے یہ نتیجہ نکلا کہ حفیظ نے صحیح معلومات بہم پہنچائی تھیں۔ اب اس عورت کا دوبارہ ہاتھ لگنا مشکل تھا لیکن میں نے اس کے باوجود ایک سپاہی کو کہا کہ وہ روزانہ سادہ کپڑوں میں پارک میں جایا کرے۔

ہم بھی آخر انسان ہیں ہمارے انداز سے غلط ثابت ہو سکتے ہیں اور اس وقت میں بھونچکا رہ گیا جب سپاہی نے تیسرے دن مجھے آ کر اطلاع دی کہ وہ عورت کو لے آیا ہے۔

عورت کو وہ باہر بٹھا آیا تھا۔ میں نے عورت کو بلانے سے پہلے سپاہی کی کہانی سننا بہتر سمجھا۔

لیجیے اس کی زبانی سنیے۔

"سر! مجھے پارک میں جاتے ہوئے آج تیسرا دن تھا۔ آج مجھے پارک میں عورت نظر آ گئی میری متلاشی نظریں روزانہ داخلی گیٹ کی طرف ہوتی تھیں۔ دو دنوں میں، میں نے یہ اندازہ لگایا تھا کہ بہت کم بڑے پارک میں آتے ہیں۔ یہ عورت جونہی پارک میں داخل ہوئی میں نے دیکھا کہ بچے اس کی طرف دوڑ کر گئے عورت نے بچوں کو پیار کیا اور اپنے ہاتھ میں پکڑے ہوئے کپڑے کے تھیلے سے بسکٹ اور ٹافیاں نکال کر بچوں میں بانٹنے لگی۔ میں بہانے سے کسی بینچ سے اٹھ کر ان کے قریب جا کھڑا ہوا۔

عورت نے بچوں سے پوچھا کہ آج جیدی نہیں آیا؟

جب بچوں نے اسے صورت حال سے آگاہ کیا تو میں نے ان سے تھوڑی دور گھاس پر بیٹھے دیکھا کہ عورت کے چہرے پر اچانک تشویش کے آثار نظر

تعلیم

ہر ترقی یافتہ ملک میں اس کی اپنی زبان ہی ذریعہ تعلیم ہے۔ مگر پاکستان میں ذریعہ تعلیم اردو نہیں انگریزی ہے۔ جس کی وجہ سے یہاں کا معیار تعلیم پست ہے کیونکہ طالب علم اپنا قیمتی وقت علوم سیکھنے کے بجائے انگریزی سیکھنے میں ضائع کر دیتے ہیں۔ کسی غیر زبان کو ذریعہ تعلیم بنانا حماقت کے سوا کچھ نہیں۔ جاپان میں جاپانی، چین میں چینی، انگلستان میں انگریزی، فرانس میں فرانسیسی، جرمن میں جرمنی غرض یہ کہ ہر ملک کے اندر وہی زبان ذریعہ تعلیم ہے جس کو سب بخوبی سمجھتے ہیں سوائے پاکستان کے جہاں سب لوگ سمجھتے تو اردو ہیں لیکن یہاں ذریعہ تعلیم انگریزی ہے اور اسی وجہ سے ہمارا معیار تعلیم پست ہے۔ تعلیم اسی زبان میں اچھی طرح دی جاتی ہے جس کو طالب علم آسانی سے سمجھ سکیں۔ ہمارے یہاں تعلیم اس زبان میں دی جاتی ہے جس کو سمجھنے میں دس سال کا عرصہ لگ جاتا ہے پھر کہیں جا کر صحیح علم سیکھنے کا آغاز ہوتا ہے۔ ہمارے زوال، پستی اور نالائقی کا واحد سبب یہی ہے کہ ہم نے اردو کو ذریعہ تعلیم نہیں بنایا اور ہم اپنا قیمتی وقت علم سیکھنے کے بجائے انگریزی سیکھنے میں گنوا دیتے ہیں۔

مرسلہ: حق نواز...... کراچی

آ ئے..... مجھے یوں محسوس ہوا کہ جیسے اسے چکر بھی آ گیا ہو..... لیکن اس نے اپنے آپ کو سنبھال لیا اور بچوں سے بولی۔

"بچوں تم کھیلو آج مجھے جلدی جانا ہے۔" پھر اس کے قدم خارجی گیٹ کی طرف بڑھنے لگے۔ میں بھی اٹھا اور محتاط قدموں سے اس کے پیچھے جانے لگا۔ آہستہ آہستہ میں نے درمیانی فاصلے کو ختم کیا اور گیٹ کے قریب اسے جالیا۔

"بی بی..... ایک بات سنو۔"

اس عورت نے مڑ کر مجھے دیکھا اور بولی۔

"کیا بات ہے تم نے مجھے آواز کیوں دی۔" اس نے ذرا غصے سے کہا۔

"جیدی سے تمہارا کیا رشتہ ہے؟"

"کیا مطلب؟" اس نے آنکھیں نکال کر مجھے دیکھا اور دوبارہ بولی۔ "تم کون ہو؟ اور یہ سوال مجھ سے کیوں پوچھ رہے ہو؟"

"سر..... اب میں نے اپنے آپ کو چھپانا فضول سمجھا اور اس پر اپنا آپ ظاہر کر دیا۔ ساتھ یہ بھی کہا کہ ہم جیدی کو ڈھونڈ رہے ہیں۔"

"اوہ....." اس نے ہنکارا بھرا میں نے غور سے دیکھا اس کی آنکھیں کسی خوفزدہ ہرنی کی طرح نظر آ رہی تھیں۔

"تمہیں میرے ساتھ تھانے چلنا ہوگا۔" میں نے حتمی لہجے میں کہا۔

"چلو۔ میں خود بھی تھانے جانے کا سوچ رہی تھی۔" اس کے بعد میں نے اسے کمرے میں بلا لیا۔

قارئین یہ کنول تھی اس نے ایک کڑی کو چھوڑ کر سب کڑیاں ملا دیا۔

آگے بڑھنے سے پہلے وہ باتیں آپ کے گوش گزار کروں جن کا ذکر میں نے کنول کر دیا تھا۔ اور جو مجھے حفیظ نے بتائی تھیں۔

حفیظ نے بتایا تھا کہ ایک صبح جب وہ جاگا تو کوٹھی کے باہر گیٹ کے پاس اسے ایک متحرک چیز نظر آئی جو ایک سفید کپڑے میں لپٹی ہوئی تھی۔ اس نے ہچکچاتے ہوئے اسے اٹھا لیا۔ یہ ایک نومولود بچہ تھا۔

اس وقت اس کی شادی ہو چکی تھی۔

غیر ارادی طور پر وہ بچے کو لے کر اپنی بیگم کے پاس پہنچ گیا۔

"یہ کیا اٹھا لائے ہو حفیظ.....؟"

اور جب اسے پتہ چلا کہ یہ ایک نومولود بچہ ہے تو اس نے اسے ہاتھوں پر اٹھا لیا۔

"پتہ نہیں کون اپنا گناہ ہماری دہلیز پر چھوڑ گیا ہے؟"

حفیظ نے خالی خالی نظروں سے اپنی بیگم نعمانہ کی طرف دیکھا اور بولا۔

"یہ تو شاید کسی کو پتہ نہ چلے۔"

"میں تو کہتی ہوں کہ کسی رفاہی ادارے کو فون کریں اور بچہ ان کے حوالے کر دیں۔"

بچہ اس وقت سویا ہوا تھا۔ اور اس کے ہونٹوں پر ایک معصوم سی مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔

حفیظ نے مجھے بتایا تھا کہ اس کا دل بالکل نہیں مان رہا تھا کہ بچے کو کسی رفاہی ادارے کے سپرد کیا جائے۔ اس نے اپنی بیگم کو سمجھاتے ہوئے کہا۔

"دیکھو۔ نعمانہ اس بچے کا کیا قصور ہے؟ قصور تو ان کا ہے جو اسے دنیا میں لانے کا موجب بنے ہیں۔"

"پھر..... ہم کیا کریں..... دیکھیں میری بات مان جائیں۔"

"کیوں..... نہ ہم اس بچے کو گود لے لیں۔" حفیظ نے کہا۔ اس کے بعد کافی دیر تک میاں بیوی میں بحث و تکرار ہوتی رہی آخر کار حفیظ نے اپنی بیگم کو قائل کر لیا۔ حفیظ ایک محتاط اور قانون کا احترام کرنے والا بندہ تھا۔ اس نے تھانے میں اطلاع دی تھی اور قانونی طور پر

بچے کو گود لیا تھا۔ میں نے تھانے کا پرانا ریکارڈ دیکھا تھا تو اس بات کی تصدیق ہوگئی تھی اور میں نے یہ کام اسی دن کرلیا تھا جب حفیظ نے مجھے اپنا راز بتایا تھا۔

حفیظ کو شک تھا کہ یہ بچہ اس کا ہوسکتا ہے۔ یہ تو اس کے دل کی آواز تھی اور شاید ضمیر کی بھی۔

کنول نے اس بات کی تصدیق کردی تھی کہ یہ بچہ اس کا اور حفیظ کا ہی تھا اور وہی اسے حفیظ کی کوٹھی کی دہلیز پر چھوڑ کر آئی تھی۔

اس سے پہلے اس نے اپنی کہانی سنائی تھی۔ یعنی امید سے ہونے کے بعد اس پر کیا گزری تھی۔

اس نے بتایا کہ جونہی حفیظ نے اسے ذلیل کرکے واپس بھیج دیا تھا۔ اس کے دل میں یہ خیال آیا تھا کہ اپنے آپ کو ختم کرلے لیکن پھر یہ سوچ کر اس ارادے سے باز رہی تھی کہ اس کے اندر پلنے والے وجود کا کیا قصور ہے؟ وہ گھر جا نہیں سکتی تھی' کچھ پیسے اس کے پاس تھے اس کی ایک دور پار کی خالہ قریبی شہر میں رہتی تھیں اور اس کے گھر والوں سے ناراض تھی' کنول سیدھی اس کے پاس چلی گئی اور اپنی آپ بیتی اسے جا سنائی۔ وہ بیوگی کی زندگی بسر کررہی تھیں' اس کا ایک بیٹا اور ایک بیٹی تھی' بیٹی اپنے گھر کی ہوگئی تھی اور بیٹا دیار غیر گیا ہوا تھا۔ خالہ نے کنول کے سر پر ہاتھ پھیرا اور اسے ہر قسم کے تعاون کا یقین دلایا۔ خالہ نے ایک شرط پر اس کا ساتھ دینے کا وعدہ کیا تھا کہ جونہی بچہ پیدا ہو' وہ اسے حفیظ کی دہلیز پر چھوڑ آئے۔ کنول کے پاس یہ شرط ماننے کے علاوہ کوئی چارہ نہیں تھا۔

اس نے ایسا ہی کیا... اور خالہ کے مرنے تک اس نے بچے کے متعلق سوچا بھی نہیں...... لیکن خالہ کے مرنے کے بعد بچے کی محبت اس کے دل میں جاگی' اور وہ اس شہر میں آگئی...... اور ایک دن جب وہ پارک کے پاس سے گزری تو نہ جانے کیوں اس کے قدم پارک کے اندر چلے گئے' کہتے ہیں خون کی کشش ہو کہ وہ سے بھی اپنی طرف کھینچتی ہے۔ وہ جیدی کی طرف کھنچی چلی گئی' لیکن ظاہر ہے وہ اسے کیسے اپنا بیٹا سمجھ سکتی تھی' بہرحال اس کے بعد وہ اکثر وہاں جانے لگی اور بچوں کے لیے ٹافیاں اور بسکٹ بھی لے جانے لگی۔ خیر اس کی کہانی جیسی بھی تھی' اس نے ایک جرم تو کیا تھا ایک نومولود بچے کو چھوڑ گئی تھی۔ میں نے اس کا کیس سپرد عدالت کردیا تھا۔

لیکن اس کیس کی ایک اہم کڑی باقی تھی' جیدی کو کون لے گیا تھا۔ کنول نے مجھے بتایا تھا کہ جب اسے جیدی کی گمشدگی کا پتہ چلا تھا اسے اپنا دماغ گھومتا ہوا محسوس ہوا تھا۔ اسے اس دوران یہ چل چکا تھا کہ جیدی وہی بچہ ہے جسے وہ آٹھ سال پہلے حفیظ کی دہلیز پر چھوڑ گئی تھی۔ ادھر حفیظ اور اس کی بیگم نغمانہ کے متعلق بتاتا چلوں کہ ان کی کوئی اولاد نہیں ہوئی تھی۔ اس لیے انہیں جیدی سے بہت زیادہ پیار ہوگیا تھا اور اب وہ اسی طرح پریشان تھے جیسے ان کا سگا بیٹا کھو گیا ہو۔

زندگی میں کیسے کیسے لمحے آتے ہیں' انسان بے حس ہوجاتا ہے۔ شاید اس کے گناہ سامنے آجاتے ہیں۔ ایک لمحے کی غلطی اس کے لیے سزا بن جاتی ہے۔

یہی کچھ حفیظ کے ساتھ ہوا تھا۔ اس نے اپنی بیگم کو سب کچھ بتادیا تھا' کیونکہ کنول کو سپرد عدالت کرنے سے پہلے میں نے حفیظ پر ساری صورت حال واضح کردی تھی۔ اب حالات ایسے ہوگئے تھے کہ وہ زیادہ دیر یہ راز چھپا نہیں سکتا تھا۔ دونوں نے کنول کے لیے ایک اچھا سا وکیل کرلیا تھا۔ خیر یہ معاملے تو اپنی جگہ پر تھا' میرا مسئلہ اپنی جگہ پر تھا۔

ہمیں جیدی کو ڈھونڈنا تھا۔ اس کا کوئی کھرا کھوج نہیں مل رہا تھا۔ ہنوز دلی دور است والا معاملہ تھا۔ میرے دل سے یہ دعا نکل رہی تھی کہ جیدی ہمیں زندہ سلامت مل جائے۔

جو بھی جرم کیا جاتا ہے اس کا کوئی نہ کوئی مقصد اور وجہ ضرور ہوتی ہے۔ جیدی کو کیوں اغوا کیا گیا تھا۔ اس کا

مقصد ابھی اندھیرے میں ہی تھا۔
کنول کو میں نے اچھی طرح تفتیش کی چکی میں پیس کر دیکھ لیا تھا۔ اس کا کوئی ارادہ نہیں تھا جیدی کو لے جانے کا۔ بقول اس کے وہ ایک خاص دن کے انتظار میں تھی۔ مگر اب تو سب پچھا لٹ پلٹ ہو گیا تھا۔
ہم نے مخبروں کی ڈیوٹیاں لگائی ہوئی تھیں۔ وہ ادھر ادھر سے سن گن لے رہے تھے۔ ایک بات میں یہاں آپ کو اور بتا دوں کہ ہم نے جاوید عرف جیدی کی تصویریں ارد گرد کے تھانوں میں بھجوا دی تھیں۔
مگر ابھی تک کوئی حوصلہ افزا خبر ہم تک نہیں پہنچی تھی۔
میں انہی خیالوں میں گم تھا کہ اے ایس آئی ابرار میرے کمرے میں داخل ہوا اور سلام دعا کے بعد جب وہ میرے سامنے بیٹھ چکا تو میں نے پوچھا۔
"آؤ..... بھئی کیا حال چال ہیں؟ چھٹیاں کیسی گزریں.....؟"
"بس سر..... شکر ہے بھائی اب کافی ٹھیک ہے۔"
"اوہ..... سوری بھئی یہ بات تو میرے ذہن سے نکل ہی گئی تھی کہ تم بھائی کے ایکسیڈنٹ کا سن کر چھٹی لے کر گئے تھے۔"
کچھ دیر ہم یہی باتیں کرتے رہے۔
پھر میں نے موجودہ کیس کے متعلق تفصیل سے اسے بتا دیا۔
"سر..... یہ تو کافی الجھا ہوا کیس لگتا ہے۔ اگر بچے کو اغوا برائے تاوان کے لیے لے جایا گیا ہے تو اب تک مجرموں کی طرف سے کوئی مطالبہ تو سامنے آنا چاہیے تھا۔" اے ایس آئی نے سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا۔ میں نے دیکھا کہ اس کے ماتھے پر سوچ کی لکیریں ابھر آئی تھیں۔
"عجیب گورکھ دھندا ہے۔ یہ کیس کسی کروٹ بیٹھ ہی نہیں رہا۔ سب سے جواب طلب بات تو یہ ہے کہ جیدی کو کیسے لے جایا گیا ہوگا؟"
"کیوں نہ سر جرائم پیشہ افراد کو تھانے میں لا کر انہیں تفتیش کی چکی میں پیسا جائے۔"
"فی الحال ایک دو دن انتظار کر لیا جائے تو بہتر ہے۔ پھر میں نے اے ایس آئی کو اس کی وجہ بتائی تھی۔
"ٹھیک ہے سر..... میں بھی اس لائن پر کام کرتا ہوں۔" وہ چلا گیا اور میں سوچ کے تانے بانے بننے لگا۔ کچھ دیر کے بعد سپاہی چائے رکھ کر چلا گیا اور میں اس سے دو دو ہاتھ کرنے لگا۔
تھانے میں چھوٹے موٹے لڑائی جھگڑے کے کیس بھی آتے رہتے ہیں۔
شام سے ذرا پہلے ایک مضروب کو لایا گیا۔ میں نے اس کے زخموں کا معائنہ کیا باقی زخم معمولی نوعیت کے تھے صرف ایک زخم ذرا گہرا تھا۔ جو بازو پر آیا تھا۔ یہ کسی چاقو کا زخم تھا۔ اس دور میں بدمعاشوں اور جرائم پیشہ لوگوں کے پاس بٹن سے کھلنے والے چاقو ہوتے تھے۔
مضروب کے ساتھ دو بندے بھی آئے تھے۔ ایک بندے کو میں نے اپنے پاس بٹھا لیا اور دوسرے کو مضروب کے ساتھ سول اسپتال بھیج دیا۔ ساتھ سپاہی انور کو بھی بھیج دیا تھا۔
جو بندہ میرے پاس رہ گیا تھا اس کا نام آصف معلوم ہوا بندے کی عمر کا اندازہ میں نے چالیس سال کے لگ بھگ قریب لگایا۔ رنگ ذرا سانولا اور چہرہ بیضوی تھا۔ ہلکی ہلکی مونچھیں اس نے چھوڑی ہوئی تھیں۔
اس سے لڑائی کی جو کہانی سامنے آئی وہ میں اپنے الفاظ میں بیان کر دیتا ہوں۔
اس نے بتایا کہ عارف (مضروب) کو صاحب نے خنجر سے زخمی کیا ہے عارف کا بازار میں ایک چائے کا چھوٹا سا ہوٹل تھا۔ صاحب اکثر اس کے ہوٹل میں چائے پینے آتے تھے۔ آج شاید وہ غصے میں تھے۔ انہوں نے چائے کا ایک گھونٹ لے کر پیالی میز کے

اوپر چیخ دی اور اٹھ کھڑے ہوئے۔ پھر تیزی کی تیزی سے
عارف کے پاس گئے اور اسے گالی دے کر بولے۔
"یہ چائے ہے..... اس میں تو چینی ہی نہیں ہے۔"
"دیکھیں صاحب انسان سے بھول چوک ہو جاتی
ہے۔ آج غلطی سے چینی نہیں ڈال سکا آپ تشریف
رکھیں۔ میں آپ کو نئی چائے بنا دیتا ہوں۔ عارف نے
گالی پر خون کے گھونٹ پیتے ہوئے کہا۔
"اب تم چائے کو رہنے دو..... تم انتہائی ..... ہو....."
یہ ایک غلیظ گالی تھی۔
عارف نے چائے پھینٹنے والے چمچے سے اس کے
ہاتھ پر ضرب لگائی اور غصے سے بولا۔
"صاحب اپنی زبان کو لگام دو میں یہاں مزدوری
کرتا ہوں۔ گالیاں سننے نہیں آتا۔"
اس کے بعد صاحب نے اچانک جیب سے خنجر
نکال لیا اور عارف پر حملہ کر دیا۔
لوگ دوڑ پڑے لیکن چھڑاتے چھڑاتے عارف
کو اتنے زخم آ گئے جس کا ذکر آ چکا ہے۔
بہرحال میں نے آصف کو کانسٹیبل وڈیری کی بیرک
میں بٹھا دیا۔ اور مضروب وغیرہ کا انتظار کرنے لگا۔
آدھے گھنٹے بعد وہ آ گئے ڈاکٹر نے رپورٹ بنا دی
تھی جس میں زخموں کی تفصیل درج تھی۔
عارف نے مجھے ایک کہانی سنائی۔ جسے سن کر میں
اچھل پڑا۔
صاحب نے عارف کو قتل کی دھمکی بھی دی تھی۔
میں نے محرر کو بلا کر عارف اور اس کے ساتھ آئے
ہوئے بندوں کو اس کے ساتھ بھیج دیا۔ آصف کو بھی
کانسٹیبل سے بیرک سے بلا لیا تھا۔ میں نے محرر کو
سمجھا دیا تھا کہ رپورٹ میں کیا کیا لکھنا ہے۔
تقریباً ایک گھنٹے بعد ہمارا مطلوبہ بندہ ہمارے
سامنے تھا۔ سپاہی منور اسے لایا تھا اور اب میرے
اشارے پر کسی حکم کے منتظر جن کی طرح اس کے سر
مسلط تھا۔
"ہاں بھئی..... صاحب عارف کو کیوں زخمی کیا
ہے؟ اور خنجر کیوں اپنے پاس رکھا ہوا ہے؟"
"جناب! دراصل آج میرا بیوی کے ساتھ جھگڑا
ہو گیا تھا اس لیے میں غصہ میں تھا اور تھانیدار صاحب
میں عارف کے پاؤں میں گر کر معافی مانگ لوں گا
اور اس کو کچھ پیسے بھی دے دوں گا۔"
"اچھا....." میں نے ہنکارا بھرا۔ اس لیے غصے
کو حرام قرار دیا گیا ہے۔ بہرحال پھیکی چائے کی وجہ
سے اتنا مشتعل ہونا سمجھ میں نہیں آیا۔"
"وہ جی..... یہ کوئی نفسیاتی مرض ہے۔"
"کیا مطلب....." میں نے اسے گھورا۔ اب تم
اپنے آپ کو پاگل ظاہر کرو گے۔"
"تھانیدار صاحب اگر چائے میں چینی نہ ہو تو مجھے
غصہ آ جاتا ہے آج بیوی کے ساتھ بھی اسی بات پر جھگڑا
ہوا تھا اور جب ہوٹل میں بھی پھیکی چائے سامنے آئی
تو....." وہ خاموش ہو گیا۔
قارئین آپ اس بات پر حیران نہ ہوں ہر بندے
میں کوئی نہ کوئی ایسی بات ہوتی ہے جسے سن کر حیرانگی
ہوتی ہے۔
وہ بھی کہنا چاہتا تھا کہ اس کا غصہ ساتویں آسمان کو
چھونے لگا تھا۔ ہم اسے اس سے بھی اوپر پہنچانا چاہتے
تھے۔ کیونکہ اس کا جرم بہت بڑا تھا۔
"میں نے اسے تیکھی نظروں سے دیکھتے ہوئے
کہا۔ جب تمہیں اس بات پر غصہ آ جاتا ہے تو تم نے خنجر
کیوں اپنے پاس رکھا ہوا ہے۔
یہ خنجر تو مجھے ویسے ہی پسند آ گیا تھا۔ اس نے بے
خیالی میں خنجر جیب سے نکال کر میرے سامنے رکھ دیا۔
لگتا تھا اس کا دماغ کام کرنا چھوڑ چکا ہے۔ یہ ایک
خوبصورت خنجر تھا۔ اس کا دستہ ہاتھی دانت کا تھا۔
میں نے خنجر اٹھا کر اپنی میز کی دراز میں رکھ لیا۔

"کیا مطلب تھانیدار صاحب! خنجر آپ نے میز کی دراز میں کیوں رکھا ہے؟"

"یہ آلۂ قتل ہے۔" میں نے ذومعنی لہجے میں کہا۔

"میں نے کسی کو قتل نہیں کیا؟"

"زخمی تو کیا ہے اور قتل کی دھمکی بھی دی ہے۔" میں نے خشک لہجے میں کہا۔

وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے میری طرف دیکھنے لگا۔

میں اسے اس نہج پر لے آیا تھا کہ کسی تشدد کے بغیر اس نے سب اگل دینا تھا۔ لوہا گرم تھا میں نے اس پر آخری چوٹ لگاتے ہوئے کہا۔

"جیدی ...کہاں ہے؟"

"وہ ...وہ ...وہ" اس کو چکر آ گیا۔ سپاہی نے اسے پکڑ لیا۔ میرے اشارے پر کرسی پر بٹھایا اور دوڑ کر اس کے لیے پانی لے آیا۔

پانی پی کر وہ ذرا سنبھلا اور پھر اس نے ہمیں سب کچھ بتا دیا۔

کہتے ہیں جب انسان گرتا ہے تو اس کی کوئی حد نہیں ہوتی۔

یہ لالچ، خود غرضی اور بے حسی کی داستان ہے۔ پہلے یہ بتا دوں کہ ہمارا مجرم حنیف تھا۔ جی ہاں، حفیظ کا بھائی۔

اسے سب حالات کا علم تھا۔ اسے یہ بھی پتہ چل چکا تھا کہ اس کی بھابھی کبھی ماں نہیں بن سکتی۔ جیدی اس کی آنکھوں میں کھٹکتا تھا۔ دراصل وہ تمام جائیداد پر نظریں جمائے ہوئے تھا۔ اس نے سوچا کہ اگر جیدی کو اغوا کر کے مار دیا جائے تو راستہ صاف ہو سکتا ہے۔ اس کے بعد اس کا ارادہ اپنی بھابی کو بھی مارنے کا تھا۔ ایسے بندوں کی سوچ سطحی ہوتی ہے۔ وہ کوئی جرم کرنے سے پہلے گہرائی میں نہیں سوچتے۔ ان کا ذہن یہ سوچ ہی نہیں سکتا کہ آیا حالات ان کی سوچ کے مطابق ہوں گے بھی کہ نہیں؟

وہ جیدی کا چچا تھا۔ ظاہر ہے جیدی اس سے مانوس تھا۔ بلکہ وہ زیادہ تر اپنے چاچو کے ساتھ ہی رہتا تھا۔ اس لیے اسے اغوا کرنے میں اسے زیادہ پریشانی نہیں ہوئی۔ پریشانی تو اس وقت ہوئی جب دوسرے دن اس نے گھر جانے کی ضد شروع کر دی۔ اس دوران حنیف نے خنجر خرید لیا تھا۔ اس نے خنجر اس کی شہہ رگ پر رکھتے ہوئے کہا۔ چند دن خاموشی سے رہو پھر میں تمہیں لے جاؤں گا۔

سب سے خوش آئند بات یہ تھی کہ جیدی ابھی زندہ تھا۔ اس کی زندگی کے دن ابھی پورے نہیں ہوئے تھے۔ دراصل جس جرائم پیشہ بندے کے گھر جیدی کو رکھا گیا تھا اس نے یہ مشورہ دیا تھا کہ پہلے اغوا برائے تاوان کے سلسلے میں لاکھوں لاکھ تھیا لیے جائیں لیکن ابھی یہ معاملہ زیر غور ہی تھا کہ مجرم ہمارے قابو آ گیا۔

ظاہر ہے ہم نے جیدی کو بازیاب کروانے کے علاوہ حنیف کے ساتھی کو بھی گرفتار کر لیا تھا۔

عارف نے اغوا والے دن جیدی کو حنیف کے ساتھ شام ڈھلے شہر سے باہر دیکھ لیا تھا۔ عارف وہاں اپنے ایک قریبی رشتے دار کے جنازے میں شرکت کے لیے گیا تھا۔ لیکن اس کے دل میں یہ خیال نہیں آیا تھا کہ چچا (جب حفیظ نے جیدی کو اپنا بیٹا بنا لیا تھا تو وہ چچا ہی تھا) بھتیجے کو اغوا کی نیت سے لے جا رہا ہے۔

عارف کو ایک دن پہلے ہی پتہ چلا تھا کہ جیدی لاپتہ ہے وہ ابھی حفیظ کو بتانے ہی والا تھا کہ یہ واقعہ ہو گیا اسے یقین ہو گیا تھا کہ حنیف نے ہی جیدی کو غائب کیا ہے اور اس طرح یہ بات حفیظ سے پہلے ہم تک پہنچ گئی اسے کہتے ہیں کہ خود اپنے جال میں صیاد آ گیا۔



روحانی علاج

حافظ شبیر احمد

عقیل خان.... کراچی

جواب: نماز کی پابندی کریں' فجر کی نماز کے بعد ایک تسبیح سورۃ قریش اول وآخر 11/11 مرتبہ درود شریف' کاروبار ٹھیک ہونے کے لیے تصور کاروبار کا رکھ کے پڑھیں۔ عشاء کی نماز کے بعد 41/41 مرتبہ سورۃ الفلق' سورۃ الناس پڑھ کے اپنے پورے جسم پہ دم کریں' پانی پر بھی۔ وہ پانی پورا دن استعمال کریں اور ایک بوتل پر بھی وہ دکان پر چھڑک دیں' یہ پورا عمل روزانہ کرنا ہے۔ روزانہ استعمال بھی رکھنا ہے اور چھڑکنا بھی ہے' صدقہ بھی دیں۔

صبا خان...... کراچی

جواب: نورین! عشاء کی نماز کے بعد تین مرتبہ سورۃ عبس پڑھیں۔ پڑھتے وقت یہ تصور ہو کہ جو رکاوٹ اور جو بندش ہے رشتہ ہو جانے میں وہ ختم ہو رہی ہے۔ پھر دعا بھی کریں' فجر کی نماز کے بعد سورۃ فرقان آیت نمبر 74,70 مرتبہ پڑھیں (اول وآخر 11/11 مرتبہ درود شریف) اچھا رشتہ نے کی دعا کریں۔

خورشید شریف...... آسٹریلیا

جواب: عشاء کی نماز کے بعد سورۃ قریش 111 مرتبہ (اول وآخر درود شریف 11/11 مرتبہ) دعا کریں کہ اچھی جاب جلدی مل جائے' باقی مسئلہ جاب کے بعد حل کریں گے۔

گلشن بانو' عمرانہ سبحان...... کلا کوٹ بکھر

جواب: بظاہر آپ کی باتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کے شوہر اور دیور پر بندش ہے اولاد کی۔ آپ نے نام مع والدہ کے نہیں بتایا۔

بعد نماز فجر سورۃ آل عمران آیت نمبر 38' 111 مرتبہ اول وآخر 11,11 مرتبہ درود شریف۔ دعا بھی کریں۔

بعد نماز مغرب اور عشاء۔ سورۃ اخلاص' سورۃ فلق' سورۃ الناس 11,11 مرتبہ۔ بندش کے توڑ کے لیے۔ صدقہ بھی دیں۔ یہ وظائف آپ سب نے کرنے ہیں۔

مسرت جبیں...... ضلع ساہیوال

جواب: رشتوں کے لیے: (تمام بہنیں کر سکتی ہیں)۔ بعد نماز فجر سورۃ فرقان آیت نمبر 74' 70 مرتبہ اول وآخر 11,11 مرتبہ درود شریف۔ دعا کریں جہاں بہتر ہو ہیں ہو۔ اللہ تعالیٰ راستا نکال دے گا۔

تو بر مجید بعد نماز عشاء سورۃ قریش پڑھے 11 مرتبہ اول وآخر 11,11 مرتبہ درود شریف۔ دعا کرے اپنے لیے۔ کام بنے۔

مسئلہ نمبر 3: جب گھر میں چیخنے آئے اس پر 3 مرتبہ سورۃ مزمل پڑھ کر دم کریں اول وآخر 3,3 مرتبہ درود شریف۔ لڑائی جھگڑوں کے لیے۔

فرزانہ اشفاق...... بہاولپور

جواب: آپ کو وہ وظائف چھوڑنے نہیں چاہیے تھے۔ بعد نماز فجر سورۃ فرقان آیت نمبر 74' 70 مرتبہ اول وآخر 11,11 مرتبہ درود شریف۔ جلد اور اچھے رشتے کے لیے دعا کریں اور ہر نماز کے بعد بسم اللہ پوری 121 مرتبہ اول وآخر 3,3 مرتبہ درود شریف۔ نیت ہو کہ جو رکاوٹ آرہی ہے وہ ختم ہو جائے رشتے میں۔

یہ وظائف جاری رکھیں جب تک رشتہ نہ ہو میں بھی دعا کروں گا۔

رضوانہ الیاس...... گوجرانوالہ

جواب: بعد نماز مغرب سورۃ فلق' سورۃ الناس 21,21 مرتبہ پڑھ کر اپنے اوپر دم کریں۔

بعد نماز عشاء سورۃ قریش 111 مرتبہ اول وآخر 11,11 مرتبہ درود شریف روزی کے لیے۔ گھر کے تمام افراد کر سکتے ہیں۔

انیلہ ذوالقرنین۔۔۔۔ بحریہ ٹاؤن

جواب:۔ مسئلہ نمبر 3,1۔ "یا ودود" 1000 مرتبہ اول وآخر 11،11 مرتبہ درود شریف۔ وظیفہ بعد نماز فجر یا بعد نماز عشاء کریں۔ پڑھ کر 1 بوتل پانی پر دم کرلیں۔ وہ پانی کھانا پکاتے ہوئے اس میں ڈالیں اور دن میں ایک بار پلا بھی دیں بچوں اور شوہر کو۔ بوتل کا پانی 1 ہفتہ استعمال کریں۔ یہ عمل ہر ہفتہ کرنا ہے۔ لڑائی جھگڑے نہیں ہوں گے آپ دونوں کے درمیان محبت رہے گی۔

مسئلہ نمبر 2:۔ بعد نماز عشاء سورۃ قریش 111 مرتبہ اول وآخر 11،11 مرتبہ درود شریف روزانہ۔ اچھی اور جلد نوکری کے لیے دعا کریں۔

گلتی (لالی)۔۔۔۔ چکوال

جواب:۔ بعد نماز فجر "یا قدوس" 101 مرتبہ اول و آخر 3،3 مرتبہ درود شریف۔ پڑھتے وقت منگنی ذہن میں ہوں اور مقصد بھی۔ دعا بھی کریں ان شاء اللہ جلد چھوٹ جائے گی۔

بعد نماز عشاء سورۃ فاتحہ 41 مرتبہ اول وآخر 11،11 مرتبہ درود شریف۔ پڑھ کر اپنے پورے جسم پر دم کریں صحت کے لیے۔

عنبرین گل۔۔۔۔ مظفر گڑھ

جواب:۔ مسئلہ نمبر 1:۔ سورۃ والضحیٰ 41 مرتبہ۔ اول وآخر 11،11 مرتبہ درود شریف۔ فجر کی سنت اور فرض کے درمیان اور نماز مغرب سے اتنی پہلے کہ وظیفہ مکمل کرکے جب دعا مانگیں تو مغرب کی اذان شروع ہوجائے۔

پڑھتے وقت تصور ہو کہ شوہر اور سسرال والے خوشی سے لپٹتے رہے ہیں۔ دعا بھی کریں۔

مسئلہ نمبر 2:۔ روزگار کے لیے بعد نماز عشاء سورۃ قریش 111 مرتبہ اول وآخر 11،11 مرتبہ درود شریف۔ گھر کے تمام افراد کرسکتے ہیں۔ معاشی حالات کے لیے۔

مسئلہ نمبر 3:۔ بعد نماز فجر سورۃ فرقان آیت نمبر 70'74 مرتبہ اول وآخر 11،11 مرتبہ درود شریف۔ جلد اور اچھے رشتے کے لیے دعا کریں۔

بعد نماز مغرب اور عشاء سورۃ الفلق' سورۃ الناس 11،11 مرتبہ پڑھ کر دم کریں مرکا وٹیں ختم کرنے کے لیے آپ دونوں بہنیں کریں ابو کے لیے دعا کریں۔



http://facebook.com/elajbilquran
www.elajbilquran.com

> **نوٹ**
>
> جن مسائل کے جوابات دیے گئے ہیں وہ صرف انہی لوگوں کے لیے ہیں جنہوں نے سوالات کیے ہیں۔ عام انسان بغیر اجازت ان پر عمل نہ کریں۔ عمل کرنے کی صورت میں ادارہ کسی صورت ذمہ دار نہیں ہوگا۔
>
> ای میل صرف بیرون ملک مقیم افراد کے لیے ہے۔
>
> rohanimasail @ gmail.com

روحانی مسائل کا حل کوپن برائے ستمبر 2014ء

نام........................ والدہ کا نام.................... گھر کا مکمل پتا........................

....

گھر کے کون سے حصے میں رہائش پزیر ہیں...

خوشبوئے سخن

عمیر اسرار

میں منتظر ہوں

نئی روشن صبحوں میں، اپنے سنگی ساتھیوں میں
اب رقصاں ہونٹوں پہ تم
پرروشن ہنسی جب ڈھل جائیں
لرزاں قسمیں پھسل جائیں
سنگی ساتھی بچھڑ جائیں
تو تم نہ گھبرانا

لوٹ آنا

میں منتظر رہوں گی
بہار رتوں میں چاند نگر میں
پرندوں سے آشیاں بنانا
بہار رتیں گزر جائیں جو
خزاں پیڑوں سے لپٹ جائے
پرندے آشیاں چھوڑ جائیں
تو تم نہ گھبرانا

لوٹ آنا

میں منتظر رہوں گی
محبتوں کے ساحل پر ہم سفر بنانا
سیپیاں چننا اور مسکرانا
شوریدہ سر لہروں میں چھٹے ہاتھ ہم سفر کا
تو تم نہ گھبرانا

لوٹ آنا

میں منتظر رہوں گی
ابھی تو خوش ہو سوچ میں مست ہو
لمحہ جو کوئی کرب کا آیا
الم نے جب تمہیں رلا دیا
تو تم نہ گھبرانا

لوٹ آنا

میں منتظر رہوں گی
میں منتظر رہوں گی

ریحانہ سعید.....لاہور

غزل

یہ خوش مزاجی ملی ہے وراثت میں مجھے
دکھوں کے سمندر میں مسکرانا فرض سمجھتا ہوں
کیا جس نے نچھاور ہلکا سا تبسم مجھ پر
تبسم سود کے ساتھ لوٹانا قرض سمجھتا ہوں
خود غرضی دنیا کی بھی نہ کر سکی مجھے بدظن
غرض مند چہروں کو بے غرض سمجھتا ہوں
روشن بے سوچ میری جلائے رکھتا ہوں امیدوں کا چراغ
زرد کہے زمانہ جس شجر کو اسے سرسبز سمجھتا ہوں
توہین ہے ابن آدم کی احساس محبت کا ختم ہو جانا
احترام آدمیت کے داعیوں کو صاحب عقل و خرد سمجھتا ہوں
یہی ہے جرم فاروق میرا کہ جلتا ہے زمانہ جس پہ
درد مند ہوں دردمندوں کا درد سمجھتا ہوں

عمر فاروق ارشد.....فورٹ عباس

غزل

محبت کے تقاضوں کو نبھانا ٹھیک لگتا ہے
غم دل کو چھپا کر مسکرانا ٹھیک لگتا ہے
زمانے کا گلہ کرنا کوئی اچھا نہیں لگتا
جو اچھے لوگ ہیں ان کو زمانہ ٹھیک لگتا ہے
وفا کے تیر اس جانب جفا کے تیر اس جانب
ابھی دیکھیں گے ہم کس کا نشانہ ٹھیک لگتا ہے
حقائق کا جنہیں زہراب پینے کی نہیں عادت
انہیں عشق و محبت کا فسانہ ٹھیک لگتا ہے
کبھی عقل و خرد کی بات پر رونے کو جی چاہتا ہے
کبھی نادانیوں پر کھلکھلانا ٹھیک لگتا ہے
حسیں لگتا ہے مجھ کو اور بھی غصے کی حالت میں
میری باتوں پر اس کا تلملانا ٹھیک لگتا ہے
لگی ہے پاؤں میں مہندی نکل سکتے نہیں گھر سے
مگر ہم سے نہ ملنے کا بہانہ ٹھیک لگتا ہے

ریاض حسین قمر...... منگلا ڈیم

غزل

کیسی یہ تنہائی ہے
تجھ سے جا ٹکرائی ہے
کس کس کو بتلا دوں میں
کتنا وہ ہرجائی ہے
اپنے ہی گھر والوں نے
گھر میں آگ لگائی ہے
بھول گیا تھا جس کو میں
اس نے جان بچائی ہے
جس سے اس کو فیض ملے
بات وہی سمجھائی ہے
مانا اپنا کوئی نہیں
ساتھ اک تنہائی ہے

قدیر رانا۔ راولپنڈی

غزل

کچھ بھی باقی بچا نہیں منانے کو
مہرباں آئے تھے پھر منانے کو
ایک ہی پل میں بدل گیا سب کچھ
جانے اب کیا ہوگیا زمانے کو
جن سے اپنا رشتہ تھا کوئی
آئے تھے وہ بھی ہمدردیاں جتانے کو
تجھ سے کسی نے کہا پلٹ آنے کو
رہ گئیں دل میں پھر یادیں ستانے کو
دل کو جل کے راکھ ہوچکا جاوید
اور کیا رہ گیا ہے جلانے کو

محمد اسلم جاوید...... فیصل آباد

تشویش

رات عجیب سی بات ہوئی
برسوں بعد میں گزری تھی
ان رستوں سے ان گلیوں سے
جن رستوں پہ جن گلیوں سے
جن رستوں پہ جن گلیوں میں
ہم وقت گزارا کرتے تھے
وہ دیس تمہارا اپنا ہے
پر رات عجیب سی بات ہوئی
اس دیس کی سرد فضاؤں نے
مجھے روک لیا اور پوچھا
جو بن تیرے مر جانے کی باتیں کرتا تھا
کہاں ہے وہ اس کے ہوئے کہاں گئے
تم سے بچھڑ کر کیسے زندہ ہے؟

تبسم سکینہ صدف

غزل

قیمتیں ہیں خرید سے باہر
بات گفت و شنید سے باہر
دیکھو مفلس غریب بیٹھا ہے
محفل جشن عید سے باہر
پھر بھی ہوگیا کالا بکرا
دسترس مرید سے باہر
آج جو ہو رہا ہے دنیا میں
نہ تھا ماضی بعید سے باہر
ہو نہ جائیں خلوص و پیار و وفا
میرے دور جدید سے باہر
دے گواہی اگرچہ ہیں منصف
ذرہ دل چشم دید سے باہر
کفر ہے دل کی مایوسی
کچھ نہیں ہے امید سے باہر

تیر رضاوی...... لیاقت آباد



ذوقِ آگہی

عفان احمد

کھڑے ہو کر پانی پینے کے نقصانات

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان کے مطابق پانی پینے کی چھ سنتیں ہیں۔
پانی ہمیشہ بیٹھ کر بسم اللہ پڑھ کر سیدھے ہاتھ سے دیکھ کر تین سانس میں پینا چاہیے۔ پانی پینے کے بعد الحمد للہ کہنا چاہیے اس لیے ہمیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کے مطابق پانی پینا چاہیے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقے کے مطابق پانی نہ پینے کے بہت سے نقصانات ہیں جو درج ذیل ہیں۔

- کھڑے ہو کر پانی پینے والا انسان شیطان کا ساتھی بن جاتا ہے۔
- کھڑے ہو کر پانی پینے سے پیاس نہیں بجھتی۔
- کھڑے ہو کر پانی پینے سے انسان کا پیٹ بڑھتا ہے۔
- کھڑے ہو کر پانی پینے سے مثانہ میں پتھری پیدا ہوتی ہے۔
- کھڑے ہو کر پانی پینے سے شوگر کا مرض لاحق ہو جاتا ہے۔
- کھڑے ہو کر پانی پینے سے انسان کا نظام انہضام خراب ہو جاتا ہے۔
- ان تمام بیماریوں سے بچنے کیلئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقے کے مطابق پانی پینا چاہیے۔

رابعہ ساحر محمد حنیف ۔۔۔ جہانیاں منڈی

حضرت شیخ سعدی رحمہ اللہ تعالیٰ کا واقعہ

میں نے کبھی زمانہ کی گردش کی شکایت نہیں کی زمانہ کے حوادثات سے کبھی منہ نہیں بنایا مگر اس وقت کہ میرے پاؤں میں جوتے نہیں تھے اور خریدنے کے لیے پیسے بھی نہیں تھے۔ اسی حال میں کوفہ کی جامع مسجد آیا رنجیدہ دل میں نے وہاں ایک آدمی کو دیکھا جس کے پاؤں ہی نہیں تھے۔ میں نے حق تعالیٰ کی نعمت (پاؤں ہونے کا) شکر ادا کیا اور جوتے نہ ہونے پر صبر کیا۔
(گلستان ص ۱۱۷)

فائدہ: انسان کو اپنے سے کم درجہ آدمیوں پر نظر رکھنی چاہیے اس لیے کہ ایسا کرنے سے شکر کی توفیق ہوتی ہے۔

محمد عارف اللہ نثار ۔۔۔۔ اوکاڑہ

نہلے پہ دہلا

1۔ آم کے آم اور گٹھلیوں کے دام کیسے وصول ہوتے ہیں؟
☆ جب خوبصورت بیوی کے ساتھ ڈھیر سارا جہیز بھی ہاتھ آئے۔

2۔ بہتی گنگا میں ہاتھ کیسے دھوئے جا سکتے ہیں؟
☆ جب سربراہ کسی منچلے کو جوتے پڑ رہے ہوں تو آپ بھی اپنا حصہ ڈال لیجیے۔

3۔ آج کل لوگ وعدہ وفا کیوں نہیں کرتے؟
☆ ٹائم کی پرابلم کی وجہ سے۔

4۔ اگر کوئی کریم واقعی رنگ گورا کر دے تو؟
☆ سمجھ لیجیے کہ یہ کریم جعلی ہے۔

5۔ اصل پھول اور مصنوعی پھول میں کیا فرق ہے؟
☆ صرف کانٹوں کا

6۔ آج کل بھولا بادشاہ کسے کہتے ہیں؟
☆ جو صرف مطلب کی بات سمجھے۔ کیا سمجھے۔

ریاض بٹ ۔۔۔ حسن ابدال

قیمتی موتی

☆ اگر آنکھیں راستوں کے مناظر میں نہ الجھیں تو منزل پر پہنچ کر تھکی ہوئی نہیں ہوتیں۔
☆ کسی انسان کو دکھ دینا اتنا آسان ہے جتنا سمندر میں پتھر پھینکنا مگر یہ کوئی نہیں جانتا کہ وہ پتھر کتنی گہرائی میں گیا ہو گا۔
☆ کسی بھی چیز کو باہر ڈھونڈنے سے بہتر ہوتا ہے کہ

بندہ پہلے اپنے اندر کی تلاشی لے جو باہر نہیں مل رہا وہ اپنے اندر ضرور مل جاتا ہے۔
٭ ہمارے دلوں میں اتنی تھوڑی جگہ کیوں ہے کہ ہم تمام رشتوں سے ایک جیسی محبت نہیں کرتے۔
شاہد حسن ...... اوکاڑہ

کمرشل بریک

پولیس ...... یہ پیٹ سانٹے اور
چور ...... حفاظی کرے ذوالحبت کے
ڈاکو ...... سر اٹھا کے جیو
محکمہ صحت ...... خالص ہی سب کچھ ہے
ڈاکٹر ...... شاید زندگی شاید موت
صدر ...... جیسے چاہو جیو
اینٹی کرپشن ...... یہی تو ہے دو غلا پن
اسمبلی ...... چھوڑو کر ما کری رہو کول یار
سیاستدان ...... روپیہ کھایا پیا ہضم کیا
راشی افسر ...... کھاؤں گا نہیں تو بڑا کیسے ہوں گا
صحافی ...... نام ہی کافی ہے
جواری ...... یہی تو زندگی ہے
شوہر ...... پیالی سے طبیعت صاف چہرہ شاداب
صدف مختار ...... بوسال سرور

جھوٹ کی سزائیں

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا " جب آدمی جھوٹ بولتا ہے تو (رحمت) کے فرشتے اس سے ایک میل دور ہو جاتے ہیں اس بدبو کے باعث جو جھوٹ بولنے سے پیدا ہوتی ہے (جامع ترمذی)۔
● جھوٹ بولنے والے کا دل سیاہ ہو جاتا ہے اور وہ اللہ کے نزدیک جھوٹا لکھا جاتا ہے (موطا امام مالک)۔
● رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "اس شخص کے لیے ویل (یعنی جہنم) ہے جو لوگوں کو ہنسانے کی خاطر جھوٹی باتیں سناتا ہے اس کے لیے ویل ہے۔"
(ابوداؤد ترمذی)
● نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جھوٹی گواہی کو بڑے گناہوں میں شمار کیا ہے (بخاری و مسلم)۔
نور الدین ...... آگرہ

ماضی، حال، مستقبل

جو وقت چلا جاتا ہے ماضی اسے ہم واپس نہیں لا سکتے اور آنے والے وقت مستقبل کو روک نہیں سکتے لیکن ان دونوں کے درمیان میں جو وقت آتا ہے حال ہے۔ اس میں ہم کچھ ایسا کر سکتے ہیں جس سے ماضی میں کی گئی غلطیاں چھپ جائیں اور ہمارا مستقبل سنور جائے۔
انعمٰی انور ...... سجاول

انمول موتی

٭ مومن وہ ہے جو خوشحالی میں شکر اور مصیبت پر صبر کرتا ہو۔
٭ کسی تصویر کے اتنا قریب مت جاؤ کہ وہ دھندلی نظر آئے۔
٭ حسن شکر میں لپٹی زہریلی گولی ہے۔
٭ جب آپ ناکام ہو جائیں تو ناکامی سے ملنے والا سبق اٹھا لیں۔
راشدہ امین ...... کوٹ ادو

خواہش

زندگی میں انسان کسی چیز کی دل سے خواہش کر سکتا ہے لیکن اسے حاصل نہیں کر سکتا۔ کچھ خواہشات حسرت میں تبدیل ہو کر رہ جاتی ہیں اور یہ حسرتیں ایک گہرا زخم بنا جاتی ہیں اور زندگی میں دو باتیں بڑی تکلیف دہ ہوتی ہیں ایک جس کی خواہش ہو اس کا نہ ملنا اور دوسری جس کی خواہش نہ ہو اس کا مل جانا۔
کاش ......
خواہشات جو ہم نہیں ہمارا دل کرتا ہے وہ پوری ہو سکتی ...... !
احمد عباس ...... کوٹ ادو



ابن صفی کا تخلیقی و ادبی رجحان

محمد عارف اقبال



غالباً یہ مارچ یا اپریل 1958 کی بات ہے جب "نئے افق" کراچی کے ایڈیٹر جناب مشتاق احمد قریشی اردو کالج، کراچی کے آفس میں بابائے اردو مولوی عبدالحق صاحب سے ملے اور ابن صفی کے بارے میں ایک مشہور و معروف ادیب کی شکایت کی تو مولوی عبدالحق مرحوم نے مشتاق احمد قریشی سے برملا فرمایا تھا:

"اردو پر ابن صفی کا بڑا احسان ہے۔"

ابن صفی مرحوم (پ: اپریل 1928ء۔ و: 26 جولائی 1980ء) کے چہیتے شاگرد مشتاق احمد قریشی لکھتے ہیں:

"ابن صفی کے ساتھ ساتھ اسرار احمد ناروی بھی آخری وقت تک زندہ رہا۔ یہ دونوں شخصیتیں ایک ہی ذات میں جمع تھیں اور ان میں کوئی آویزش نہ تھی۔ اسرار احمد ناروی داغ کے جانشین اور زبان و بیان کے استاد حضرت نوح ناروی کے بھتیجے تھے۔ زبان و بیان کے نکات انہیں ورثہ کے طور پر ملے۔ جذبات و افکار ان کے اپنے تھے۔"

اردو دنیا کے معروف فکشن رائٹر ایم اے راحت اپنے محبوب اور محسن ادیب ابن صفی کے بارے میں کیا لکھتے ہیں، ذرا ملاحظہ کیجیے:

"سینتالیس سال سے قلم کو زندگی کا سہارا بنا رکھا ہے۔ تھوڑا سا لفظوں کا کھیل آ گیا ہے لیکن جس ہستی کے بارے میں کچھ کہنا ہے اس کے لیے الفاظ کی

بازیگری ممکن نہیں۔ سونوکِ قلم کو سادگی کی سیاہی میں ڈبو کر سچ لکھنا زیادہ بہتر تھا۔ میرا تعلق ہندوستان کے شہر علی گڑھ سے ہے۔ تفصیل میں نہیں جاؤں گا۔ چھوٹی عمر تھی۔ بچوں کی کہانیاں پڑھتا تھا۔ ایک لائبریری سے رابطہ تھا، اس دن کوئی کہانی نہ ملی تو لائبریرین نے ایک کتاب دے کر کہا اسے پڑھو۔ اس کتاب کا نام 'پتھر کی چیخ' تھا۔ یہاں سے ابن صفی سے عشق ہوا اور یہ عشق اس منزل تک لے آیا کہ خود تحریر نگار بن گیا۔ بصد خلوص یہ اعتراف کر رہا ہوں کہ انہیں پڑھ کر میں نے پڑھنا سیکھا۔ لکھنا تو بہت بعد کی بات ہے، اور میں ہی نہیں، آج ایسے بے شمار لکھنے والے ہیں جو محترم ابن صفی کے بتائے راستے پر چل کر خود کو ادیب کہلوا رہے ہیں۔ جن میں نمیں بھی شامل ہوں۔" (خصوصی تحریر ۲۰۱۲)

جاسوسی ادب کے حوالے سے اردو دنیا کے عظیم ادیب اور ناول نگار ابن صفی کی ادبی خدمات کا اعتراف اردو کے چند ادیبوں اور نقادوں نے بھلے ہی نہ کیا ہو لیکن ایک دنیا جانتی ہے کہ ابن صفی کا قد اردو ادب میں نہ صرف بلند تھا بلکہ منفرد اسلوب و ناول نگاری میں وہ اپنے فن کے موجد بھی تھے اور خاتم بھی۔ ان کا تخیلی اندازہ ان کے 250 سے زائد شاہکار ناولوں کے مطالعے سے ہوتا ہے۔ ان ناولوں کے حوالے سے ماہر اقبالیات اور تاریخ داں خرم علی شفیق کی دو کتابیں "سائیکو مینشن" اور "رانا پیلس" شائع ہو چکی ہیں۔ خرم علی شفیق نے ابن صفی کی یافت علامہ اقبال کے "مرد بزرگ" میں کی ہے۔ علامہ اقبال کے الفاظ میں:

اس کا انداز نظر اپنے
زمانے سے جدا
اس کے احوال سے
محرم نہیں پیران طریق

ابن صفی جاسوسی ناولوں کی طرف کیوں آئے اس کا پس منظر انہوں نے اپنے ایک مضمون "بقلم خود" میں بیان کر دیا ہے۔ انہوں نے کلاسیکی اور تخلیقی ادب کا وسیع و عمیق مطالعہ کیا تھا۔ ابتدا ہی سے شاعری، انشا پردازی اور افسانہ نگاری ان کا خاص میدان رہا۔ جاسوسی ادب تخلیق کرنے سے قبل ان کی 100 سے زائد تخلیقات ماہنامہ نکہت، الہ آباد اور دیگر رسائل میں شائع ہوتی رہیں۔ افسوس کہ ان تخلیقات کا بیشتر حصہ ضائع ہو چکا ہے۔ افسانہ نگاری اس وقت شروع کی تھی جبکہ وہ ساتویں کلاس کے طالب علم تھے۔ اس زمانے کے معروف ادیب اور ہفت روزہ شاہد کے مدیر عادل رشید نے انہیں "مصور جذبات" کا خطاب دیا تھا۔ اسرار ناروی کی شاعری پر ان کے ایونگ کرسچن کالج، الہ آباد کے دو اساتذہ پروفیسر انوار الحق (صدر شعبہ اردو) اور انگریزی کے استاد مسٹر بلنس نے غیر معمولی تبصرہ کیا تھا۔ انگریزوں کی غلامی سے آزادی کی جدوجہد کے دوران میں ہی اسرار احمد ناروی نے اپنے زمانہ طالب علمی میں شاعری کی ابتدا کی۔ جب انہوں نے اپنی نظم "آخری التجا" کالج کے ایک مشاعرے میں سنائی تو تہلکہ مچ گیا تھا۔ 1948 میں ان کا پہلا انشائیہ "فرار" قلمی نام طغرل فرغان سے ماہنامہ نکہت الہ آباد میں شائع ہوا تو ان کے قلم کی قدر و قیمت کا اندازہ اس وقت کے "جوہریوں" کو بخوبی ہو گیا تھا۔

ان کے قلم میں ادبی روایت سے انحراف اور ادب میں احتجاج کا انوکھا انداز محسوس کیا گیا۔ الہ آباد یونیورسٹی سے وابستہ ان کے ایک استاد ڈاکٹر سید اعجاز حسین نے اپنے ہونہار شاگردوں کے تذکرے پر مشتمل اپنی کتاب "ملک ادب کے شہزادے" میں ابن صفی (اسرار ناروی) کا تذکرہ ایک شاعر کی حیثیت سے کیا اور مستقبل کے لیے بہت سی امیدیں باندھیں۔ اسرار ناروی کی نظم "بشریٰ کی آواز" سن کر ان کے انگریزی کے استاد مسٹر بلنس (Mr.

Higgins نے جو اردو شاعری سے گہری دلچسپی رکھتے تھے، کہا تھا "فراق صاحب کی رباعیات اور بنسری کی آواز کے علاوہ مجھے تو اور سب کچھ Echo of Poetry (شاعری کی بازگشت) معلوم ہو رہا تھا۔" واضح ہو کہ اس وقت ابن صفی الہ آباد کے کرسچن کالج، الہ آباد میں سیکنڈ ایئر کے طالب اور "بزم ادب" کے صدر بھی تھے۔ اسی سال سالانہ مشاعرے میں ابن صفی نے اپنی نظم "بنسری کی آواز" پڑھی تھی۔

جاسوسی ادب کے آغاز (مارچ 1952) سے قبل ابن صفی کی شعری تخلیقات کے ساتھ نثری ادب میں جو معرکۃ آرا تخلیقات منصۂ شہود پر آئیں ان میں 'میں افسانہ کیوں کر لکھتا ہوں؟'، 'آبِ حیات' کی پیروڈی، 'آبِ وفات'، 'قاضی عبدالغفار کی مجنوں کی ڈائری' کی پیروڈی، 'دیوانے کی ڈائری'، 'چاپلوسی'، 'ایک ادبی نشست'، 'اب کدھر جاؤں' وغیرہ خاص طور سے قابلِ توجہ ہیں۔ ابن صفی کے تخلیقی اور ادبی رجحان کی روشنی میں معروف نقاد پروفیسر احتشام حسین (21 اپریل 1912 — یکم دسمبر 1972) کا ایک تنقیدی جائزہ بھی قابلِ توجہ ہے جو 1948 میں "اردو ادب: دوسری جنگِ عظیم کے بعد" کے عنوان سے شائع ہوا تھا۔ ایک اقتباس ملاحظہ کیجیے:

"...ادب کا اصل موضوع انسان اور اس کی بدلتی ہوئی حالت ہے... گو روایتی انداز اور نقالی کے سہارے جینے والا ادب بدلتی ہوئی زندگی سے ہم آغوش نہیں ہوتا لیکن باشعور ادیبوں میں سے اکثر سماجی حقائق ہی کو اپنے افسانوں، شعروں، ڈراموں اور ناولوں میں تخیلی اور جذباتی پیکر دیتے ہیں۔ اس لیے اردو ادب کے مطالعہ میں جنگ کے خاتمہ کو کسی میکانکی نظر سے دیکھنا صحیح نہ ہوگا بلکہ یہ دیکھنا ہوگا کہ جنگ کے زمانے اور جنگ کے بعد ہندوستان اور اس کے سیاسی و سماجی مسائل میں کیا خاص فرق پیدا ہوئے اور اردو کے ادیبوں کے یہاں ان کا اظہار کس حد تک ہوا ہے۔"

پروفیسر سید احتشام حسین کے اس تنقیدی جائزے کی روشنی میں ابن صفی کے ادبی نصب العین پر نگاہ مرکوز کی جائے تو واضح طور پر محسوس ہوتا ہے کہ دوسری جنگ عظیم کے بعد ادب کے بدلتے ہوئے منظر نامہ میں انہوں نے اپنی انفرادیت برقرار رکھی۔ ان کی تخلیقی سوچ ہمیشہ منفرد اور عام ڈگر سے ہٹ کر ہوتی تھی۔ سماج اور تاریخ پر ان کی نہ صرف گہری نظر تھی بلکہ ان کی شخصیت فکری بصیرت سے مالا مال تھی۔ ان کا ایک افسانہ "جنس کی ناک" ملاحظہ کیجیے۔ اس کے مطالعہ سے بخوبی اندازہ ہوگا کہ ابن صفی کا ذہن کس قدر باریک بینی سے ہر مسئلہ کی تہہ تک پہنچنے کا عادی تھا۔ "آبِ وفات" پیروڈی 1952 سے قبل لکھی گئی تھی۔ ڈاکٹر سید اعجاز حسین کی کتاب "اردو ادب: آزادی کے بعد" شائع ہوئی تو اس میں اس پیروڈی کا حوالہ دیتے ہوئے اسے نقل بھی کیا گیا تھا۔ معروف نقاد پروفیسر سید احتشام حسین نے دوسری جنگ عظیم کے بعد ہندوستان کی آزادی کے بعد کے اثرات پر جو تبصرہ کیا ہے، چند جملے ملاحظہ کیجیے:

"...۱۵/ اگست تاریخ ہند کا سنہرا ورق بن گیا۔ اردو کے بہت سے ادیبوں نے جشنِ آزادی میں شرکت کی اور بہت سے مبہوت ہو کر رہ گئے کیوں کہ اس آبِ حیات میں زہرِ آب کی موج بھی شامل تھی۔ جس طرح جنگ ختم ہوئی تھی مگر انسانیت غیر معمولی کرب میں مبتلا تھی اسی طرح آزادی ملی تھی لیکن آزادی کا پرچم خون میں ڈوبا ہوا تھا..."

اس پس منظر میں ابن صفی یا طغرل فرغان کے محسوسات بھی کم کربناک نہ تھے۔ چنانچہ انہوں نے اپنے مضمون "میں نے لکھنا کیسے شروع کیا؟" میں اپنے احساسات اور آئندہ کے عزائم کا اس طرح اظہار کیا:

”بہت ہی بھیانک قسم کے ذہنی ادوار سے گزرتا ہوا یہاں تک پہنچا ہوں، ورنہ میں نے بھی آفاقیت کے گیت گائے ہیں۔ عالمی بھائی چارے کی باتیں کی ہیں۔ لیکن ۱۹۴۷ء میں جو کچھ ہوا، اس نے میری پوری شخصیت کو تہہ و بالا کر کے رکھ دیا۔ سڑکوں پر خون بہہ رہا تھا اور عالمی بھائی چارے کی باتیں کرنے والے سوکھے سہمے اپنی پناہ گاہوں میں دبکے ہوئے تھے۔ ہنگامہ فرو ہوتے ہی پھر پناہ گاہوں سے باہر آگئے اور چیخنا شروع کر دیا ”یہ نہ ہونا چاہیے تھا۔ یہ بہت برا ہوا“ لیکن ہوا کیوں؟... تم تو بہت پہلے سے یہی چیختے رہے تھے۔ تمہارے گیت ویدانتی کے اس طوفان کو کیوں نہ روک سکے۔“

ابن صفی نے اپنے اس مضمون میں 1947 کے کربناک حقائق اور اس وقت کے حالات کے تجزیے سے جس نتیجے پر پہنچے اور ادب میں جس منفرد اسلوب کی بنیاد ڈالنے کا عزم کیا، اس کا اظہار آگے کچھ اس طرح کیا:

”میں سوچتا... سوچتا رہا۔ آخر کار اس نتیجے پر پہنچا کہ آدمی میں جب تک قانون کے احترام کا سلیقہ نہیں پیدا ہوگا یہی سب کچھ ہوتا رہے گا۔ یہ میرا مشن ہے کہ آدمی قانون کا احترام کرنا سیکھے اور جاسوسی ناول کی راہ میں نے اسی لیے منتخب کی تھی۔ تھکے ہارے ذہنوں کے لیے تفریح بھی مہیا کرتا ہوں اور انہیں قانون کا احترام کرنا بھی سکھاتا ہوں۔ فریدی میرا آئیڈیل ہے جو خود بھی قانون کا احترام کرتا ہے اور دوسروں سے بھی قانون کا احترام کرانے کے لیے اپنی زندگی تک داؤ پر لگا دیتا ہے۔“

ابن صفی نے اس مضمون میں اپنے ادبی مشن اور نصب العین کی طرف واضح طور پر اشارہ کیا ہے۔ مقام حیرت ہے کہ اردو کے چند ادیب اور نقاد آج بھی اپنی عدم واقفیت کے سبب ابن صفی کے ادبی مشن کو محض تفریح قرار دیتے ہیں۔ ان کے اس ادبی رویے پر افسوس تو ہوتا ہی ہے ساتھ ہی اس سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ اردو ادب میں نقادوں کی ذہنی پس ماندگی اور ان کے متضاد رویے نے آزادی کے بعد ادب کے ارتقا اور نشوونما کو ناقابل تلافی نقصان سے دوچار کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اردو دنیا میں ابن صفی کے نقال تو کھمبیوں کی طرح پیدا ہوئے لیکن اور بھی مقبول تخلیق کاروں میں کوئی بھی نظر نہیں آتا۔ اس کے برعکس ایسے ادیبوں اور شاعروں کی بھیڑ ضرور دکھائی دیتی ہے جو ایڑی اٹھا کر اپنا قد اونچا کرنے کی کوشش کرتے رہے ہیں۔ انہیں ذاتی طور پر انعامات و اعزازات بھی دیے جاتے رہے ہیں مگر ان کی تخلیقات سے اردو عوام یا اردو ادب کو کوئی فائدہ نہیں پہنچا۔ بعض شعرا، افسانہ نگاروں اور ناول نگاروں کی تخلیقات کو چند ادیبوں اور نقادوں کی جانب سے بظاہر نقد و ادب کی کسوٹی پر پرکھ کر ان کی شان میں قصیدے بھی پڑھے اور لکھے جاتے ہیں۔ اس کے باوجود یہ سوال اپنی جگہ قائم ہے کہ وہ عوام میں کتنے مقبول ہیں اور کتنے فیصد اردو کے قارئین ان کی تخلیقات کو اپنے دل کی آواز سمجھتے ہیں۔ شاید یہی سوال عصر حاضر کے معروف ادیب و نقاد شمس الرحمن فاروقی کے سامنے بھی تھا۔ لہٰذا جب انہوں نے تجزیہ کیا تو وہ بھی اسی نتیجے پر پہنچے۔ موصوف لکھتے ہیں:

”میرا خیال ہے کہ ابن صفی ہمارے زمانے کے مقبول ترین ناول نگار تھے اور ابھی ان کی مقبولیت باقی ہے، چاہے پہلے جیسی نہ ہو۔ جب مجھ جیسے طالب علم کتابوں کی دکانوں کے چکر لگایا کرتے تھے کہ ابن صفی کا ناول سب سے پہلے ہمارے ہاتھ آجائے۔ اردو ہی نہیں، دنیا کے جاسوسی ادب میں ایسا بہت کم ہوا ہے کہ کسی جاسوسی ناول نگار کی موت کے اتنی مدت بعد بھی اس کے ناول پڑھے جاتے رہیں۔ میری نسل (یعنی وہ نسل جو دوسری جنگ عظیم کے فوراً بعد پروان چڑھی) کے سامنے انگریزی کے جو مقبول

ترین جاسوسی ناول نگار تھے، ان میں شاید ہی کوئی ایسا ہو جس کا نام آج لوگوں کو یاد ہو۔ ان کے ناول کا مقبول ہونا تو دور کی بات ہے۔"[9]

شمس الرحمٰن فاروقی نے اردو دنیا میں ابن صفی کی مقبولیت کے بارے میں جو اعتراف کیا ہے اس میں یہ بات بھی داخل ہے کہ وہ خود بھی ابن صفی کے ناولوں کے رسیا رہے اور آج ان کی شخصیت ایک معتبر ادیب و نقاد کی حیثیت سے تسلیم کی جاتی ہے۔

ہندوستان میں ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کی شخصیت اردو زبان و ادب کے حوالے سے ایک معتبر اور مستند دانشور، محقق اور نقاد کی ہے۔ ان کو یہ اعزاز بھی حاصل ہے کہ انہوں نے اردو ادب میں "جاسوسی ادب کے بھتہ" کو تحلیل کرنے کی کوشش کی۔ ساہتیہ اکادمی، نئی دہلی نے مارچ 2007 میں انہی کے ایما پر ابن صفی کے جاسوسی ناولوں کے حوالے سے جرمن اسکالر کرسٹینا اوسٹر ہیلڈ کا لیکچر رکھا تھا۔ اس موقع پر انہوں نے کلیدی خطبہ بھی پیش کیا۔ اپنے خطبہ میں انہوں نے بجا طور سے یہ سوال اٹھایا کہ "...اگر جاسوسی ادب، ادب نہیں ہے تو جاسوسی کے ساتھ لفظ ادب لگاتے کیوں ہیں...؟ پہلے تو یہ ہے کہ ہم خود تضاد بیانی کے شکار ہیں اور پھر ناک بھوں چڑھاتے ہیں اور پھر جب ادبی تاریخیں لکھی جاتی ہیں تو وہ لوگ جنہوں نے کئی نسلوں کی ذہنی آبیاری اور تربیت کی ہے... جنہوں نے ابن صفی کو ناگری میں بھی پڑھا ہے، اگر ایسا ہے تو کیا وجہ ہے کہ ہماری جتنی معاصر تاریخیں ہیں اردو ادب کی، وہ ابن صفی کے contributions اور ان کے ذکر سے خالی ہیں۔"[10]

معروف شاعر سرشار صدیقی (پ: 25 دسمبر 1926) کانپور میں پیدا ہوئے، حلیم ڈگری کالج، کانپور میں تعلیم حاصل کی اور 1950 میں تنہا پاکستان چلے گئے۔ ان کی پہلی غزل 1944 میں علامہ نیاز نے نگار میں چھاپی تھی۔ ان کے پانچ شعری مجموعے منظر عام پر آچکے ہیں۔ اسی کے ساتھ ہی ان کے "ادبی تبصروں کا مجموعہ" شائع ہوا اور "زخم گل" کے نام سے ان کا ایک منظوم ڈرامہ بھی منظر عام پر آچکا ہے۔ سرشار صدیقی نے جب ابن صفی کی "بازیافت" کی تو 1972 میں ایک فکر انگیز مضمون تحریر کیا۔ مضمون کے آخر میں انہوں نے لکھا کہ "...ابن صفی کا لاشعور جس میں اب بھی اسرار ناروی پوشیدہ ہے، اس راہ پر جانے کے لیے سوچ رہا ہے جہاں وہ اپنے اس ظاہری وجود کی اہمیت کے ساتھ ساتھ جس کا نام ابن صفی ہے، اپنے باطنی وجود کی تشکیل نو کر سکے جسے اسرار ناروی کے نام سے ظاہر ہونا ہے — اپنی فکری دنیا کے صحیح موعود کی طرح۔"

اپنے اسی مضمون میں سرشار صدیقی نے ابن صفی کی ادبی خدمات کو سکہ بند اردو ادیبوں اور نقادوں کی جانب سے نظر انداز کیے جانے کے اسباب پر اس طرح اظہار خیال کیا ہے:

"نقادوں کا ایک اور طبقہ ہے جو شدید احتیاط پسندی کا مریض ہے۔ جب تک کسی اہل قلم پر چند بے باک نقاد کھل کر اظہار خیال نہیں کر لیتے، اس وقت تک یہ احتیاط پسند نقاد اس اہل قلم پر اپنی رائے دینے سے بھی کتراتے ہیں۔ یہ لوگ ادب میں احساس کمتری کی بدترین مثالیں ہیں اور اُن نقادوں سے بھی فروتر ہیں جو اپنی حاجت روائی کے لیے اپنے نظریاتی حریف کا قصیدہ لکھنے سے بھی دریغ نہیں کرتے۔"[11]

دبستان لکھنؤ کے نمائندہ شاعر لکھنوی (16 نومبر 1917 — 23 ستمبر 1989) نے 1946 میں کانپور کے ایک بڑے مشاعرے میں شرکت کی اور وہیں سے مشہور ہوئے۔ شاعر لکھنوی 1948 میں پاکستان چلے گئے اور ریڈیو پاکستان سے منسلک ہوئے۔ ان کی تصانیف میں "زخم ہنر" بھی شامل ہے۔[12]

شاعر لکھنوی نے ابن صفی میں اسرار احمد ناروی کا

مطالعہ بڑی گہرائی سے کیا ہے۔ 1972 میں ابن صفی کی ادبی اور شعری خدمات پر ایک فکر انگیز مضمون تحریر کیا تھا۔ ایک اقتباس ملاحظہ کیجیے:

"...ان کی شاعری پردہ نشین کی زندگی بسر کر رہی ہے۔ یہ پردہ نشینی کسی عیب یا کجی کی بنا پر نہیں بلکہ تخلیط ارباب نظر کی بنیاد پر اختیار کی گئی ہے۔ ورنہ ان کی نظموں اور غزلوں میں تازگی و تازہ کاری کی جو فضا، سمت و منزل کی جو پہچان، الفاظ و معنی کی جو ہم آہنگی، اظہار و بیان کی جو رنگا رنگی اور قدیم و جدید کی جو دھوپ چھاؤں موجود ہے وہ ظلمتوں سے کہیں زیادہ گھٹاؤں میں اپنے چراغ روشن رکھنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔"

ابن صفی کا شمار ان کمیاب شہرہ آفاق ادیبوں، شاعروں، ناول نگاروں اور انشا پردازوں میں ہوتا ہے جن کی مثال تقریب فہم کے لیے مرزا غالب، علامہ اقبال یا پریم چند اور سعادت حسن منٹو سے بھی دی جا سکتی ہے کیوں کہ ان کی تحریروں کو سرحدوں میں قید نہیں کیا جا سکتا ہے اور جن پر پوری ادبی دنیا کا حق ہے۔ ان کی تخلیقات کو ہر اردو داں تک پہنچانا ہماری ادبی ذمہ داری ہی نہیں بلکہ اس سبب اردو زبان کی توسیع و اشاعت کا اہم فریضہ بھی ادا ہوتا ہے۔

حواشی و حوالہ جات

1. علامہ نیاز فتح پوری (1884—24 مئی 1966، کراچی) ماہنامہ "نگار" کے مدیر تھے۔ ابن صفی پر تیکھا وار کرتے تھے۔ نیاز کے ادبی رویے نے بہتوں کو پریشان کیا تھا۔ منشی پریم چند نے نیاز پر ایک سخت مضمون بھی قلم بند کیا تھا جو "زمانہ" میں شائع ہوا۔ یہ مضمون ندیم صدیقی صاحب نے حال ہی میں "اردو میں فرعونیت" کے عنوان سے روزنامہ اردو ٹائمز، ممبئی (۲ ،اپریل ۲۰۱۰) میں شائع کیا ہے۔
2. ابن صفی کون؟ مؤلف: عثمان احمد قریشی، کراچی، صفحہ 57
3. حضرت نوح ناروی (18 ستمبر 1878 — 10 اکتوبر 1962)۔ استاد ذوق کے قریبی شاگرد۔ تحت اللفظ پڑھتے تھے اور ہر روز ایک غزل کہنا ان کا معمول تھا۔ تین دیوان۔ سفینۂ نوح، طوفان نوح، اعجاز نوح منظر عام پر آئے۔
4. یادش بخیر ابن صفی، مؤلف: مشتاق احمد قریشی، مارچ 2013 کراچی، صفحہ 192
5. یادش بخیر ابن صفی، صفحہ 321
6. ابن صفی: مشن اور ادبی کارنامہ، مرتب و مؤلف: محمد عارف اقبال، جون 2013، صفحہ 13 تا 23، ابن صفی کا ادبی نصب العین۔
7. روایت اور بغاوت، سید احتشام حسین (تحریر 1948)، مطبوعہ 2005، صفحہ 115، ناشر: اتر پردیش اردو اکادمی، لکھنؤ۔
8. روایت اور بغاوت، سید احتشام حسین، صفحہ 119
9. ابن صفی: مشن اور ادبی کارنامہ، صفحہ 83
10. ابن صفی: مشن اور ادبی کارنامہ، صفحہ 80
11. ابن صفی: کہتی ہے تجھ کو خلق خدا غائبانہ کیا، مرتب و مؤلف: راشد اشرف، کراچی، مئی 2012، صفحہ 190، 193
12. دبستانوں کا دبستان (جلد اول)، احمد حسین صدیقی، کراچی، صفحہ 232-233
13. ابن صفی: کہتی ہے تجھ کو خلق خدا غائبانہ کیا، راشد اشرف، کراچی، صفحہ 196

ایڈیٹر ہار اردو بک ریویو، نئی دہلی



قسط نمبر 13

جگت سنگھ

شمیم نوید

تاریخ کے صفحات میں محفوظ سرزمین پنجاب کی ایسی دلگداز داستان جو کلاسک داستانوں میں شمار ہوتی ہے ۔۔۔۔ جور و جبر کے خلاف بغاوت کی آتشیں آندھیوں کا احوال' جو حاکمانہ غرور کے کوہساروں کے ساتھ ہوس جاہ و جلال سے ٹکرا جاتی ہیں۔ یہ کہانی ان لوگوں کے لیے بھی افسانہ عبرت ہے' جو آنے والی نسلوں کو انتقام اور دشمنی کے جذبات منتقل کرتے رہتے ہیں اور سیدھے سادھے نوجوان "جگت سنگھ" بن جاتے ہیں اور پھر حالات کسی کے قابو میں نہیں رہتے۔ اس کہانی کا مرکزی کردار "جگت سنگھ" ایک ایسا ڈاکو ہے جس کا نام سن کر بڑے بڑے بہادروں کا پتہ پانی ہو جاتا تھا۔ درحقیقت فطری طور پر امن و آشتی کا علمبردار ہے۔ "جگت سنگھ" کے کردار کا رومانی پہلو' جو شروع سے آخر تک "چندن" اور "ویرو" کی صورت میں اس کہانی میں رچا بسا نظر آتا ہے اس بات کا معتبر ترین گواہ ہے کہ لطیف جذبات رکھنے والا نوجوان جسے دنیا خطرناک ڈاکو کے طور پر جانتی ہے اندر سے کتنا نرم اور محبت کرنے والا ہے۔

"جگت سنگھ" کہاں سے چلا اور کہاں پہنچا' آئیے قارئین یہ جاننے کے لیے ہم بھی زیر نظر کہانی میں "جگت سنگھ" کے ساتھ سادہ سادہ گاؤں کے سرسبز کھلیانوں' اونچے نیچے ٹیلوں اور پرخطر گھاٹیوں کے نشیب و فراز میں سفر کرتے ہیں۔

"ویرو کہاں ہے اس کا تمہیں پتہ معلوم ہے موہن سنگھ!" جگت نے پرجوش آواز میں کہا۔ "ویرو کے باپ نے مجھ سے کہا تھا' تم جانتے ہو۔"

موہن سنگھ سناٹے میں آ گیا۔ اس کا دل لرز رہا تھا مگر اس نے محسوس نہیں ہونے دیا۔ اب اسے جگت سے ڈر لگ رہا تھا کھسکنے کا موقع سوچتے ہوئے بولا۔

"ویرو کے باپ نے کہا؟ سالا جھوٹا...... اس لالچی نے ہی کسی کے ساتھ بیٹی کا سودا کر دیا ہوگا۔"

جگت آگے بڑھا تو موہن سنگھ ہوشیار ہو گیا۔ وہ کھڑکی کی جانب جھپٹا مگر جگت نے لاٹھی آڑے رکھ دی۔ لہٰذا وہ لڑکھڑا کر گرا۔

"فرار ہونے کی کوشش نہ کرنا بڈھے' اگر تم زبان نہیں چلاؤ گے تو میرے ہاتھ چلنے لگیں گے۔"

موہن سنگھ منہ سے جھاگ نکالتا ہوا کھڑا ہو گیا۔ جگت نے اس کے دونوں راستے روک لیے۔ جگت کی ضرب سے بچنے کی خاطر اس نے کھمبے کی آڑ لی۔ جگت کا غضب ناک چہرہ دیکھ کر اس کا دماغ گھوم گیا اور وہ قہقہہ لگا کر ہنسنے لگا۔ جگت کا غصہ اور تیز ہو گیا۔ وہ آگے بڑھا' موہن سنگھ قہقہہ لگاتا ہوا پیچھے ہٹنے لگا۔

"بول...... ویرو کہاں ہے؟" جگت دونوں ہاتھ پھیلا کر گرجا۔ "تمہیں پانچ منٹ کا وقت دیتا ہوں۔ نہیں تو مارے جاؤ گے۔" موہن سنگھ قہقہہ لگا کر ہنسا۔ اس کا بگڑا ہوا چہرہ اور پاگل پن کی ہنسی دیکھ کر جگت جوش غضب سے بھر گیا۔ اس نے دانت پیس لیے اور اس کی کلائی کی نسیں تن گئیں۔ وہ آگے بڑھ رہا تھا' موہن سنگھ پیچھے ہٹتا جا رہا تھا۔

"نہیں نہیں...... تم مجھے نہیں مار سکو گے۔ میں جانتا ہوں ویرو کا کیا ہوا۔" موہن سنگھ زور سے چلایا۔

"پھر بول..... جلدی بول بیوقوف! ورنہ میں تیرا خون پی جاؤں گا۔" جگت کی آنکھوں میں خون کی سرخی تیرنے لگی۔ موہن سنگھ پھر چلایا۔

"میں اکیلا ہی جانتا ہوں اور مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ کہہ دینے کے بعد تم مجھے زندہ نہیں چھوڑو گے۔" وہ ہانپنے لگا۔ "یہی وجہ ہے کہ میں تمہیں نہیں بتاؤں گا۔ تم مجھے مار نہیں سکو گے' نہیں مار سکو گے۔" پاگلوں کی طرح چیختا ہوا وہ دیوار سے ٹک گیا۔ دیوار پر لکڑی کی چار کھونٹیاں تھیں۔ ان میں سے دو کھونٹیوں کے درمیان اس کا سر پھنس گیا۔ جگت کی رگ و پے میں آگ برس رہی تھی۔ اس کے دونوں ہاتھ موہن سنگھ کی گردن پر جم گئے۔ موہن سنگھ نے پیر اٹھایا۔ اس سے پہلے جگت نے اس کے پیٹ میں گھٹنا مارا۔ موہن سنگھ کے منہ سے بدبودار شراب کی کلی نکل گئی۔ جگت کی انگلیاں گردن پر دب گئیں۔

"بول..... جلدی بول دے! ویرو کہاں ہے؟"

موہن سنگھ نے سر ہلانے کی کوشش کی لہٰذا جگت نے اس کا سر دیوار سے ٹکرا دیا۔ "بتا! ویرو کہاں ہے؟"

آہستہ آہستہ جگت کی انگلیاں گردن پر سخت ہونے لگیں۔ پھر دونوں انگوٹھے موہن سنگھ کے حلق کی شاہ رگ پر دب گئے۔ آخری وقت میں کہہ دے گا اس انداز سے پر اس نے انگوٹھوں کا دباؤ بڑھا دیا۔ موہن سنگھ کا منہ پھٹ گیا۔ زبان بل کھانے لگی۔ جگت کا خون تیزی سے گردش کرنے لگا۔ موہن سنگھ نے دونوں کھونٹیاں پکڑنے کے لیے ہاتھ مارے' جگت نے دباؤ اور بڑھایا۔ آنکھیں بند کر کے پیر کے پنجوں کے بل کھڑے رہ کر جگت نے آخری زور آزمایا۔ موہن سنگھ کا پورا جسم اکڑ گیا اور دوسرے لمحے موہن سنگھ کی روح جسم کا ساتھ چھوڑ گئی..... جگت نے آنکھیں کھول کر دیکھا' موہن سنگھ کا بگڑا ہوا چہرہ کھونٹی پر ڈھلک گیا تھا۔ اس کے دونوں ہاتھ دوسری دو کھونٹی پر جم گئے تھے۔ پھیلے ہوئے منہ میں زبان بل کھا گئی تھی۔ دیوار سے لگ کر کھڑی ہوئی موہن سنگھ کی لاش دیکھ کر جگت پیچھے ہٹ گیا پھر اپنے ہاتھوں کی ہتھیلیوں' انگلیوں اور انگوٹھوں کو حیرت سے دیکھنے لگا۔ جیسے خون سے بھر گئے ہوں' اس طرح ہاتھ جھٹک دیے۔ موہن سنگھ کے مردہ چہرے کی جانب نظر ڈالی۔ اسے لگا جیسے ابھی تک وہ قہقہہ مار کر کہہ رہا ہو..... میں اکیلا جانتا ہوں' لہٰذا تم مجھے نہیں مار سکو گے..... اس کے قہقہے اب بھی تو مجھے محسوس ہو رہے تھے جگت الجھن میں پڑ گیا۔

شراب کی نصف بھری ہوئی بوتل پر اس کی توجہ گئی۔ اس نے ہاتھ میں اٹھائی' مگر موہن سنگھ کی شراب کو منہ سے چھونے کے لیے اسے نفرت جاگی۔ دانت پیس کر بوتل کی شراب موہن سنگھ کے چہرے پر انڈیل دی پھر زور سے دیوار پر بوتل پھینک کر لالٹین اٹھائی اور باہر نکل گیا۔

گھوڑی پر سوار ہونے کے بعد اسے پوری طرح ہوش آیا کہ اس کے ہاتھوں ایک قتل ہو چکا ہے۔ اب سوائے ڈاکوگری کے تمام راستے بند ہو چکے ہیں مگر ویرو کی تلاش کا کیا ہوگا؟

اس کا اس کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔



جنون میں آ کر اس نے موہن سنگھ کی گردن دبا کر اسے مار ڈالا۔ مگر اس حرکت سے ویرو کی تلاش کا کام مشکل بن گیا۔ یہ بعد میں جگت کی سمجھ میں آیا۔ ویرو کے متعلق میں اکیلا جانتا ہوں۔ ایسا موہن سنگھ بک رہا تھا' تب کیوں اس نے حلق کا دباؤ کم نہ کیا؟ کیا وہ جان بچانے کے لیے اسے بنا رہا تھا؟ تو پھر اس نے یہ کیوں کہا کہ "جگت! میں کہہ دوں گا تو تم مجھے زندہ

نہیں رہنے دوگے۔" شاید موہن سنگھ نے ویرو سے انتقام لینے کے لیے اس کی درگت بنادی ہوگی۔

غروب ہوتے ہوئے سورج کی سمت گھوڑی دوڑی جارہی تھی پھر بھی شفق اس سے دور ہوتی ہوئی معلوم ہورہی تھی۔ کیا ویرو بھی اس سے اتنی ہی دور نکل گئی ہوگی جہاں وہ کبھی نہیں پہنچ سکے گا؟ اور ممکن ہے وہ پہنچ جائے۔ اس صورت میں ویرو اس سے منہ نہیں پھیرے گی؟ ویرو تو اسے صحیح راستے پر لانا چاہتی تھی مگر وہ مجرم بن گیا۔ کون جانے قسمت اسے کس طرف لے جارہی تھی؟

چھ میل دور پہنچنے کے بعد درمیان میں روپا دریا آتا تھا۔ جگت نے گھوڑی روک دی۔ سورج مغرب میں ڈوب چکا تھا۔ بہتا ہوا پانی دیکھ کر جگت کو پیاس ستانے لگی۔ دریا پار کرکے وہ نیچے اترا' گھوڑی اس نے چرنے کے لیے چھوڑ دی اور خود کنارے پر پانی میں پیر رکھ کر کھڑا ہوگیا۔ ٹھنڈے پانی کے پیروں کو چھونے سے دماغ کو تھوڑی ٹھنڈک ملی اور تازگی محسوس ہونے لگی۔ اب اسے پرسکون انداز میں سوچنا تھا۔ دریا کا پاٹ ختم ہوجانے کے بعد دو راستے نکلتے تھے۔ ایک راستہ نانا کے گاؤں کی جانب جبکہ دوسرا نانک نگری کی جانب جارہا تھا' جہاں بچپن کا ٹھکانہ تھا۔ اسے کہاں جانا چاہیے؟ موہن سنگھ کو قتل کرنے والے ہاتھ کہنی تک اس نے پانی میں دھوئے مگر ہاتھ دھونے سے کیے گئے کرم نہیں دھلتے یہ جانتے ہوئے بھی اسے تھوڑا اطمینان ہوا پھر پانی کے چھینٹوں سے چہرہ بھگویا۔ چہرہ صاف کرتے ہوئے اس کا ہاتھ گردن میں پہنے ہوئے تعویذ پر گیا۔ تب ویرو کی یاد نے اسے بے چین کردیا۔ اس نے پیٹ بھر کر پانی پیا' پھر وہ بہتے ہوئے پانی کو دیکھتا ہوا زندگی کے گزرے ہوئے لمحات کے خیال میں گم ہونے لگا۔

اندھیرا گہرا ہو رہا تھا مگر اسے ہوش نہیں تھا۔ چھوڑی ہوئی گھوڑی دریا کے کنارے زمین پر لوٹ پوٹ کر جسم کی ریت گرا رہی تھی۔ اچانک دوڑتی ہوئی جیپ کے انجن کی آواز پر گھوڑی کے کان کھڑے ہوگئے۔ مگر جگت کے خیالات کا سلسلہ نہیں ٹوٹا۔ جیپ کنارے پر آکر رکی تب اس کے بریک نے جگت کو چونکا دیا۔ گردن گھما کر عقب میں دیکھنے لگا۔ اسی لمحے اس کے چہرے سے ٹارچ کی روشنی ٹکرائی۔ تیز روشنی میں دو آنکھیں ملتا ہوا دیکھنے لگا۔ پھر دو قدم آگے بڑھ کر لاٹھی اٹھانے جھکا' اسی لمحے آواز سنائی دی۔ "کون.... جگا.....؟" آواز جانی پہچانی تھی مگر کس کی تھی؟ یہ جلدی سمجھ میں نہیں آئی۔ دماغ پر چھائے ہوئے خیالات کے ہجوم کو ہٹانے کے لیے اس نے سر کو جھٹکا دیا تب آواز والی شخصیت سامنے آگئی اور جگت چونک گیا.... ارجن سنگھ.... پولیس چیف ارجن سنگھ.... اس کے دماغ کی رگیں تن گئیں۔ خون پوری تیزی سے دوڑنے لگا۔

"ارے! تم اندھیرے میں اکیلے بیٹھے کیا کررہے ہو؟" ارجن سنگھ اس کے چہرے کے تاثرات جانچتا ہوا بولا۔ جگت نے تیزی سے جیپ کی جانب نظر گھمائی۔ دو پولیس والے جیپ سے اتر رہے تھے۔ دو پل کے لیے جگت کا دل جیسے دھڑکنا بھول گیا۔ بیوقوف موہن سنگھ کی گردن دبا کر اندھیرے میں غائب ہونے کی بجائے دریا کنارے بیٹھا رہا.... جگت نے ہونٹ چبا کر اپنے آپ سے کہا۔ شیر ہوکر ارجن سنگھ کے ہاتھ میں خرگوش کی طرح پھنس گیا۔ جگت کانپ گیا۔ لاٹھی اٹھانے کا موقع تھا' مگر اس میں چھپی ہوئی برچھی کا خول اتارنے کا وقت نہیں تھا۔ گھوڑی نظر کے سامنے تھی مگر ارجن سنگھ درمیان میں کھڑا ہوا تھا۔ ختم.... اب ہاتھ اٹھا کر

اپنے آپ کو سپرد کرنے یا فرار کی کوشش کرکے شوٹ ہونے کے علاوہ کوئی چارہ نہیں تھا۔

"کیوں جگا! کیا سوچ رہا ہے؟ پرانا حساب صاف کرنا ہے؟" ارجن سنگھ گھبرائے بغیر بولا۔ جگت نے پھر ہونٹ کاٹے۔ لاٹھی پر گرفت مضبوط کی' دماغ نے ہاتھ کو حکم دیا۔ "وار کر!" اسی لمحے ارجن سنگھ قریب آیا' اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر بولا۔ "ابھی جیل سے رہا ہو کر آ رہے ہو؟ حساب صاف کرنے کی جلدی کیا ہے؟" پھر رک کر بولا۔ "مگر یہاں تو کس کا انتظار کر رہا تھا؟"

جگت کے ذہن میں روشنی ہوگئی۔ ارے احمق موقع سنبھال لے اس شخص کو تمہارے جرم کا ابھی پتہ نہیں ہے دماغ کو قابو کرتے ہوئے دو چار منٹ لگے پھر لبوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

"میں نے سمجھا تمہیں حساب صاف کرنے کی جلدی ہے۔" پھر ارجن سنگھ کے چہرے کے تاثرات پڑھ کر بولا۔ "مجھے ابھی دھرم پور پہنچنے کی جلدی ہے۔ نانا کی طبیعت اچانک بگڑ گئی ہے لہٰذا گھوڑی تیزی سے دوڑاتا ہوا آ رہا تھا۔ جانور کو تھوڑا آرام کرنے کے لیے چھوڑ دیا اور خود یہاں بیٹھ گیا۔" پھر پستول پر جمے ہوئے ارجن سنگھ کے ہاتھ پر نظر کرتے ہوئے اس نے سیٹی بجا کر گھوڑی کو قریب بلایا۔ وہ قریب آئی تو اس کی لگام تھام لی پھر اس کی پشت پر ہاتھ پھیرتا ہوا بولا۔ "دیکھو! جلدی میں اس پر زین رکھنا بھی بھول گیا۔"

اب اس کے اور ارجن سنگھ کے درمیان گھوڑی کی آڑ تھی۔ اب ارجن سنگھ کیا کرتا ہے' اس پر مدار تھا۔ ارجن سنگھ نے تارچ اس کی جانب میں دبائی' گھوڑی سرہلاتی ہوئی پیچھے ہٹ گئی۔ جگت بھی اس کے ساتھ ہی دور ہٹ گیا۔ "ٹھیک ہے..... نانا کو کچھ ہوا اس سے پیشتر ان سے ملاپ کر لے۔ ہم تو جلد یا بدیر پھر ملیں گے۔" آخر الفاظ میں چھپا ہوا اڑنک جگت کو کھٹک گیا مگر اس کے متعلق خیال کیے بغیر اس نے گھوڑی کی پیٹھ پر جست لگائی۔ لگام کھینچنے سے پہلے ایک بار پھر اس نے غور سے ارجن سنگھ کے چہرے کی جانب دیکھا۔ نہیں..... ابھی سوہن سنگھ کے قتل کے متعلق اسے کچھ معلوم نہیں ہے..... اس کو یقین ہو گیا اور اس نے گھوڑی کے پہلو میں ایڑ لگائی' گھوڑی دھرم پور کی راہ پر روانہ ہوگئی۔

آٹھ دس قدم آگے بڑھ کر اس نے چونکنے کے انداز میں سر گھما کر دیکھا' ارجن سنگھ ابھی وہیں کھڑا ہوا تھا۔ لگام کو زور سے جھٹکا دیا اور گھوڑی دوڑنے لگی۔ ایک فرلانگ کا فاصلہ اس نے سانس روک کر طے کیا۔ پیٹھ پر سے پسینے کا ریلا بہنے لگا۔ ارجن سنگھ کے پستول کی گولی ہر وقت اس کی پشت میں سوراخ کر سکتی تھی۔ دریا کو پار کرنے کے بعد اس نے نظر گھما کر دیکھا' ارجن سنگھ جیپ میں بیٹھ رہا تھا۔ اب بھی جگت کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا معجزہ ہوا ہے؟ پہلی بار اسے محسوس ہوا کہ کوئی غیبی طاقت اس کی مدد کر رہی ہے۔ ویرو کے دیئے ہوئے تعویذ کا یہ کارنامہ ہوگا؟ پھر نظر گھما کر دیکھا' پولیس جیپ دریا پار کر کے مخالف سمت میں دوڑ رہی تھی۔ وہ جب تک نظر آتی رہی جگت گھوڑی روک کر کھڑا رہا۔ پھر اطمینان کی سانس لی۔ اس نے نانا کے گھر کا راستہ تو دلاور خان کی توجہ ہٹانے کے لیے پکڑا تھا۔ ارجن سنگھ کو قتل کے متعلق جب پتہ چلے گا' وہ اس کا تعاقب کرے گا اس سے پیشتر اسے فرار ہو جانا چاہیے۔ آج کی رات اس کے لیے امتحان کی رات تھی۔ اس نے گھوڑی لوٹائی اور دوسرے راستے پر نانک نگر کی جانب دوڑا دی۔ ہوا کی طرح دوڑتی ہوئی گھوڑی پر بیٹھے ہوئے جگت کے

ذہن میں پولیس سے نفرت زور کرنے لگی۔ ارجن سنگھ کے الفاظ اس کے کان میں ہتھوڑے کی طرح ضرب لگا رہے تھے۔ "جلد یا بدیر ہماری ملاقات ہوگی۔" جگت نے دانت پیس لیے۔

"اچھا بیٹے۔ ملاقات ہوگی تو چھٹی کا دودھ یاد کرواؤں گا۔"

ارجن سنگھ کو جگت کی حرکت عجیب سی لگی۔ ممکن ہے اپنے نانا کی بیماری کی وجہ سے اتنا گھبرایا ہوا ہو مگر اس نے جگت کو صحیح سلامت واپس کیوں جانے دیا؟ ایک آدھ چانٹا ہی مار دیتا تو ہاتھ کی کھجلی کم ہو جاتی۔ ایسا محسوس کرتا ہوا ارجن سنگھ کافی دیر بعد شیخ پور کے پولیس تھانے پر پہنچ گیا۔ تب موہن سنگھ کے قتل کی خبر نے اس کا استقبال کیا۔

"صاحب اوگڑیا کے ایک شخص کا قتل ہو گیا۔ کسی نے اس کی گردن دبا دی۔" ارجن سنگھ نے کسی قسم کی بے چینی نہیں دکھائی۔ پولیس تھانے میں قتل، چوری اور ڈاکے کے کیس سنا آنا، میں تو تعجب کی بات تھی۔ ارجن سنگھ کرسی پر بیٹھ گیا۔ اس کا ماتحت قتل کی تفصیل بتانے لگا۔ "پرانی دشمنی کا انتقام لیا گیا ہے شاید۔ قاتل فرار ہو گیا۔"

"کسی کو وہاں بھیجا ہے؟" ارجن سنگھ میز پر پڑی ہوئی رپورٹ کو ایک نظر دیکھتا ہوا بولا۔

"ہاں صاحب! دو آدمی بھیجے ہیں۔ مگر صوبیدار صاحب نے آپ کو بلایا ہے۔" ماتحت نے کان کو کھجاتے ہوئے کہا۔ "انہیں جگا پر شک ہے۔"

"جگا......!" نام سن کر ارجن سنگھ کھڑا ہو گیا۔ اس کے پیر میں جھٹکا سا محسوس ہوا۔ "پہلے بھونکنا تھا کہ موہن سنگھ کا قتل ہوا ہے۔" کرسی زور سے ہٹا کر وہ باہر آ گیا۔ ماتحت اس کے پیچھے دوڑا۔

"قتل ہوتے کسی نے دیکھا ہے؟" ارجن سنگھ نے پوچھا۔

"نہیں صاحب! مقتول کی چارپائی گھر دوارے گئی تھی، تب کسی نے مکان میں داخل ہو کر جلدی سے کام ختم کر لیا۔"

"پھر صوبیدار کو جگا پر کیوں شک ہے؟"

"جگا جیسا کوئی شخص گاؤں میں آیا تھا، اس کی خبر ملی۔ پھر اسے گھوڑی پر تیزی سے جاتے ہوئے بھی دو تین آدمیوں نے دیکھا۔" جیپ اسٹارٹ ہو گئی۔ تھوڑا ماتحت نے ڈرائیور سے کہا۔ "اوگڑیا کی جانب چلاؤ۔"

"نہیں...... دھرم پور کی جانب چلو۔" ارجن سنگھ چیخا۔ وہ اپنے آپ کو کوسنے لگا۔ ہاتھ سے کیسے موقع سرک گیا۔ اسے دیکھ کر جگا اسی وجہ سے گھبرا گیا ہوگا۔ میں نے اسے جانے دیا...... اسے اپنے رخسار پر چانٹے مارنے کو جی چاہا مگر دوسروں کی موجودگی حائل تھی۔ ماتحت اپنے چیف کی بے چینی کا اسرار سمجھ نہیں سکا۔ مگر ڈرائیور کے ساتھ والے دونوں پولیس مین سمجھ گئے کہ صاحب سوتے میں بک گئے۔

دھرم پور پہنچنے تک ارجن سنگھ نے بمشکل مایوسی کو دبائے رکھا، مگر جگت کے نانا کی کھڑکی کو تالا لگا دیکھ کر ایسا غصہ آیا کہ دروازے پر زور سے لات ماری۔ "نصیب کو تالا لگ گیا...." وہ بڑبڑایا۔

پڑوسی سے معلوم ہوا۔ "نارائن سنگھ دو دن سے بیٹی کے پاس رتیا میں ہیں۔"

ایک غلیظ گالی اس کی زبان سے نکل گئی۔ "حرام خور کہہ رہا تھا کہ نانا بیمار ہو گئے ہیں۔ پہنچنے کی جلدی ہے۔" بند کھڑکی کی جانب دو چار گالیاں اچھال کر وہ جیپ میں جا بیٹھا۔ "اب رتیا کی جانب چلو۔" ارجن سنگھ کو یقین تھا کہ جگت وہاں نہیں ہوگا مگر بھٹکنے کے علاوہ کیا علاج تھا؟

جگت کی وجہ سے اس کی ملازمت جانے والی

تھی۔ یہ تو اچھا ہوا کہ پولیس کمشنر پرم گرالہ اس کے گلے پر چلتی ہوئی چھری رک گئی۔ چار سال کی سفارش کے بعد بمشکل شیخو پورہ کے پولیس چیف کی جگہ واپس ملی تھی۔ اب اسے اپنا پرانا حساب چکانا تھا۔ بچن کی ٹولی کو پھنسانے کا جال بچھایا ہوا ہے اس میں جگت بھی پھنس جائے تو اس کی کارکردگی کو چار چاند لگ جائیں گے۔ تباہ کیے ہوئے پانچ سال سود سمیت واپس مل جائیں گے۔



"جگت! تم نے ارجن کو خوب چکر دیا۔" بچن اس کی پیٹھ تھپتھپاتا ہوا بولا۔ جگت ہمیشہ کے لیے واپس لوٹا ہے یہ بن کر سب خوش ہو گئے تھے۔

"اب پھر پہلے جیسا کھیل شروع کریں گے۔" ہوشیار نے کہا۔

"سنو ساتھیو!" بچن نے ہاتھ بلند کر کے کہا۔ "ابھی اور اسی وقت سے جگت ہمارا سردار ہے۔" مگر جگت نے سے روک لیا۔ "بچن نہیں! ابھی ایسی کیا جلدی ہے؟ مجھے کچھ کہنا ہے۔" پھر جگت سب کی جانب دیکھتا ہوا بولا۔ "موہن سنگھ کو قتل میں نے پرانی دشمنی کی وجہ سے نہیں کیا۔ اس نے ویرو کے متعلق مجھے بتا دیا ہوتا تو میں شاید اس کی گردن دبانے کے لیے وہاں نہ ٹھہرتا۔ مگر ویرو بھی بسر کرنے کے لیے میں نے ڈاکہ زنی چھوڑی تھی۔ ویرو مل جاتی تو موہن سنگھ زندہ ہے یا مر گیا اس کی مجھے پروا نہیں تھی۔" وہ کچھ دیر رک گیا پھر بولا۔ "ابھی ویرو کی تلاش باقی ہے۔" آخری جملہ نرم لہجے میں کہا۔

"اس میں ہم تمہارے ساتھ ہیں۔" بچن اور ہوشیار نے ایک آواز میں کہا۔

"مگر ہوشیار! تم بھول رہے ہو۔" جگت نے اس کی جانب دیکھ کر کہا۔ "ویرو کی وجہ سے ایک بار ہماری ٹولی میں پھوٹ پڑ گئی...... پھر اس بار......"

"اس کا انجام ہم نے دیکھ لیا۔" ہوشیار نظر اٹھائے بغیر بولا۔ "اسی پھوٹ نے کرپال کی قربانی لی۔ اب ایسی غلطی نہیں ہوگی جگت۔"

"تمہارے دل میں یقین ہو گیا۔" کہتے ہوئے بچن نے بلند آواز میں کہا۔ "پھر آج سے جگت ہمارا سردار...... منظور......"

سب نے منظور کی صدا لگائی۔ مگر یہ آواز یں بلند ہوں اس سے پیشتر ایک آواز آئی۔

"مجھے منظور نہیں۔"

سب ہنومان کی جانب کڑی نظروں سے دیکھنے لگے اب تک وہ خاموش بیٹھا تھا۔

"تمہیں کیا اعتراض ہے ہنومان؟" بچن نے تیکھے لہجے میں کہا۔ "جگت نہیں تھا تب دن رات اس کا نام جپتا تھا اب واپس لوٹا تو نامنظور کہتا ہے؟"

ہنومان نے بچن کو جواب دینا تھا مگر وہ جگت کی جانب دیکھ کر بولا۔ "جگت پر ہمارا اکیلے کا حق نہیں۔ اس کے ماں، باپو، چندن بھابھی، نانا، ان سب کی منظوری ضروری ہے بچن۔" کوئی درمیان میں نہ بولے اس وجہ سے ہاتھ بلند کرتے ہوئے کہا۔ "جگت کو واپس حاصل کرنے کے لیے گھر والوں نے کیا کم دکھ جھیلے ہیں؟ ان کے پاس سے جگت کو چھین لینے میں کون سی بہادری تم سب لوگ کر رہے ہو؟" ہنومان اکھڑائے ہوئے لہجے میں نہ بولتا تو بچن اس کی بات ہنس کر ٹال دیتا۔ ایسی سنجیدہ بات کہنے کی اس کی عادت نہیں تھی۔ جگت کو بھی محسوس ہوا کہ باپ بننے کے بعد اس کا دل نرم ہو گیا ہے۔

"ہنومان! اس میں چھین لینے کی بات کہاں ہے؟ میں نے خود اس سے کہا تھا کہ جوش میں آ کر ہتھیار مت اٹھانا۔ اب قتل کر کے آیا تو گھر جانے کی بات

ہی کہاں رہتی ہے؟"

"موہن سنگھ کو جگت نے قتل کیا ہے اس کا ثبوت کیا ہے؟" ہنومان نے پراسرار انداز میں دلیل دی۔ "اسے کسی نے دیکھا نہیں۔ ہوسکتا ہے قتل کا الزام کسی اور شخص پر آئے۔ تو پھر جگت کو کیوں گھر چھوڑنا چاہیے؟" بچن کے حلق سے یہ بات نہیں اتری۔ وہ جواب دینا چاہتا تھا مگر جگت بول اٹھا۔

"ہنومان! بچن تم لوگ خواہ مخواہ بحث کر رہے ہو۔ موہن سنگھ کو قتل کرنے سے پہلے میں نے ہمیشہ کے لیے گھر چھوڑ دیا ہے۔" سب کے منہ کھل گئے۔ جگت نے یہ بات کیوں چھپائی؟ ہر ایک کی آنکھیں سوال کر رہی تھیں۔ "کیوں گھر چھوڑا جگت؟"

اب بات نکلی لہٰذا کہے بغیر چارہ نہ تھا۔ "ماں نے ویرو کی بات مجھ سے چھپائی یہ جانتے ہی مجھے غصہ آگیا۔ مجھے نہ جانے دینے کے لیے انہوں نے زبردستی کی۔ یہ بھی کہا کہ چوکھٹ پار کر جاؤ پھر گھر واپس نہ لوٹنا۔" جگت رک گیا پھر آہ بھر کر بولا۔ "پھر بھی میں چوکھٹ پار کر کے گھر سے باہر نکل آیا اور کہتا آیا کہ پھر کبھی واپس نہیں آؤں گا۔"

سب سے زیادہ صدمہ ہنومان کو ہوا۔ "تم کیا کر بیٹھے جگت؟ ماں کا دل دکھایا......؟" اس کی آواز میں لرزش تھی۔ "مجھے معلوم ہے کہ اب ممتا کی قیمت سمجھ آئی ہے۔ میں نے بھی بے چاری کا دل دکھایا اور آج میں تڑپ رہا ہوں۔ لاش کی طرح جی رہا ہوں۔" ہنومان کی آنکھوں میں کبھی اتنے آنسو نظر نہیں آئے تھے۔

سب کے درمیان سناٹا مسلط ہوگیا۔ جگت کو بہت بے چینی ہونے لگی گھر کی یاد تازہ ہوگئی۔ اسے روکنے کی کوشش کرتی ہوئی ماں کی غمگین صورت نظر میں گھومنے لگی۔ سسکیاں لیتی ہوئی چندن کا بجھا ہوا چہرہ جیسے اس سے پوچھ رہا تھا "ابھی جی بھر کے ملے بھی نہ تھے اور چھوڑ کر چلے گئے......؟

"بچن! میں پھر ڈاکو بن چکا ہوں۔" جگت نے سب کو چونکا دیا۔ "ڈاکہ ڈالنے کا کوئی نیا ٹھکانہ ہے؟" ہنومان کے علاوہ سب خوش ہوگئے۔ بچن بولا۔

"سب انتظام کرلیا ہے۔ تیسرے دن گوند گڑھ کے زمیندار کی تجوری صاف کرنی ہے۔ بہت دنوں سے لمبا ہاتھ نہیں مارا۔"

"خطرہ کتنا ہے......" جگت اپنے اصلی مزاج میں آگیا۔ "جگہ کے متعلق پہلے سے چیکنگ کر لی ہے؟"

"خطرہ معمولی سا ہے۔ ایک قاتل شخص ہمیں مل گیا ہے۔ وہ زمیندار کا باورچی تھا۔ ملازمت سے نکال دیا لہٰذا انتقام لینے کے لیے تیار ہوگیا۔ زمیندار کی حویلی سے پوری واقفیت رکھتا ہے۔" بچن پر مسرت لہجے میں کہہ رہا تھا۔

"کہاں ہے وہ قاتل شخص......؟"

"ہم نے اسے ڈاکہ ڈالنے والے دن ملنے کو کہا ہے پولیس کو شک نہ ہو جائے اس لیے۔"

"اس کا نام کیا ہے؟"

"قادر میاں۔ ہم نے اس کو چیک کرلیا ہے۔ بہت اچھا نشانہ باز ہے۔ ضرورت پڑنے پر ایک دو کو شوٹ کرنے کی ذمہ داری بھی اپنے سر لی ہے۔"

"بہتر ہے......تیاری کرو!" جگت نے سبز جھنڈی لہرا دی۔

شام سات بجے روانہ ہونا تھا۔ جگت مسرت سے جھوم رہا تھا۔ وہ ڈاکو بن گیا ہے اس بات کا اعلان زمیندار کے اس ڈاکے سے ہونے والا تھا۔ ارجن سنگھ کی نیند حرام کرنے کی یہ اچھی شروعات ہے۔ پانچ سال سے دا-غل چھوٹ گئی تھی اس پر دو دن میں اس کا ہاتھ جما کسے پتہ پہلی گولی کا کون نشانہ بنے گا؟

جگت ہنومان سے باتیں کررہا تھا اسی لیے بچن اور ہوشیار آ گئے۔ "قادر میاں آ گیا ہے جگت! تمہارا نام سن کر خوش ہو گیا۔ کہتا ہے ایسے استاد کا ساتھ ملے پھر دا خات کرنے کی کس کی طاقت ہے۔"

"السلام علیکم!" کہتا ہوا جیم شحیم قادر بادب انداز میں سامنے آ گیا۔

"وعلیکم السلام" کہہ کر جگت غور سے اسے دیکھنے لگا۔ انسان کو سمجھ لینے کی جگت کو قدرتی بخشش تھی۔ بہت دیر تک وہ اسے غور سے دیکھتا رہا۔ اس پر قادر مہندی لگی داڑھی کھجانے لگا۔ اس کے بائیں شانے پر بندوق اور دائیں پہلو میں تلوار لٹک رہی تھی۔ سرخ لنگی، سفید کرتا اور سر پر ترکی ٹوپی اس کے رنگیلے مزاج کی چغلی کھا رہی تھی۔ پان کھانے کی عادت کی وجہ سے اس کے دانت سیاہ پڑ گئے تھے۔ تیز نظروں سے وہ جگت کے دل کا جائزہ لے رہا تھا۔

"سب تیار ہے؟" جگت نے اسے چونکا دیا۔ "پولیس کو اس کی خبر تو نہیں لگے گی؟"

"ارے اس طرف پولیس کا سایہ بھی نہیں آ سکے گا۔" قادر میاں نے دونوں ہاتھ سے تالی بجائی اور جگت کی نظر اس کے بائیں ہاتھ پر جم گئی مگر چہرے سے ظاہر نہیں ہونے دیا۔

"میاں! آپ دائیں ہاتھ سے نشانہ لیتے ہیں یا بائیں ہاتھ سے؟" جیسے اس کے کہنے کا مطلب نہ سمجھا ہو اس طرح قادر الجھن میں پڑ گیا۔ جگت نے صاف بات کی۔ "بایاں انگوٹھا کٹا ہوا ہے اس لیے پوچھا۔"

بچن درمیان میں بولا۔ "ہاں...... یہ کہنا بھول گیا۔ باورچی کی ملازمت کے دوران ایک بار سبزی کاٹتے ہوئے اس کا انگوٹھا کٹ گیا تھا۔ مگر یہ دائیں ہاتھ کا استعمال کرتا ہے لہٰذا اسے تکلیف نہیں ہوتی۔"

جگت کی نظر قادر کے دائیں انگوٹھے کی طرف گئی۔ ناخن پر مہندی لگی ہوئی تھی، کافی دیر تک وہ دیکھتا رہا، تب قادر کا دایاں انگوٹھا کپکپایا۔

"کس سوچ میں ڈوب گئے جگت؟" بچن نے جلدی سے کہا۔ "اب ہماری روانگی کا وقت ہے۔" مگر جگت نے پروا نہیں کی۔ "میاں! سبزی کاٹنے کی چھری بہت تیز تھی؟ انگوٹھا ٹھیک ہو سکے ایسا نہیں لگتا؟"

"اس کی پروا کون کرے......؟" قادر نے بے پروائی سے کہا۔ "میں نے کٹا ہوا انگوٹھا کھڑکی سے باہر پھینک دیا۔" جگت کی پیشانی پر لکیریں تن گئیں۔ اس نے چوغے کی جیب میں ہاتھ ڈالا، ڈبیہ نکالی تیزی سے کھول کر اندر سے انگوٹھے کا ناخن نکال کر قادر کے سامنے کر دیا۔

"یہ ناخن دیکھو...... شاید تمہارا ہے۔" دانت پیس کر جگت بولا۔ "چار سال سے میری بیوی نے سنبھال کر رکھا ہے۔"

بچن، ہنومان یا ہوشیار کچھ سمجھ نہیں سکے ایسے وقت میں جگت بے مطلب کی بات کیوں کر رہا تھا؟ مگر قادر دو قدم پیچھے ہٹ گیا۔ جگت کے جبڑے تن گئے۔ "کیوں! پہچان گئے قادر؟"

جواب میں قادر کا دایاں ہاتھ تلوار کے ہتھے پر گیا، پلک جھپکتے میں میان سے تلوار نکال کر جگت پر جھپٹا۔ ہنومان اسی تیزی سے ہوشیار ہو گیا اس نے لکڑی کی گھوڑی بلند کر کے درمیان میں رکھی جس سے قادر کی تلوار ٹکرائی اور دور جا گری۔ قادر کو پل بھر کے لیے رائفل استعمال کرنے کی خواہش ہوئی مگر ہوشیار اور بچن دونوں اس کی جانب جھپٹے۔ وہ جست لگا کر کمرے سے باہر جانے لگا، مگر چوکھٹ تک پہنچا تھا کہ بچن نے رائفل کی لبلبی دبا دی۔ گولی

پسلی توڑتی ہوئی باہر نکل گئی۔ "آہ" کہتا ہوا تین چار قلابازیاں کھاتا ہوا قادر دور جا گرا۔ جگت، بچن اور ہوشیار وہاں دوڑ گئے۔

ڈلتے پڑے ہوئے قادر کو جگت نے ٹھوکر مار کر سیدھا کیا۔ اس کی پسلی سے خون کی دھار نکل رہی تھی اور آنکھیں پھیلی ہوئی تھیں۔ اس کے ہانپتے ہوئے سینے پر جگت نے پیر رکھا۔ "بول! تجھے میرے گھر میں کس نے بھیجا تھا؟" جواب نہ ملا تو سینے پر زور سے پیر پٹکا۔

قادر چیخا مگر زبان نہیں چلائی۔ جگت جوش میں آ گیا۔ "کہہ دے...... ورنہ تیری آنکھیں نکال لوں گا۔ تجھے مرنے نہیں دوں گا بلکہ تڑپاؤں گا۔ بول! ارجن سنگھ نے بھیجا تھا؟"

قادر کی زبان باہر لٹک گئی مگر اس میں بات کرنے کی طاقت نہیں رہی تھی۔ آنکھیں اور گردن ہلا کر اقرار کیا۔ جگت اور بپھر گیا۔ "کیوں آیا تھا؟ میری بیوی کو چھیڑنے......؟"

قادر نے پھر اقرار کیا۔ بچن سے برداشت نہ ہوا۔ جگت کچھ کہے اس سے پیشتر بائفل کی نال قادر کی پیشانی پر رکھ کر اس نے لبلبی دبا دی۔ دھماکے سے اس کی کھوپڑی کے چیتھڑے اڑ گئے۔

"یہ تم نے کیا کر دیا بچن......؟" جگت دانت پیس کر بولا۔ "اس سے اور معلومات اگلوانی تھیں۔ کچھ دیر اور رک جانا تھا۔"

بچن کا غصہ ابھی سرد نہیں ہوا تھا۔ "جگت! یہ چندن بھابھی کی عزت لینے گھر میں گھسا تھا۔ یہ سن کر میرے ہاتھ کس طرح رک سکتے تھے؟ اس ذلیل کے ذرے ذرے کرنے کو جی چاہتا ہے۔" بچن نے قادر میاں کی لاش پر تھوکا۔

"جگت! تم نے عین موقع پر اسے پکڑ لیا۔" ہوشیار کہنے لگا۔ "نہیں تو آج ہم سب پھنس گئے تھے۔"

"یہ تو سب ٹھیک ہے مگر اس انگوٹھے کی بات تم نے ہم سے نہیں کہی؟" ہنومان نے پوچھا۔

"ایسا موقع ہی کہاں ملا تھا؟" جگت نے ہاتھ میں تھامی ہوئی ڈبیہ بند کرتے ہوئے کہا۔ "ساڑھے چار سال پہلے یہ بدتمیز نصف شب کو میرے گھر کی چھت پر آ کر دروازے کی زنجیر اندر سے کھول رہا تھا تب چندن نے تلوار سے اس کا انگوٹھا کاٹ لیا تھا۔"

"واہ...... کیسی بہادر ہے ہماری بھابھی......" ہنومان نے مسرت کا اظہار کیا۔

مگر جگت فوراً بولا۔ "بچن! اس شخص نے ہمارے مقام کا پتہ ارجن سنگھ کو بتا دیا ہوگا۔"

"نہیں...... آج پہلی بار اسے یہ مقام بتایا جگت! ہم نے اس سلسلے میں کافی ہوشیاری برتی ہے۔ ہوشیار اسے آنکھوں پر پٹی باندھ کر یہاں لایا تھا۔ ابھی تک ہم اسے باہر ہی ملتے رہے ہیں۔"

محبوبہ سے بیوی تک

ٹرین کے ڈبے میں ایک مشہور سیاسی لیڈر کی خوبصورت سیکریٹری اس پر اپنی حسین اداؤں اور سب سے زیادہ اپنی باتوں کا جادو چلانے کی کوشش کر رہی تھی۔ آخر سیاسی لیڈر نے اپنی نیند سے بوجھل آنکھوں کو زبردستی کھولتے ہوئے کہا۔ "سنو! اگر ہم تھوڑی دیر کے لئے یہ فرض کر لیں کہ ہم میاں بیوی ہیں تو کیسا رہے گا؟" سیکریٹری دل ہی دل میں خوش ہوتے ہوئے بولی۔ "مجھے کوئی اعتراض نہیں۔" لیڈر نے ذرا سختی سے کہا۔ "تو پھر بکواس بند کرو۔ خود بھی سو جاؤ اور مجھے بھی سونے دو۔ اسے کہتے ہیں تبلے پہ دہلا کیا خیال ہے جناب کا......"

ثوبیہ رحمان...... سرحد

"پھر تو بچن! ہم ارجن سنگھ کو اس کی لاش پہنچائیں۔ اسے پتہ چلے کہ سیر پر سوا سیر بھی موجود ہے۔"

"یہ کام میں کروں گا۔" ہوشیار نے کہا۔ "قادر کی لاش کو اس کے گھوڑے پر باندھ کر زمیندار کے گھر تک پہنچا دوں گا۔"

"ایسا کرتے ہوئے پھنس نہ جانا' یہ خیال رہے..... اور لاش کے ساتھ ایک پرچی بھی بھیج دینا جس پر لکھنا۔ "ارجن سنگھ! جگا پھر ڈاکو بن گیا۔ اس خوشی میں یہ تحفہ حاضر ہے۔"



چندن سسر کے لیے بستر بچھا رہی تھی' اسی لمحے دروازے پر دستک ہوئی۔ چندن کے ہاتھ رک گئے۔ "کون آیا ہوگا؟" اس نے کمرے میں بیٹھے ہوئے ساس سسر کی جانب دیکھا' وہ بھی چونکتے ہو گئے تھے۔ زنجیر پھر کھڑکی۔ چندن دروازے کی طرف بڑھ گئی۔ اسے یقین تھا کہ جگت نہیں لوٹنے گا۔ پھر بھی اس کے دل کی دھڑکنیں بڑھ گئیں۔ دروازہ کھولا تو سامنے نانا کھڑے ہوئے تھے پھر بھی آس نہیں ٹوٹی' اس نے نانا کے عقب میں نظر دوڑائی' نانا سمجھ گئے۔

"بہو! میں اکیلا ہوں۔" یہ کہہ کر وہ اندر آ گئے۔

ماں جی اور سوہن سنگھ برآمدے میں کھڑے تھے۔ چندن دروازہ بند کر کے ساس کے پیچھے کھڑی ہو گئی۔ نانا کا بجھا ہوا چہرہ چغلی کھا رہا تھا کہ کچھ کام نہیں ہوا پھر بھی ماں جی نے پوچھا۔

"کیا ہوا.....؟"

نانا خاموش رہے۔ چندن نے پانی کا لوٹا دیا۔ پانی پی کر وہ چارپائی پر لیٹ گئے پھر بولے۔

"کچھ نہیں ہوا۔" وہ زیادہ نہیں بولے۔

"مجھے یقین تھا کہ وہ آپ کی بات نہیں مانے گا۔ کسی حالت میں بھی وہ گھر واپس نہیں آئے گا۔" ماں جی بڑبڑائیں۔

نانا نے آہ بھری۔ "اب آنا ہوگا تو بھی نہیں آ سکے گا۔"

یہ سن کر سوہن سنگھ بے چین ہو گئے۔ "کیا مطلب؟"

ماں جی تڑپ اٹھیں۔ "کیا اس نے ویرو کو اغوا کر لیا؟" صرف ایک چندن خاموش رہی۔ وہ خود میں نانا کی بات سننے کی ہمت پیدا کر رہی تھی۔

"صبح یہاں سے گیا تو مجھے پتہ چلا کہ ویرو کے باپ نے گلے میں پھانسی لگا کر خودکشی کر لی ہے پھر ایک جگہ اور جانا تھا' اپنے واحد دشمن کے گھر....." نانا کچھ رک کے پھر لڑکھڑاتی زبان میں بولے۔ "شام اس کے گاؤں گیا مگر وہاں سے بھی ناکام واپس آنا پڑا۔ مجھ سے پہلے جگت وہاں پہنچ چکا تھا۔" نانا نے باری باری تینوں کی جانب دیکھا۔ جنی کی حالت پر اس کا دل دہل گیا۔ کیا وہ اس بات کا صدمہ جھیل سکے گی جو وہ کہنے جا رہے ہیں؟ مگر نہ کہنے سے بات چھپ نہیں سکے گی۔ صبح سارا گاؤں جان لے گا۔ یہی کہنے کے لیے اپنے گھر کی بجائے سیدھے یہاں آئے تھے۔ ممکن تھا پانچ سال پہلے ایسا ہوتا تو وہ گاؤں بھر میں شکر تقسیم کرتے۔ جگت کی پیٹھ ٹھونکتے۔ مگر آج خبر دیتے ہوئے وہ گھبرا رہے تھے۔ "شام کو دشمن کا قتل ہو گیا..... اب جگت واپس نہیں لوٹ سکے گا۔" یہ سن کر ماں جی سناٹے میں آ گئیں۔ چندن کا منہ کھل گیا اور سوہن سنگھ نے سر جھکا لیا۔ کوئی کچھ نہ بولا۔ پورا ماحول ٹھہر گیا۔



سب کی آنکھوں سے نیند جیسے کوسوں دور تھی'

آدھی رات گزر چکی تھی اور اب تک چاروں اپنے اپنے بستر پر پڑے کروٹیں بدل رہے تھے کہ اچانک دروازے پر کھٹکا ہوا۔ آس کنتی دھوکے باز ہوتی ہے چاروں یہ سوچ کر اٹھ بیٹھے کہ جگت آیا ہوگا۔ چندن تیزی سے اوپری منزل کی سیڑھیاں اتر کر برآمدے میں جلتے ہوئے فانوس کی روشنی بلند کرتی ہوئی آگے بڑھ رہی تھی اسی لمحے سوہن سنگھ بولے۔ "تم رہنے دو.....میں دروازہ کھولتا ہوں۔"

دروازے میں ارجن سنگھ کھڑا تھا۔ وہ استقبال کا انتظار کیے بغیر اندر گھس آیا۔ "سب جاگ رہے ہو؟" وہ ہنس کر بولا۔ پھر آس پاس نظر ڈالی۔ "کیوں آیا ہوں یہ تو سمجھ چکے ہوگے۔" پھر نانا کی جانب حیرت سے دیکھ کر بولا۔ "ارے تمہاری طبیعت پوچھنا بھول گیا۔ اب کیسی طبیعت ہے؟"

نانا کو اس کا ڈرامائی انداز پسند نہیں آیا مگر ضبط کر گئے۔ "میری طبیعت خراب کب ہوئی تھی؟ تم سے کس نے کہا؟"

"تمہارے جگت نے۔" پولیس چیف طنزیہ لہجے میں بولا۔ اور چاروں پر خوف چھا گیا.....کیا جگت گرفتار ہوگیا؟ مگر نانا نے سوچا اگر ایسا ہے تو ارجن سنگھ یہاں کیوں آیا؟

"مجھے بیوقوف بنا گیا۔" ارجن سنگھ دانت پیس کر بولا۔ "مگر اس وقت یہ خبر نہیں تھی کہ وہ موہن سنگھ کا قتل کر کے ہی آ رہا ہے۔ مجھ سے کہنے لگا کہ اچانک نانا کی طبیعت خراب ہوگئی ہے اس لیے جلدی پہنچنا ہے۔"

چاروں کے چہرے کھل اٹھے۔ ارجن سنگھ نے دروازے پر کھڑے ہوئے سپاہیوں کو آواز دی۔ "جلدی چلو.....گھر کی تلاشی لو۔" پھر نانا سے بولا۔ "میں جانتا ہوں وہ یہاں نہیں آیا ہوگا مگر دیکھنے میں کیا حرج ہے؟"

اعتراض کی کوئی وجہ نہیں تھی۔ پھر بھی نانا نے انجان بنتے ہوئے پوچھا۔ "موہن سنگھ کا قتل ہونے کے بعد جگت پر شک جانا عین ممکن ہے۔" نانا کی بات سن کر ارجن سنگھ خاموش رہا۔ موہن سنگھ کے قتل کی خبر سن کر کوئی نہیں چونکا تھا اسی وقت وہ سمجھ گیا تھا کہ یہ خبر پہلے ہی یہاں پہنچ چکی ہے۔ ممکن ہے کوئی کام کی بات معلوم ہو جائے اس لیے ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔

"اس میں شک کا سوال نہیں، جگت کو گاؤں میں آتے اور پھر فرار ہوتے ہوئے بہت سوں نے دیکھا ہے۔ اگر وہ مجرم نہ ہوتا تو مجھ سے جھوٹ بول کر فرار نہ ہوتا۔" پھر لہجے میں ہمدردی شامل کر کے بولا۔ "مجھے تم لوگوں پر رحم آتا ہے، تم لوگوں نے کتنا برداشت کیا مگر وہ صحیح راستے پر نہیں آیا۔ پانچ سال کی قید بھگتنے کے باوجود پرانی دشمنی کا جنون کم نہیں ہوا۔"

پانچ سال پہلے کی بات یاد دلا کر ارجن سنگھ نے نانا کے دل میں سوئی ہوئی نفرت جگا دی۔ ان کا دل چاہا کہ کہہ دیں۔ "دشمنی تو تجھ سے ہونی چاہیے۔ قتل تو تیرا کرنا تھا۔ تو نے ہم سے دھوکا کیا۔ اس کا بدلہ لیتا تو میں سمجھتا۔ دھوکہ دے کر پولیس کے حوالے کیا اور پھر قلابازی کھا گیا۔ بدمعاشی کی۔ مار مار کر اسے ختم کرنے کی ذلیل حرکت کی۔ اور آج رحم دکھانے کا ڈرامہ کرتا ہے؟" مگر پولیس چیف کو چھیڑنا آفت سر لینے کے برابر تھا، لہٰذا وہ خاموش ہی رہے۔ تلاشی لے کر ہاتھ جھٹکتے ہوئے سپاہی باہر آ گئے۔ ارجن سنگھ الجھن میں پڑ گیا آخر سب کیوں خاموش ہیں؟ اس نے جگت کی ماں کی جانب غور سے دیکھا تو ان کے لرزتے ہوئے لب کہہ رہے تھے۔

"بھائی! وہ ہمارا دشمن تو تھا مگر اس کی بیوہ سے ہماری طرف سے تعزیت کرنا۔"

نانا چونک گئے۔ پھر سمجھ گئے کہ لڑکی نے بالکل ٹھیک بات کی تھی۔ ارجن سنگھ نے متعجب لہجے میں کہا۔ "موہن سنگھ کی بیوہ کیسی؟ وہ تو کب کی طلاق لے کر الگ ہوگئی ہے۔" پھر جیسے اسے کچھ یاد آ گیا، وہ بولا۔ "اچھا ہوا تم نے یاد دلا دیا۔ مجھے اس عورت کو تلاش کرنا پڑے گا۔" پھر دروازے کی جانب تیزی سے قدم بڑھاتے، پھر جاتے ہوئے طنزیہ لہجے میں بولا۔ "جگت اس سے ملے بغیر نہیں رہے گا، پرانا رشتہ جو ہے۔" اس کی بیہودہ بات نے چندن کے دل میں چنگی بھری۔



رات نے گیارہ کا گھنٹہ بجا اور ارجن سنگھ چونک پڑا۔ وہ گوند گڑھ کے زمیندار کی حویلی کی گیلری میں چھپا ہوا تھا۔ اس خیال سے اس کا ذہن ہوا میں تیر رہا تھا کہ بچن کی ساری پارٹی آج پھنس جائے گی۔ چھتر مسلح پولیس والے اس نے آس پاس اس طرح چھپا دیے تھے کہ کسی کو شک نہیں ہو سکتا تھا۔ قادر میاں اندازے سے زیادہ چالاک نکلا۔ تھوڑے دنوں میں اس نے بچن جیسے ہوشیار ڈاکو کا اعتماد حاصل کر لیا تھا۔ ارجن سنگھ نے محسوس کیا کہ قادر کی کامیابی کا سہرا اس کی میٹھی زبان کے سر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سیرا اپنا عورتوں پر جادو کر جاتا ہے۔ جب وہ جگت کے گھر سے انگوٹھا کٹوا کر واپس لوٹا تھا تو اسے چانٹا مار دیا تھا۔ ارجن کو اس بات کا افسوس ہوا۔ کوئی پروا نہیں، آج کی فتح سے وہ بدلہ چکا دے گا۔ ایک گھنٹہ گزر گیا مگر گھوڑوں کی ٹاپیں نہیں سنائی دیں تو ارجن سنگھ پہلو بدلنے لگا۔ نصف شب پہلے آنے کی بات تھی، پھر اتنی دیر کیوں؟ بچن اتنا پکا تھا کہ اس نے اپنے مقام کے متعلق قادر میاں کو ہوا نہیں دی تھی۔ "کچھ آواز سنائی دے رہی ہے غالباً.....! یہ آواز مغرب کی جانب سے آ رہی ہے۔ گھوڑوں کی ٹاپوں کی آواز۔" ارجن سنگھ نے بیلٹ میں سے پستول نکالتے ہوئے کہا۔ پھر پولیس والوں کو تاکید کر دی کہ کوئی جلد بازی نہیں کرے گا، ممکن ہے سارا گروہ ساتھ نہ آئے، دو تین آدمی پہلے چیک کر جائیں، اس کے بعد باقی لوگ آئیں۔ سب کے آنے کے بعد انہیں چاروں سمت سے گھیرنا تھا۔ اس گھیرے سے نکلنے کی کوشش کرنے والوں کے لیے ارجن سنگھ نے شوٹ کرنے کا حکم دے دیا تھا۔ گھوڑوں کی ٹاپوں کی آواز قریب آ گئی۔ اس کا اندازہ درست تھا۔ وہ دو سے زیادہ آدمی نہیں تھے۔ اس نے گیلری سے جھانک کر دیکھا، قادر کا سفید گھوڑا دور سے صاف نظر آ رہا تھا، مگر وہ اس کی پیٹھ پر سوار کیوں نہیں تھا...... دو منٹ خاموشی رہی۔ گیلری کے نیچے سے گھوڑا گزر گیا تو اس کی آنکھیں پھیل گئیں۔ گھوڑے کے پیچھے کوئی آدمی گھسٹتا ہوا آ رہا تھا۔ گھوڑا حویلی کے پاس آ کر رک گیا۔

ارجن سنگھ الجھن زدہ انداز میں کچھ دیر بے حس و حرکت بیٹھا رہا، مگر عقب میں کوئی آتا دکھائی نہیں دیا تو اس نے ٹارچ روشن کر دی۔ روشنی کا دائرہ گھومتا ہوا گھوڑے سے بندھے ہوئے شخص کے چہرے پر مرکوز ہو گیا اور پولیس چیف کے کپکپاتے ہوئے ہاتھ سے ٹارچ چھوٹ گئی۔ "قادر میاں.....؟" وہ بڑبڑایا اور دوڑ کر اس کے قریب پہنچا۔ دوسرے سپاہی بھی ساتھ تھے۔ قادر میاں کے سر میں گولی کا سوراخ نظر آ رہا تھا جس پر خون جم گیا تھا، اسے چت کر کے دیکھا تو راستے پر گھسٹنے کی وجہ سے اس کی ناک، ہونٹ، شانے، سینہ اور گھٹنے سب جگہ سے گوشت ادھڑا ہوا تھا۔

"صاحب! اس کی گردن میں کچھ بندھا ہوا ہے۔" ایک سپاہی نے چیف کی توجہ مبذول کرائی۔

پرچہ کھول کر پڑھتے ہی ارجن سنگھ کے جسم میں آگ لگ گئی۔ "کمبخت جگا وہاں پہنچ گیا عین وقت پر ٹپک پڑا' مگر وہ قادر کو کس طرح پہچان گیا؟" وہ بڑبڑایا۔ تین چار بار پرچہ پڑھ کر اس کی نظر قادر کے دائیں ہاتھ پر گئی' دوسرا انگوٹھا کٹا ہوا دکھائی دیا۔ "پھر تو جگا سب کچھ جان گیا۔ اس نے قادر میاں سے دوسری اطلاع بھی اگلوالی ہوگی۔ وہ ڈاکو بن گیا ہے' اسی خوشی میں مجھے لاش کا تحفہ بھیجا ہے۔"

ارجن سنگھ نے محسوس کیا کہ جگا نے قادر کا انگوٹھا نہیں بلکہ اس کی ناک کاٹ دی تھی۔

"اسے بڑھنے سے پہلے ہی دبا دینا پڑے گا۔" اس نے دانت پیسے۔ "جگا! تمہاری موت میرے ہاتھ سے ہوگی۔ تم پھر بازی کھیلنے کو تیار رہو' مگر یاد رکھنا حکم کا اکا میرے ہاتھ میں ہے' اب مجھے ویرو کو استعمال کرنا پڑے گا۔" ارجن سنگھ بڑبڑایا تھا۔



ویرو کی تلاش سے دن بدن جگت مایوس ہو رہا تھا۔ موہن سنگھ کا قتل کرنے کی حماقت اب اس کی سمجھ میں آئی تھی۔ ممکن ہے وہ سچ کہتا ہو' ویرو کے متعلق صرف وہی جانتا ہو۔ جرم سرزد ہو جانے کے بعد وہ کھلے عام نہیں گھوم سکتا تھا۔ ویرو کے باپ کے علاوہ دوسرے رشتے داروں کا اسے پتہ نہیں تھا' کہاں جا کر...... کس سے پوچھا جائے؟ گھر ہوتا تو چندن اس کی مدد کرتی۔ خیالات کے ہجوم میں اچانک ایک خیال سے جگت دہل گیا۔

"ممکن ہے ویرو کو کچھ ہو گیا ہو؟ وہ زندہ ہی نہ ہو......؟" اس خیال کے تحت جگت کا جسم پسینے سے تر ہو گیا' جیسے اس کی ساری طاقت سلب ہو گئی ہو۔ اس کا جسم ڈھیلا پڑ گیا۔ بچن' ہنومان اور ہوشیار جگت کی اس حالت پر پریشان ہو گئے۔ جگت جیسا بہادر انسان ویرو کے لیے کیسا پاگل بن گیا ہے؟ رات کو سکون سے نہیں سو پاتا' سوتے ہوئے چونک کر بیدار ہو جاتا' پھر دکھ بھلانے کے لیے شراب میں ڈوب جاتا ہے۔ ایک بار پشت پھیر کر راستے میں کھڑی ہوئی عورت کو دیکھ کر کس طرح مسرت میں ڈوب کر دوڑا تھا مگر ویرو کی جگہ دوسری عورت کو دیکھ کر شرمندہ ہو گیا تھا اور بجھے ہوئے چہرے سے واپس لوٹ آیا تھا۔ یا تو ویرو کا پتہ چلنا چاہیے یا پھر اسے دل سے نکال دینا چاہیے۔ اگر ان دو باتوں میں سے کوئی بات نہ ہوئی تو وہ پاگل ہو جائے گا۔ بچن کو ایک مرتبہ خیال آیا کہ وہ کہہ دے۔ "جگت! تم جس ویرو کو دن رات تلاش کر رہے ہو وہ اس دنیا میں نہیں ہے۔ اسے بھول جاؤ۔" مگر یہ جھوٹ بولنے کی اس میں ہمت نہ ہوئی۔ کیونکہ وہ کئی بار کہہ چکا تھا۔ "جس نے ویرو کو ہاتھ لگایا ہوگا اس کی میں چٹنی کر دوں گا۔" ایسا کہتے وقت اس کا چہرہ کتنا ہیبت ناک ہو جاتا تھا۔

"بچن! ہم ایک ٹھکانہ بھول گئے۔" ایک دن کھانا کھاتے ہوئے اچانک جگت بولا۔ "کرہین ڈاکٹر کے ہاں تلاش نہیں کیا۔ ہم دونوں آخری بار وہیں سے الگ ہوئے تھے۔ ممکن ہے وہاں اس نے پناہ لی ہو۔" سب جگت کی جانب دیکھنے لگے۔ کسی نے جواب نہیں دیا۔ جگت کو بھی کبھی بے وقت اسکی دھن سوار ہو جاتی تھی۔ "یہاں تلاش باقی رہ گئی ہے۔ لہٰذا چکر لگا لیں؟" اس کا دل رکھنے کی خاطر بچن یا ہوشیار اس کے ساتھ جاتے اور دھکے کھا کر واپس آ جاتے۔ اس وقت کسی نے جواب نہیں دیا تو جگت جھینپ گیا۔ سر جھکا کر بولا۔ "میں جانتا ہوں میری وجہ سے تم لوگوں کو پریشان ہونا پڑتا ہے مگر میں کیا کروں؟" اس کی آواز بھرا گئی۔ پھر کھنکار کر بولا۔ "ویسے بھی مجھے ہنومان کے پیر کے علاج کے سلسلے

میں ڈاکٹر صاحب سے ملنا ہے۔ بچن! چلو ہم ابھی چلیں۔" ہاتھ میں لیا ہوا نوالہ اس نے تھالی میں واپس رکھ دیا اور ہاتھ دھونے لگا۔ بچن کو بھی اسی طرح اٹھنا پڑا۔ جگت کے دل کا شک دور کرنا ضروری تھا۔

تین گھنٹے بعد وہ گاؤں میں داخل ہو گئے۔ جنگل سے گزرنے کے بعد انہیں چرچ نظر آیا۔ جگت کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ اس چرچ میں دونوں نے یسوع مسیح کی تصویر کے سامنے شمعیں جلا کر اپنے دل کی مراد مانگی تھی کہ ویرو کا پیار ہمیشہ اس کی زندگی میں سائے کی طرح ساتھ دے گا اور ویرو کی یاد سائے کی طرح اس کے ساتھ رہے گی۔ ڈاکٹر کا گھر آ گیا۔ گھوڑے پر سے دونوں نیچے اتر گئے۔

"بچن! تم باہر رہنا۔" یہ کہہ کر جگت آگے بڑھا۔ دروازہ کھٹکھٹایا۔ فوراً ہی اندر سے آواز آئی۔

"کون ہے.....؟" ڈاکٹر صاحب کی آواز پہچان کر جگت نے زنجیر کھٹکھٹائی۔ اندر سے لاٹھی کی کھٹ کھٹ سنائی دی۔ دو چار لمحے جگت کو بہت طویل محسوس ہوئے۔ دروازہ کھولتے ہی ڈاکٹر بڑبڑائے۔

"بھائی اس وقت کون ہے؟"

"مجھے نہیں پہچانا ڈاکٹر صاحب؟" جگت اندر چلا گیا۔

"آواز پہچانی ہوئی ہے۔ مگر یادداشت ساتھ نہیں دے رہی۔" ڈاکٹر کی آواز سے بڑھاپا جھلک رہا تھا۔ جگت نے فانوس کی روشنی بڑھائی' پھر ڈاکٹر کے سامنے کھڑا ہو کر بولا۔

"اب روشنی میں دیکھیں۔"

"اندھیرا یا اجالا سب برابر ہے بھائی۔" ڈاکٹر ہنسا۔ اس کی آواز میں درد کی جھلک تھی۔ جگت کا دل رو دیا۔ "آنکھیں ہیں مگر روشنی گنوا دی بیٹا۔"

جگت پیچھے ہٹ گیا۔ "ڈاکٹر صاحب آپ..... آپ....."

"ہاں بیٹا! اندھا ہو گیا ہوں۔" یہ کہہ کر وہ جگت کی جانب ہاتھ بڑھاتے ہوئے بولا۔ "اب تمہیں پہچان لیا۔ جگت یاد آیا ہے۔ مجھے یقین تھا کہ جیل سے رہا ہو کر تم مجھ سے ملنے آؤ گے۔ میری بھی تمہارا نام دہرا رہی تھی۔" ڈاکٹر کا ہاتھ جگت کے شانے پر پڑا تو وہ پیار سے ہاتھ پھیرتے ہوئے بولے "تم تو بہت بڑے ہو گئے۔"

"مگر ماں کہاں ہے ڈاکٹر صاحب؟" گھر میں

وحدانیت

لوگوں کی اکثریہ رائے ہے کہ اللہ تعالیٰ ہماری دعائیں نہیں سنتا کیا کبھی ہم نے یہ غور کیا ہے کہ ہم دعائیں کیا مانگتے ہیں۔ ان کی نیت کیا ہوتی ہے کیا ہم کامل یقین سے دعائیں مانگتے ہیں۔ نہیں قطعی نہیں مانگتے اگر ہم دعا مانگ بھی رہے ہوتے ہیں تو اس میں ہماری بھلائی اور دوسرے کا نقصان ہوتا ہے۔ مثلاً اے اللہ تو آج اتنی بارش دے کہ دل بھر جائے اس دعا سے ہمارا دل تو بھر جاتا ہے مگر دوسروں کا حال برا ہوتا ہے۔ دعا میں کاملیت نہیں ہوتی۔ اللہ مجھے فلاں چیز دے میں اس سے یہ وہ کروں گا بھلا رب العزت کیسے وہ دعا قبول کر سکتا ہے جس میں ایک انسان کا بھلا ہو رہا ہو اور دوسرے کا نقصان۔ میرا ایمان ہے کہ جب بھی سچے دل سے نفع نقصان سوچے بغیر دعا مانگی جائے قبول ہوتی ہے۔ کہتے ہیں انسان سخت مشکل میں ہو تو اگر وہ کوئی دعا مانگے تو وہ قبول ہو جاتی ہے۔ اس وقت کی دعا کسی بھی نفع نقصان سے پاک ہو کر دل میں ایمان پختہ رکھ کر قبول ہونے کے یقین سے مانگی جاتی ہے اور قبول ہوتی ہے۔

حنا ناز..... چنڑ داون خان

نظریں گھما کر جگت نے پوچھا۔ اس سوال سے ڈاکٹر کے چہرے پر پھیلتا ہوا غم دیکھ کر جگت کانپ گیا۔

"وہ مجھے چھوڑ کر چلی گئی...... اپنے بیٹے کے پاس ....." اتنا کہہ کر گلے میں لٹکتے ہوئے کراس کو انہوں نے بوسہ دیا۔ شدت جذبات سے جگت ڈاکٹر سے لپٹ گیا۔ ڈاکٹر کے بوڑھے شانے پر گرم آنسو گرنے لگے۔ "تین ہفتے پہلے وہ ہم سے بچھڑ گئی۔ ورنہ آج تجھے دیکھ کر اس کی آنکھیں ٹھنڈی ہوتیں۔"

آنسوؤں اور ہچکیوں سے دل کا غبار دھونے کے بعد جگت ڈاکٹر سے جدا ہوا۔ ہاتھ تھام کر ڈاکٹر کو کرسی پر بٹھایا۔ "میری ماں چل بسیں آپ کو نظر نہیں آتا پھر دیکھ بھال کون کرتا ہے؟"

"اس کا انتظام یسوع مسیح نے کر دیا ہے۔ ایک جوان عورت بیٹی کی طرح میرا خیال رکھتی ہے۔ وہ چرچ میں پڑی رہتی ہے۔ بیچاری دکھیاری ہے۔"

"عورت؟" جگت بڑبڑایا۔ "کہیں وہ ویرو تو نہیں؟" اس نے سوچا۔

"مگر بیٹے! تم اس وقت کیوں آئے ہو؟" ڈاکٹر نے پھر اس کی پشت پر ہاتھ پھیرتے ہوئے پوچھا۔ "گھر میں سب لوگ ٹھیک تو ہیں؟ یا پھر رات کو بھٹکنے کی عادت نہیں گئی؟"

"ڈاکٹر صاحب آپ جس عورت کی بات کر رہے ہیں وہ ویرو تو نہیں؟"

"ویرو.....؟" ڈاکٹر گہری سوچ میں ڈوب گئے۔ "ہاں..... وہ تمہارے ساتھ آئی تھی۔ وہ ویرو؟ نہیں نہیں..... وہ تو برابر والے گاؤں کی ہے۔ شوہر نے بدچلن کہہ کر گھر سے نکال دیا تو بیچاری نے چرچ میں پناہ لے لی۔" جگت نے آہ بھری مگر ڈاکٹر نے سن لی۔ "ویرو یہاں کہاں سے آئے گی؟"

"میں اس کی تلاش میں آیا ہوں۔ وہ چار ماہ سے لاپتہ ہے۔" جگت نے آہ بھر کر ساری بات ڈاکٹر کو بتا دی۔ مگر اس کی اتنی ہمت نہیں ہوئی کہ ڈاکٹر کو یہ بتا دیتا کہ وہ گھر چھوڑ آیا ہے اور موہن سنگھ کو قتل کر کے ڈاکو بن گیا ہے۔

پھر کراس آنکھوں سے لگا کر ڈاکٹر بولے۔ "جہاں ہوں گی وہاں بھگوان اس کی حفاظت کریں گے مگر تمہارے گھر سب کیسے ہیں؟ تم یہاں اکیلے آئے ہو؟"

پہلا سوال نظر انداز کرتے ہوئے جگت نے کہا۔ "میرے ساتھ میرا دوست ہے اسے باہر کھڑا کیا ہے۔"

"مطلب یہ کہ تم پھر ڈاکو بن گئے؟" ڈاکٹر کی آواز میں لرزش تھی۔ جگت خاموش رہا۔ ڈاکٹر کے چہرے کی جھریوں میں حرکت پیدا ہوئی۔ ان کا سر ہلنے لگا۔ "تم، تم....." الفاظ زبان سے چپک گئے۔

"جی ہاں..... میں پہلے جیسے ہو گیا۔"

جگت کے بولنے سے پہلے ڈاکٹر چیخے۔ "نہیں ..... نہیں" بہت دیر تک ان کا جسم کپکپاتا رہا۔ جگت ان کی حالت دیکھ کر گھبرا گیا۔ اسے ڈر محسوس ہوا کہ ڈاکٹر یہ صدمہ نہیں جھیل سکیں گے۔ کچھ دیر بعد ڈاکٹر پرسکون ہو گئے تو اسے حیرت ہوئی۔ "بھگوان معاف کرے..... میں غصے پر قابو نہیں رکھ سکا۔" تیسری بار انہوں نے کراس کو آنکھوں سے لگایا پھر جو کچھ کہا وہ جگت کے دل پر نقش ہو گیا..... "اچھا ہوا کہ تم میری بیوی کے مرنے سے پہلے نہیں آئے۔ اس کو پتہ چلتا تو وہ کبھی تمہیں معاف نہ کرتی۔"

اس نیک انسان کی روح کا صدمہ دیکھ کر جگت کو پہلی بار محسوس ہوا کہ اس نے ایسا جرم کیا ہے جسے معاف نہیں کیا جا سکتا۔ یہاں آ کر اس نے ڈاکٹر

کے دل پر ضرب نہ لگائی ہوتی تو اچھا تھا۔ زیادہ دیر رکنے میں اسے شرم محسوس ہوئی۔ میری کی قبر پر جانے کی خواہش کا بھی اس نے اظہار نہیں کیا۔ اس نے اس عورت کو دیکھنے کی بھی ضرورت نہ تھی جو چرچ میں پڑی تھی۔ خاموشی سے ڈاکٹر کے پاؤں چھو کر کچھ کہے بغیر جگت بھاری قدموں سے باہر نکل گیا۔

بچن نے دیکھا کہ جگت کے چہرے پر مایوسی کی جگہ پچھتاوا تھا۔ ڈاکٹر سے ملنے کے بعد جگت کا دماغ سن ہو گیا تھا۔ بچن اور ہوشیار نے اسے مایوسی سے بچانے کی خاطر ویرو کی تلاش اپنے ذمے لے لی۔ جگت کی امید ٹوٹ جانے پر بھی تو پانچویں دن ہوشیار ہانپتا ہوا آیا۔

"جگت...... جگت!" وہ پرجوش انداز میں کہہ رہا تھا۔ "ویرو کا پتہ مل گیا۔" یہ سن کر جگت فوراً کھڑا ہو گیا۔ اس کی رگوں میں تیزی سے خون گردش کرنے لگا۔ آنکھیں جوش سے چمکنے لگیں۔

"ہوشیار! تم سچ کہہ رہے ہو؟" جگت نے یہ سوچ کر پھر پوچھا کہ کہیں اس کے سننے میں غلطی تو نہیں ہوئی؟

"بالکل سچ کہہ رہا ہوں جگت!" ہوشیار ہانپتے ہوئے سینے پر ہاتھ رکھ کر بولا۔ "وہ اپنی خالہ کے گھر رہتی ہے۔"

"دیکھا...... ہمیں یہی ٹھکانہ یاد نہیں آیا۔" جگت خوشی کا اظہار کرتا ہوا بولا۔ "میں کہہ رہا تھا ناں کہ وہ کسی کے ساتھ بھاگ نہیں سکتی۔ میرا انتظار کر رہی ہوگی۔ مگر ہوشیار! تم نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے؟ تم اس سے ملے؟"

"نہیں جگت......" ہوشیار ٹھنڈا پڑ گیا۔ "مگر تین چار جگہوں سے پکی اطلاع ملنے کے بعد تمہیں یہ خوشخبری سنانے آیا ہوں۔ میں دیکھنے جاتا تو شاید رشتے دار ہوشیار ہو جاتے۔"

"ارے رشتے داروں کی ایسی تیسی...... چل میرے ساتھ۔ میں ابھی اسے بھی اٹھا کر لاتا ہوں۔" جگت کی مسرت اور جوش سے قابو میں نہیں تھا۔

"مگر جگت میں نے دوسری بات سنی ہے۔" ہوشیار بجھ گیا۔ "آج سے پانچویں دن ویرو کی شادی ہو رہی ہے۔"

جگت پر بجلی گر گئی۔ صورت بدل گئی۔ چہرہ سرخ ہونے لگا۔ "نہیں نہیں...... ہوشیار! یہ غلط ہے۔ ویرو کبھی شادی کرنے کو تیار نہیں ہوگی۔" اس کا ہیبت ناک روپ دیکھ کر ہوشیار اور ہنومان خوفزدہ ہو گئے۔ شانے پر بندوق رکھ کر جگت نے ہوشیار کا بازو تھام لیا۔ "چلو! ہم ابھی وہاں چلیں گے۔"

ہوشیار الجھن میں پڑ گیا مگر ہنومان درمیان میں آ گیا۔ "جگت اس طرح پاگل ہونے کی ضرورت نہیں۔ بچن بھی اس کی اطلاع حاصل کرنے گیا ہے۔ اسے آنے دو شاید کچھ اور اطلاع مل جائے۔"

جگت کا دل مچل رہا تھا مگر اسے رک جانا پڑا۔ "ویرو...... شادی" یہ دو الفاظ اس کے ذہن میں بار بار گردش کر رہے تھے۔ ارجن سنگھ حکم کا اکا چل چکا تھا۔



"بچن! ہم تمہارا انتظار کر رہے تھے۔" جگت نے مسرت بھرے لہجے میں کہا۔ "ہوشیار نے پتہ حاصل کر لیا ہے۔" مگر بچن پر اس کی بات کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ تاثرات سے عاری انداز میں وہ پھیکی سی ہنسی ہنس دیا۔ ویرو کے پاس پہنچ جانے کی جلدی میں جگت نے اس طرف دھیان نہیں دیا۔

"وہ خالہ کے گھر رہتی ہے...... میں ہوشیار کو لے کر ابھی روانہ ہوتا ہوں۔" وہ ایک ہی سانس میں کہہ

گیا۔

"اب جا کر کیا کرو گے؟" بچن نے مایوس لہجے میں کہا۔ "ہوشیار نے تمہیں یہ بتایا ہوگا کہ ویرو کی شادی ہونے والی ہے۔"

"ہاں..... یہی وجہ ہے کہ میں اس کے پاس پہنچ جانا چاہتا ہوں۔" جگت کا لہجہ سخت تھا۔ "میں اسے بھگا لاؤں گا۔"

بچن آنکھیں پھیلا کر اسے دیکھنے لگا۔ اسے سخت حیرت تھی۔ اس کا تجربہ ہونے کے باوجود کہ عورت کا پیار انسان کو کیسا پاگل بنا دیتا ہے بچن کو جگت کی حرکت بیہودہ معلوم ہوئی۔ "کسی کو بیاہنے والی عورت کو اٹھانے کی بات کر رہا ہے؟" بچن سختی سے بولا۔

ہنومان اور ہوشیار چونک گئے۔ اس طرح بات بڑھنے کا سب کو ڈر محسوس ہوا مگر جگت اپنی بات پر قائم رہا۔ "میں یہ بات ماننے کو تیار نہیں۔ ویرو کسی سے شادی نہیں کرے گی۔ اس کی شادی زبردستی کی جا رہی ہے اور میں یہ جاننے کے بعد ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر نہیں بیٹھ سکتا۔"

"اور اگر ویرو راضی خوشی شادی کرنا چاہتی ہو پھر؟" بچن سر جھکا کر بولا مگر یہ سن کر جگت کے دل پر چوٹ لگی۔ وہ الجھن میں پڑ گیا۔

"یہ نہیں ہو سکتا بچن! تم خواہ مخواہ بحث کر رہے ہو۔ میں ویرو کو جانتا ہوں۔"

"میں بھی اچلا کو جانتا تھا جگت۔" بچن نے جگت سے نظر ملا کر کہا۔ "عورت کی مجبوری اکثر اسے ناممکن کام کرا دیتی ہے۔"

"ویرو سے زبردستی کرنے والے کو میں شوٹ کر دوں گا بچن! مجھے تم سے بحث نہیں کرنی۔ میں جا رہا ہوں۔" جگت نے ہوشیار کو بھی کھینچا۔ ہنومان ٹھنڈی سانس بھر کر بچن کو دیکھنے لگا۔ بچن نے ہونٹ کاٹے پھر بلند آواز میں بولا۔

"ٹھہرو جگت! تم اس طرح نہیں جا سکتے۔" پھر بھی جگت آگے بڑھا۔ بچن گرجا۔ "میں کہتا ہوں ٹھہر جاؤ......" جگت کے قدم فرش پر جم گئے۔ وہ پیچھے مڑے بغیر بولا۔

"کیا ہے؟" اس کی آنکھوں سے آگ برسنے لگی۔ بچن کھڑا ہو کر اس کے قریب گیا۔

"پہلے ہمیں یقین کرنا ہے کہ ویرو وہاں ہے بھی یا نہیں۔"

"یہ یقین کرنے کے لیے ہی میں وہاں جا رہا ہوں۔"

"اور فرض کرو! ویرو وہاں ہو اور راضی خوشی سے شادی کر رہی ہو تو پھر تم کیا کرو گے؟"

جگت کا ہاتھ نا شعوری طور پر گیا مگر جواب دینے سے پہلے ہچکچایا۔ بچن نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ "تجھے یاد ہے جگت اچلا کو حاصل کرنے کے لیے میں بھی اسی طرح جوش میں آ گیا تھا۔ تم میرے ساتھ گئے تھے اور مجھے گھر کے باہر کھڑا رکھا تھا اور تم اچلا سے مل کر لوٹ آئے تھے۔"

"مگر وہ تو میں اس کی مرضی معلوم کرنے گیا تھا۔ ایک بیاہی ہوئی عورت اپنا گھر چھوڑ کر نہ آنا چاہتی تو مجھے اسے زبردستی نہیں لانا تھا۔"

"یہ سچی بات ہے جگت! اگر میں ساتھ گیا ہوتا تو اچلا کا انکار سن کر پاگل ہو جاتا اور نہ جانے کیا کر بیٹھتا۔" پھر اس کا لہجہ بھیگ گیا۔ "جسے بہت زیادہ چاہتے ہو وہ ہمارا ہاتھ جھٹک دے تو مرنے کی خواہش ہوتی ہے۔"

"جو بھی ہو مگر آج ہمیشہ کے لیے فیصلہ ہو جائے گا۔"

"جگت! تمہیں میری بات ماننی پڑے گی۔ مجھے

ابھی شک ہے کہ اس میں کوئی چال ہے۔ ہم اتنے عرصے سے تلاش کررہے تھے پھر بھی ویرو کا نام ونشان نہیں ملتا تھا' وہ اس طرح اچانک کیسے ظاہر ہوگئی؟"

"مجھے بچن کی بات میں وزن نظر آتا ہے۔" ہنومان بیساکھی کے سہارے اچھلتا ہوا اس کے قریب آگیا۔ "تم ویرو کی تلاش میں ہو ممکن ہے ارجن سنگھ بھی یہ بات جانتا ہو۔ تمہیں پھنسانے کے لیے اس نے یہ جال پھیلایا ہو اس بات کا بھی امکان ہے۔"

اب جگت الجھن میں گرفتار ہوگیا۔ "تم سب لوگ بات کا بتنگڑ کیوں بنا رہے ہو؟ میں جان خطرے میں ڈال کر بھی وہاں جاؤں گا۔ ویرو سے زیادہ پیاری مجھے زندگی بھی نہیں ہے۔"

کچھ دیر تک کوئی بھی نہ بولا۔ جگت سچ مچ پاگل ہو رہا تھا پھر بھی بچن اسے جانے نہیں دینا چاہتا تھا۔ "ایک کام کریں...... پہلے ہم یقین کرلیں کہ ویرو وہاں ہے یا نہیں؟ پھر سب ساتھ جاکر اسے اٹھا لائیں گے۔"

"ہاں یہ ٹھیک ہے۔" ہنومان اور ہوشیار ایک ساتھ بولے لیکن جگت کی ضد جوں کی توں رہی۔

"مگر جو شخص چیک کرنے جائے گا اس کے لیے بھی تو خطرہ ہے' پھر میں ہی کیوں نہ جاؤں؟"

"مجھے ایک ترکیب سوجھی ہے۔" بچن بولا۔ "ہم میں سے کوئی نہ جائے' بلکہ یہ کام اچلا کے سپرد کردیا جائے۔" پھر اس نے جگت کو ایک نظر دیکھ کر کہا۔ "اچلا' ویرو کو پہچانتی ہے' ویرو اس سے سچ بات کہتے ہوئے نہیں ہچکچائے گی۔ اچلا عورت ہے لہٰذا وہاں جانے میں رکاوٹ بھی نہیں ہوگی۔ وہ اس کی سہیلی بن کر وہاں جاسکتی ہے۔"

اب جگت کچھ ڈھیلا پڑ گیا۔ بچن نے اچھی ترکیب بتائی تھی۔ مگر ذہن پر سوار ہونے والی "جلدی" نے پھر بہانہ ڈھونڈا۔ "اس میں وقت ضائع ہوجائے گا۔ اور وہ لوگ زبردستی اس کی شادی کردیں گے۔"

"وقت ضائع نہیں ہونے دیا جائے گا۔" بچن پر مسرت لہجے میں بولا۔ "میں بھی اچلا کے ساتھ جا رہا ہوں جگت! میں اس کے گھر دو چار مرتبہ ہو آیا ہوں۔ لہٰذا تم کوئی فکر نہ کرو۔ کل صبح اچلا ویرو سے ملنے اس کی خالہ کے گھر روانہ ہوجائے گی اور شام تک جواب لے آئے گی۔"

جگت کی اجازت کا انتظار کیے بغیر بچن روانہ ہوگیا۔ ہوشیار اور ہنومان کو بھی یہ ترکیب پسند آئی۔ جگت جوش کو دبانے کی کوشش کرنے لگا۔ ایک دن اسے بہت طویل دکھائی دیا۔ کسی سے کچھ کہے بغیر وہ اندر جاکر چارپائی پر لیٹ گیا۔ ویرو کا خیال جگت کو سونے نہیں دے رہا تھا۔ اسے یقین تھا کہ ویرو کسی سے شادی پر تیار نہیں ہوگی۔ اس نے طلاق اس لیے حاصل کی تھی کہ جیل سے رہا ہونے کے بعد میرے ساتھ زندگی گزار سکے۔ وہ زبردستی پر خودکشی کو ترجیح دے گی پھر بھی ایک گہرا خوف اسے ستا رہا تھا۔ وہ موہن سنگھ کو قتل کرکے پھر ڈاکو بن گیا ہے یہ جاننے کے بعد ممکن ہے کہ ویرو اس سے ناراض ہوگئی ہو اور شادی کے لیے تیار ہوگئی ہو پھر اچلا اسے منا نہیں سکے گی' میں ہی اسے سمجھاؤں گا۔ موہن سنگھ کا قتل کس حالت میں اچانک ہوا؟ یہ جاننے کے بعد اسے مجھ سے نفرت نہیں رہے گی۔ میں اس کی تلاش میں کتنا بے چین رہا ہوں یہ جان کر اور یہ معلوم ہونے کے بعد کہ اس کی خاطر میں نے گھر چھوڑ دیا' ویرو شادی کا ارادہ ترک کردے گی اور میرے ساتھ آنے کو تیار ہوجائے گی۔ سوچتے سوچتے جگت کے سر میں سخت درد ہونے لگا۔ بچن خواہ مخواہ درمیان میں کود پڑا۔ مجھے

اس کی بات نہیں سنی چاہیے تھی۔ ایک دن میں تو سب کچھ الٹ پھیر ہو جائے گا...... جگت فوراً بیٹھ گیا۔

ہتومان اور ہوشیار گہری نیند سو رہے تھے۔ چارپائی پر سے کھڑے ہو کر اس نے لٹکی ہوئی رائفل اٹھالی پھر خیال آیا کہ رائفل کسی کی نظر میں آ جائے گی۔ ہوشیار کے بیلٹ میں پستول تھی۔ اس پر نظر گئی مگر اسے بیدار نہیں کرنا تھا۔ وہ کسی سے کچھ کہے بغیر جانا چاہتا تھا' صبح تک وہ واپس لوٹ آئے گا ویرو کو ساتھ لے کر۔

گھر سے باہر جھانک کر اس نے دیکھا' کوئی بھی نہیں جاگ رہا تھا مگر باہر پہرہ دیتے ہوئے ساتھی کا کیا ہوگا؟ اسے کسی طرح سمجھالوں۔ کہوں گا نیند نہیں آ رہی' اس لیے شراب پینے جا رہا ہوں۔ اس نے آہستگی سے سوئے ہوئے ہوشیار کے بیلٹ سے پستول سرکالی۔ ہوشیار نے حرکت کی' جگت کچھ ہچکچایا' مگر سارے دن کی دوڑ دھوپ کی وجہ سے تھکا ہوا ہوشیار پھر نیند کی آغوش میں پہنچ گیا۔ پستول اندر کی بیلٹ میں چھپا کر جگت آگے بڑھ گیا۔

"نیند نہیں آ رہی تھی' نشہ کر کے آتا ہوں۔ گھنٹے بھر میں لوٹ آؤں گا۔" باہر پہرہ دیتے ہوئے ساتھی سے یہ کہہ کر اس نے گھوڑی دوڑا دی۔

پوری رفتار سے گھوڑی دوڑانے کے باوجود اسمعیل آباد پہنچتے ہوئے پورے تین گھنٹے صرف ہو گئے۔ ستائے بغیر یا کوئی دیکھ نہ لے اس کی پروا کیے بغیر جگت گھوڑی دوڑا رہا تھا۔ وہ ویرو کی خالہ کے گھر سے لاعلم تھا۔ اس گاؤں میں دو انفارمر رہتے تھے۔ "ان سے معلوم کرلوں گا۔" اس یقین کے ساتھ وہ روانہ ہوا تھا۔

"مجھے یقین تھا کہ آپ آئیں گے۔" انفارمر نے آنکھوں سے نیند بھگانے کی خاطر جماہی لیتے ہوئے کہا۔ "مگر شادی کے دن آنے کا امکان نہیں تھا۔"

"میں ابھی پہنچنا چاہتا ہوں۔ تمہیں مجھے گھر بتانا پڑے گا۔" اس کے چہرے پر گھبراہٹ دیکھ کر جگت نے کہا۔ "ساتھ نہیں آنا' صرف نقشہ سمجھا دو۔ میں خود سمجھ لوں گا۔"

"ایسے چھوٹے گاؤں میں مکان تلاش کرنے میں کون سی دیر لگے گی؟" انفارمر نے اپنا بچاؤ کیا۔

"گاؤں کے اس کنارے میرا مکان اور دوسرے کنارے اس تیلی کا گھر ہے۔ ویرو کا خالو تیل کا کولہو چلاتا ہے۔ لہٰذا لوگ اسے تیلی کہتے ہیں۔ دروازے کے قریب کولہو کا بیل بندھا ہوا ہوگا۔ ایک لائن میں مکان آتے ہیں۔ گردوارے کا جھنڈا بھی دکھائی دے گا۔ اس سے پیچھے آگے جاؤ گے تو ساتھ والا مکان اس کا ہے۔"

"مکان میں داخلے کا پچھلا راستہ تو ہوگا؟"

"ہاں...... راستہ ہے۔ مکان کے پیچھے چھوٹا سا میدان ہے۔ وہی تیلی کا باڑہ ہے۔ گھوڑی پر کھڑے ہو کر آسانی سے دیوار پر چڑھ سکتے ہیں۔"

"گھر میں کتنے آدمی رہتے ہیں؟"

"خالہ خالو کے بچے نہیں ہیں۔ دو بھانجیوں کے ساتھ رہتے ہیں۔"

"دو بھانجیاں ہیں؟"

"ہاں...... ویرو کی چھوٹی بہن بھی بہت دنوں سے خالہ کے گھر میں رہتی تھی۔ اب ویرو بھی آ گئی ہے۔"

"ابھی یعنی کتنے عرصے سے؟" جانے کی جلدی کے باوجود جگت معلومات حاصل کرنے کے تجسس کو روک نہیں سکا۔

"یہ کوئی نہیں جانتا۔ اچانک اس کی شادی کی بات آئی۔ کہتے ہیں اس طرح وہ لوگ اس کی شادی کرا دیں گے مگر بات کھل گئی۔"

"کس سے شادی ہو رہی ہے؟"

"یہ بھی کوئی نہیں جانتا کہ کسی کو پتہ نہ چلے۔" انفاد سر کچھ دیر رک گیا پھر مسکرا کر بولا۔ "بیاہنے والا اس گاؤں کا نہیں اور پھر وہ بیچارہ تمہارے نام سے ڈرتا ہوگا۔ لوگ کہتے ہیں کہ اس نے ویرو سے شادی کی شرط یہ رکھی ہے کہ شادی سے پہلے اس کا نام ظاہر نہیں کیا جائے گا نہیں تو جگا اسے زندہ نہیں چھوڑے گا۔"

"بے وقوف......" جگت کے جبڑے سخت ہو گئے۔ "بارات سے پہلے اس کا جنازہ اٹھے گا۔"

سارا گاؤں پچھلے پہر کی نیند میں ڈوبا ہوا تھا۔ چوک میں پہرہ دیتا ہوا چوکیدار بھی جھونکے لے رہا تھا۔ جگت کو راستہ صاف نظر آیا۔ گردوارے کے جھنڈے پر نظر جمائے ہوئے اس نے گھوڑی کو آگے بڑھا دیا۔ ایک مکان کے دروازے کے قریب کھڑا ہوا بیل اونگھ رہا تھا۔ وہیں جگت نے گھوڑی روک لی۔ سامنے والے کسی گھر میں بچہ رو رہا تھا۔ جگت پھرتی سے تیلی کے مکان کے عقب میں پہنچ گیا۔ سنسان رات میں ذرا سی آہٹ بھی کافی بلند سنائی دے رہی تھی۔ جگت نے آہستہ سے باڑے کے دروازے کو دھکیلا مگر وہ کھلا نہیں۔ تقریباً سات فٹ اونچی دیوار پر نظر گئی۔ جگت گھوڑی کی پشت پر کھڑا ہو گیا۔ دونوں ہاتھ دیوار پر جما کر اس نے جست لگائی۔ دیوار کے کنارے پر ہاتھ پڑتے ہی ایک چھوٹا سا پتھر آواز کے ساتھ باڑے میں گرا اور چارپائی پر سویا ہوا جسم حرکت کرنے لگا۔ جگت ہچکچایا نہیں۔ وہ باڑے میں کود گیا۔ وہ شخص چارپائی سے اٹھ کر بیٹھ گیا۔

"کون...... کون ہے...... ؟"

جگت نے تیزی دکھائی۔ اس سے پہلے کہ وہ شخص چیخ مارنے کے لیے منہ کھولے جگت جھپٹ کر اس کے قریب پہنچ گیا۔ جگا اس کے کھلے ہوئے منہ پر ہاتھ رکھ کر خوفناک آواز میں بولا۔

"خبردار اگر شور کیا۔" پھر دوسرے ہاتھ سے پستول نکال کر اس کے چہرے سے ہاتھ ہٹا لیا۔ جگت نے اندازہ لگایا کہ وہ ویرو کا خالو ہی ہوگا۔ اس کے چہرے پر فانوس کی روشنی پڑ رہی تھی۔ اوپر کا ہونٹ درمیان سے کٹا ہوا تھا۔ اس کی آنکھیں کبھی پستول کو اور کبھی جگت کی جانب دیکھ رہی تھیں جن میں خوف دکھائی دے رہا تھا۔ جگت کو یقین تھا کہ اس میں مقابلہ کرنے کی طاقت نہیں۔

"بول...... ویرو کہاں ہے؟" یہ سن کر اس کے شانے جھٹکے سے حرکت کرنے لگے۔ پیشانی پر پسینے کے قطرے ابھر آئے۔ بولنے کے لیے ہونٹ پھڑ پھڑائے مگر آواز نہیں نکل سکی تو اس نے اوپری منزل کی جانب اشارہ کیا پھر بھی جگت نے آنکھیں دکھاتے ہوئے پوچھا۔ "اوپر ہے؟" اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

جگت نے اوپری منزل کی جانب بڑھنے کے لیے قدم اٹھائے مگر جھٹکے سے کھڑا ہو گیا۔ اگر وہ اوپر جائے گا تو اس صورت میں تیلی شور مچا دے گا۔ اس کی نظر کھونٹی پر لٹکتے ہوئے صافے پر گئی۔

"چارپائی پر لیٹ جاؤ۔" جگت نے حکم دیا۔ ویرو کا خالو خوف سے کپکپانے لگا۔ جگت نے گھونسہ مار کر اسے لٹا دیا۔ تیزی سے بیٹنے پر صافے کا کپڑا لپیٹ کر چارپائی کے نیچے گانٹھ لگا دی۔ ایک ٹکڑا اس کے منہ میں ٹھونس دیا۔ "ذرا بھی شور کیا تو زندہ نہیں چھوڑوں گا۔" یہ کہتا ہوا وہ اوپری منزل کی طرف بڑھا۔ ویرو سے ملاقات کے خیال سے اس کی رگوں میں خون تیزی سے گردش کر رہا تھا۔ سینہ جذبات سے دھڑک رہا تھا۔ اوپر ایک ہی کمرہ تھا جو باہر سے بند کیا ہوا تھا۔ زنجیر چڑھی دیکھ کر پہلے تو وہ گھبرا گیا۔ نیچے

جا کر بوڑھے کا جبڑا توڑ دینے کی خواہش ہوئی مگر ایک بار کمرہ کھول کر دیکھ لیا جائے۔ یہ تجسس زور کر گیا اور اس نے زنجیر گرادی۔ جلدی میں اس نے دروازے کو زور سے دھکیلا۔ اندر کسی عورت کی ہلکی سی چیخ سنائی دی۔ ایک کونے میں جلتے ہوئے چراغ کے ہلکے اجالے میں جگت نے غور سے دیکھا ایک عورت بستر سے اٹھ کر دیوار کی جانب دوڑی۔ جگت نے سانس روک کر آہستہ سے کہا۔

"ویرو......!" اچانک وہ رک گئی۔ وہ دوپٹے کی بجائے سینے پر ہاتھ باندھ کر جگت کی جانب پشت پھیرے کھڑی تھی۔ جگت دبے قدموں سے آگے بڑھا......"ویرو......ویرو......" اس کی آواز میں لرزش تھی مگر اسے قریب آتا دیکھ کر وہ دیوار کے قریب سرک گئی۔ وہ سرتاپا لرز رہی تھی۔

"آپ یہاں کیوں آئے؟" وہ لڑکھڑاتی آواز میں بولی۔ جگت کا دل خوشی سے دھڑک اٹھا مگر اس سوال کی اسے توقع نہیں تھی جیسے اس کے کان میں سیسہ پگھلا کر ڈال دیا گیا ہو۔ دل میں چبھن سی ہوئی۔

"ویرو! میں تمہیں لینے آیا ہوں۔" بڑی مشکل سے اپنے جذبات کو دبا کر جگت بولا۔

دوسری جانب سے سسکیاں سنائی دیں۔ دیوار سے سر لگا کر وہ رو رہی تھی۔ جگت کا دل رونے لگا۔ دونوں کے درمیان ایک قدم کا فاصلہ تھا۔ جگت نے قریب جا کر اس کے شانے پر ہاتھ رکھا' شانے کو جھٹکا دے کر وہ ہٹ گئی۔

"میں ویرو نہیں......" اور جگت کا بڑھا ہوا ہاتھ سن ہو گیا۔ جیسے کسی نے اس کا دل مٹھی میں لے لیا ہو۔ "ویرو نہیں......" یہ لفظ اس کی زبان پر جم گئے۔ دو چار لمحے اس کا ذہن ساکت رہا۔ دروازے سے گھسنے والی ہوا کے جھونکے سے تھرتھرانے والی چراغ کی لو پر اس کی نظر گئی۔ وہ دوڑا اور تیزی سے دروازہ بند کر دیا۔ پھر اطمینان کی سانس لے کر وہ اس کے قریب گیا۔ ایک ہاتھ سے چراغ اٹھایا اسے قریب آتا دیکھ کر وہ دیوار سے پشت لگا کر نیچے بیٹھ گئی اور دونوں گھٹنوں میں سر دبا کر سسکیاں بھرتی ہوئی رونے لگی۔

"تم ویرو نہیں تو کون ہو......؟" اس کی آواز پھٹ گئی۔ جواب نہ ملا تو وہ اس کے قریب جا کر غصے سے بولا۔ "تم کون ہو......؟" دھیرے دھیرے سر اٹھا۔ ویرو کو دیکھنے کے لیے ترسی ہوئی آنکھیں تجسس انداز میں اسے دیکھنے لگیں۔ اسے آنسوؤں سے بھرا ہوا چہرہ دکھائی دیا۔ وہ بالکل ویرو جیسی تھی مگر ویرو نہیں تھی...... جگت کے ہاتھ سے چراغ چھوٹ گیا اور کمرہ تاریک ہو گیا...... اس کا خون جوش مارنے لگا۔ بیلٹ میں لگی ہوئی پستول کی جانب ہاتھ بڑھا تو وہ بولی۔

"میں ویرو کی بہن دھنو ہوں۔" ابھی اس کا رونا جاری تھا۔

"پھر ویرو کہاں ہے؟"

"کسے معلوم؟" وہ بولی۔ اور یہ سن کر جگت کی مٹھیاں کسنے لگیں۔ اس کے ذہن پر شیطان سوار ہو گیا تھا۔ "مجھے نہیں معلوم......" اندھیرے میں اس کا چہرہ نظر نہیں آ رہا تھا۔ "میں کچھ نہیں جانتی۔"

"کسے ویرو کا پتہ ہے؟ کون جانتا ہے؟" جگت غصے میں کپکپا رہا تھا۔ اگر اس کے سامنے عورت کی بجائے مرد ہوتا تو اس کے ہاتھ نہ رک سکتے۔

"میرے باپو کو پتہ تھا' مگر انہوں نے کسی کو نہیں بتایا۔" یہ کہہ کر دھنو پھر رونے لگی۔

"اب رونا بند بھی کرو گی؟" جگت غصے میں بولا۔ "ویرو کی شادی کی بات غلط ہے؟"

اس کا رونا تھم گیا۔ "بناوٹ ہے......سب غلط ہے تم یہاں کیوں آئے؟" اس سے پہلے کہ وہ پوری

افسانہ

میں آج بھی حسین ہوں

عین نون محمود

میں نے بہت عرصے سے اپنا چہرہ ہی نہیں دیکھا تھا' آج جو آئینے کے روبرو کھڑا ہوا تو احساس ہوا وقت کتنا بدل گیا ہے' کل جہاں تازگی تھی آج وہاں افکار کی مدت سے نقشہ کچھ ڈھل سا گیا ہے۔ میں پل بھر کو بجھ سا گیا اور دل بھر آیا' آنکھوں کی نمی نے ماضی کے دریچے کھول دیئے' اس کا حسن آنکھ میں اتر گیا۔ مخملی سی گھٹا جیسی زلفیں منفرد ادا' دلفریب سراپا' اک زمانہ تھا اس پر فدا' اس کی ایک دید' ایک نظر کے لیے گھنٹوں انتظار ہوتا تھا۔ کیا زمانہ تھا' بس جستجو تھی ہر دل کی وہ میں بھی اس کا طالب تھا اور اپنے احباب میں کافی نمایاں تھا' مگر طلب اور تمنا کسک بن گئی۔ اس سے الفت کا اظہار کیا اور ذات تماشہ بن گئی۔ اس کی یاد نے دل کو اور رنجیدہ کر دیا۔ میں نے پھر اپنا عکس آئینے میں دیکھا اور اس کو سوچنے لگا۔ وہ بے حد حسین تھی اور شاید خطرناک حد تک۔ دل بہت مشکل سے قابو ہوتا تھا' اس کے روبرو خیال ہمیشہ ہی بھٹک جاتا تھا۔ من اس کے لبوں کی نرمی کے لیے تڑپ اٹھتا تھا۔ مگر وہ ہمیشہ ہی صاف بچ جاتی تھی۔ یقیناً وہ بھی یہ سب جانتی تھی نگاہوں کے سوال پہچانتی تھی۔ مگر وہ ان باتوں پہ خوف زدہ ہونے کے بجائے محظوظ ہوتی تھی۔ آہستہ آہستہ حسین ہونے کا احساس اس کے اندر اتنا بڑھ گیا کہ اس نے ہم وا جیسی صورت والوں کی محفل میں آنا ہی چھوڑ دیا۔ میں ماضی کے اوراق شاید اور پڑھتا کہ مجھے برسوں بعد اس سے ہوئی کل کی ملاقات یاد آ گئی۔ کل ہی تو ملی تھی' بینک میں بل جمع کرانے آئی تھی۔ کتنی نازک تھی وہ کل اس کا سراپا کتنا اجنبی سا لگا تھا' شباب ڈھل سا گیا تھا' آخر عمر کی بھی بات ہوتی ہے مگر جانے کیوں مجھے اس کی آنکھوں میں جہاں بھر کی ویرانی اور تنہائی نظر آئی تھی۔ یوں لگا کہ وہ اپنے حسن کے سحر میں آپ اتنا محو ہو گئی ہو گی کہ اپنی ہی ذات میں تنہا رہ گئی ہو گی۔ یقیناً وہ اپنے ہی حسن کے سمندر میں ڈوب کر مر چکی تھی۔ مجھے کل دیکھی اس کی آنکھیں بھرپور انداز سے یاد آ گئیں اور میں پھر آئینے میں اپنی آنکھیں دیکھنے لگا۔ مجھے اپنی آنکھوں میں جانے کتنی ہی محفلیں نظر آنے لگیں کتنے ہی نام زبان پر آ گئے۔ مدت سے ڈھلے چہرے پہ آج بھی کتنی ہی محبتوں کے سائے نظر آ گئے۔ میں مسکرانے لگا' رب کا شکر ادا کرنے لگا۔ دل و ذہن میں یہ خیال امر ہو گیا کہ

میں کل بھی حسین تھا اور میں آج بھی حسین ہوں

بات کرتا "گھونگھرو" بن جاتی۔ جگت چونک گیا۔ نیچے یقیناً کوئی تھا۔ کوئی اوپری منزل چڑھ رہا تھا۔ جگت نے پستول ہاتھ میں تھام لیا۔ دھنو گھبراہٹ میں بولی۔ "پولیس..... تم بھاگ جاؤ۔"

جگت بپھر گیا۔ "دیو کے نام سے مجھے پھنسایا گیا ہے۔" وہ دروازے کی جانب جھپٹنا چاہتا تھا مگر دھنو نے اس کا بازو پکڑ لیا۔

"وہاں سے نہیں..... یہ کھڑکی کھول کر چھت پر۔"

کمرے کا بند دروازہ کسی نے دھکیلا مگر کھلا نہیں۔ جگت پل بھر خاموش رہا۔ پستول میں چھ راؤنڈ تھے۔ مقابلہ کرنے میں جان کا خطرہ تھا۔ ممکن ہے جس طرح دھنو کہتی ہے اس طرح فرار کا موقع مل جائے۔ دروازے پر ضربیں پڑنے لگیں۔ دھنو نے جواب دیا۔ "کھولتی ہوں۔" کھڑکی کھول کر جگت چھت پر چڑھ گیا۔ سن کرتی ہوئی گولی اس کے قریب سے گزر کر دیوار سے ٹکرائی۔ جگت کا دل دھڑک اٹھا۔ باہر راستے پر پولیس اس کا انتظار کر رہی تھی۔ پھر..... نیچے جانا خطرے سے خالی نہیں تھا۔ وہ گھٹنوں کے بل سرکتا ہوا چھت کے سرے کے قریب گیا۔ رائفل کے دھماکے سے پورا محلہ جاگ اٹھا تھا۔ شور ہونے لگا۔ جگت نے دیکھا برابر والے مکان کی چھت قریب تھی۔ وہاں ایک دو آدمی بھاگتے نظر آئے۔ یہ اچھا موقع ہے۔ پولیس کو فائر کا موقع نہ دینا ہو تو لوگوں میں شامل ہو جانا چاہیے۔ بجلی کی سی تیزی سے اس نے دوسری چھت پر جست لگائی۔ اس بار بھی پولیس کا فائر خالی گیا۔ شور اور بڑھ گیا۔ اب ارجن سنگھ برابر والی چھت پر آ گیا تھا۔ اس نے جگت کو تیسرے مکان کی چھت پر جست لگاتے دیکھا۔ اندھیرے میں نشانہ لیا، گولی جگت کی بائیں ٹانگ کی ران کو چھوتی ہوئی نکل گئی۔ جگت لڑکھڑا کر چھت پر گرا۔ ران سے گرم گرم خون ابل پڑا۔ مگر وہ پروا کیے بغیر اٹھ کر دوڑا۔ یہ اچھا تھا کہ مکان برابر برابر تھے۔ جگت پانچویں مکان کی چھت تک پہنچ گیا۔

اتنی دیر میں سارا محلہ شور سے گونج اٹھا۔ "جگا ڈاکو..... جگا ڈاکو....." کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ پولیس وارننگ دے رہی تھی۔ "کوئی راستے یا چھت پر نظر نہیں آئے گا۔ ورنہ گولی مار دی جائے گی۔" سامنے گردوارے کا جھنڈا نظر آ رہا تھا۔ درمیان میں ایک مکان کی آڑ تھی۔ ٹانگ میں شدید درد تھا۔ سر پر بندھا ہوا کپڑا اس نے زخم پر مضبوطی سے کس دیا۔ اس عرصے میں دو ہوائی فائر ہوئے۔ جگت سمجھ گیا کہ پولیس الجھ گئی ہے۔ اندھیرا اس کی موافقت میں تھا۔ اب اگر چھت سے نکل جائے تو فرار کا موقع تھا۔ وہ پھر ایک چھت پر کود گیا۔ گردوارہ سامنے نظر آ رہا تھا۔ وہاں کود جانے کے بعد راستہ ملنے کی امید تھی۔ اس نے آس پاس دیکھا، پولیس نظر نہیں آئی۔ "کہاں گیا..... کہاں گیا؟" کا شور سنائی دے رہا تھا۔ چھت کے کنارے کھڑے ہو کر اس نے جست لگائی مگر گردوارے کی چھت کو پیروں نے چھوا ہی تھا کہ نیچے پھسل گیا۔ وہ کس پر گرا تھا؟ یہ سمجھ میں نہیں آیا۔ مگر اس کے گرنے کی آواز نہیں ہوئی۔ پھر کوئی اس پر گرا..... اس کی آنکھوں میں اندھیرا چھا گیا۔ وہ بے چینی محسوس کرنے لگا اور بیہوش ہو گیا.....!

○✣○✣○

"جگا فرار ہو گیا....."

"نہیں وہ گاؤں میں چھپ گیا ہے۔ جائے گا کہاں؟"

ہاں بھئی..... فرار ہونے کا اسے موقع ہی نہیں ملا تھا۔ سارا محلہ پولیس نے گھیر لیا تھا۔ اور سارا گاؤں

جاگ اٹھا تھا کسی نے اسے فرار ہوتے نہیں دیکھا۔"
"مگر چھپنے کی جگہ تو ہو؟ پولیس محلے کے ایک ایک مکان کی تلاشی لے رہی ہے۔ کہتے ہیں اس کے پیر میں گولی لگی اور گھوڑی بھاگ گئی۔"

"بھئی جو بھی ہو بہرحال' ہم لوگوں کی جان بچ گئی۔ گولیاں ایسے چل رہی تھیں کہ ان کی جھپٹ میں آنے والا ڈھیر ہو جاتا۔"

"ڈاکو کو پکڑنے کے لیے پولیس بستیوں میں کیوں اسور چے بناتی ہے؟ وہ سردار جی کی عورت پیٹ سے تھی' بیچاری فوراً بیہوش ہو گئی۔ آٹھویں ماہ بچہ ہو گیا۔"

"جگا یہاں کیوں آیا تھا؟ کیا دیرو کو اغوا کرنے کے لیے! ہم بیوقوف بن گئے۔ شادی کی بات صرف ڈھونگ تھا۔"

اسمٰعیل آباد میں صبح ہونے تک یہی باتیں ہوتی رہیں۔ ارجن سنگھ پیچ و تاب کھا رہا تھا۔ کہاں غائب ہو گیا؟ اسے کس نے چھپایا؟ اس کے دماغ کی عجیب حالت تھی۔ اتنی احتیاط کے باوجود اس کے ہاتھ سے ترپ کا پتہ نکل گیا تھا۔ یہ اس کی برداشت سے باہر تھا۔ محلے محلے پولیس تلاشی لے رہی تھی۔ وہ خود بار بار ان چار پانچ مکانوں کے گرد چکر لگا رہا تھا جس جس چھت سے جگا کودا تھا' ان چھتوں کو چیک کیا گیا۔ خون کے نشان بھی درمیان میں رک گئے تھے۔ گردوارے میں جگا کا داخلہ ممکن نہیں تھا۔ وہاں پولیس کی چھاؤنی بنی ہوئی تھی۔ کہیں گاؤں کے لوگوں کو شک نہ ہو اس لیے پولیس پجاریوں کے قافلے کی شکل میں وہاں ٹھہری تھی۔ گردوارے میں چھپنے کی کوشش کرنے کا مطلب پھنس جانا تھا۔ طلوع ہوتے ہوئے سورج کی روشنی میں ارجن سنگھ نے گردوارے کی چھت کے کنارے پر کسی کے پیر کا نشان دیکھا۔

کچھ دور خون کا ایک قطرہ بھی نظر آیا۔ رات فانوس یا ٹارچ کی روشنی میں انہیں یہ کیوں نظر نہ آیا؟ وہ ضرور گردوارے تک آیا تھا مگر آگے کوئی نشان نہیں تھا۔ وہ پھر مایوس ہو گیا۔ "کمال ہے...... کمبخت نہ جانے کہاں غائب ہو گیا؟" وہ بڑبڑایا۔ گردوارے کی پشت پر دو مکانوں کے آنگن تھے۔ ایک گاؤں کے ہندو جج کا مکان تھا اور دوسرے مکان میں ایک سکھ گرمکھ سنگھ رہتا تھا۔ دونوں کی ایک چھت تھی۔ دونوں مکانوں کے درمیان دیوار بھی ایک تھی۔ دونوں سرکاری ملازم تھے۔ ایک قانون کا دوسرا فوج کا ملازم تھا۔ ان مکانوں میں جگت کو چھپنے کا موقع مل ہی نہیں مل سکتا تھا۔ جج ڈسٹرکٹ کورٹ میں حاضری کی غرض سے ہفتے میں پانچ دن گاؤں سے باہر رہتا تھا۔ گرمکھ سنگھ فوج سے چھٹی ملتی تو چھ ماہ میں ایک ہفتہ یا پندرہ دن کے لیے گھر آتا۔ جج کے گھر میں اس کی بیوی کے علاوہ تین بچے تھے۔ گرمکھ سنگھ کی بیوی اکیلی تھی۔

"بھائی جان! وہاں کھڑے کیا سوچ رہے ہیں؟" دائیں جانب کے برآمدے میں سے گرمکھ سنگھ کی بیوی نے پکارا۔ "نصف شب سے دوڑ بھاگ اور خون پانی کر رہے ہیں۔ تھوڑا آرام کریں۔ تازی لسی تیار ہے۔ دو پیالے پی لیں' کچھ تازگی محسوس ہو گی۔"

اوپر کھڑا ہوا ارجن سنگھ اس جوان صورت کو متجسس نظروں سے دیکھنے لگا۔ گاؤں کے لوگ پولیس کو بدنام کر رہے تھے اور یہ عورت ہمدردی دکھا رہی تھی۔ کچھ دیر بعد اسے خیال آیا کہ وہ اس کے سامنے احمقوں کی طرح کھڑا ہوا ہے۔

"بھابی جی! لسی نہیں' مگر چائے پی سکتا ہوں۔ آپ چولہا جلائیں' میں ابھی آتا ہوں۔"

ارجن سنگھ گیا تو دروازہ کھلا ہوا تھا اور آنگن میں چارپائی بچھی ہوئی تھی۔ وہ سمجھ گیا کہ عورت پکا

ہے۔ اپنے شوہر کی غیر حاضری میں پرایا مرد گھر میں ہو، اس صورت میں دروازے بند نہیں ہونے چاہئیں اور اسے ممکن حد تک آنگن سے آگے بڑھنے نہیں دینا چاہیے۔

وہ چارپائی پر بیٹھا اسی لمحے وہ اندر سے چائے لے کر آ گئی۔ "لیں بھائی جان! چینی کم ہو تو کہنا۔ ان کے فوج میں داخلے کے بعد اب چائے بنانا سیکھی ہوں۔"

"گرمکھ سنگھ کی کیا خبر ہے بھابھی؟" ارجن سنگھ نے کپ لبوں سے لگاتے ہوئے پوچھا مگر گرم چائے سے زبان جل گئی اس لیے جھٹکے سے کپ کھینچ لیا۔ اس نے آنگن کا جائزہ لیا۔ ایک کونے میں گھاس کے ڈھیر پر اس کی نظریں جم گئیں۔

"کیا دیکھ رہے ہو بھائی جان؟" گرمکھ کی بیوی نے اسے چونکا دیا۔ "کیا آپ یہ سوچ رہے ہیں کہ گھاس کے ڈھیر میں آپ کا ڈاکو چھپا ہوگا؟"

"ارے ایسا کیسے ہو سکتا ہے؟" ارجن سنگھ نے چائے کا گھونٹ پیتے ہوئے اس کو کن انکھیوں سے دیکھا۔ "ایسا سمجھتا تو آپ کے گھر کی بھی تلاشی لیتا۔"

"آپ تلاشی لینے نہیں آئے مگر میں نے تو بلا لیا۔" یہ کہہ کر وہ مسکرائی۔ "محلے کی عورتیں تو اس پر بحث کر رہی تھیں کہ پولیس نے سب کے گھر کی تلاشیاں لیں مگر کلدیپ یا پنچی کے گھر کے دروازے تک نہیں جائے۔"

"یہ تو عورتوں کی عادت ہے۔" پر وہ کپ نیچے رکھتا ہوا بولا۔ "سرکاری ملازمین کے مکان کی تلاشی لینے سے خود ہماری سبکی ہوتی ہے۔" یہ کہتے ہوئے ارجن سنگھ کی نظر پھر گھاس پر گئی۔ "میں سوچ رہا تھا گھر میں ایک بھینس ہے پھر اتنا بڑا گھاس کا ڈھیر کیوں؟"

"یہ بھی کوئی بات ہوئی؟" کلدیپ نے ایک ادا سے کہا۔ "جنگ ہو رہی ہے اس لیے سال بھر کا کوٹہ گھر میں رکھا ہے۔ ہر ماہ قیمتیں بڑھ جاتی ہیں۔" پھر کونے کی کوٹھڑی کی جانب اشارہ کر کے بولی۔ "اس میں اناج اور لکڑی بھی بھر رکھی ہے۔"

ارجن سنگھ نے محسوس کیا کہ ایسی فالتو باتوں کی بجائے کوئی میٹھی بات سننے کو ملے تو مزہ آ جائے۔ "آپ گھر میں تنہائی محسوس کرتی ہوں گی؟ گرمکھ تو جنگ ختم ہونے سے پہلے واپس نہیں آئیں گے۔"

کلدیپ نے محسوس کیا کہ اب وہ اٹھ جائے تو بہتر ہے۔ گرمکھ کی یاد آتے ہی اسے خوف کی لرزش محسوس ہوئی مگر اسے جواب دینے کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی۔ دروازے سے پنگاؤں کا صوبیدار نظر آیا۔ وہ جلدی سے اندر داخل ہو گیا۔ "صاحب! جگا کی گھوڑی مل گئی ہے۔"

ارجن سنگھ "اچھا؟" کہتا ہوا اٹھ کھڑا ہو گیا۔

"برابر والے گاؤں میں پکڑی گئی ہے۔"

"پھر تو زخمی جگا وہیں چھپا ہوا ہے۔" یہ کہتا ہوا ارجن سنگھ باہر نکل گیا۔ پیر کی ٹھوکر سے چائے کا خالی کپ دور گر کر ٹوٹ گیا۔

"صاحب! برابر والی پنچی بہن کے گھر بھی چکر لگا آنا تاکہ ہمیں گاؤں کی عورتوں کے طعنے نہ سننے پڑیں۔" کلدیپ نے بلند آواز میں کہا جیسے پڑوسنوں کے کان تک اس کی آواز پہنچ جائے۔ ارجن سنگھ کے جانے کے بعد اس نے بلند آواز میں دروازہ بند کر دیا۔



درد کی شدت سے ہنکارہ بھرتے ہوئے جگت نے پہلو بدلنے کے لیے سر اٹھایا مگر سخت تکلیف کی وجہ سے ہلکی سی چیخ مار کر پڑا رہا۔ آنکھیں کھولنے کی کوشش

کی مگر پلکیں جیسے من من بھر کی محسوس ہوئیں۔ ذہن میں کچھ حرکت ہوئی' جسم کو جھٹکا سا لگا۔ نیم بے ہوشی میں اسے محسوس ہوا کہ وہ کروٹ ہوئے گرا اور آنکھوں میں اندھیرا چھا گیا۔ یہ سب یاد آنے کے بعد آنکھیں کھولنے کی خواہش زور کر گئی پھر بھی ہمت نہ ہوئی۔ آنکھوں کے سامنے جیل کی کوٹھڑی یا پولیس کی چوکی نظر آئے گی۔ اس بات کا اسے یقین ہو چکا تھا۔ آخر ارجن سنگھ کا منحوس چہرہ دیکھنے کی جلدی کیا ہے!" اسی لمحے سر پر کسی کا ہاتھ گھومنے لگا۔ بڑا نرم ہاتھ تھا۔ ہلکی سی کھنکھنار بھی سنائی دی مگر یہ تو کسی عورت کے کنگن کی آواز تھی۔ جلدی سے پلکیں کھل گئیں۔ پہلے سب دھندلا نظر آیا۔

"تم کون ہو......؟" وہ بمشکل بولا۔

"شکر ہے......" عورت کی اطمینان بھری آواز سنائی دی۔ "ہوش آنے میں کتنی دیر ہو گئی۔ میں تو گھبرا گئی تھی۔" پھر شانے پر ہاتھ پھیرتی ہوئی بولی۔ "میرے ویر کیسے ہیں؟"

جگت اب بھی اسے پہچان نہیں سکا تھا۔ اسے کہاں دیکھا تھا' یہ یاد نہیں آ رہا تھا۔

"آپ......آپ کون ہیں؟"

"چھوٹی بہن کو آپ' آپ کہہ رہے ہیں!" کلدیپ نے لاڈ سے کہا۔ "پہچانے نہیں' یاد ہے میری شادی میں آپ نے جہیز بھیجا تھا۔ جب آپ ہمارے گھر ڈاکہ ڈالنے آئے تھے تو میں نے آپ کو بھائی بنایا تھا۔" جگت کی آنکھیں خوشی سے چمکنے لگیں۔ وہ کچھ کہنا چاہتا تھا' مگر کلدیپ چونک گئی۔ دروازے پر دستک ہوئی۔ اس کے چہرے پر خوف پھیلا ہوا تھا۔ خوف جگت سے چھپ نہ سکا۔ وہ بیٹھ گیا' مگر کلدیپ نے اسے روکا۔ "آپ چپ چاپ لیٹے رہیں۔ میں خود ہی سنبھال لوں گی۔"

وہ کھڑی ہو گئی۔ کوٹھڑی کا دروازہ اس نے باہر سے بند کر دیا۔ جگت اس عورت کی ہمت پر رشک کرنے لگا۔ اتنے سال پہلے' کن حالات میں اس نے کلدیپ کو دیکھا تھا اس کے دادا دادی کو دھمکی دے کر اور گھر کی دیوار توڑ کر زیورات نکلوائے مگر واپس لوٹنے سے پہلے اس لڑکی نے اسے بھائی بنا کر مٹھائی کا تھال آگے کیا اور مہندی لگے ہاتھ دیکھ کر اسے خیال آیا کہ لڑکی کی شادی ہونے والی ہے۔ اگر زیورات لے گیا تو بارات منڈپ سے واپس لوٹ جائے گی۔ پھر کوئی اس کا ہاتھ نہیں تھامے گا۔ اس نے زیورات لوٹا دیے تھے اور چار دن بعد بھائی کی طرح شادی میں جہیز بھی بھیجا تھا۔ چھ سات سال بعد اسی کے گھر میں سہارا ملا۔ قدرت کے بھی عجیب کھیل ہیں۔

جگت کا ذہن ماضی کے ورق الٹ رہا تھا اور کان کھلتے ہوئے دروازے پر لگے ہوئے تھے۔ کلدیپ سے کوئی عورت بات کر رہی تھی۔ پھر وہ بولتی ہوئی اندر آنے لگی۔ کلدیپ نے اسے کس طرح چھپایا ہوگا! گھر میں کوئی نہیں' پولیس کو اس کی بو کیوں نہیں ملی؟ اگر پولیس کو پتہ چل گیا تو اس مظلوم عورت کا کیا حال ہوگا؟ اس خیال سے جگا بے چین ہو گیا۔ اس کی نظر کوٹھڑی کے بند دروازے پر جمی ہوئی تھی۔ کمر پر ہاتھ پھیرا تو پستول نہیں تھا۔ پیر اونچا کرنے کی کوشش کی تو سارے جسم میں درد کی لہر دوڑ گئی اور وہ بمشکل چیخ کو دبا سکا۔ کچھ دیر بعد دروازہ بند ہونے کی آواز سنائی دی۔ اس نے اطمینان کا سانس لیا۔ کوٹھڑی کھول کر کلدیپ اندر آئی۔ جگت غور سے اسے دیکھنے لگا۔ کلدیپ کو حیرت ہوئی۔ "غور سے کیا دیکھ رہے ہیں؟"

پھر بھی جگت کچھ نہ بولا' نہ ہی اس نے نظر ہٹائی' کلدیپ اس کے سر کے قریب بیٹھ گئی۔ "یہ تو پڑوسن تھی......آٹا مانگنے آئی تھی۔" جگت اب بھی غور سے

اسے دیکھ رہا تھا۔

"کلدیپ! میں تمہارے گھر میں ہوں۔" وہ ہنس دی۔

"کیوں...... بہن کے گھر بن بلائے مہمان ہونا پڑا اس کا افسوس ہو رہا ہے؟"

"مہمان نہیں آفت بن کر آیا ہوں۔" جگت پرجوش لہجے میں بولا۔ "میں یہاں کس طرح آیا؟ گھر میں کون کون ہے؟ میں یہاں چھپا ہوا ہوں یہ کون کون جانتا ہے؟"

"جگا بھائی! آپ بے چین نہ ہوں۔" کلدیپ نے اس کے سینے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ "گھر میں، میں اکیلی ہوں۔ میرے سوا کوئی آپ کے بارے میں نہیں جانتا۔" جگت کچھ پوچھنا چاہتا تھا مگر کلدیپ بولی۔ "پہلے آپ کچھ پیٹ میں ڈالیں۔ میں نے آپ کے لیے رات تیار کی ہے۔"

جگت کو راب پلاتی ہوئی کلدیپ کہنے لگی۔

"بندوق کا دھماکہ ہوا اور میں جاگ گئی۔ پہلے تو ڈر کر کمرے کے دروازے بند کرلیے مگر پھر جگا ڈاکو جگا ڈاکو کی آوازیں سنیں۔ میرا دل لرز گیا۔

میں آنگن میں لرزتی ہوئی کھڑی رہی۔ ہر فائر میرے دل پر زخم لگا رہا تھا۔ بڑا شور ہو رہا تھا۔ میں دونوں کانوں پر ہاتھ رکھ کر آنکھیں بند کیے کھڑی رہی پھر زبردست دھماکہ سا ہوا۔ گھاس کا ڈھیر الٹ گیا۔ میں چند لمحے آنکھیں پھاڑے کھڑی رہی۔ گھاس کے نیچے سے آپ کا تڑپتا ہوا ہاتھ بلند ہوا پھر بھی میں بے حس و حرکت کھڑی دیکھتی رہی۔ مگر جب خون کی دھار پر نظر گئی تو نہ جانے کس طرح مجھ میں ہمت پیدا ہوئی۔ میں پولیس کی پروا کیے بغیر آپ کو بچانے کے لیے دوڑی۔"

کلدیپ سانس لینے کے لیے رکی پھر بولی۔

"باہر دوڑ دھوپ اور شور ہو رہا تھا۔ پھر اس کے بعد جو کچھ ہوا کس طرح ہوا یہ اب بھی سوچ کر الجھن میں پڑ جاتی ہوں۔"

"کیا ہوا......؟" جگت نے پوچھا۔

"میں نے فانوس کی روشنی کم کرکے اندھیرے میں گھاس کو آپ کے اوپر سے ہٹا دیا۔ آپ کو دو چار بار ہلایا مگر کامیابی نہیں ہوئی۔ تب میری الجھن بڑھ گئی۔ پولیس کی آمد سے پیشتر مجھے آپ کو گھر کے اندر کرلینا چاہیے تھا مگر میں اکیلی تھی۔ آپ کو کس طرح اٹھا سکتی تھی؟"

"میں بھی الجھن میں ہوں۔" جگت نے مسکرا کر کہا۔ "مجھے اٹھانے کے لیے تمہارے جیسی دو چار عورتیں چاہئیں۔"

"میں نے بمشکل آپ کو چارپائی تک لے جاکر لٹا دیا مگر چارپائی کو ہلانے میں مجھے پسینے چھوٹ گئے۔ بہت زور آزمایا پھر بھی نہ کھسکی۔ میں پریشان ہوگئی۔ درمیان میں ٹارچ کی روشنیاں چکرا رہی تھیں۔ چھتوں پر دوڑ دھوپ ہو رہی تھی۔ اسی لمحے مجھے بھینس کا خیال آیا۔ فوراً ہی چارپائی کی پائنتی سے رسی باندھی اور دوسرا سرا بھینس کے گلے میں ڈال دیا پھر آنگن سے برآمدے میں اور برآمدے سے کوٹھڑی میں بھینس چارپائی کھینچ لائی تب میں نے اطمینان کی سانس لی پھر ہمت بھی آگئی۔ بھینس کو دوبارہ باندھ کر کمرے کے دروازے بند کرکے آپ کو بمشکل کوٹھڑی میں لٹا دیا۔ میرا ناک میں دم آگیا۔" کلدیپ کی ہنسی میں پیار تھا۔

جگت کی آنکھیں بھیگ گئیں۔ پیشانی پر پھرتا ہوا کلدیپ کا ہاتھ پیار سے دبایا اور آنسو روکنے کے لیے پلکیں بند کرلیں۔ "بہن! تمہارا احسان میں اس دنیا میں ادا نہیں کرسکوں گا۔" جگت کی آواز بھیگ

گئی۔ "پتہ نہیں ہر آفت سے بچانے میں قدرت کی کیا مرضی ہے؟"

"جب تک آپ صحت مند نہ ہو جائیں تب تک آپ کو اس قید سے رہائی نہیں ملے گی۔ سمجھے؟" کلدیپ خفا ہو کر بولی۔ "میں نے آپ کے زخم پر جڑی بوٹی لگائی ہے۔ بہت گہرا زخم ہے۔"

"مگر کلدیپ! تم اپنے گھر میں اکیلی کس طرح رہتی ہو؟ تمہارا شوہر کہاں ہے؟"

"وہ فوج میں ہیں۔ آپ نے تو کبھی انہیں دیکھا نہیں۔ ٹھہریں۔ میں ان کی تصویر لاتی ہوں۔"

فوجی لباس میں شانے پر رائفل رکھ کر کھڑے ہوئے جوان کی تصویر دیکھ کر جگت کی آنکھوں میں ٹھنڈک ہوئی۔ "کیسے رعب سے کھڑا ہوا ہے..... کلدیپ! اس کا نام کیا ہے؟"

کلدیپ شرما گئی۔ "فوٹو کے پیچھے پڑھ لیں۔" گرمکھی زبان میں بگڑے ہوئے الفاظ سے لکھا ہوا تھا۔ "گرکھ سنگھ، میجر سکھ بٹالین۔" جگت نے فوٹو اٹھا کر مذاق میں کہا۔ "سلام میجر صاحب....."

کلدیپ کی مسرت پھولی نہ رہی تھی۔ فوٹو لوٹاتے ہوئے جگت اچانک سنجیدہ ہو گیا۔

"مگر کلدیپ! تم نے یہ کیا کیا؟ وہ فوج کا میجر ہے۔ اور اس کے گھر میں باغی کو سہارا دے کر تم نے کتنا بڑا جرم کیا ہے..... اس کا تمہیں احساس نہیں۔ بھائی کی جان بچانے کی خاطر تم نے اپنے شوہر کی ملازمت بھی داؤ پر لگا دی۔ تمہارا یہ جرم جب اسے پتہ چلے گا تو وہ تمہیں کبھی معاف نہیں کرے گا۔"

"تو کیا میں اپنی نظر کے سامنے آپ کو گرفتار ہونے دوں؟ آپ کو کچھ ہو جاتا تو بھگوان مجھے کبھی معاف نہ کرتے۔" کلدیپ پرجوش لہجے میں بولی۔ "پھر آپ کو یہاں چھپایا ہے یہ کسے معلوم ہوگا؟"

"کلدیپ! تم ارجن سنگھ کو نہیں جانتیں۔ وہ زہریلا شخص مجھے گرفتار کرنے کے لیے زمین آسمان ایک کر دے گا۔ تم کتنے دن چھپائے رکھو گی؟"

"میں نے ارجن سنگھ کی آنکھوں میں دھول جھونک دی ہے۔ صبح ہی اسے آنگن میں بلا کر چائے پلا چکی ہوں۔ یہ جاننے کے باوجود کہ سرکاری ملازم اور پھر فوج کے عہدے دار کے گھر کی تلاشی لینے وہ نہیں آئے گا اس کے دل سے شک دور کرنے کی غرض سے میں نے خود اسے گھر کی تلاشی لینے کے لیے کہا۔ اس وقت تک آپ ہوش میں نہیں آئے تھے۔"

جگت نے اسے بہت سمجھایا کہ آج رات وہ یہاں سے چلا جائے گا مگر اس نے قسم دے کر اسے چپ کر دیا۔ "جب تک آپ ٹھیک نہ ہو جائیں میں آپ کو نہیں جانے دوں گی۔ باہر نکل کر آپ کتنے فاصلے تک بھاگ سکیں گے؟ پولیس کی دسترس سے بچ نہیں سکیں گے۔"

کلدیپ کی بات بھی سچ تھی۔ اس حالت میں وہ بیٹھ بھی نہیں سکتا تھا پھر بھاگنے کا سوال ہی کہاں رہ جاتا تھا؟ پولیس کو چکر دینے کے لیے جسم کا ساتھ چاہیے پھر بھی اس نے دل میں فیصلہ کر لیا کہ وہ یہاں زیادہ دیر نہیں رکے گا اور موقع ملتے ہی بھاگ جائے گا۔

"ارے ہاں..... میرا پستول کہاں گیا؟"

کلدیپ مسکرائی۔ "اب یاد آیا آپ کو؟ مگر آپ بھول گئے وہ آپ کی بیلٹ میں نہیں تھا۔ میں نے اناج کے دو تھیلوں کے درمیان ہاتھ ڈال کر پستول نکال لیا۔ یہاں محفوظ کر دیا تھا۔"

پستول ہاتھ میں آتے ہی جگت کا خیال اور مضبوط ہو گیا۔ اب فرار ہونے میں خطرہ کم ہوگا مگر اسے بار بار کلدیپ کے سر پر لٹکتی ہوئی تلوار نظر آ رہی تھی۔

خطرے کی تلوار..... اسے یقین تھا کہ کسی کو شک نہیں ہوا۔ "میں نے جیتر میں تحفہ بھجوایا تھا اس کے بارے میں سب جانتے ہیں ممکن ہے کسی کو پرانی بات یاد آجائے۔" یہ الفاظ جگت کی زبان پر بھی آگئے۔

"ایسا ممکن نہیں....." کلدیپ پورے اعتماد سے کہہ رہی تھی۔ "ہم سے یہاں اس گاؤں میں ہم سال بھر سے رہنے آئے ہیں۔ ہاں کوئی یہ بات نہیں جانتا۔"

قدرت ہر طرح موافقت کر رہی تھی اس کا یقین ہونے کے بعد جگت فرار ہونے کے راستے تلاش کرنے لگا۔ بچن یا دوسرے ساتھی اسے یہاں بچانے نہیں آسکتے تھے۔ کلدیپ صبح و شام اس کے زخم پر مرہم پٹی کر دیتی۔ تین وقت کھانا اور دن کا بڑا عرصہ گھر کے باہر گزارتی' برابر والے گردوارے میں جا کر پوجا پاٹھ کرتی۔ پڑوسن کے ہاں بیٹھ کر گپ لگاتی' تاکہ اس کے گھر میں باہر والوں کی حاضری نہ ہو اور کسی کو شک نہ گزرے۔ اس کی غیر حاضری میں جگت کمرے میں لاٹھی کے سہارے چلتا۔ چوتھے دن اس کی نظر قینچی پر گئی۔ اس کے ذہن میں روشنی ہوگئی۔ حالانکہ وہ اپنے خیال سے کچھ دیر تک پریشان رہا لیکن اس کے علاوہ کوئی چارہ نہ تھا۔ اگر زندگی کو خطرہ درپیش ہو تو انسان مذہبی حد بندیوں کو فراموش کر سکتا ہے۔ جگت نے دل کو سمجھایا' شہید بھگت سنگھ کو بھی ایسا ہی کرنا پڑا تھا..... وہ کھانا کھا کر کلدیپ کے سونے کا انتظار کرتا رہا۔ پھر فانوس کی روشنی بڑھا کر سامنے چھوٹا آئینہ رکھ کر ہاتھ میں قینچی اٹھائی' پہلے ہاتھ لرز گیا۔ قینچی چہرے تک لے جاتے ہوئے وہ پسینے میں نہا گیا۔ اس نے دل میں گرو گوبند سنگھ کا نام لے کر بزرگوں کی معافی چاہی پھر تیزی سے داڑھی پر قینچی چلانے لگا..... کچھ دیر میں نیچے بالوں کا ڈھیر ہوگیا۔ پیٹھ پر پہنچتے ہوئے بال اب کانوں تک آگئے تھے۔ اس کا چہرہ بدلا ہوا نظر آنے لگا۔ کسی کام میں اس نے اتنی تھکن محسوس نہیں کی تھی۔ گرے ہوئے بال جمع کر کے اس نے گٹھڑی باندھ لی پھر نصف گھنٹے تک خاموش رہا۔



صبح کے طلوع ہوتے ہوئے سورج کی پہلی کرن نے ابھی زمین کو چوما تھا کہ ارجن سنگھ کے ماتحت نے اسے بیدار کر دیا۔ اسے صرف دو گھنٹے پہلے سونا نصیب ہوا تھا پھر یہ کون سی آفت آگئی؟ اس نے جھلائے ہوئے لہجے میں کہا۔ "کیا ہے؟ تھوڑی دیر سونے دو کمبخت جگا نے نیند حرام کر دی ہے۔"

"نہیں صاحب..... اب اس کی موت قریب ہے۔" اس کے ماتحت نے کہا۔ "جگا گرکھ سنگھ کے مکان میں چھپا ہوا ہے..... ہمیں شک ہے۔"

ارجن سنگھ کا تجسس کم ہونے لگا۔ "لعنت ہے..... اتنا کہنے کے لیے میری نیند خراب کی تھی؟" اس نے لمبی جماہی لی۔ "گاؤں کی عورتیں سرکاری ملازمین کے گھر کی تلاشی لینے کے لیے کہہ رہی ہیں اس لیے تم لوگ سنک گئے ہو۔ گرکھ کی بیوی نے خود مجھے گھر بلایا تھا۔"

"صاحب! یہ میرا اندازہ نہیں بلکہ گاؤں کے ڈاکٹر نے مجھے اشارہ دیا ہے۔"

اب ارجن سنگھ ہوشیار ہو گیا۔ "ڈاکٹر نے؟ مگر کس طرح شک ہوا؟"

"وہ کہہ رہے تھے کہ کلدیپ ان کے گھر آئی تھی تو پوچھ رہی تھی کہ ڈاکٹر صاحب! گولی کے زخم کا کیا علاج کیا جاتا ہے؟" یہ سن کر ارجن سنگھ چارپائی سے کود پڑا۔

"فوراً اس کے مکان کے گرد گھیرا ڈال دو....."

کلدیپ جگت کے لیے پراٹھے بنا رہی تھی۔ ارجن سنگھ نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ”کیا مہمان کے لیے ناشتہ تیار ہو رہا ہے؟“ کلدیپ کے ہاتھ سے پراٹھا چھوٹ گیا اور چہرہ اتر گیا۔ ارجن سنگھ تیز نظروں سے گھر کے کونوں کا جائزہ لے رہا تھا۔ کلدیپ بمشکل کہہ سکی۔

”آیئے... آپ مہمان کیسے؟ میں ابھی پراٹھے لاتی ہوں۔“

”میں دوسرے مہمان کی بات کر رہا ہوں بھابی۔“ ارجن سنگھ طنزیہ انداز میں ہنس کر بولا۔ پھر کوٹھڑی کے دروازے کی جانب بڑھا۔ کلدیپ کا دل بیٹھ گیا وہ اسے روکنے کھڑی ہوئی مگر عقب میں دو رائفل بردار پولیس والوں کو آتے دیکھ کر اس کے پیر فرش سے چپک گئے۔ کوٹھڑی کے دروازے پر لات مار کر ارجن سنگھ ایک طرف ہٹ گیا۔ ”جگتے! اگر جان پیاری ہے تو ہتھیار باہر پھینک دے۔“

کلدیپ کی پیشانی کی رگیں ابھر آئیں۔ ”تم کیسی بے ہودہ بات کر رہے ہو؟“ کلدیپ نے کہا مگر ارجن سنگھ نے اس کی جانب دھیان نہیں دیا۔ اس نے ایک رائفل بردار پولیس والے کو آگے بڑھایا۔

”جاؤ..... اندر جا کر اسے شوٹ کر دو۔“ وہ پہلے لحہ بھر تک کھڑا لرزتا رہا مگر جب چیف نے گرج کر کہا۔ ”جا رہے ہو یا نہیں؟“ تو پھر وہ لڑکھڑاتے قدموں سے کوٹھڑی کی جانب بڑھا۔ ارجن سنگھ رائفل یا پستول کے دھماکے کے انتظار میں تھا مگر چند لمحے بعد پولیس والا واپس پلٹا۔

”صاحب..... اندر کوئی نہیں۔“

ارجن سنگھ نے خود کوٹھڑی میں جا کر چیک کر لیا تو کلدیپ کو اطمینان ہوا۔ اس نے دل میں بھگوان کا شکر ادا کیا مگر ارجن سنگھ کو دکھانے کی خاطر غصے میں بولی۔

”اب ہو گیا اطمینان‘ تلاشی لے لی؟“

ارجن سنگھ اپنے ماتحت کو گالیاں بکتا ہوا باہر چلا گیا۔ اس کے جاتے ہی کلدیپ نے کوٹھڑی میں جھانکا‘ اندر کوئی نہیں تھا۔ اناج کی بوریوں کے پیچھے دیکھا‘ وہاں بھی کوئی نہیں تھا۔ کونے میں پڑی ہوئی پوٹلی پر نظر گئی‘ وہ تیزی سے وہاں گئی کھول کر دیکھا تو اندر بال تھے..... وہ سمجھ گئی‘ اس کی آنکھوں سے مسرت بھرے آنسو گرنے لگے مگر پھر دل میں خوف محسوس ہوا۔

”کیا وہ صحیح سلامت نکل گیا ہوگا.....؟“

○❖○❖○

کلدیپ کے گھر سے جگت باہر نکل گیا مگر اسے پولیس کے جال سے نکلنے کے لیے بہت چوکنا رہنا تھا۔ لاٹھی کے سہارے ایک پیر سے لنگڑاتا ہوا کمر جھکا کر سر نیچے کیے وہ آگے بڑھ رہا تھا۔ ذرا سی بھی آواز کے لیے اس نے کان چوکنے کر رکھے تھے۔ دایاں ہاتھ کمر پر لگے ہوئے پستول پر تھا۔ وہ باہر نکلنے سے پہلے چوغے اور لنگی کو دو چار جگہ سے پھاڑ چکا تھا اور سر پر کپڑے کا چھوٹا سا ٹکڑا لپیٹ لیا تھا جس سے وہ فقیر نظر آئے۔ ”اندھے فقیر کو راستہ دکھاؤ!“ یہ کہتا ہوا لاٹھی ٹیکتا وہ آگے بڑھ رہا تھا۔ اندھیرے میں خاموشی سے آگے بڑھنے پر کسی کو شک ہو سکتا تھا۔

ارجن سنگھ نے محکمے پر سے پولیس کا گھیرا ہٹا کر گاؤں کے گرد لگوا دیا تھا۔ جگا گاؤں سے باہر نہیں گیا‘ اس کا اسے یقین تھا۔ وہ دو تین بجے تک چکر لگاتا رہا تھا تاکہ پولیس مستعد رہے۔ جگت نے سب سوچ رکھا تھا۔ سالوں سے پولیس کے ساتھ اس کا واسطہ رہا تھا لہٰذا ان کی کمزوریوں سے واقف تھا۔ رات کے آخری حصے میں چوکیدار جھونکے کھانے لگتا ہے‘ پلکوں پر نیند کا بوجھ بڑھ جاتا ہے اور جھونکے آنے لگتے

ہیں۔ اس انتظار میں جگت نے نصف شب گزار دی۔ شام سے وہ بے چین ہو رہا تھا۔ اپنے سگے بھائی کی طرح پیار کرنے والی اور جان جوکھم میں ڈال کر آسرا دینے والی بہن سے کہے بغیر خاموشی سے جانے میں اسے جرم نظر آ رہا تھا۔ صبح بیدار ہو کر کلدیپ اسے نہیں دیکھے گی اس صورت میں اسے کیسا جھٹکا محسوس ہوگا؟ پھر بھی اسے دل مضبوط کر کے نکل جانا تھا۔ اندر سے ایک خیال اسے چونکا رہا تھا۔ "بھاگ... جا... بھاگ جا..."

کوئی غیبی قوت سائے کی طرح اس کا ساتھ دے رہی تھی۔ اس کی حفاظت کر رہی تھی۔ جگت اس کے اشارے کے خلاف کچھ نہیں کرتا تھا۔ البتہ ذہن پر شیطان مسلط ہو جائے اس صورت میں وہ غلط فیصلہ کر بیٹھتا تھا ویرو کی تلاش میں ساتھیوں سے پوشیدہ رہ کر یہاں دوڑ آنے پر اسے پچھتاوا ہو رہا تھا۔

اکیلی عورت کے گھر میں چار دن چھپ کر رہا تھا اگر اس بات کا دنیا کو پتہ چل گیا تو کلدیپ کی زندگی برباد ہو جائے گی۔ ممکن ہے اس کا شوہر بھی اسے نہ رکھے۔ سماج میں بیچاری بدنام ہو جائے گی۔

تین بجنے کے بعد بھاری دل اور بھاری قدموں سے چلتا ہوا وہ گھر سے باہر آ گیا۔ کلدیپ گہری نیند سو رہی تھی۔ اس کے معصوم چہرے پر پیار بھری نظر ڈالتا ہوا وہ کمرے کے باہر آ گیا۔ ابھی چوکھٹ پار کی تھی کہ ایک لمحے اس کے دل سے آواز آئی۔

"نہیں... نہیں۔" اس کو ڈر لگا۔ وہ دروازے کی آڑ میں چھپ گیا۔ کلدیپ اسے دیکھ لے گی وہ سانس روک کر مجرم کی طرح کھڑا رہا۔ اس نے آنکھ کے گوشوں سے دیکھا کلدیپ پہلو بدل کر بڑبڑائی۔ "میرے گھر میں کوئی نہیں چھپا۔"

جگت نے گہری سانس لی۔ اس میں آہ بھی شامل تھی۔ باہر سے بے پروا نظر آنے والی عورت نیند میں کیسی تڑپ رہی تھی۔ اس نے یہاں رہ کر کلدیپ کے دل پر کیسا ظلم کیا تھا۔ "اب چاہے پولیس کے ہاتھ لگ جاؤں مگر اس پر اب زیادہ ستم نہیں ہوگا۔ بہن سکھی رہو۔ سلامت رہو۔ زندہ رہوں گا تو پھر ملنے کا وچن دیتا ہوں۔" وہ بڑبڑایا۔

کلدیپ کے گھر کا عقبی میدان تو وہ آسانی سے پار کر گیا۔ دو چار کتوں نے بھونک کر اسے جانے دیا۔ مگر گاؤں کی حد پار کرنا مشکل ثابت ہو رہا تھا۔ اسے اس بات کا اندازہ تھا کہ پولیس والے جھوٹے تالا بے ہوں گے مگر ایسا نہیں تھا۔ ایک پولیس والا کاندھے پر رائفل رکھ کر راؤنڈ لے رہا تھا۔ پندرہ گز دور سے اسے پولیس والا نظر آ یا تو اسے دوسرا راستہ بدلنے کی خواہش ہوئی مگر پولیس والا اسے دیکھ چکا تھا۔ لہٰذا اس کے سامنے سے بھاگنا ممکن نہیں تھی۔ ایک پل کی ہچکچاہٹ ضبط کر کے وہ آگے بڑھا۔ اس نے دیکھا پولیس والے نے جھٹکے سے رائفل ہاتھ میں تھام لی ہے۔ کمر اور جھکا کر لاٹھی زور سے زمین پر مار کر اس نے آواز لگائی۔ "اندھے فقیر کو راستہ دکھاؤ..."

ایک ایک قدم اسے موت کی جانب لے جا رہا تھا۔ خطرہ ہونے کے باوجود اس نے سر اٹھا کر پولیس والے کو دیکھنے کی جلدی نہیں کی۔ دیکھے بھالے بغیر وہ فائر نہیں کھولے گا اس بات کا جگت کو یقین تھا۔ اور پستول میں بچی ہوئی دو گولیاں ضرورت پڑنے پر فائر کرنے کے لیے کافی تھیں۔ پانچ گز کا فاصلہ رہ گیا تو جگت جان کر پتھر سے ٹھوکر کھاتا ہوا نیچے گرا۔ "اوئے رہا..." کی آواز سے ہاتھ کی لاٹھی دور جا گری۔ گھٹنہ دباتا ہوا وہ بیٹھ گیا۔ پولیس والے کے جوتوں کی آواز قریب آ رہی تھی۔ خطرناک لمحہ قریب آ رہا تھا۔

"ارے بابا! اس اندھیرے میں کہاں جارہے ہو؟" پولیس والے نے لاٹھی اٹھا کر اسے کھڑا کرنے کے لیے سہارا دیا۔

"رب تمہیں خوش رکھے بیٹا۔" آنکھیں بند رکھ کر جگت بھرائے ہوئے لہجے میں بولا۔ "اندھے کو اندھیرا کیا اجالا کیا۔"

اس کی لاٹھی دیتے ہوئے اس کا دھیان جھکے ہوئے چہرے کی جانب گیا۔ آنکھوں سے بھی جگت نے محسوس کیا کہ وہ اسے دیکھ کر دو قدم پیچھے ہٹ گیا تھا۔ لحہ دو لمحے میں وہ فائر کردے گا یا چیخ مارے گا۔ ایک پل کے لیے اسے پستول نکالنے کی خواہش ہوئی مگر دل مضبوط کرلیا۔ وہ پولیس والے کو سوال کرنے کا موقع دیے بغیر خوفزدہ لہجے میں بولا۔ "سانپ...... سانپ...." اچانک خطرہ انسان کا ذہن سن کردیتا ہے۔ اندھا آدمی سانپ کو کیسے دیکھ سکتا ہے؟ یہ سوچے بغیر پولیس والا بھڑک کر عقب میں دیکھنے لگا اور جگت نے چیتے کی سی پھرتی سے زقند بھری۔ فولادی کلائیوں سے پولیس والے کے حلق کے گرد گھیرا ڈال دیا اور دوسرے ہاتھ سے اس کا منہ دبا کر بند کردیا پھر اس طرح تنک گیا کہ جسم کا بوجھ اس پر آجائے۔ گردن کا گھیرا پولیس والا ضبط نہ کرسکا اور زمین پر گر پڑا اس کے ہاتھ سے رائفل گر گئی پھر بھی جگت نے پکڑ ڈھیلی نہیں کی۔ وہ بھی اس پر گرا۔ یہ سب چند لمحے میں ہوگیا پھر بھی جگت کوئی خطرہ مول نہیں لینا چاہتا تھا۔ برابر پڑی ہوئی رائفل اٹھا کر اس کا بٹ اس نے پولیس والے کے سر پر مارا۔ ضرب زوردار تھی، ایک ہلکی سی چیخ گونجی۔ جگت رائفل اٹھا کر بھاگنا چاہتا تھا مگر کسی کے دوڑنے کی آواز سنائی دی۔ جگت کو سمجھنے میں غلطی ہوگئی تھی۔ اس نے ایک ہی پولیس والے کی گنتی کر رکھی تھی مگر وہ دو تھے۔ پہلے والے کو بٹ نہ مارا ہوتا تو دوسرے کی توجہ اس طرف نہ ہوتی۔ وہ تیزی سے ایک درخت کے پیچھے چھپ گیا۔ دوڑتا ہوا پولیس والا کچھ دور کھڑا رہ کر ٹارچ سے آس پاس کا جائزہ لینے لگا۔ روشنی کا دائرہ زخمی پولیس والے پر ٹھہر گیا۔ اس نے تیزی سے روشنی کا دائرہ چاروں سمت گھمایا مگر کچھ نظر نہ آیا۔ جگت جس درخت کے پیچھے چھپ کر کھڑا تھا' وہاں روشنی کا دائرہ رک گیا۔ جگت ہوشیار ہوگیا۔ اس نے رائفل کے دھماکے کا انتظار کیا مگر روشنی کا دائرہ ہٹ گیا۔ جگت پولیس والے کے جوتوں کی آواز پر کان لگائے کھڑا تھا کہ شاید وہ قریب آکر نشانہ لے گا۔

چند منٹ اسی طرح بیت گئے مگر یکا یک آہٹ رک گئی تو جگت الجھن میں پڑ گیا۔ "کیا وہ اسے دیکھ چکا ہوگا؟ کیا کوئی آڑ لے کر فائر کرنا چاہتا ہوگا؟ پھر تو دیر ہوجائے گی۔" اس نے تنے کے عقب سے رائفل کی نال نکال کر لبلبی پر انگلی رکھ دی۔ صرف ایک آنکھ سے اس نے عقب میں نظر دوڑائی۔ مخالف سمت سے فائر ہونے کی صورت میں خطرہ تھا مگر اس کا خوف غلط تھا۔ پولیس والا تو زخمی ساتھی کے جسم پر سر جھکا کر ٹارچ کی روشنی میں اس کا زخم دیکھ رہا تھا۔ جگت نے موقع سے فائدہ اٹھایا' جست لگا کر وہ اس پر جھپٹا۔ اس سے پہلے کہ وہ چونک کر کھڑا ہوا اس نے ضرب لگائی' جگت کا نشانہ چوک گیا۔ گرتے ہوئے پولیس والے نے رائفل کی لبلبی دبانے کی کوشش کی۔ جگت چونک گیا اس کے پاس دو راستے تھے۔ اس کا نشانہ خالی کردینے کے لیے ہٹ جاتا یا رائفل کے فائر کو روکتا۔ موقع نازک دیکھ کر اس نے دوسرا خطرہ مول لیا۔ اس نے رائفل تھامے ہوئے ہاتھ کو زور سے جھٹکا دیا۔ وہ اتنا قریب آگیا تھا کہ لبلبی دبنے کی صورت میں گولی اس کا سینہ چیر دیتی مگر پولیس والے

کی انگلی دیر سے لبلبی تک پہنچی اور ریوالور اس کے ہاتھ سے دور جا گری۔ جگت اس کے سینے پر چڑھ بیٹھا۔ اندھیرے میں دونوں میں سے کسی کا چہرہ نظر نہیں آ رہا تھا۔ جگت کے ذہن پر شیطان سوار ہو گیا۔ ارجن سنگھ نے ویرو کا لالچ دے کر اسے پھنسانے کی چال چلی تھی۔ یہ غصہ اس نے پولیس والے پر اتارا' جگت کے بھاری جسم کا وزن اس کے سینے پر پڑا تو وہ ہاتھ پیر ہلانے کی کوشش کرنے لگا۔ چیخ مارنے کے لیے اس نے منہ کھولا تو جگت نے فوراً ہی اس کے جبڑے پر دو گھونسے جڑ دیے پھر اس کے بالوں کو مٹھی میں لے کر بازو کا تمام زور آزما کر اس کا سر زور سے زمین پر پٹخنے لگا۔ جب وہ اس کے سینے پر سے اٹھا تو اسے پیر کا درد اور فرار ہونے کا خیال آیا۔ اس نے دونوں پولیس والوں کے جسم گھسیٹ کر برابر والی کھائی میں ڈال دیے اور ان کی رائفلیں اٹھا کر وہاں سے فرار ہو گیا۔ دو گھنٹے میں اسے بہت دور نکل جانا چاہیے تھا۔ کسے معلوم آگے کون سی مصیبت اس کا انتظار کر رہی ہوگی......؟



جگت جس قدر ویرو کی تلاش میں مایوس ہو گیا' اسی قدر زیادہ بپھرنے لگا۔ باپ دادا کے انتقام کے سلسلے میں اس کے تمام دشمن بھینٹ چڑھ چکے تھے۔ پھر بھی انتقام کی آگ بجھنے کی بجائے اور بھڑک اٹھی تھی۔ ویرو کو چھین لینے والا سارا سماج اسے دشمن دکھائی دیا۔ اپنی آزادی چھین لینے والے پولیس ڈیپارٹمنٹ کے خلاف اس نے جنگ شروع کر دی تھی۔ اس کی دھاک بیٹھ گئی۔ انعام کے لیے ڈکا کے سر کی رقم بڑھ گئی مگر ڈکا کی عزت ہونے لگی۔ وہ بے لگام ہو چکا تھا۔

ساتھی حیرت زدہ تھے۔ "جگت! تم بہت زیادہ بدل گئے ہو۔ تم نے بال کاٹ کر مذہب کا فرمان ٹھکرایا' اسی کا یہ اثر ہے۔ بال رکھ لو ورنہ بھگوان کا غضب نازل ہوگا۔" وہ کہتے۔

"غضب......" جگت پھیکی ہنسی میں بولا۔ "میں نے مذہب کو سینے سے لگایا اس کا مجھے کیا انعام ملا؟ بغاوت ختم کرنے کے لیے چار سال جیل کی تکالیف برداشت کیں' گھر واپس لوٹا مگر مجھے گھر کا سکھ نہیں ملا۔ ویرو نہیں ملی۔ کوئی میرے دل کے درد کو نہیں سمجھ سکا۔ کسی نے مجھے سچی بات نہیں بتائی۔" وہ کچھ رک گیا۔ اس کی آنکھوں میں سرخی ابھر آئی۔ "اب ڈاکو ہی رہوں گا تو اچھے برے کی تمیز کرنے سے فائدہ بھی کیا ہوگا۔"

"جگت! یہ تم نہیں بلکہ تمہارے اندر کا شیطان بول رہا ہے۔" بچن نے غصے میں کہا۔

جگت بپھر گیا۔ "اچھا...... اب تمہیں مجھ میں شیطان نظر آتا ہے؟ پھر مجھے اکیلا چھوڑ دو' تم سب مجھے چھوڑ جاؤ۔"

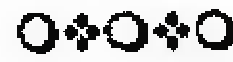
بچن کو بہت صدمہ ہوا۔ ویرو کی جدائی میں وہ اس قدر پاگل ہو جائے گا یہ اس سے برداشت نہیں ہوا پھر بھی جگت کو چھوڑنے کے لیے وہ تیار نہیں تھا۔ جگت کے ذہن کو ٹھنڈا کرنے کا علاج کیا ہے' ویرو؟ مگر اس کا پتہ تو نہ ہی پتہ چلے گا۔ ہاں...... چندن بھابھی ہے۔ سب کے لیے برا کہنے والا جگت' چندن کور کا نام آتے ہی نرم پڑ جاتا تھا۔ اس کی قربت جگا کو ٹھکانے لگائے گی۔ نفرت کو ختم کرنے کے لیے پیار سے بڑھ کر کوئی علاج نہیں۔ مگر دونوں کا ملاپ کس طرح کیا جائے؟ گھر کا نام سن کر جگت برہم ہو جاتا تھا۔

"میں اس چوکھٹ پر بھی قدم نہیں رکھوں گا۔" وہ کہتا۔

"جگت! میں دو دن پہلے اچلا سے ملا تھا' وہ

تمہارے گھر رستا جانے والی ہے۔ چندن بھابی کو کچھ بھیجنا ہے؟"

"خیریت بھیج دینا۔" جگت بولا جیسے ٹالنا چاہتا ہو مگر بچن کے لیے اتنا کافی تھا۔ اچلا' چندن بھابھی سے ملنے جائے گی' اتنی اطلاع دینی کافی تھی۔ باقی وہ خود سنبھال لے گا۔



"آؤ بہن..... کس سے کام ہے؟" ماں جی نے انجانی عورت کا استقبال کرتے ہوئے کہا اور اسے چارپائی پر بٹھایا۔ اچلا' جگت کی ماں کو غور سے دیکھ رہی تھی۔

"چندن بھابھی نہیں ہیں؟"

"اوپر گئی ہوئی ہے۔" ماں جی اب غور سے اسے دیکھنے لگیں۔ چندن کور کو بھابھی کہنے والی عورت کون ہو سکتی ہے؟ اسے پہلے بھی کبھی نہیں دیکھا تھا۔ اچلا کا دل اوپری منزل پر جانے کو چاہا مگر وہ ضبط کر گئی۔

"لڑکی! میں نے تمہیں پہچانا نہیں۔" ماں جی نے بے چین لہجے میں کہا۔ "آنکھیں دھندلی ہونے لگی ہیں۔"

"میں..... میں اچلا ہوں۔" اپنی پہچان بتاتے ہوئے وہ ذرا ہکلائی۔ صرف نام بتایا۔ ماں جی اور الجھن میں پڑ گئیں۔ اسی لمحے چندن نیچے آگئی۔ اچلا دوچار لمحے اسے دیکھتی رہی پھر مسکرا کر بولی۔ "آپ ہی چندن بھابھی ہیں؟"

"ارے..... یہ چندن کو بھی نہیں پہچانتی؟" ماں جی بڑبڑائیں۔

"میں نے آپ کو پہچانا نہیں۔" چندن صرف اتنا بولی۔

"ہم پہلی بار مل رہے ہیں لہٰذا آپ کیسے پہچانیں گی؟" اچلا پراسرار لہجے میں بولی۔ "ویرو میرے ہی

پال رہی تھیں..... دودھیا میں۔" ماں جی چونک گئیں۔ چندن بھی بجھ گئی۔

"اوہ اب خیال آیا بھئی..... آپ اچلا بہن ہیں۔" یہ کہہ کر وہ اچلا سے لپٹ گئی۔ ماں جی کو ان کا اس طرح لپٹ جانا کچھ اچھا معلوم نہیں ہوا۔ ویرو کے لیے محبت رکھنے والی ماں جی کو اب اس کے نام سے نفرت ہو گئی تھی جس کی وجہ سے جگت گھر چھوڑ گیا' قتل کیا' پھر ڈاکو بن گیا۔ ویرو کی پہچان والی عورت کے لیے ان کی نفرت جاگی۔ چندن اچلا کو اندر لے گئی۔ دونوں نے بہت سی باتیں کیں۔ جگت کی باتیں سننے میں چندن اتنی گم ہو گئی کہ چولہا جلانے کا ہوش نہ رہا۔

"بچن سنگھ نے مجھے ایک کام سے آپ کے پاس بھیجا ہے۔" اچلا اب خاص بات پر آگئی۔ "جگت بھائی تم سے ملنے نہیں آئیں گے' تم ان سے ملنے جاؤ گی۔"

"کہاں؟ کس طرح؟" چندن کا دل دھڑک اٹھا۔ جگت سے ملنے کے لیے وہ تڑپ رہی تھی۔ چھ ماہ میں ایک بار بھی اس نے خبر نہیں لی تھی۔ چندن کو اس کا افسوس تھا۔

"الور میں..... جہاں تمہاری زمین ہے۔" بچن کی بتائی ہوئی بات اچلا کہنے لگی۔ "پولیس کو شک بھی نہیں جائے گا اور جگت بھائی کے ساتھ تم وہاں کچھ دن اطمینان سے رہ سکو گی۔"

چندن سوچ میں ڈوب گئی۔ "وہاں جانے کے لیے ساس سسر اجازت دیں گے؟ اچلا بہن! آپ کو میری وجہ سے تھوڑا جھوٹ بولنا پڑے گا۔"

"کیا؟" اچلا نے حیرت سے پوچھا۔

"ماں جی سے کہنا انہوں نے ملاقات کے لیے مجھے الور بلایا ہے۔ جیسا کبھی کا تہوار منانے۔"

اچلا ماں جی کی جانب بڑھنے کے لیے اٹھی' مگر چندن نے روک لیا۔ "ابھی نہیں' میرے سسر کے آنے کے بعد۔"

"بہتر ہے۔" یہ کہہ کر اچلا بیٹھ گئی۔ بچن نے اس سے جو کچھ کہا تھا وہ کہنے کے لیے زبان ساتھ نہیں دے رہی تھی۔ آخر ہمت کی۔ "چندن بھابھی! جگت بھائی کا آج کل دماغ گھوم گیا ہے۔ بچن سنگھ کہہ رہے تھے کہ وہ پہلے جیسے نہیں رہے۔ آپ انہیں سنبھالنا' آپ جیسی عورت کے ہوتے ہوئے وہ ویرو کے لیے اس طرح کیوں تڑپ رہے ہیں؟"

چندن کی آنکھیں برسنے لگیں۔ کچھ دیر رو لینے کے بعد وہ بولی۔ آواز بھرائی ہوئی سی تھی۔ "ہمارے سب کے نصیب خراب ہیں' بہن! نہیں تو میں اپنے ہاتھوں ویرو کو اس گھر میں لے آتی۔"

اسی لمحے صدر دروازہ کھلا' بات ادھوری رہی۔ چندن اٹھ گئی۔ سوہن سنگھ گھر میں آئے۔ ان کا چہرہ مرجھایا ہوا تھا۔ وجہ پوچھنے کی نہ تھی کیونکہ ان کے پیچھے ارجن سنگھ دروازے میں داخل ہوا۔ آخری چار ماہ میں چھ بار گھر کی تلاشی لے چکا تھا۔ جب بھی آتا تھا چیزیں بکھیر دیتا۔ دھمکی دیتا۔ چار چھ دن کے لیے سب کی نیندیں خراب کرنے چلا جاتا۔ اسی وجہ سے اس کی اچانک آمد نے سب کو دم بخود کر دیا۔

"صاحب! آپ ہمارے پیچھے کیوں پڑ گئے ہیں؟" جگت کے باپو بے چین لہجے میں بولے۔

ارجن کے پیچھے دو سپاہی کھڑے ہوئے تھے' وہ تلاشی کے لیے اندر جانے کا انتظار کر رہے تھے۔ "کیا کروں بزرگ ...... فرض تو پورا کرنا ہی پڑتا ہے۔" ارجن سنگھ کے لہجے میں ریاکاری تھی۔ "تمہارا بیٹا ہمیں کتنا پریشان کر رہا ہے؟ اب پولیس پر وار کرنے سے بھی نہیں ہچکچاتا۔"

"مگر اس میں ہمارا کیا قصور؟ وہ یہاں کبھی نہیں آتا۔ لوٹ کا مال ہمارے گھر میں ہونے کی غلط اطلاع پر ہمیں کیوں پریشان کیا جاتا ہے؟" سوہن سنگھ کے لہجے میں کچھ تلخی تھی۔ "ہر بار خالی ہاتھ لوٹتے ہو۔"

"اس بار شاید خالی ہاتھ نہیں لوٹوں گا۔" ارجن سنگھ برآمدے تک آ گیا۔

ماں جی درمیان میں آ گئیں۔ "چیف صاحب! ہمیں پریشان کرنے کا آپ کو بہانہ چاہیے۔ کیوں ہماری آہ لے رہے ہو؟"

ارجن سنگھ کی آنکھیں پھیل گئیں۔ "ماں جی! یہ سوال اپنے بیٹے سے پوچھو' روز کتنے لوگوں کی آہ لیتا ہے۔"

"میرا بیٹا...... میرا بیٹا کے طعنے رہنے دو صاحب!" ماں جی کا مزاج بگڑ گیا۔ "اب وہ ہمارا بیٹا نہیں رہا۔" چندن کے دل پر ضرب لگی۔ برابر کھڑی ہوئی اچلا بھی ماں جی کے غصے سے لرز گئی۔ سوہن سنگھ جگت کی ماں کو ٹھنڈا کرنا چاہتے تھے اسی لمحے ارجن سنگھ بولا۔

"کیا ایسا کہنے سے جگت تمہارا بیٹا نہیں رہے گا؟"

"میں نے اسے دل سے بھلا دیا ہے۔" ماں جی چیخ اٹھیں۔ "کہنے سے نہیں' بلکہ قانون کی رو سے۔" یہ کہہ کر جگت کے باپو کی جانب گھومیں۔ "انہیں عاق کرنے والی دستاویز دکھا دو۔"

سب بت کی طرح کھڑے رہ گئے۔ ارجن سنگھ کے لیے یہ حیرت کی بات تھی۔ چندن کور کے لیے یہ صدمہ تھا۔ سوہن سنگھ مکان میں گئے اور ایک بنڈل بنا ہوا کاغذ لے کر آ گئے اور ارجن سنگھ کے ہاتھ پر رکھ دیا۔ "لیجیے صاحب! اس کے علاوہ ہمارے پاس اس کا دوسرا علاج نہیں تھا۔"

ایک سرکاری کاغذ سے ماں باپ اور بیٹے کے خون کا رشتہ کیسے ختم ہوجاتا ہے؟ چندن کور سوچ رہی تھی۔ ارجن سنگھ نے کاغذ واپس لوٹا کر چندن کور کی جانب نظر کی۔ اس کا غصہ اس نے کڑوے بول کہہ کر اتارا۔ "وہ آپ کا بیٹا نہیں رہا مگر اس کا شوہر تو رہے گا۔"

چندن کور کا جی چاہا کہ وہ پولیس چیف کا گلا دبا دے۔ ماں جی نے آج اپنے ہاتھوں ممتا کا گلا گھونٹ دیا تھا۔ عاق کرنے کی بات انہوں نے چندن سے پوشیدہ رکھی تھی۔ مجبوراً اسے اس وقت کھول کر اس کا دل دکھایا تھا مگر وہ کیا کرتیں؟

گھر کے تنگ ماحول سے اچیا گھبرانے لگی۔ اسے محسوس ہوا کہ اب اس کی حاضری یہاں غیر ضروری ہے۔ جاتے ہوئے وہ جگت کے باپو سے کہہ گئی۔

"تمہارے بیٹے کا پیغام میں نے چندن بھابی کو دے دیا ہے۔" سو ارجن سنگھ اور ماں جی چندن کو گھور رہے تھے۔ مگر اچیا جا چکی تھی۔

بیساکھی سے چار روز پہلے چندن لاہور روانہ ہوگئی۔ مگر وہ لاعلم تھی کہ ارجن سنگھ کا آدمی اس کا تعاقب کررہا تھا......!!



دوپہر کا کھانا کھا کر ہزارہ ایک درخت کی چھاؤں میں لیٹا ہوا تھا۔ جگت کے باپو کی ہلور کی زمین کو کھیتی کے لائق بنانے کے لیے پانچ سال سے وہ کام کررہا تھا۔ پنجاب چھوڑ کر راجستھان میں داخل ہونا بھی اسے پسند نہیں تھا مگر اسے جگت کے جیل سے رہا ہونے کا انتظار تھا تاکہ وہ اسے زمین سپرد کرکے چلا جائے۔ اس نے یہی سوچا تھا۔ بہن بہنوئی نے بھی ہزارہ کو یقین دلایا کہ تمہارے بھانجے کے جیل سے رہا ہونے کے دو چار ماہ بعد ہم سب وہاں رہنے جائیں

گے مگر جگت دو ماہ بھی گھر میں نہ ٹک سکا اور ہزارہ کا تمام سوچنا بیکار گیا۔ جگت کے ہاتھوں موہن سنگھ کے قتل کے بعد ہزارہ نے پورے سات سال بعد گھر میں قدم رکھا تو نانا کا دل بھر آیا۔ سالوں پہلے جوش کی حالت میں انہوں نے بیٹے سے کہہ دیا تھا کہ جب تک جگت کا آخری دشمن ختم نہ ہوا اس وقت تک تم گھر کی چوکھٹ پر قدم نہیں رکھو گے مگر آخری دو سال میں انہیں بیٹے کی جدائی بہت زیادہ ستانے لگی۔ بیٹے کو بیاہ کر گھر میں بہو لانے کے ارمان انہیں پریشان کررہے تھے۔ آنگن میں جھولا بندھے، توتلی زبان میں کوئی انہیں دادا دادا کہہ کر پکارے۔ معصوم بچہ ان کی پشت پر سوار ہوکر "چل میرے گھوڑے چل" کہہ کر کھیلے۔ وہ دن دیکھنے کے لیے ان کا بڑھاپا تڑپ رہا تھا۔

"بیٹا! اب جلد سے جلد تمہاری شادی کرنی ہے۔" نانا نے اس سے مشورہ طلب کیا مگر ہزارہ خاموش رہا۔

"جگت کی بیوی چندن کور کے رشتے داروں میں ایک لڑکی ہے، تم کہو تو بات کروں؟" تب ہزارہ کو بولنا پڑا۔

"باپو! آپ تو جانتے ہی ہیں کہ جگت اب کبھی گھر میں قدم نہیں رکھے گا۔ مجھے چندن کور کی فکر ہورہی ہے۔ چار چھ ماہ تک شوہر نہ ملے یہ کون سی عورت برداشت کرسکتی ہے۔"

"بیٹا! اس بات کو کیوں درمیان میں لا رہا ہے؟" یہ بات نانا کی سمجھ میں نہیں آئی۔ وہ آخر میں بولے۔ "ہاں ہزارہ اس میں مایا کور کی غلطی تھی۔ جس طرح گھر میں ایک بار قدم نہ رکھنے کے لیے میں نے تم سے کہا تھا اسی طرح غصے میں اس نے بھی جگت سے یہی بات کہہ دی تھی آخر بھی وہ میری بیٹی......" ان کی آواز میں جوش نہیں افسوس تھا پھر انہوں نے بنیادی بات کی۔ "مگر ہزارہ! چندن کور کے دکھ میں تم کنوارے نہیں رہو گے۔"

"یہ بات نہیں باپو! میں بہن اور بھانجے کے درمیان نفرت دور کرنا چاہتا ہوں۔" وہ بولا۔ "جب جگت گھر میں آنے پر تیار ہوگا تو میں شادی کروں گا۔"

نانا کو اس کا ارادہ پسند آ گیا۔ مگر پھر سوچنے لگے۔ جگت یہ ضد ضرور پوری کرے گا ایک بار اس سے کہا تو جائے۔ ماموں کے لیے بھانجا اتنا بھی نہیں کرے گا؟

اس بات کو چھ ماہ کا عرصہ گزر گیا۔ جگت ہزارہ کو نہ مل سکا۔ ہزارہ لیٹ کر ہرے بھرے کھیتوں کی جانب دیکھتا ہوا سوچ رہا تھا اس بار بہن اور بہنوئی کی جانب سے بیساکھی منانے کے لیے خط بھی نہیں آیا۔ وہ دو دن سے ڈاکیے کا انتظار کر رہا تھا۔ شام تک رتیا یا دھرم پور سے کوئی خبر نہ آنے پر اس نے صبح پنجاب روانہ ہونے کے متعلق فیصلہ کر لیا تھا۔ کھیت کی حد کے قریب ایک ریڑھا نظر آیا۔ ہزارہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔ "کون آیا ہوگا؟" وہ تیزی سے دوڑ گیا۔ چندن کور کو ریڑھے سے اترتے دیکھا تو سوچا کہ بہن بہنوئی بھی آئے ہوں گے مگر چندن کو اکیلی دیکھ کر وہ بے چین ہو گیا۔

"سب ٹھیک تو ہیں؟" اس نے پوچھا۔

دوپٹہ درستی شانے پر کپڑوں کا بنڈل رکھتی چندن بولی۔ "سب خیریت سے ہیں۔"

"پھر تم اس طرح اکیلی.....؟" ہزارہ اس سے آگے نہ کہہ سکا۔ اسی لیے چندن کور نے کن انکھیوں سے ریڑھے والے کی جانب دیکھا۔

"تمہارے رشتے کی خبر لائی ہوں۔" اور ہزارہ کو بولنے کا موقع دیئے بغیر وہ مکان کی جانب بڑھی۔ ریڑھا آگے بڑھا۔ ہزارہ الجھن میں پھنسا رہا۔ چندن کور اس کے لیے رشتے کے متعلق خبر لے کر آئی ہوگی؟

"اس کے لیے تم نے یہاں تک آنے کی تکلیف گوارا کی۔" خبر معلوم کرنے کے لیے ہزارہ نے کہا۔

"تم جانتی ہو کہ جگت جب تک اپنی ضد نہ چھوڑے گا اس وقت تک رشتہ نہ کرنے کی میری ضد بھی جاری رہے گی۔" چندن کچھ دیر تک خاموش رہی۔ وہ مسکرا رہی تھی۔

سر جھکا کر اس نے کہا۔ "میں تم دونوں کی ضد چھڑانے آئی ہوں۔" پھر آہستہ سے بولی۔

"تمہارے بھانجے یہاں آ رہے ہیں۔"

"اچھا.....؟" ہزارہ کو حیرت ہوئی۔ "جگت اتنی دور آئے گا؟" خوشی کے جوش میں وہ بلند آواز میں بولا۔ چندن نے آس پاس نظر گھمائی۔

"یہاں کوئی چغلی کھانے والا تو نہیں ہے؟"

"فکر نہ کرو بھانجے کا یہاں بال بیکا نہیں ہوگا۔" ہزارہ نے اطمینان دلایا۔ "بیساکھی کے بہانے کھیت میں کام کرنے والوں کو چار دن کی چھٹی دے دوں گا۔ لہٰذا ان کی حاضری نہیں رہے گی۔" چندن نے اطمینان کی سانس لی۔

"میں نے بڑی بے چینی سے سفر طے کیا ہے ممکن ہے کوئی مجھے دیکھ لے...... پھر ملاقات کی بجائے زندگی بھر کی جدائی ہو جائے گی۔" چندن کی آواز بھرا گئی۔ ہر کوئی جانتا تھا کہ اب جگت کی گرفتاری ہونے کے بعد اسے کالے پانی سے کم سزا نہیں ملے گی جہاں سے کوئی واپس نہیں لوٹتا۔ چندن کور کی اس بے چینی نے ہزارہ کو ہوشیار کر دیا۔ اس کی خوشی اب اندیشوں میں گھر چکی تھی۔

(ان شاء اللہ باقی آئندہ ماہ)

